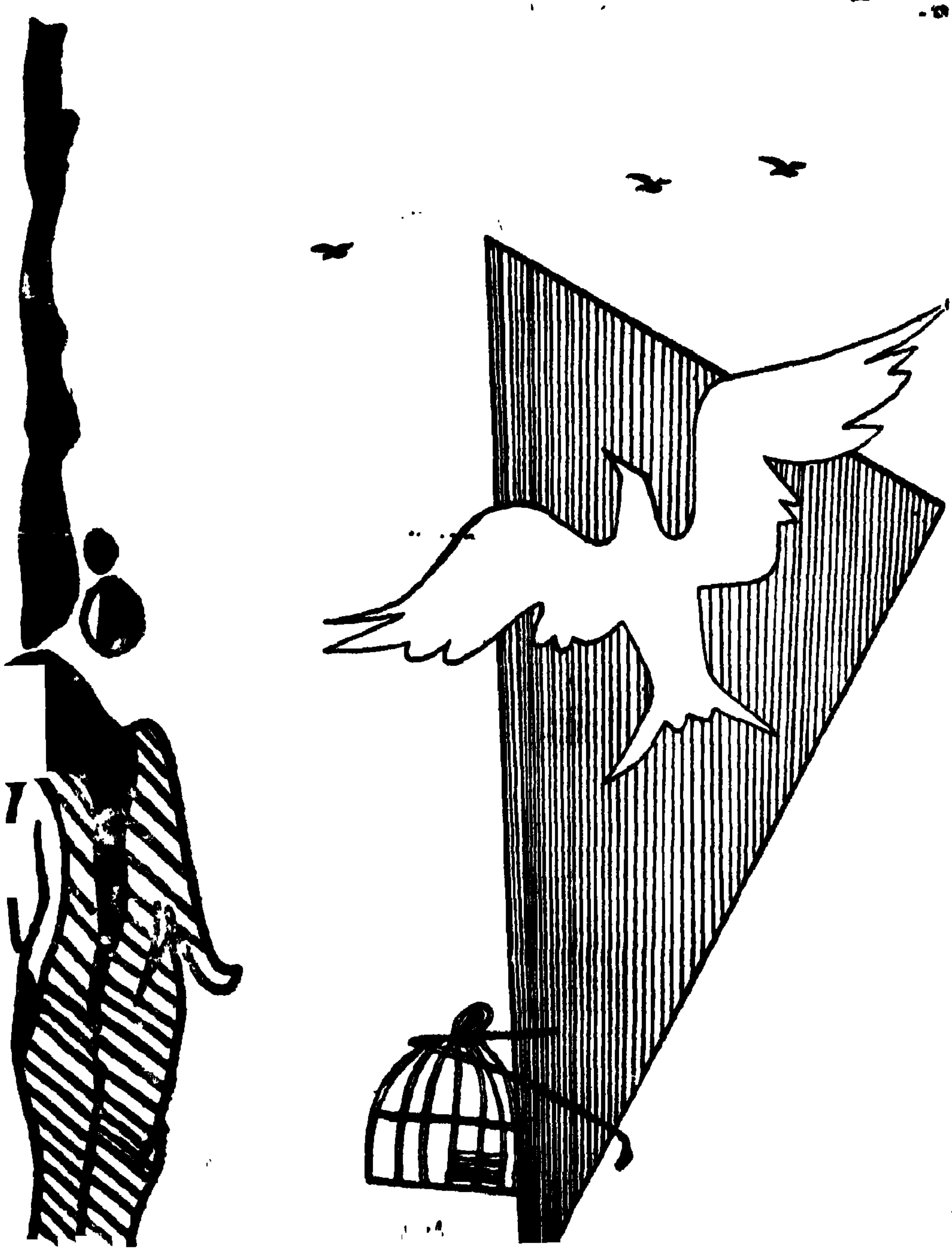
ماهنامه



مارچ پاسٹ کا پیغام



چنوتیوں کے مقابلے کا عزم
یہی پریڈ کا جذبہ ہے

DAVP

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شسنہاروی

بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس شسنہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی
فیضان عزیزی
کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

جلد ۵۲ شمارہ ۱

بدلِ اشتراک
فی شمارہ .... ۴/- روپے
زرِ سالانہ .... ۵۰/- روپے
لائف ممبری ..... ۱۰۰/- روپے

فہرست

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ سُہیل

سیلور سائیڈ روڈ، گیا (بہار)
فون نمبر ۲۱۵۰۲

نمود

انسان مر چکا ہے

آج ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال کچھ ایسی ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں انسان مر چکا ہے۔ ماضی قریب کے فرقہ وارانہ فساد، نسل کشی کی متعدد واردات سیاسی عدم استحکام اور ذات پات کے جھگڑوں نے ماضی وحال میں اتنے ہولناک مناظر پیش کئے ہیں کہ حالات سے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ ابھی حال میں گیا ضلع کے بارا گاؤں میں قتل وغارت گری کا جو ننگا ناچ رچایا گیا ہے اس کی ذمہ داری کس پر جاتی ہے۔ اہل سیاست خلوص کے ساتھ مسائل کا حل کرنے کی بجائے حالات کو ہوا دیتے ہیں۔ اور انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بارا گاؤں میں جو کچھ ہوا وہ اس کے قتل کے واقعہ کا رد عمل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عمل اور رد عمل کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کیا سیاست، قانون، انتظامیہ، پولس — یہ سب کے سب حالات میں سدھار لانے کے اہل نہیں؟ ہندوستان کے ان علاقوں میں تیزی کے ساتھ جنگل کا قانون نافذ ہو رہا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ ان عناصر پہ کڑی نظر رکھے جو ہماری زندگی کو تباہ کر رہی ہے

(ادارہ)

اصغر علی انجنیئر

قسط نمبر ۱

پریم چند ـــ حیات اور فن

اور لوگوں کی طرح فنکار بھی اپنے ماحول کا پیدا وار ہوتا ہے ۔ اور اسی لئے ہمارے لئے فنکار کے حالات زندگی کا مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے ۔ پریم چند ایک بڑے فنکار تھے اور ان کے ذہنی اور فنی ارتقا کا مطالعہ ان کی زندگی کے حالات کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے ۔ بچپن کے حالات پر روشنی ڈالنا خصوصاً ضروری ہوتا ہے کیونکہ ماہرین نفسیات ہمیں بتاتے ہیں کہ بچپن میں جو اثرات ذہن پر مرتب ہوتے ہیں وہ آگے چل کر انسان کے ذہنی ارتقاء میں اہم رول ادا کرتے ہیں دراصل زندگی کا یہ دور بڑا ہی حساس (SENSITIVE) اور کئی معنی میں فیصلہ کن دور ہوتا ہے ۔ اس لئے ہم شروعات میں پریم چند کے بچپن کا جائزہ لیں گے ۔

پریم چند خود اپنی زندگی کو سادہ اور سپاٹ بتاتے ہیں ۔ وہ خود ایک جگہ اپنی زندگی پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :

"میری زندگی ایک سادہ اور سپاٹ میدان ہے ۔ جس میں کہیں کہیں گڈھے تو ملیں گے ، لیکن اس میں کوئی ٹیلے ، پہاڑیاں ، گھنے جنگل ، گہری وادیاں یا کھنڈر نہیں ملیں گے ۔ پہاڑوں میں گھومنے پھرنے والوں کو یہاں سخت مایوسی ہوگی ۔"

پریم چند کی اپنی زندگی کا جائزہ نہایت سادہ مگر علامتی پہلو اور گہری معنویت لئے ہوئے ہے ۔ دیہاتی زندگی بڑی سادہ اور سپاٹ ہی ہوتی ہے ۔ اور قدرے پرسکون بھی ۔ شہروں کی طرح نہ گہما گہمی اور نہ رنگا رنگی ۔ دیہات کے لوگ صابر وشاکر اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں دن رات مصروف ۔ نئی نئی تمنائیں اور آرزوئیں یہاں جنم ہی نہیں لیتیں ۔ بس کسی طرح روکھی سوکھی میسر آجائے اور پھٹے پرانے کپڑے نصیب ہوجائیں ۔ زندگی کی یہی پہلی اور آخری تمنا ہر چیز کا محور بن کر رہ جاتی ہے ۔ لیکن اتنی سادہ سی آرزو پورا کرنے کے لئے بھی ہندوستانی کسانوں کو جدوجہد کرنا پڑتا ہے ۔ پریم چند کی کہانیاں اسی کی داستان ہیں ۔ ان کے فنکارانہ ذہن نے کسانوں کی زندگی کے سطحی سکون کو چیر کر اس کا بھرپور مشاہدہ کرلیا تھا ۔

پریم چند کی سادہ اور سپاٹ زندگی نے کس طرح کسانوں کی زندگی کے آتار چڑھاؤ اور دیہاتی سماج کی حرکیات (DYNAMICS) کو اپنی گرفت میں لیا اس کا انکشاف پریم چند کے ناقدوں کے لئے بڑا چیلنج ہے۔ فنکار کے لاشعور کی گہرائیوں میں اتر کر ہی اس چیلنج کا کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ پریم چند خود ہمیں اپنی زندگی کے پیچیدہ موڑوں کا پتہ نہیں دیتے۔ اپنی زندگی کا خلاصہ وہ چند لفظوں میں یوں پیش کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں :

"تاریخ پیدائش ۱۹۳۷ء سمبت ہے۔ باپ کا نام منشی عجائب لال، سکونت موضع مڑھوا، لمہی، متصل پانڈے پور، بنارس، ابتدا آٹھ سال تک فارسی پڑھی، پھر انگریزی شروع کی۔ بنارس کالجیٹ اسکول سے انٹرس پاس کیا۔ والد کا انتقال پندرہ سال کی عمر میں ہوگیا۔ والدہ ساتویں سال گذر گئیں تھیں۔ پھر تعلیم کے محکمے میں ملازمت کی۔ ۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی"

ظاہر ہے محض اتنی موٹی سی روپ ریکھا ہمارے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ ہمیں اور ذرائع سے جن میں ان کی بیوی شیو رانی کی کتاب "پریم چند گھر میں" اور ان کے بیٹے امرت رائے کی کتاب ہمارے لئے خاص طور سے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔
پریم چند کا جنم ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو لمہی نام کے گاؤں میں ہوا۔ جو موضع مڈھوا میں بنارس سے اعظم گڑھ جانے والی سڑک پر بنارس سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں لمہی میں پندرہ بیس گھر کرمیوں کے، دو ایک کمہار، ایک آدھ ٹھاکر، تین چار مسلمان، اور نو دس گھر کائستوں کے۔ یہی کل آبادی اس گاؤں کی تھی۔ منشی پریم چند کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ دھنپت رائے سے پریم چند بننے کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ اس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔ پریم چند کا جنم ایک کچے مگر بڑے سے مکان میں ہوا تھا۔ جو ان کے دادا گر سہائے لال پٹواری نے اس گاؤں میں آباد ہو کر بنوا لیا تھا۔ پٹواری اگرچہ مالک ہو تو گاؤں کے راجہ سے کم نہیں ہوتا۔ وہی گاؤں کا کرتا دھرتا بن بیٹھتا ہے۔ اور اپنی آمدنی کا ذریعہ بھی پیدا کر لیتا ہے گرسہائے لال اپنے پیشے کے گر سے اچھی طرح واقف تھے۔ جلد ہی انہوں نے ساٹھ بیگھے زمین بھی خرید لی۔ جو انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے مہاویر لال کے نام لکھ دی۔ امرت رائے ہمیں بتاتے ہیں کہ گرسہائے لال پینے کے بھی عادی تھے اور دوسرے شرابیوں کی طرح نشے میں اپنی بیوی کی خبر بھی لیا کرتے تھے۔ ان کے لڑکوں کو اپنی ماں کے ساتھ یہ برتاؤ بہت کھلتا، مگر کر ہی کیا کر سکتے تھے۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔ البتہ ان کے بڑے بیٹے مہاویر اسم بامسمی ہٹے کٹے اور بڑے بہادر تھے۔ کبھی کبھی ماں کو پٹتا دیکھ کر باپ پر پل پڑتے اور انہیں اپنے قابو میں کر لیتے۔

امرت رائے "قلم کا سپاہی" میں لکھتے ہیں۔

"آئے دن یہ ناٹک گھر میں ہوا کرتا لیکن مار پیٹ بند نہیں ہوئی۔ اور اسی طرح پٹواری گیری کرتے شراب پیتے، اور بیوی کو دھنکتے ہوئے منشی گرسہائے لال پچپن ساٹھ کی عمر تک جئے"

گرسہائے لال کے بہادر کے علاوہ تین اور بیٹے تھے ۔ کلیشور لال ، عجائب لال ، اور آدیتہ نارائن لال ، دھنپت رائے عرف منشی پریم چند عجائب لال کے سپوت تھے ۔ عجائب لال ڈاکخانے میں منشی ہو گئے تھے ۔ اس سے پہلے کلیشور اور ان کے بعد آدیتہ نارائن نے بھی ڈاک خانے میں منشی گری کا ہی پیشہ اختیار کیا لیکن کلیشور نے ۳۰ برس کی عمر میں ہی اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیا ۔ کلیشور لال کا بیٹا بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تقریباً اسی عمر میں اپنی بیوی اور چار بچوں کو تنہا چھوڑ کر دنیا سے چل بسا ۔ ادھر آدیتہ نارائن پر غبن کا مقدمہ چلا ۔ اور سات سال کی قید ہو گئی ۔ کہتے ہیں جیل سے رہائی کے بعد گاؤں لوٹنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی ۔ اور منہ چھپا کر کہیں چل دیئے ۔ اور پھر ان کا کہیں پتہ نہ چلا ۔ ان کا لڑکا بھی آوارہ ہو گیا ۔ تین لڑکیوں میں سے دو لڑکیوں کی شادی ہوئی ۔ اور ایک نے کنوارپن کو سینے سے لگائے زندگی کے دن کاٹ دیئے ۔

اب عجائب لال تنہا کمانے والے اور اتنا بڑا کنبہ ۔ ڈاکخانے سے بیس پچیس روپے ماہوار سے زیادہ نہ مل پاتا اسی میں سے گھر کا خرچ چلتا ۔ اور انہی بے آسرا عورتوں کی روزی بھی ۔ آدیتہ نارائن کی بچی کی شادی کا انتظام بھی اسی آمدنی میں سے ہوا ۔ ویسے تو اوپر کی آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی مگر گاؤں کے ان پڑھ کرمیوں کی طرف سے ان کے عزیزوں ، رشتہ داروں کو خط لکھتے ، یا ان کے نام آئے ہوئے خطوط پڑھ دیتے ۔ اس کے صلے میں گیہوں ، چاول ، سبزی اور دودھ مفت مل جاتا ۔ عجائب لال آدمی تھے شریف ۔ کوئی بری عادت نہ تھی ۔ سارا گاؤں ان کی عزت کرتا تھا ۔ پنچ بھی بنائے جاتے تو انصاف کا دامن نہ چھوٹتا ۔ گیتا پاٹھ بھی کرتے اور اپنے طور پر سچے مذہب پر عمل کرتے ۔ بیوی بھی نیک مزاج اور سگھڑ تھی ۔ آنندی دیوی سیرت اور صورت دونوں اعتبار سے اچھی تھیں ۔ خدمت خلق کا جذبہ ان میں بھی تھا ۔ اور اپنے شوہر کی طرح گاؤں میں نیک نام تھیں ۔ انہیں دو لڑکیاں پہلے ہوئیں لیکن جلد ہی دونوں خدا کو پیاری ہو گئیں ۔ تیسری بار لڑکی ہوئی مگر اس بار زندہ رہی ۔ اور سگی نام پڑ گیا ۔ اس کے سات آٹھ برس بعد دھنپت رائے پیدا ہوئے ۔ بابا پیار سے "نواب" کہکر پکارتے تھے اسی لئے سب سے پہلے پریم چند نے نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا ۔

ایک بیٹی اور ایک بیٹا ماں دونوں کو جی جان سے چاہتی تھیں ۔ لیکن نواب کچھ زیادہ ہی چہیتے تھے ۔ سب سے چھوٹا اور اس پر لڑکا ۔ ماں کلیجے سے کیوں نہ لگائے رکھتی ۔ امرت رائے کہتے ہیں ۔

"ماں کو ہر دم یہی ڈر لگا رہتا کہ کوئی اس کے بیٹے کو کہیں نظر نہ لگا دے گا ۔ کچھ جادو ٹونا کر دے گا ، لڑکا چنچل تھا بھی ۔ جسے ٹونا کہتے ہیں ہر دم جھاڑ پھونک کروائی رہتی ۔ رائی لون سے نظر اتروائی رہتی ۔ اور ڈٹھونا تو نواب کو پانچ چھ سال کی عمر تک لگایا جاتا رہا ۔ ماں کا بس چلتا تو وہ کبھی بیٹے کو اپنے آنچل سے الگ نہ ہونے دیتی "

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ ماں اپنے لاڈلے کو سات آٹھ برس سے زیادہ اپنی چھتر چھایا میں نہ رکھ سکی ۔ آنندی دیوی سخت بیمار ہو گئیں ۔ اور چھ مہینے کے اندر اندر سب کو روتا چھوڑ کر چل بسیں ۔ نواب کو ماں کی یاد آتی تو

چپکے چپکے آنسو بہاتے۔ اب ان کا بھائی (چچیرے بھائی) کے سوا کوئی ساتھی نہ تھا۔ بھابھی ان کا خیال رکھتے۔ یوں تو منشی عجائب لال کا مختلف دیہاتوں اور قصبوں میں تبادلہ ہوتا رہتا۔ کبھی باندہ، کبھی اعظم گڑھ، کبھی بستی، کبھی گورکھپور، تو کبھی لکھنؤ کے آس پاس۔ کبھی بیوی بچے ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی وہ لمہی میں رہ جاتے۔ لیکن ادھر بیوی کے انتقال کے بعد عجائب لال لمہی چلے آئے۔ اور بیمار رہے۔ دھنپت رائے کے لئے پھر وہی مولوی صاحب اور ان کا مکتب، گلی ڈنڈا، اور کھیتوں سے چرائے ہوئے مٹر اور گنے۔

دھنپت رائے بچپن سے ہی بڑے شریر تھے۔ کھیتوں سے مٹر اور گنا چرانا کوئی ان سے سیکھتا۔ انہیں نت نئی شرارتیں سوجھتیں۔ ہر روز لوگ ان کی ماں کے پاس شکایتیں لے کر آتے۔ کسی کو پیٹ دیتے تو کسی کا کان کاٹ لیتے اور کسی کی حجامت ہی بنا ڈالتے۔ ایک دن اپنے ساتھی رامو کا بانس کی قینچی سے کان کاٹ لیا۔ رامو کی ماں اپنے بچے کا کان لہولہان دیکھ کر نواب کی ماں کے پاس کوسنے دیتی ہوئی پہونچی۔ نواب کی ماں نے دو تین تھپڑ لگا کر کان کاٹنے کی وجہ پوچھی تو نواب نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا "پتہ نہیں کیسے کٹ گیا میں تو اس کی حجامت بنا رہا تھا"۔ دھنپت رائے اور ان کے چچیرے بھائی ہمجولی تھے۔ ساتھ ساتھ مولوی صاحب کے مکتب جاتے اور راستے میں طرح طرح کی شرارتیں کرتے۔ اس کا ذکر ہمیں پریم چند کی کہانی "چوری" میں ملتا ہے۔ اس ناسٹیلجک کہانی کا انداز دیکھئے:

"ہائے بچپن تیری یاد نہیں بھولتی۔ وہ کچا ٹوٹا گھر، وہ پوال کا بستر، وہ برہنہ جسم، برہنہ پا کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ کہتے ہیں جوتے پہن کر اس وقت جتنی خوشی ہوتی تھی اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی گرم پتیلے رس میں جو لذت تھی وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں ہوتی۔ چربن اور کچے بیروں میں جو ذائقہ تھا وہ اب شیر برنج اور کھیر میں بھی نہیں ملتا۔

میں اپنے چچا زاد بھائی ہلدھر کے ساتھ دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کی ہوگی۔ ہلدھر (وہ اب بہشت میں ہے) مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ ہم دونوں علی الصبح باسی روٹیاں کھا کر دوپہر کے مٹر اور جو کا چربن لے کر جاتے۔ کوئی حاضری کا رجسٹر تو تھا نہیں۔ اور نہ غیر حاضری کا جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ پھر خوف کس بات کا۔ کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑی کی بہار دیکھتے۔ گاڑیوں کے وقت کا جتنا علم ہم کو تھا اتنا شاید ٹائم ٹیبل کو بھی نہ تھا۔ راستے میں شہر کے مہاجن نے ایک باغ لگوانا شروع کیا تھا

وہاں ایک کنواں کھدوا رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے لئے ایک دلچسپ تماشا تھا۔ بڈھا مالی ہمیں اپنی جھونپڑی میں بڑی محبت سے بٹھاتا تھا۔ ہم اس سے جھگڑ جھگڑ کر اس کا کام کرتے۔ کہیں بالٹی لئے پودوں کو سینچ رہے ہیں۔ کہیں کھرپی سے کیاری گوڑ رہے ہیں۔ کہیں مقراض سے بیلوں کی پتیاں چھانٹ رہے ہیں۔ ان کاموں میں کتنا لطف تھا۔ مالی بچوں کی فطرت کا عالم تھا۔ ہم سے کام لیتا مگر اس طرح کہ گویا ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ جتنا کام وہ دن بھر کرتا۔ اسے ہم گھنٹہ بھر میں ختم کر دیتے۔

کبھی کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے۔ مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی ان کی ٹیڑھی ہوئی تیوریاں اتر جاتیں۔ اتنی تخیلی قوت آج ہوتی تو ایسا ناول لکھ مارتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہت سر کھپانے کے بعد کوئی کہانی سوجھتی ہے خیر ہمارے مولوی صاحب درزی تھے۔ مولوی گیری صرف شوقیہ کرتے تھے۔ ہم دونوں بھائی اپنے گاؤں کے کرمی کمہاروں سے ان کی خوب تعریف کرتے یا کہتے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے سفری ایجنٹ تھے۔ ہماری کوشش سے مولوی صاحب کو کچھ کام مل جاتا تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

جس روز کوئی بہانہ نہ سوجھتا۔ اس روز مولوی صاحب کے لئے کوئی نہ کوئی سوغات لے جاتے۔ کبھی سیر آدھ سیر پھلیاں توڑ لیں۔ تو کبھی دس پانچ گنے، کبھی جو یا گیہوں کی ہری ہری بالیں لے لیں۔ ان تحفہ جات کو دیکھتے ہی مولوی صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا۔ جب ان چیزوں کی فصل نہ ہوتی تو ہم سزا سے بچنے کی کوئی اور ہی تدبیر سوچتے "

کیسی معصوم شرارتیں تھیں۔ یہ بچے بھی اپنے بڑوں کی نفسیات سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ اور ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ پھر پریم چند تو فنکارانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کا زرخیز ذہن نئی نئی باتیں اور انوکھے خیالات کی تلاش کرتا رہتا۔ اور مولوی صاحب کو جھانسہ دینے کی نت نئی تدبیریں سوچتا رہتا۔ مولوی صاحب کو ان شریر بچوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے۔ ایک معنی میں دیہات کی زندگی ہی کیا؟ اسی لئے پریم چند نے اسے سپاٹ زندگی بتایا ہے۔ مگر فنکار کا مشاہدہ تو بہت تیز ہوتا ہے۔ وہ سادگی میں بھی پیچیدگیاں اور وحدت میں رنگارنگی تلاش کر لیتا ہے۔ آخر سادہ جینے میں بھی تو سو الجھنیں ہوتی ہیں۔ اور جنہوں نے پریم چند کو پڑھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناول میں کتنی خوبصورتی سے دیہات کی سادی زندگی کی الجھنوں، پیچیدگیوں، محرومیوں، اور دکھوں کو پیش کیا ہے۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ خوشیاں اور محرومیاں اضافی باتیں ہیں۔ جہاں ایک بڑا سرمایہ دار لاکھوں دولت پا کر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا ایک دیہات کا کسان ایک روپیہ

پاکر ہوجاتا ہے اور اگر یہی روپیہ گم ہو جائے تو اسے اتنا ہی دکھ بھی ہوتا ہے جتنا ایک لکھ پتی کو اپنی ساری دولت گنوا کر ہوتا ہے۔ پریم چند ایک حساس فنکار کی حیثیت سے ان باتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ دیکھئے اپنی کہانی "چوری" میں ایک روپیہ پانے کی بچپن میں اپنی خوشی کو کس طرح بیان کیا ہے:

"برسات کے دن تھے، آکاش پر بادل چھائے ہوئے تھے ہم دونوں خوش خوش مکتب چلے جا رہے تھے، ہزاروں منصوبے باندھتے تھے۔ ہزاروں ہوائی قلعے بناتے تھے۔ یہ موقع بڑی خوش قسمتی سے ملا تھا۔ اس لئے روپے کو اس طرح خرچ کرنا چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دنوں تک چل سکے۔ ان دنوں پانچ آنے سیر بہت اچھی مٹھائی ملتی تھی۔ اور شاید آدھے سیر مٹھائی میں ہم دونوں سیر ہو جاتے لیکن یہ خیال آیا کہ مٹھائی کھائیں گے تو روپیہ آج ہی ختم ہو جائے گا۔ کوئی سستی چیز کھانی چاہئے۔ جس میں مزہ بھی آئے، پیٹ بھی بھرے اور پیسے بھی کم خرچ ہوں۔ آخر امرودوں پر ہماری نظر گئی۔ ہم دونوں راضی ہو گئے دو پیسے کے امرود لئے۔ سستا وقت تھا۔ بڑے بڑے بارہ امرود ملے۔ ہم دونوں کے کرتوں کے دامن بھر گئے۔ جب ہلدھر نے کنجڑن کے ہاتھ میں روپیہ رکھا تو اس نے شک کی نظر سے دیکھ کر پوچھا۔ روپیہ کہاں سے پایا لالا؟ چرا تو نہیں لائے؟ جواب ہمارے پاس تیار تھا۔ زیادہ نہیں تو دو تین کتابیں پڑھ ہی چکے تھے۔ تعلیم کا کچھ کچھ اثر ہو چلا تھا۔ میں نے جھٹ سے کہا۔ مولوی صاحب کی فیس دینی ہے۔ گھر میں پیسے نہ تھے تو چاچی نے روپیہ دے دیا"

اس قصے میں جہاں بچپن کا مشاہدہ، چلبلا پن اور ذہنی اپج وغیرہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہاں ہمارے طرز تعلیم پر ہلکا سا طنز بھی ہے۔ "تعلیم کا کچھ کچھ اثر ہو چلا تھا" اس جملے میں یہ طنز جھلکتا ہے ہماری تعلیم ہمیں اچھا سماجی کردار پیدا کرنے کے بجائے اپنی ذاتی مفادات کی حفاظت کے لئے ہوشیار اور چالاک بناتی ہے۔ ان دونوں بچوں نے بھی اسی تعلیم کے زیر اثر اپنے بچاؤ کے لئے فوراً بہانہ تراش لیا

اپنی ماں کی موت کے بعد پریم چند کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد عجائب لال نے دوسری شادی کرلی۔ دھنپت رائے کی سوتیلی ماں کا برتاؤ ان کے ساتھ بہت اچھا نہ تھا۔ پتائی بھی ہوتی۔ عجائب لال بھی اپنے آپ کو بے بس پاتے۔ بڑھاپے کی شادی تھی۔ جوان بیوی اپنے بوڑھے خاوند کی ڈانٹ ڈپٹ کہاں سننے والی تھی۔ اس کی ساس سے بھی نہ بنتی لیکن ساس کا تو چند دنوں بعد انتقال ہو گیا۔ دھنپت رائے اپنی سوتیلی ماں کو چاچی کہہ کر پکارتے۔ چاچی اپنے ساتھ اپنا چھوٹا بھائی وجے بہادر سنگھ لائی تھی۔ یہ عمر میں دھنپت رائے سے بڑے تھے۔ مگر دونوں میں بہت خوب چھنتی۔

چی جی اب سارے گھر کی تنہا مالک تھیں۔ دھنپت رائے ڈر کے مارے اکثر گھر سے غائب رہتے۔ ان کو رہنے کے لئے جو کوٹھری ملی تھی اس کے دروازہ میں باہر کی طرف کھلتا تھا۔ اس لئے آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ قریب میں ہی ان کے ایک ہم جماعت کے والد کا تمباکو کا کاروبار تھا۔ وہیں جا کر بیٹھ جاتے اور طلسم ہوش ربا کی داستان پڑھی جاتی جو ان کے تخیل کے لئے بھی مہمیز ثابت ہوئی۔ یہ آوارہ گردی کے دن تھے۔ امرت رائے نے قلم کا سپاہی میں اسے یوں بیان کیا ہے:

"بارہ تیرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اسے (پریم چند کو) سگریٹ، بیڑی کا چسکا لگ چکا تھا اور اپنے ہی لفظوں میں ان باتوں کا علم ہو چکا تھا جو بچوں کے لئے مضر ہوتا ہے۔ بنا ماں کے بچے کا ایسا ہی حال ہوتا ہے نہ ہو تو تعجب کی بات ہے...... وہ پیار تھپکن جانے سر کا ہاتھ ہٹ جائے تو ایک ایسی کمی محسوس ہوتی ہے جو بچے کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بہت سے سانچے، بہت سی مورتیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ جن کو بنانے میں برسوں لگے تھے۔"

پریم چند کے لئے یہ واقعہ بڑا ہی جانکاہ تھا۔ عمر بھر وہ اس غم کو بھول نہیں سکے۔ اس کا اظہار ان کے تخلیق کردہ کرداروں میں نئے نئے طریقوں سے ہوتا رہا۔ ان کے ایک ناول "میدان عمل" میں ایک کردار امرکانت کہتا ہے:

"زندگی کی وہ عمر جب انسان کو محبت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بچپن ہے۔ اس وقت پودے کو تری مل جائے تو زندگی بھر کے لئے اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اور اس وقت خوراک نہ پا کر اس کی زندگی خشک ہو جاتی ہے۔ میری ماں کا اسی زمانے میں انتقال ہوا۔ اور تب سے میری روح کو خوراک نہیں ملی۔ وہی بھوک میری زندگی ہے"

کتنا درد اور کتنی تڑپ ہے ان سیدھے سادے لفظوں میں۔ ایسا لگتا ہے مصنف نے اپنے دل کا درد بھر دیا ہے اپنے روح کا غم سمو دیا ہے۔ تخلیقی عمل میں بچپن کے گہرے تاثرات بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی صورت میں اس عمل کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں فرائڈ اور یونگ کے نفسیات کے نظریوں کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اور سرلزم کی تحریک نے ادبی نظریات کو ایک نیا موڑ دیا۔ ادیب کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لئے اس کے سماجی اور گھریلو حالات کا مطالعہ بڑا ضروری اسی لئے سمجھا جاتا ہے۔ پریم چند نے میدان عمل میں اپنے بچپن کے تجربے کو بعض جگہ تو براہ راست بیان کر دیا ہے۔ امرکانت کی کہانی ان کے اپنے باپ کی کہانی بن جاتی ہے:

امرکانت نے دوستوں کے کہنے سننے سے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس سات سال کے بچے نے نئی ماں کا بڑے پیار سے استقبال کیا۔ لیکن اسے جلد معلوم ہو گیا کہ اس کی نئی ماں اس کی ضد اور شرارتوں کو اسے معاف کر دینے والی نظروں سے نہیں دیکھتی۔

باقی صفحہ پر

سید [illegible]لی مظفر
قسط ۱

پراگندہ طبع لوگ

[میر نے کہا تھا کہ ؎   پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر کی صحبت نہیں رہی

یہ شعر تعارف، انکسار اور تعلی کا ایک آمیزہ ہے عظیم شخصیتوں سے نہ ملنے کا افسوس تو اپنی جگہ ایک سچائی ہے مگر ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان کی نگارشات اور تخلیقات سے ان کی صحبت کی تلافی ہو جاتی ہے فنکار کی تحریریں ہمارے لئے صحبت دوام کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ "تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا"، تو دراصل وہ اپنی صحبت جاوید کی بشارت دیتا ہے۔ حافظ شیرازی نے کہا ہے کہ ؎

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم   اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

حافظ پیالے میں عکس رخ یار دیکھتے ہیں اور ہم تخلیقات و نگارشات کے آئینے میں فنکار سے ملتے رہتے ہیں نواب سید علی مظفر کی شخصیت کے نقوش اب کچھ لوگوں کی نظر [illegible] دھندلے ہو گئے ہوں مگر ہماری ثقافت و تہذیب، فن اور فلم، شعر و سخن اور علم کے صحیفوں کی چار پانچ دہائی پہلے کی ورق گردانی کرنے والے حضرات جانتے ہیں کہ وہ کتنی دنیاؤں کو روندکر اب عالم استغنا میں گوشہ گیر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے بمبئی میں طویل عرصے تک فلمیں بنائی ہی نہیں، بلکہ ہندوستانی [illegible] کو معیار کی بلندی، سنجیدگی اور آرٹ بخشنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ (ناکام اس لئے کہ ہماری فلمیں عوام کے ذوق معیار کو بلند تو نہ کر سکیں بلکہ خود عوام سے قریب آنے کے لئے نیچے جھک گئیں۔) ایسے میں مظفر نواب جیسی شخصیت کے لئے فلم کی دنیا کو تیاگ دینے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہ تھا۔ بمبئی اور دوسرے ثقافتی مراکز میں شعراء، اہل قلم اور دانشور حضرات سے ان کے مراسم، مختلف مجموعوں اور نشستوں میں زبان [illegible] بیان اور علم و ادب کے مسائل پر مباحث نیز دیگر علمی اطلاعات یہ سب ہمارے [illegible] ہے [illegible] رہتے ہیں ——— ہماری گزارش پر [illegible] علی مظفر [illegible] دل" کے عنوان

سے وہ بہت کچھ نہیں دینے کا وعدہ کیا ہے جو دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں انہیں دیا ہے۔
ہم اسے ماہنامہ سہیل میں بالاقساط شائع کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب یہ شائع ہو جائے گا تو
ہماری تہذیبی، علمی اور ادبی تاریخ کا ایک گراں بہا باب تیار ہو جائے گا ——— مسعود منظر]

اردو غزل اور غزل گوئی پر اتنے سارے مضامین لکھے جا چکے ہیں کہ ان کو اگر کوئی شخص (کسی بھی مضمون کو چھوڑے بغیر) جمع کر دے تو غالباً کسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر کی (P.H.D) ڈگری کا مستحق ہو سکتا ہے۔ صنف غزل (خصوصاً اردو) پر مضمون لکھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا آسان ایک اردو غزل کہہ لینا۔ اور یہ کام (غزل کہہ لینا) اتنا ہی دشوار بھی ہے۔ غزل جیسی چیز تو بہت آسانی سے لکھی جا سکتی ہے۔ مگر سوال اٹھتا ہے کہ اس پر غزل کا اطلاق ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔

غزل پر تنقید کرنے سے پہلے یہ مسئلہ طے ہونا ضروری ہے کہ غزل کیا ہے۔ غزل کی تعریف اگر کہنے کو ہو تو کیا کہوں، کیا لکھوں۔ کلیم الدین احمد نے تو "غزل" جو بھی ہو اس کے متعلق نہایت بالغ النظری سے بحث کی ہے مگر غزل کیا ہو شاید اس پر توجہ نہیں کی، بلکہ کی ہے۔ وہ آگے چل کر بتاؤں گا۔ غزل کی تعریف انشا نے دریائے لطافت میں یوں کی ہے۔

"غزل اس کلام موزوں سے عبارت ہے کہ اس کی پہلی بیت مقفّٰی ہو جسے مطلع کہتے ہیں۔ باقی شعر اس قبیل سے ہوں کہ بیت کا دوسرا مصرعہ مطلع کا ہم قافیہ ہو یہ سب جانتے ہیں۔ اہل عجم کا قاعدہ ہے غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص ڈالتا ہے اس کو مقطع کہتے ہیں"

غزل کے متعلق سید انشا مزید فرماتے ہیں۔

"غزل میں معشوق شراب، فراق کے الم کا شکوہ اور معشوق کی جفاؤں اور بری عادتوں کے سوا اور مضامین کا ذکر زیبا نہیں۔ جو اس کے خلاف ہو وہ غزل نہیں۔ لوگوں کے تصرفات غیر معتبر ہیں اور جن لوگوں نے بے وقوفوں پر رنگ جمانے اور صاحب طرز جدید بننے کا لقب حاصل کرنے کے واسطے غزل کو معمہ بنا دیا ہے ان کا کلام غیر فصیح ہے۔ وہ نافہموں میں مقبول اور مشہور ہوں لیکن عقلمندوں کے نزدیک معتبر نہیں"

اچھا صاحب، غزل کی تعریف ہو چکی اب میں اپنی ایک غزل پیش کرتا ہوں۔

محرکِ صوتِ بصارت مجھے معلوم نہ تھا | امتحان لبِ رویت مجھے معلوم نہ تھا ۱
دیدۂ ثقلِ سماعت پہ گراں گزرے گی | ایک دن خاطرِ لذت مجھے معلوم نہ تھا
جلوۂ عقدۂ تخلیق کثافت ہوگا | ناخنِ مرگ لطافت مجھے معلوم نہ تھا

باعث نفی حقائق کہ ایاغ معدوم　　بن گیا جام حقیقت مجھے معلوم نہ تھا
پنجۂ مہر لطافت میں عطارد کا چراغ　　راکب صحن بلاغت مجھے معلوم نہ تھا
مدح ساقی جو بس چشم میں نقطے کا اثر　　تشنۂ سنگ ملامت مجھے معلوم نہ تھا

فرمائیں گے کہ یہ بکواس بند کی جائے۔ اشعار کی تعریف ہے "کلام موزوں" ۔ یہ ناموزوں کلام نہیں۔ البتہ جو
مین کی قید کی گئی ہے شاید نہ ہو۔ اچھا اب ایک دوسری غزل پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں ۔

یہ بو کا شور ایسا فسانہ پڑھا نہ تھا　　رسوائیوں کا کوئی بھی چرچا مرا نہ تھا
کٹہل نے خشت سر میں جمایا ہے کیا کہیں　　ایسی کلنگی کہ شترلیفہ سڑا نہ تھا
کتی نے پھونکا کان میں کھلی کے کیا فسوں　　دھوبی بھی کہہ رہا تھا کہ گدھا کھرا نہ تھا
ظلمت کے کان میں چھپی تنہائیوں کی چیخ　　حدت وہ تھی کہ چاند سے سورج جلا نہ تھا
شہرت نے ڈھانپ دیا بوالہوس کا زور　　لعنت کی اوٹ میں کوئی سینہ چھپا نہ تھا
کیسا سینما دیکھ تماشائیوں کا رنگ　　عریاں سا پوسٹر ابھی سارا چھپا نہ تھا

کیا خیال ہے یہ غزل پسند آئی۔ خفا نہ ہوتے ایک تیسری غزل بھی ہو جائے ۔

رات مستی میں جلنے کیا پی لی　　صبح دنیا دکھائی دی پیلی
اس نے میری زبان جب کیلی　　بد دعا پھر زمانے بھر کی لی
ان کے دل پر اثر نہیں ہوگا　　خواہ جتنی ہو بات جوشیلی
لو وہ سننے کو اب ہوتے راضی　　میں نے اپنی زبان جب سی لی
خاک سمجھے وہ درد غیروں کا　　آنکھ جس کی نہ ہو کبھی گیلی
چشم ساقی بتاؤں کیا شئے ہے　　صاف پانی میں بیکٹری نیلی
اتنی کڑوی ملی شراب غم　　گھونٹ میں نے بہ صد خوا پی لی
اک خلوص عمل کی طاقت ہے　　بھاری شہتیر ہو گئی تیلی

ائیے۔ اچھا چھوڑیئے۔ یہ میری غزلیں ہیں جن میں کسی بھی شعر پر غزل کے شعر کا اطلاق ہو تو ہو مگر کسی ایک شعر میں
زل یا غزل کی روح دکھائی دے تو میں مجرم ۔
آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں سرے سے غزل گو شاعر نہیں یا غزل گوئی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میں دراصل
بات ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ کن کن غزلوں پر غزل نہیں ہونے کا اطلاق ہوتا ہے۔ آئیے اب لگے ہاتھوں آپ کو
اتذہ سخن کی غزلیں (جو غزل ہو ہی نہیں سکتی ہیں) سناتا ہوں ۔

لو لو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے　　یاں چٹ کئے ہیں اس سے عمامے بڑے بڑے

قامت نے تیرے باغ میں جا خط بندگی
لکھوا لیا ہے سرو چمن سے کھڑے کھڑے

آ جا نگہ سے اب تو مرے یار کب ہوا
دو روز دوستی میں جو باہم لڑے لڑے

کیا قدر دل یہاں تو جنوں کی گلی کے بیچ
دل خاک ہو گئے ہیں کہ روڑوں پڑے پڑے

دنداں دہن میں وقت تبسم نہ دیکھے ہم
موتی سے کچھ ہمیں نظر آئے جڑے جڑے

سودا کے ہوتے وامق و مجنوں کا ذکر کیا
عالم محبت اکھاڑے ہے مردے گڑے گڑے

جی ہاں! یہ سعدا ہیں مرزا رفیع سودا۔ صرف اس وجہ سے کہ یہ کلام سودا کا ہے اس کا شمار غزل میں کیجیے گا کیا؟

کل ایک گھر میں خوب سے چھوٹے بڑے لڑے
ہاتھوں سے ہاتھ اور کڑوں سے کڑے لڑے

چلنی سے چھاج، چھاج سے چھلنی الجھ گئی
مٹکوں سے مٹکے لوٹے گھڑوں سے گھڑے لڑے

لڑکوں سے لڑکے چھٹے جوانوں سے جب جواں
بڈھوں سے بڈھے کڑبڑوں سے کڑبڑے لڑے

چونٹوں سے چونٹے کھٹمل پسو چونٹیوں سے چونٹیاں
بیٹوں سے بیٹے لینڈ گھڑوں سے گھڑے لڑے

حقوں سے حقے چلموں سے چلمیں بھی تو نیاں
نیچوں سے نیچے گڑگڑوں سے گڑگڑے لڑے

جب تل گئی لڑائی ترازو کی تول میں
باٹوں سے باٹ لوٹے دھڑوں کے دھڑے لڑے

انشا یہ دیدے اپنے بھی اس دھوم دھام میں
دیدوں سے ایک شخص کے ہو کر کڑے لڑے

دونوں غزلوں (اردو میں (ALLEGCD GHAZAL) جیسا لفظ نہیں۔ ورنہ ALLEGCD) میں ایک فرق بین ہے۔ پہلی کوشش (یعنی سودا کا غزل نما کلام) میں اشعار منفرد ہیں۔ اور ہر شعر میں الگ مضمون ہے۔ اس وجہ سے کلیم الدین احمد نے غزل پر پراگندگی کا الزام لگایا ہے۔ مگر دوسری کوشش (انشا کا غزل نما کلام) میں نفس مضمون ایک ہی یعنی جنگ ہے۔ صنعت بھی کافی ہے "تل گئی"، "ترازو"، "تول"، "باٹ"، مگر دونوں کلام میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس پہ غزل کا اطلاق ہو۔ اس میں غزل کی پراگندگی نہیں ہے۔ تو کیا یہ غزل ہو گئی۔ ہرگز نہیں۔ مطلع اور مقطع مرتب کرنے سے اور ردیف و قافیہ بٹھانے کا نام غزل نہیں۔ انشا کا ایک اور غزل نما کلام بھی دیکھیے۔

پرتو سے چاندنی کے ہے صحن باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ کر دے چراغ ٹھنڈا

شفقت سے ہاتھ تو دھر ٹک دل پہ میرے تا ہو
یہ آگ سا دہکتا سینہ کا داغ ٹھنڈا

مئے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر
جس کے دھوئیں سے ہووے ساقی دماغ ٹھنڈا

تجھ بن جو دل کی ہے جوش چشم یاں رو
ہم نے مدام پایا اس کا اجاغ ٹھنڈا

ہیں ایک شخص لاتے حسن کی شراب انشا
دھو دھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

مزید اور غزل نما نمونۂ کلام ناسخ، شاہ نصیر، ذوق، امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی، جلال، وحید الہ آبادی، ریاض خیرآبادی، سائل دہلوی، بے خود دہلوی، ثاقب لکھنوی، جلیل مانک پوری، پنڈت امرناتھ ساحر، سیماب اکبرآبادی،

خودی، ذوق کا دیوان، جو تشنۂ طباعت تھا اس کی پیش کش کر رہا ہوں ۔ امید کرتا ہوں کہ ناظرین کا مسئلہ حل ہو جائے گا ۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم وائے بے دردی
فلک پر گر بگولہ جا لگا خاکِ شہیداں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پہ ہے روئے خنداں کا

(ناسخ)

ہم پھڑک کر توڑتے سارے قفس کی تیلیاں
پر نہ تھیں اے ہم صفیرو اپنے بس کی تیلیاں

ہر الیاں اور حنا چلمن لیے پردہ نشیں!
ہو گئیں بد رنگ میں لگ کے برس کی تیلیاں

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں

تھے گرفتارِ قفس جو پیشِ عرفانِ چمن
مانعِ پرواز تھیں ان کی قفس کی تیلیاں

کون صحرائے سخن سے چن کے باندھے گا نصیر
تجھ سے اہلِ معنی و مضمون رس کی تیلیاں

(نصیر)

موت ہی کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل
عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہو، گو پست قامت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ رسمِ کتابت ہو تو ہو

آج اک پگڑی ہوتی تھی میکدے میں زاہد جی
ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

(ذوق)

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ ہوں
صبحِ بہار ہو جو گریباں دریدہ ہوں

میرے صفائے دل نے جو کھولے ہیں تیرے عیب
شرمندہ مثلِ زنگیِ آئینہ دیدہ ہوں

اے اہلِ بزم مجھ کو اٹھاؤ نہ بزم سے
شمعِ سحر ہوں عمر بہ پایاں رسیدہ ہوں

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے
دونوں سے مثلِ سرو میں دامن کشیدہ ہوں

شبنم کے ساتھ تیرے چمن میں ہے یہ نصیب
گل ہائے نرگسی چمن میں جو میں آبدیدہ ہوں

[illegible] کالوں کے سامنے
پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

شرمندہ نجم ہوں ترے خالوں کے سامنے
گوروں کی فوج ہٹ گئی کالوں کے سامنے

ثابت رہا فلک مرے نالوں کے سامنے
ٹھہری سپرِ حباب کی بھالوں کے سامنے

موسیٰ سے کہہ دو طور پہ جایا کریں نہ روز
اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

آنکھیں کھلی ہیں کاکلِ پیچاں کی یاد میں
دیکھو چراغ جلتے ہیں کالوں کے سامنے

جنسِ سخن کا کوئی نہیں قدرداں منیرؔ
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

(منیر شکوہ آبادی)

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ جس میں چراغ بھی نہ ملا۔

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کرکے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

(حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی)

ان ساری متغزل نما غزلوں میں شاعرانہ عشق کا پتہ چلتا ہے۔ رعایتیں اور صنعتیں واضح ہیں۔ پھر بھی یہ غزلیں نہیں۔ نہ ان کا ایک بھی منفرد شعر ایسا ہے جس پر تغزل کا دھوکا ہو۔ اور بھی غزلیں اگلے صفحے پر پیش کر رہا ہوں۔

اٹھا لے جائیں گلشن سے کدھر ہم آشیاں اپنا
ہوا ہے عین فصلِ گل میں دشمن باغباں اپنا

کوئی شب اور وہ رشکِ قمر ہے میہماں اپنا
دکھائے چار دن کی چاندنی یہ بھی سماں اپنا

نہیں ہیں کون سی جا موت کی حسرت میں سرگرداں
فلک کرتا ہے وعدہ دیکھئے پورا کہاں اپنا

بُرے دن میں زمیں کب پاؤں کے نیچے ٹھہرتی ہے
گلہ کرتے ہیں شکوہ ہم نہیں ہے آسماں اپنا

چمن نازاں ہے کیا اپنی بہارِ چند روزہ پر
لئے جاتا ہے دل شوقِ بہارِ جاوداں اپنا

نہیں ہوش و خرد کی بات بھی سودائے گیسو میں
اندھیری رات میں یہ لٹ رہا ہے کارواں اپنا

حلاوت ہے مزے سے لطف و شیرینی سے مملو ہے
زباں اپنی، سخن اپنا، کلام اپنا، بیاں اپنا

(وحید الہ آبادی)

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

یہ سر بہ مہر بوتلیں ہیں جو شراب کی
راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

پوچھو نہ ہم سے عالمِ غفلت کے خواب کی
دنیا کچھ اور ہی تھی ہمارے شباب کی

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

تاک کی کیفیتیں ہیں حسب جذباتِ ... | شادابیاں جیسے ... کی ... کی
وہ شام ہے ... بہار گل | جب ... کے ساتھ ... شباب کی

(... آبادی)

ہے خوب ... سے مجھے ... ہم یوں بھی ہیں اور یوں بھی
... حسن، جستجو کا ستم ... یوں بھی ہے اور یوں بھی

تم آؤ مرگ شادی ہے، نہ آؤ مرگ ناکامی
تقرب ... عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مرے سر پر کبھی ... تمہارے پاؤں کا چھے
غرض ... کی ... ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے یہ ... خانہ تعجب اس پر آتا ہے
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے نواب ... کہتے ہیں شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانہ میں ترا سائل مجرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

(... دہلوی)

... کیسی کیسی غزل ... شاعرانہ ... کبھی جا سکتی ہیں، گر غزل ... کے ... ہر ... غزل کون سی ہے یا غزل کی تعریف کیا ہے۔ غزل کس کو کہتے ہیں۔ ذرا صبر کیجئے صبر کا پھل میٹھا اور مفید بھی ہے۔

اٹھے تری محفل سے تو کس کام کے اٹھے | دل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اٹھے
افسوس ... اغیار نے کیا کیا نہ ... ہاتھ | وہ ... جب ... ہاتھ ... کے اٹھے
دم بھر مرے پہلو میں انہیں چین کہاں ہے | بیٹھے کہ بہانے سے کسی کام کے اٹھے
... نہ زحمت | ... کبھی ... مرے نام کے اٹھے
... | ... زلف سیہ فام کے اٹھے
... | ... کے اٹھے
آغاز محبت ... | ... انجام کے اٹھے
دل ... | ... جب ... کے اٹھے

(... دہلوی)

آنکھ ملتے ہی نہ تھا نام شکیبائی کا — ورنہ خانہ تھا نقشہ تری انگڑائی کا
آئینہ جس میں ہے اندر سے کا ابھرا کیا حسن — ایک پتھر ابھارا پانی ہے خود آرائی کا
آنے دے نیند تو سب سوئیں گے اے تو یہ — نالۂ عاشق کا اور اس پر شب تنہائی کا
چاک دامانِ یوسف تھی زلیخا کو سزا — راستہ چاک سے پیدا ہوا رسوائی کا
شوق پابوسیٔ محبوب تھا ورنہ ثاقب — سنگ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

(ثاقب لکھنوی)

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے — یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے
وہ اٹھے، درد اٹھا، حشر اٹھا — مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
لگی تھی ان کے قدموں سے قیامت — میں سمجھا ساتھ سایہ جا رہا ہے
بہار آئی کہ دن ہولی کے آئے — گلوں میں رنگ کھیلا جا رہا ہے
مرے داغِ جگر کو پھول کہہ کر — مجھے کانٹوں میں کھینچا جا رہا ہے
رواں ہے عمر اور انسان غافل — مسافر ہے کہ سویا جا رہا ہے
جلیل اب دل کو اپنا دل نہ سمجھو — کوئی کر کے اشارہ جا رہا ہے

(جلیل مانک پوری)

رسوائے عشق ہے ترا شیدا کہیں جسے — عشاق میں مثال ہے رسوا کہیں جسے
مدِ نظر ہے نقش سویدا کہیں جسے — اک بے خودی ہے ذوقِ تماشا کہیں جسے
اہلِ نظر ہیں محوِ تماشائے روئے یار — ہے پردہ دارِ حسن خود آرا کہیں جسے
ہے منزلِ فنا میں مرا ہم سفر وہ داغ — روشن چراغِ گنبدِ مینا کہیں جسے
سینہ چمن ہے غنچہ دل ہے شگفتہ گل — تیری نگاہ ہے چمن آرا کہیں جسے
ہجراں نصیب دل کو ہے کیا غم کہ عشق میں — فرقت کی ایک رات ہے دنیا کہیں جسے
پردہ ہے حسن و عشق میں وصل و حجاب کا — یوسف ہے بے نقاب زلیخا کہیں جسے
ف کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہے کوئی — اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے
ساحرؔ نفس وہ دام ہے جس میں کب ہے اسیر — موجِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

(ساحر دہلوی)

ف یہ شعر تغزل کا ہے بس ۔

میں تنہا آب و رنگ بزمِ امکاں ہو نہیں سکتا — یہ دل واپس اگر تو اس گھر، مہماں ہو نہیں سکتا

یہاں ہر چیز میں بھردی گئی ہیں کوتیں کل کی وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا
معاذ اللہ کمال علم ہستی کی یہ غایت ہے کہ انسان واقف انجام انساں ہو نہیں سکتا
نہیں اک لفظ ایسا دفتر کونین میں کوئی جو میری داستان دل کا عنواں ہو نہیں سکتا
الٹ دے دل کو بھی جب دل کے سب پردے الٹ جائیں اسے بھر کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا
سنا اے چپکے چپکے دل کے پردے کھینچنے والے تری حد خودی تک وہ نمایاں ہو نہیں سکتا
جوانی بھی گئی سیماب فصل گل فنا بھی میں اب تا دیر محفل میں غزل خواں ہو نہیں سکتا

(سیماب اکبر آبادی)

سیماب کے بعد صفی لکھنوی کی غزل پیش کرنے سے پہلے ایک بات اور واضح کر دوں کہ ہر اچھا شعر لازم نہیں کہ اس میں غزل کی روح ہو یا تغزل میں ڈوبا ہوا ہو۔ مثلاً

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد بے گنہ اور وہاں کون ہے قاتل کے سوا۔

(سردار جعفری)

ہوائے تند میں یہ ریشمی خیمے نہ ٹھہریں گے کہاں تک آزماؤ گے وفاداری طنابوں کی

(پرویز شاہد)

اچھے اشعار ہیں مگر غزل کے اشعار نہیں۔ مگر اب غزل کے تین اشعار پیش کرتا ہوں۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے

(فیض احمد فیض)

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

(مجروح سلطانپوری)

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو کہ وحشی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بھی آئے گی اڑ کر چلا جائے گا

(بشیر بدر)

پھر غزل نما کلام کے نمونے پیش کر رہا ہوں۔

طالب دید پہ آنچ آئے یہ منظور نہیں دل میں ہے ورنہ وہ بجلی جو سر طور نہیں
دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بھی کچھ دور نہیں مگر اس پہ بھی ملاقات انہیں منظور نہیں
خلوت دل نہ سہی کوچہ شہ رگ ہی سہی پاس رہ کر نہ سہی آپ سے کچھ دور نہیں
ذوق پابندی وفا کیوں رہے محروم جفا عشق مجبور سہی حسن تو مجبور نہیں

تابش حسن نے جب ڈال دیئے ہوں پردے — ممکن آنکھوں سے علاج دل رنجور نہیں
لاؤ مے خانے میں کاٹ نہ دیں آتی رات — مسجدیں ہو گئیں معمور یہ معمور نہیں
کبھو کیسے ہو صفی پوچھ تو لیتا کوئی — دل دہی کا مگر اس شہر میں دستور نہیں

(صفی لکھنوی)

میکدے کا طور کچھ بھی نہیں — سانس چلتی ہے اور کچھ بھی نہیں
دل لگا کر پھنسے ہم آفت میں — بات اتنی ہے اور کچھ بھی نہیں
آپ ہیں آپ، آپ سب کچھ ہیں — اور میں اور، اور کچھ بھی نہیں
ہم اگر ہیں تو جھیل ڈالیں گے — دل اگر ہے تو جور کچھ بھی نہیں
شعر کہتے ہیں اور شعر پڑھتے ہیں — نوح میں وصف اور کچھ بھی نہیں

(نوح ناروی)

اسی میں عافیت ہے زندگی کو یوں بسر کرنا — نہ فکر نفع میں رہنا نہ پروائے ضرر کرنا
نہیں منظور اپنے درد کی تجھ کو خبر کرنا — نہیں آتا نہ آئے میرے نالوں کو اثر کرنا
ادائے دلبری کے ساتھ انہیں لاکھوں ہنر آئے — مگر آیا نہ اپنے خستہ حالوں پر نظر کرنا
اسے نیرنگ کہتے ہیں کہ اس کافر کو آتا ہے — نئے انداز سے ایک ایک ادا کو جلوہ گر کرنا
کسی کو ظلم سے کرنا ہلاک شیوۂ غفلت — کسی کو دل لگی سے زخمیٔ تیر نظر کرنا
نگاہ ناز سے دینا کسی کو درس مشتاقی — کسی کو بوئے زلف عنبریں سے بے خبر کرنا
کبھی تو شوخیوں سے جرأت آموز ہوس ہونا — کبھی پھر شیوۂ تمکیں سے محروم نظر کرنا
اشارے سے کبھی کھوئے ہوؤں کو ہوش میں لانا — کبھی پھر ہوش والوں کو یکایک بے خبر کرنا
کروں میں کاوشیں فکر سخن میں کس لئے وحشت — نہیں منظور بزم شعر میں عرض ہنر کرنا

(رضا علی وحشت)

کوئی اس طرح ساون گا رہا ہے — دل ناشاد امڈا آ رہا ہے
سروں میں ڈوبا لہرا بانسری کا — قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے
جھکولے دے رہی ہیں جیسی تانیں — کلیجا منہ کو پیہم آ رہا ہے
پپیہا ٹیرتا ہے کہہ کے پی ہو — یہ پاپی اور تڑپا رہا ہے
ادھر آواز میں کڑکی ہے بجلی — ادھر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
بھری برسات اور یہ گھپ اندھیرا — اندھیرا آپ سر ٹکرا رہا ہے

کسی کو تیلی میں جیسے ڈبو کر
یوں ہی سینے میں دم گھبرا رہا ہے
اندھیری رات میں کوندا لپک کر
دبی جو آگ تھی بھڑکا رہا ہے
ادھر چمکانے تھے ہیں مور، ادھر دل
پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھا رہا ہے
چمکتے اب نہیں جگنو ہوا میں
فلک چنگاریاں برسا رہا ہے
مسلسل نغمہ تھی جھینگر کی جھنکار
دل اب آزار حس سے جا رہا ہے
سہاگن رات کا جلتا ہے کاجل
ہر اک اک رواں سہرا رہا ہے
یہ رات اور یاد اس اک بے وفا کی
بس اب ہنسنے دو رونا آ رہا ہے

—— (مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی) ——

غزل جس قدر بدنام ہے اسی قدر صحیح معنوں میں غزل کے اشعار کہنا دشوار ترین کام ہے۔ لیکن مشاعروں میں غزل گا کر جلد مقبولیت مل جاتی ہے۔ اس لئے لوگ آسانی سے غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ حالانکہ غزل کا [illegible] اشعار ہوتا ہے۔

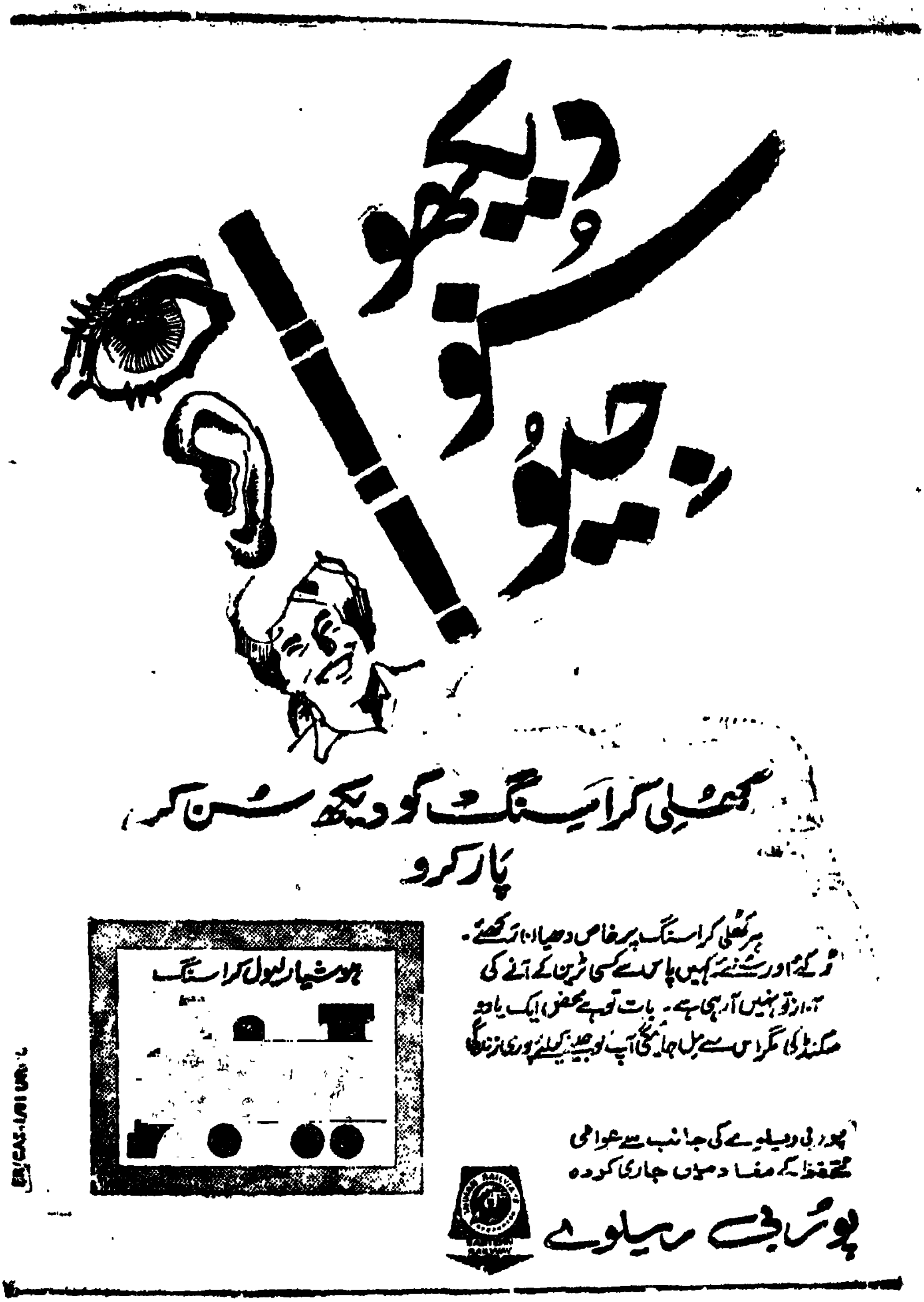
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

(جاری)

بقیہ پریم چند

جیسے اس کی ماں دیکھتی تھی۔ وہ اپنی ماں کا اکیلا لاڈلا تھا۔ بڑا ضدی، بڑا نٹ کھٹ، جو بات منھ سے نکل جاتی اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا۔ نئی ماں بات بات پر ڈانٹتی تھی یہاں تک کہ اسے ماں سے بغض ہو گیا۔ جس بات کو وہ منع کرتی، اسے زیادہ جوش سے کرتا۔ باپ سے بھی کدورت ہو گئی۔ باپ اور بیٹے میں خوشی کا رشتہ نہ رہا۔

(جاری)


دیکھو سنو
کھلی کراسنگ کو دیکھ سن کر
پار کرو
ہوشیار لیول کراسنگ
ہر کھلی کراسنگ پر خاص دھیان رکھئے۔
رکئے اور سنئے کہیں پاس سے کسی ٹرین کے آنے کی
آواز تو نہیں آ رہی ہے۔ بات تو ہے محض ایک یا دو
سکنڈ کی مگر اس سے مل جائیگی آپ کو جینے کیلئے پوری زندگی
پوربی ریلوے کی جانب سے عوامی
تحفظ کے مفاد میں جاری کردہ
پوربی ریلوے

علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گذرے

حلقۂ آہنگ نو گیا نے میرے سلسلے میں ایک اور نشست بلائی۔ یہ دراصل سوال و جواب کا سمینار تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے کی نشست میں کچھ امور پر تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ اس میں کچھ نئے شرکاء بھی تھے۔ باتیں شروع ہوتی ہیں تو پھر بہت سی ضروری و غیر ضروری باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ سوال مسئول کو تنگ کرنے یا اسے ٹٹولنے کے لئے بھی کئے جاتے ہیں۔ کچھ اس لئے ہوتے ہیں کہ بحث آگے بڑھے۔ چنانچہ آہنگ نو کے اس دوسرے جلسے میں بھی کچھ ہوا۔ شفیق احمد شفیق نے چاندنی بیگم کے حوالے سے تاثر (آڈٹ) کی سطح کا سوال اٹھایا کہ میں نے پچھلی نشست میں اسے قرۃ العین حیدر کا ایک ناکام ناول بتلایا تھا۔ اب مجھے اس کی وضاحت کرنی پڑی دراصل ناول کی کامیابی یا ناکامی کا تعلق فنکار کے تخلیقی قد و قامت سے ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے دوسرے ناولوں سے اپنے قد کو جس طرح بلند و بالا کیا ہے اس تناسب سے یہاں چاندنی بیگم میں نہ وہ واقعات کو پھیلا سکی ہیں اور نہ انہیں دوبارہ سمیٹ کر کسی بڑے فلسفیانہ نکتے تک پہونچا سکی ہیں۔ ایک عام تصور یہ ہے کہ ناول میں افسانے کے برخلاف وحدت تاثر نہیں ہوتا ایک تو یہ کہ خود وحدت تاثر (UNITY OF EFFECT) کی اصطلاح بحث طلب ہے۔ میں فی الحال اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا بس یہ کہوں گا کہ ناول میں یہ ہو یا نہ ہو مگر ایک (WHOLENESS) تکملیت کا ہونا تو ضروری ہے۔ ناول دلوانے کا خواب تو ہوتا نہیں کہ ٹکڑے بلا ضرورت سامنے آتے رہیں۔ وقوعوں کا تعدد کہیں نہ کہیں مل جل کر ایک وحدت فکر و نظر پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک بنیادی نکتہ ہے۔ جس سے داستان اور ناول کی تفریق ہوتی ہے۔ اگر سارے واقعات اتار چڑھاؤ کے بعد اور سارے کردار اپنے آزادانہ نقل و حمل کے بعد ایک بڑا (VISION یا VISDOM) نہیں دیتے تو ناول واقعات کی کھتونی بن جاتا ہے۔ چاندنی بیگم اپنی READIBILITY کے اعتبار سے تو ضرور کامیاب ہے۔ مگر یہ ناول وہ بصیرت و آگہی عطا نہیں کرتا جس کی توقع قرۃ العین حیدر سے کی جانی چاہئے شہزادہ نے اس نشست میں کچھ ذاتی سوالات بھی کئے۔ صبا اکرم نے پاکستان میں لکھی جانے والی تنقید کا مسئلہ اٹھایا اور یہ سوال کیا کہ ہندوستان میں یہاں کے کن تنقید نگاروں سے لوگ متاثر ہیں۔ میں نے جو جواب دیا وہ اردو

انٹرویو کئی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مختلف حالات اور ماحول میں سچ کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں پاکستان میں نقادوں کے درمیان میں گھرا ہوا تھا۔ بعض سوالات ایسے بھی تھے جن کے بے محابا جواب سے سامعین کی دل شکنی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر سچ کے معیار میں تھوڑا سے فرق کا آ جانا فطری بات ہے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ کہا ہے کہ "تنقید کے لئے پہلی شرط شرافت کی ہے"، مجھے اس امر کا احساس ہے کہ بعض سوالات کے جوابات میں میں نے بھی شرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ایسے مواقع پر بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ نہ کہہ دیا جائے۔ میں نے یہ بات تو صاف صاف بتا دی کہ پاکستانی تنقید نگاروں کو یہاں ہندوستان میں لوگ پڑھتے تو ضرور ہیں لیکن بہت زیادہ متاثر اور مرعوب نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر آغا نے اپنی تنقیدوں سے ایک نئی مطالعاتی جہت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لیکن وہ خود اس راہ پر دور تک چل نہیں سکتے۔ ARCHITYPAL CRITICISM سے شعری جمالیات تک پہنچتے پہنچتے وہ خود جگہ جگہ الجھنے لگتے ہیں۔ رہا معاملہ انور سدید کا تو حقیقتاً ان کی تنقید پر شارحانہ رنگ حاوی ہے۔ ان کے پاس اطلاعات کا انبار ہے لیکن PROMPTITUDE سے خزف ریزوں اور لعل و گہر کو چھانٹ کر الگ کرنے اور ان کی درجہ بندی کا کام جس قوت محاکمہ کا متقاضی ہے وہ انور سدید کے یہاں نہیں ملتی۔ انیس ناگی، سلیم احمد، اور محمد علی صدیقی کی تنقیدی نگارشات اپنی انفرادیت کی وجہ سے زیادہ معزز سمجھی جاتی ہیں۔

کراچی کی کئی ادبی و شعری نشستوں میں جناب جمیل عظیم آبادی سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ وہ ایک پختہ کار، باشعور، روایت پسند اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں غزلوں کا مجموعہ "دل کی کتاب" دوہے اور گیت کا مجموعہ "گیان درپن" اور حمد و نعت کا مجموعہ "وحدت و مدحت" اہمیت کے حامل ہیں۔ غالباً ان کی چوتھی کتاب "طلسم خیال" بھی شائع ہو چکی ہے۔ جس میں نظمیں اور قطعات ہیں۔ شان الحق حقی، سید ناصر شہزاد، نظیر صدیقی، عبد القدوس ہاشمی، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر عطا کاکوی، اور خواجہ منظر حسن منظر نیز دیگر کئی حضرات ان کے شعری کمالات کے معترف و مداح ہیں۔ ایک روز قیام گاہ پر نہ جانے کون صاحب آ کر کاغذ کا ایک پرچہ دے گئے، کھول کر دیکھا تو جناب جمیل عظیم آبادی کا ایک قطعہ تھا انہوں نے اس قطعہ میں مجھے حسن محبت سے یاد کیا ہے اور میری جس طرح عزت افزائی فرمائی ہے افسوس ہے کہ میں اپنی پریشان کن مصروفیات کی وجہ سے ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ ان سے ایک بار مل کر ہدیۂ تشکر بھی نہیں پیش کر سکا۔ ان کی دست خاص کا لکھا ہوا یہ قطعہ اب بھی ان کی یاد روشن کرتا ہے۔

یاس کا مولد، وطن بیدل کا، مسکن شاد کا ۔۔ آج بھی مرکز ہے شعری جدت و ایجاد کا
یہ علیم اللہ حالی شاعر و نقاد بھی ۔۔ مسکراتا پھول ہے باغ عظیم آباد کا

جناب جمیل عظیم آبادی معیاری شاعری سے شاعرانہ جوہر کو آگے لائے ہیں۔ عشق و ریاضت نے ان میں بے پناہی پیدا کر دی ہے۔ بالعموم انہوں نے انہیں اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں ان کی مزاج کی فطرت و طلاقت کو بہتے کھلائے ہیں۔ شاعری میں کوئی چیز ارتجالاً نہیں ہوتی۔ ایک جذبہ بے اختیار ہے جو کئی حقیقتوں اور پیکروں میں ان کی شاعری میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شعر و سخن سے ان کی ساری وابستگی دل کا معاملہ ہے۔ وحدت و صحت۔ یہ جذبے کا ایک سرمدی بہاؤ ہے۔ یوں تو جمیل عظیم آبادی کے حمد و نعتیہ کلام پر بھی غزل کا رنگ ہے۔ لیکن ایسی منظومات میں انہوں نے ہیئت کے تجربات بھی کئے ہیں۔ لیکن تمام تجربات میں جو شئے ہر جگہ مشترک ہے وہ موسیقی آہنگ اور مخصوص نغمگی ہے۔ اور اسی شئے نے بے پناہ دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان کے مجموعے گیان درپن میں دوہے اور گیت ان میں بھی معرفت اور صوفیت کا رنگ غالب ہے۔ اگرچہ دوہوں موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ خانوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ اور حمد رنگ / نعت رنگ / پریم رنگ / پیار رنگ / سچ رنگ / جھوٹ رنگ اور رنگ رنگ کے عنوانات متعین کئے گئے ہیں۔ مگر ان میں سبھوں میں بہت صوفیانہ رنگ جاری و ساری ہے۔ گیتوں میں جہاں مجازی رنگ نظر آتا ہے وہاں بھی کثافت کے بغیر لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان و بیان کے حسن، جذبات کی نفاست اور احساسات کی توانائی نے جناب جمیل عظیم آبادی کو خوش گوار روایت کا ایک مستحکم علامیہ بنا دیا ہے۔

پاکستان کے دانش وروں، قلم کاروں، شاعروں، اور ادیبوں پر احیائے مذہب کا ایک خاموش لیکن مضبوط اثر ہے۔ وہاں کے قلم کاروں کا ایک خاصا اہم طبقہ ادب کو معتقدات کے سانچے سے جانچنا چاہتا ہے اس کا ایک اچھا پہلو تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرہ صالحیت کی طرف جاتا ہے لیکن آگے چل کر دشواری وہاں ہوتی ہے جب معتقدات ٹکراتے ہیں۔ اور تب ایک سوال ابھر کر سامنے آتا ہے ——— اور یہ کہ فنون لطیفہ معتقدات کے تابع ہیں یا فنون لطیفہ ان پر حاوی ہیں۔ یا ان دونوں کی دنیا ہی الگ الگ ہے۔ یہ ایک بڑی لمبی بحث کا موضوع ہے۔

میں نے پاکستان کے بارے میں متذکرہ نتائج اس لئے بیان کئے کہ وہاں مجھے متعدد ایسی شعری تخلیقات سننے اور پڑھنے کو ملیں جن میں معتقداتی موضوعات کو بڑے اخلاص کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں عام طور پر زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ایک مخصوص زاویۂ نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسی فضا میں شعری و ادبی روایات کو زندہ رہنے کا موقع ضرور ملتا ہے۔ مگر نئے ابعاد کے سامنے آنے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔

اسی ضمن میں ایک واقعہ بھی سن لیجئے کہ کراچی میں ایک بزرگ پیر بخش مرتضیٰ انصاری بھی ہیں۔ خوش گو شاعر ہیں اور شعری و ادبی محفلوں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں۔ نشستوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اور ادارہ طلوع

پاکستان، حما ایجوکیشنل اکیڈمی، آل پاکستان تنظیم احباب، بزم تعمیر ادب، جیسے اداروں سے وابستہ ہیں کراچی کی کئی شعری نشستوں میں وہ میرا کلام سن چکے تھے۔ اور بالآخر انہوں نے کسی کے ذریعہ میری قیام گاہ پر مجھے ایک مراسلہ بھجوایا۔ یہ مراسلہ گویا میرے کلام بیان کا تاثر بھی ہے۔ میرے لئے نصیحت بھی۔ میری اصلاح بھی اور نیک خواہشات بھی۔ ان کا مکتوب لیوں ہے۔

محترم پروفیسر علیم اللہ صاحب حالی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ اسلام کو محترم پروفیسر محمد عثمان رمز صاحب کے دردولت پر آپ نے بحیثیت مہمان خصوصی نئے تقاضوں کے مطابق جو اشعار پیش کئے ہم سب تمام شرکاء مشاعرہ بے حد مستفیض ہوئے۔ اللہ آپ کو اور علم و بصیرت عطا فرمائے۔ آمین۔ فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف مذاہب، فلسفیوں، اور نظریات کے بارے میں پہلے ایک بنیاد طے کرلی جائے۔ نیز اسی پر بحث اور غور وفکر کرکے تصفیہ کیا جائے۔

۱۔ پہلے تو یہ کہ وہ اوہام و خرافات نہ ہوں بلکہ ایسے امور ہوں جن کی تصدیق عقل سلیم کرلے۔

۲۔ ایسی باتیں نہ ہوں جن کا ہماری زندگی سے تعلق نہ ہو۔

۳۔ ان میں ایسی معنوی قوت ہو جس سے ان کے سوچنے اور عمل پر قابو پانے میں مدد مل سکے۔

محترم حالی صاحب!

یہ تین معیار ایسے ہیں جن کے بغیر کوئی نظام انسانی معاشرہ اور سوسائٹی پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس لئے جب ہم ان اصولوں کے مطابق اسلامی عقائد یا ایمانیت پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں معیاروں پر یقیناً پورے اترتے ہیں۔ محترم حالی صاحب امید کہ مندرجہ بالا سطور مدنظر رکھتے ہوئے آپ اپنے علم و فن، افکار، اشعار نیز اپنے اصلاحی مضامین کے ذریعہ بھارت کے بسے ہوئے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی فرماکر اللہ تعالیٰ کے حضور بلند درجات کے لئے انتھک محنت و کوشش فرماتے رہیں گے۔ فقط حد ادب وما علینا الا البلاغ۔

احقر آپ کا خیر اندیش

پیر بخش مونس انصاری

اس مکتوب کے کچھ حصے تو واضح ہیں۔ بعض باتیں میرے پلے نہیں پڑیں۔ ہاں اتنا ہے کہ خط کا مجموعی تاثر بہرحال ظاہر ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی شعری و ادبی فضا پر تحفظ عقائد کی گرفت نے اسے ایک خاص رخ دے دیا ہے۔ یہ فضا فنون لطیفہ کے لئے کتنی سازگار رہے یہ تو کہنا مشکل ہے اس لئے کہ فنون لطیفہ کی اپنی جمالیات بھی ہوتی ہے اور اپنی اخلاقیات بھی۔ عظیم شاعر انفرادی یا جماعتی مسلمات سے اوپر اٹھ کر آفاقی جہات کی متلاشی ہوتی ہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ شاعری کی لطافت کے لئے ایک وسیع تر غیر مادی تصور، ایک روحانی کون (SPIRTUAL COSMOS) ایک ماورائی کائنات اور الہیاتی یا عرفانی HEREAFTER کی ضرورت ہے۔ اس میں کسی مخصوص مرتب نظام عقائد کا کتنا حصہ ہے یہ طے کرنا ممکن نہیں۔

(جاری)

بہار میں عوامی فلاح اور ترقی کے

بڑھتے قدم

- کوئلہ رائلٹی کی در میں ۳ گنا اضافہ کی منظوری حاصل کی گئی۔
- ریاست کسی ایک ضلع کا انتخاب کر کے ضلع کے صد فی صد گاؤں میں بجلی پہونچانے کے منصوبے پر عمل۔
- کالا زار پر قابو پانے کے لئے گذشتہ سال کے مقابلے میں دوگنی قسم کا انتظام اور ٹاسک فورس کی تشکیل۔
- ابتدائی تعلیم کو نئی منزل ۲۵ ہزار پرائمری اسکول کی تقرری کے لئے اشتہار کی اشاعت۔
- اقلیتی کمیشن کو آئینی اختیارات تفویض کرنے میں بہار آگے
- اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ کو سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کے مساوی سہولیتیں دینے کا فیصلہ۔
- اقلیتی فرقہ کے قبرستان کی گھیرا بندی مختلف مراحل میں پورا کرنے کا فیصلہ۔
- بہار تعلیمی منصوبہ کے لئے ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۵ کروڑ روپے خرچ کرنے کا انتظام۔
- دیگر سروسیز کی طرح بہار جوڈیشنل سروس کی تقرری میں ریزرویشن کا انتظام
- پولی ٹکنک، آئی ٹی آئی، انجینیرنگ، میڈیکل، فارمیسی اور ایگریکلچر کے تمام تعلیم اداروں میں ریزرویشن کا انتظام۔
- جھارکھنڈ ریجنل ڈیولپمنٹ کاؤنسل کی تشکیل
- صد فی صد عطیہ پر مزدوروں کی باز آبادکاری کے لئے ویشالی ضلع کا انتخاب۔
- دہشت گرد سرگرمیوں پر قابو پانے کے لئے ریاستی پولس فورس کو جدید ترین اسلحہ دینے کا انتظام۔
- ہوم گارڈ کے تربیت یافتہ اور باصلاحیت امیدواروں کی اسکریننگ کر کے ۵۰ ہزار نفری پر مشتمل بہار سکوریٹی فورس کی تشکیل
- چوکیداروں اور دفعداروں کے ورثا کو ان کے عہدہ پر ایک بار نامزد کر کے تقرری کا اعلان
- سرکاری ملازمت میں تقرری کی عمر کی حد سب کے لئے بڑھائی گئی۔
- پی۔ ایم سی۔ ایچ پٹنہ، آر۔ ایم سی۔ ایچ رانچی میں غریبوں کے لئے بلا معاوضہ دوا تقسیم کا مرکز کھولا گیا۔
- کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں درس و تدریس اور امتحان کو باضابطہ کرنے کے لئے ٹھوس کاروائی
- اسی ذات کے لوگوں کے ذریعہ دیئے جانے والے

تاڑی ٹیکس کی پوری طرح معافی - تاڑی فروخت کرنے کے لئے لائسنس لینے کی مجبوری ختم

- مچھواروں کو ندی اور ڈھاب پر مچھلی مارنے کا بلا ٹیکس اختیار حاصل
- ریزرویشن کے ضابطوں کو اور دھاردار بنایا گیا ریزرویشن کے ضابطوں کی خلاف ورزی تعزیراتی جرم

مقرر -

- ریاست میں آٹھ نئے ضلع اور ۲۰ نئے انومنڈل کی تشکیل
- ترقیاتی پروگراموں کا زیادہ فائدہ کمزور طبقہ کے غریب عوام کو دلانے کے لئے جیوا ایا اسکول کے قیام کا فیصلہ۔

جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

सू०ज०स० पि 151 स (सू-134)91-92



جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

ہے ابھی موسمِ گل

شوکت صدیقی

فصلِ گل آئی، ہوئی چاک قبا پھولوں کی
بارِ صد رنگ سے ہر شاخ جھکی جاتی ہے
محفل در محفل بہاروں نے سجائی ہے یہاں
محفلِ عیش جو پیغام دیئے جاتی ہے
ہے ابھی موسمِ گل آیئے کلیاں چن لیں

وقتِ گذراں کا نہیں قافلہ رکنے والا
ہے رواں اب بھی یوں ہی سرعتِ پرواز کے ساتھ
وہ گلِ تر جو کھلا آج ہے شاید ہی رہے
خاک ہو جائے گا کل صبح کے آغاز کے ساتھ
ہے ابھی موسمِ گل آیئے کلیاں چن لیں

ہیں یہ ایام جوانی کے امنگوں کی گھڑی
عہد یہ جوششِ تمنا کا نہ پھر آئے گا
وقت بھرپور جوانی کا ہے چڑھتا سورج
حسن دو چار گھڑی اس کا ہے ڈھل جائیگا
ہے ابھی موسمِ گل آیئے کلیاں چن لیں

چلنے والی ہے بہت سرد زمستاں کی ہوا
دل کی بے کیف فضاؤں پہ گہر چھائے گا
آتشِ شوق بھی بجھ جائے گی، غنچوں کے لئے
کھلنے سے پہلے ہی پیغامِ وداع آئے گا
ہے ابھی موسمِ گل آیئے کلیاں چن لیں

زخمی نظارے

پرکاش تیواری

ہر طرف
نفرتوں کے
چمکتے ہوئے
برچھے بھالے
نظر آتے ہیں
پیار کے پیڑ کی
اب وہ ٹھنڈی سی
چھاؤں کہاں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں
اب شعلے کے سیہ ناگ
پھن پھیلا کر بیٹھے ہیں
کھیتوں میں اب
کسانوں کے
چہرے نہیں
سر نظر آتے ہیں
اور باغوں میں
الفت کا ہر پودا
مرجھا گیا ہے
مروت کی کلیاں
بکھر سی گئی ہیں

نظارے
یہ ہستی کے
بس میں مجھے
تیر کی بھانتی
دل کو اب
لگتے ہیں
آدمی کیا کرے

نذیر فتح پوری

میں اگر پھول سا کھلا ہوتا
شاخ سے ٹوٹ کر گرا ہوتا

دیکھ کر خود کو پیار کر لیتے
گھر میں کاش اپنے آئینہ ہوتا

دن کے سارے عذاب سہ جاتے
پیار سورج سے کر لیا ہوتا

میں نہ آتا تو اس نے رو رو کر
فرش کمرے کا دھو دیا ہوتا

ہم سمجھتے بہار باقی ہے
کوئی پتہ اگر ہرا ہوتا

اس سے مل کر نہ بچھڑا ہوتا نذیر
خود سے مل کر بچھڑ گیا ہوتا

منیر سیفی

وہ آسمان میں اڑتا کبوتروں کا غول
صدا کی دیدے کے جھٹ پٹا اتار لیتا تھا
وہ روز مجمع لگاتا تھا رونیوں کے لئے
اور اپنے پیٹ میں خنجر اتار لیتا تھا
کہ پہلی رات تھی مخصوص بس اسی کیلئے
کنواریوں کے وہ زیور اتار لیتا تھا
ہمارے بیچ وہ ملعون اب بھی زندہ ہے
جو اہل بیت کی چادر اتار لیتا تھا

کبھی ہو جاتا ہوں خود سے بھی غافل
کبھی لکھنا لے خط چاہتا ہوں
گھٹن ہوتی ہے دوہری شخصیت سے
دل آئینے کی صورت چاہتا ہوں
فضا گھر کی مرے لائق نہیں ہے
سمندر، دشت، پربت چاہتا ہوں

مدہوش بلگرامی

۲۴۳ ، بہرا سوداگر ، ہردوئی

اب نہ جینے کی دعا دے کوئی
راہ مقتل کی دکھا دے کوئی
لوگ لے آئے ہیں مجھ پر ایماں
اب تو الزام لگا دے کوئی
میرا انصاف ابھی زندہ ہے
اب بھی زنجیر ہلا دے کوئی
یوں تو کس کس سے گلا کرتا ہوں
مجھ کو مجھ سے بھی ملا دے کوئی
خلوتِ غم ہی سجا لی میں نے
اب نہ ایسے میں صدا دے کوئی
دم گھٹا جاتا ہے انگنائی میں
اب تو دیوار گرا دے کوئی
میں پرستارِ چمن ہوں مدہوش
پھول زخموں کے کھلا دے کوئی

نسیم سامانی

میں گنہگار مرا دامن تر اپنی جگہ
تو ہے ستار ترا حسن نظر اپنی جگہ
ہے دعا اپنی جگہ باب اثر اپنی جگہ
ہے نصیب اپنی جگہ سعی بشر اپنی جگہ
تذکرہ موت کا ہو جائے تو کچھ اچھا ہے
زندگی تجھ سے بھی ہے پیار مگر اپنی جگہ
دل بھی اک شئے ہے زمانے میں خدا خانہ ہے
لیکن عظمت میں ہے اللہ کا گھر اپنی جگہ
اب یہ مرضی ہے تری عکس کو تو اپنا سمجھ
آئینہ اپنی جگہ آئینہ گر اپنی جگہ
حوصلہ چاہیے منزل پہ پہنچنے کے لئے
راہبر اپنی جگہ ذوقِ سفر اپنی جگہ
میں نے دیکھی ہے بہت موجِ نسیمِ سحری
تیری دیوار کے سائے ترا در اپنی جگہ

غــزلیں

انتخاب

مشتاق احمد نوری

اس نے جب اپنی آنکھ کھولی تو دنیا میں ہر طرف مختلف رنگوں کو بکھرا ہوا پایا۔ اس نے ہوش سنبھالا اور اسے خواہش ہونے لگی کہ وہ بھی کسی ایک رنگ کو اپنا لے۔

"مگر کون سا رنگ اس کے لئے سب سے مناسب و موزوں ہوگا؟"

یہ سوال بہت پیچیدہ تھا۔ وہ اس کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس تلاش و جستجو میں، وہ برسوں سے منہمک تھا کہ ایک دن کسی نے اس کی بغل سے جھانک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"سیاہ رنگ آنکھوں میں بھرے"

"مگر سیاہ ہی کیوں ؟!" وہ سراپا سوال بن گیا

"کیونکہ یہی وہ رنگ ہے جس میں زرد، سبز، سرخ بلکہ سارے رنگ اپنی پہچان کھو دیتے ہیں۔"

بے نقاب

وہ چبوترے پر کھڑا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ آن کی آن میں وہاں کافی بھیڑ جمع ہو گئی۔ اس نے دنیا کی بے ثباتی پر اتنی موثر تقریر کی کہ سب کو دنیا سے نفرت سی ہونے لگی اور اپنے اپنے آخرت کی فکر ستانے لگی۔ سارا مجمع اس سے کافی مرعوب نظر آ رہا تھا۔ اور اس کی ہر بات مقدس بول کی طرح اپنے دلوں میں جذب کرتا جا رہا تھا

اس جادو بیان مقرر نے پورے مجمع پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

"لوگو۔ گواہ رہنا میں نے اپنا پیغام تم سب تک پہنچا دیا ہے۔" وہ قدرے توقف کے بعد پھر گویا ہوا۔

"لوگو۔ تم سب نے میرا صرف ایک رخ دیکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں سب میرے دوسرے رخ سے بھی واقف ہو جاؤ۔"

وہ چپ ہو گیا اور چپ ہی رہا۔ پھر سارے مجمع نے آواز لگائی

"چپ کیوں ہو گئے ــــ ہم آپ کا دوسرا رُخ بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور مجمع سے خطاب کرنے لگا۔

لوگو! میں کئی دن سے بھوکا ہوں۔ میرے بچے بھی فاقے سے ہیں۔ آپ اتنے سارے حضرات اگر دو آنے چار آنے سے بھی میری مدد کریں تو میں کم از کم مہینہ بھر اپنی بھوک سے لڑ سکتا ہوں۔"

اتنا سنا تھا کہ پورا مجمع کائی کی طرح یوں پھٹ گیا گویا کسی نے وہاں بم پھینک دیا ہو

ھونی

وہ جب بھی اسکوٹر سے باہر نکلتا ہلمٹ پہننا نہ بھولتا ــــ اسے یقین تھا کہ اکسیڈنٹ ہونے پر یہ ہلمٹ اس کی حفاظت کرے گا۔

اور آج حادثہ ہو ہی گیا ــــــــ

وہ اپنے دونوں بیٹے کو صبح صبح لے کر اسکول جارہا تھا کہ دھرنا چوک پر اچانک ایک ٹرک سے ٹکر ہو گئی۔ دونوں بچے جھٹکے سے دور جاگرے اور انہیں معمولی چوٹیں آئیں۔ مگر ٹرک کا پچھلا حصہ اس کے سر سے گذر گیا۔ پورا جسم سالم تھا مگر سر ــــ جو ہلمٹ کی حفاظت میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھرتا بن گیا تھا۔

شناخت

آج وہ نیا سفاری سوٹ پہن کر باہر نکلا۔ جس نے بھی دیکھا اس نے تعریف کی۔ دوستوں کے درمیان جب گیا تو سب اس کے نئے کپڑے اور سلائی کے ڈیزائن کی تعریف کرنے لگے گویا اس کے پورے وجود میں سب سے اہم لباس ہی ہو۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کی شخصیت پر یہ سوٹ حاوی ہو گیا ہے اس نے واپس آکر کپڑے تار تار کر دیئے۔ وجہ دریافت کرنے پر اس نے کہا۔

مجھے ہر اس شے سے نفرت ہے جو میری شناخت کم کر دے اور لوگ مجھے بھول کر اس میں گم ہو جائیں۔

●●

پیش لفظ

(مسلمان)

وہ فارس سے آئے تھے
وہ کابل سے آئے تھے
لیکن وہ ملک کی تقسیم کے ذمہ دار نہیں تھے
وہ غدار نہیں تھے

○

جسم ڈھکنے کے لئے انہیں بھی ضرورت پڑتی تھی
دو کپڑوں کی
انہیں بھی بھوک لگتی تھی
تیز دھوپ میں ان کا جسم بھی جلتا تھا
وہ سردی بھی کھاتے تھے
اور بارش کا سہانا موسم بھی انہیں پسند تھا
لیکن وہ غدار نہیں تھے

○

وہ محبت کرنا بھی جانتے تھے
اور نفرت بھی
وہ عقیدت بھی رکھتے تھے
اور ان میں ایسے بھی تھے
جو کسی بھی دین کو نہیں مانتے تھے
وہ پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھتے تھے
وہ سچ بھی بولتے تھے اور جھوٹ بھی
اس لئے کہ وہ انسان تھے
ان کا رنگ روپ، سب کچھ عام انسانوں جیسا ہی تھا
لیکن وہ غدار نہیں تھے

○

انہیں بھی موت آتی تھی
اور وہ ہمیشہ کی نیند سو جاتے تھے
ان کی بھی مائیں بین کرتی تھیں
بہنیں روتی تھیں / ہنستی تھیں / حسد رکھتی تھیں
شادی کرتی تھیں

○

ان کے بھی بچے تھے
بچے ہنستے تھے، کھیلتے تھے
لڑتے تھے جھگڑتے تھے
غصہ میں آکر 'آلوک' یا 'رنجن' کو پیٹ بھی دیتے
یا پٹا جاتے تھے
پھر دوستی کر لیتے تھے
لیکن وہ غدار نہیں تھے

○

وہ ہمارے جیسے تھے
وہ تمہارے جیسے تھے
کہ ان کی شریانوں میں
خون کا بہاؤ بھی ہمارے ہی جیسا تھا

○

وہ فارس سے آئے تھے
وہ کابل سے آئے تھے
وہ دنیا بھر سے آئے تھے
لیکن وہ غدار نہیں تھے

ایک قسط وار سلسلہ

مشرف عالم ذوقی

(ناولٹ)

مسلمان

(ہندی سے اردو — تبسم فاطمہ)

(پہلی قسط)

غلامی کے آخری دنوں سے ——— ۱۹۸۶ تک

لمحہ لمحہ ایک بکھراؤ ہی تو ہے تمہارے پاس ؟

اور اس کے سوا ؟

خواہش اور گریز سے الگ کی بھی ایک شاہراہ ...ہ جہاں کھڑی ہو تم ، اور مستقل ایک لڑائی لڑ رہی ہو ...والے لمحوں کی سنگینیوں سے — یا وہ لمحہ جو ابھی ابھی ...رے پاس سے گزرا ہے — لمحے کو بھوگنے کی خواہش ...دیا نہیں — لیکن تمہیں بھوگنا ہے ——

کھلی آنکھ کے بعد حرم نتیجے کا لقمہ تو تمہیں بننا ہے .....

جیسے جنگ میں ہارا ہوا ، بندی بنا ہوا راجہ — تم اجو ؟ .... کبھی غور کیا ہے ... تمہاری ...ت بھی تو .... ؟

...زندگی کیا ؟

نہیں ڈرنا کوئی حل نہیں ہے ۔ یوں بھی تم نے ڈرنا کہاں سیکھا ہے ۔ تم نے تو جینا سیکھا ہے ۔ سخت جان آبی پرندوں کی طرح .... تم نے تو خشکیوں پر رہنا بھی سیکھ لیا ہے ۔

لیکن کیا سچ مچ ؟

دور کہیں آسمان میں ایک تارہ ٹوٹا ہے —

تارے تو ٹوٹتے ہی رہتے ہیں — ہیں نا ؟

اندھیرے سے آسمانی چھت کا جائزہ لیتی ہوئی جیسے وہ ریزہ ریزہ ہو گئی ۔ دھک .... دھک .... نوخیز سینے میں کہیں دور تک کھلبلی مچ گئی ..... اندر بیٹھا خوف ، دیوار گھڑی کی طرح ٹن ... ٹن گھنٹا مارنے لگا .... رک رک کر .... ٹھہر ٹھہر کر ....

ٹن .... ٹن .... ٹن ....

ٹن .... ٹن .... ٹن ....

ہر رات وہ اپنے جسم سے خوف کی ایسی ہی ایک ڈور کھینچنے کی کوشش میں بکھرتی جاتی ہے... پتہ نہیں ــــ بچپن سے لے کر اب تک ــ جسم سے خوف کی کتنی ڈوریں بندھی ہوئی ہیں ــــ وہ چاہتی تو بے ہمت و ر جینا ــــ طاقتور اور مضبوط ــ اتنی بڑی دنیا میں ــ مردوں کے ظلم و ستم اور خوف کی کہانیاں بیان کرنے والی اس دنیا میں ــــ تن تنہا، یگانہ اور اپنے وجود کی حفاظت کی آزمائش میں ــــــ

لیکن رسم و رواج کی جو اتنی ساری بیڑیاں پڑی ہیں ــــ

اور بیڑیوں میں دبا ہے ــــ خوف ؟

خوف...

سچ .. وہ بچپن سے ہی خوف کے ٹیکے لیتی رہی ہے....

تاک... دھن.... تاک.... دھن....

گھنگھروؤں نے اچانک پاس آکر سرگوشی کی ہے.... ننگے پیروں نے چھم چھم چمکتے فرش کا بوسہ لیا.... ساز حرکت میں آگئے اور سازندے بھی......

رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے...

گھنگھرو تیز ہوئے. نغمے تیز ہوئے ــ دیوانوں کے شور و غل اور واہ واہی کی صدائیں تیز ہوئیں ــــ اور کہیں ــــ بند دروازے سے جھانکتی دو آنکھیں رقص و مینا کی تکرار میں ان لفنگی قہقہوں کو سنتی ہوئی خوف سے سہم گئیں ــــ

خوف ــــ کبھی مجبوری کے عوض منڈیروں سے جھانکتی وحشیانہ ادائیں بن جاتیں.

خوف ــــ کبھی حیرت سے گھنگھرو اور پائلوں کو گھورتی آنکھیں بن جاتیں.

خوف ــــ بالاخانے پر آنے والوں کے قہقہوں اور بے ہنگم جھنکاروں میں الجھ الجھ جاتا...

خوف ــــ جنہیں ننھی منی سی افروزہ چیچک کے ٹیکے کی طرح اپنے وجود میں پیوست کر رہی ہوتی ــــ اور وہاں ــــ بالکنی پر ایک قطار سے میلے گندے کپڑے پھیلے ہوتے ــ جانگھیائیں ــ برا، سایہ، ان سب سے عجب سی بدبو آ رہی ہوتی ــ بالکنی کے اس دنیا کو ذرا فاصلے سے گھور رہی ہوتیں، وہی دو آنکھیں ــ اور ان گندے کپڑوں کے بیچ کھڑی ہوتیں گوہر بائی ــــ بالکنی پر گاہکوں کا انتظار کرتی ہوئی ــــ

قطرہ قطرہ خوف اس کے وجود میں بیٹھتا رہا ــــ

رقص جاری رہا ــــ

سازندے اپنی اپنی دنیا میں کھوئے رہے ــــ

طبلے کی ہر تھاپ پر گوہر بائی کے پیر ناز و ادا سے بے خود ہو جاتے.....

رقص میں لیلیٰ رہی....

لیلیٰ کے دیوانے رہے.....

گھنگھروؤں کی جھنکار تیز ہوتی ــ مینا و ساغر کھنک اٹھتے ــــ

واہ واہ کے بے ہنگم شور اچانک خوف میں تبدیل ہو کر چیچک کا ٹیکہ بن جاتے جیسے وہ لمحہ لمحہ اپنے جسم میں پیوست کر رہی ہوتی ــــ

ہاتھ میں کتاب ــــ آنکھوں میں الجھنوں کے سائے ــــ دل و دماغ میں بسی ہوئی صاف و شفاف گونج

جماعت میں ایک طرف چپ چاپ بیٹھی ، سوچ میں
ڈوبی ، ہنسی قہقہوں ، ٹھٹھوں سے الگ ۔۔ گھر میں
آنے والے عجیب عجیب چہروں والے مردوں کا تصور ...
یہ سب ۔۔۔ ؟ وہ بند کمرے میں پڑھنے بیٹھتی تو
یہی گھنگھروؤں کی تھاپ ہوتی اور وہ انجانا سا خوف
ہوتا ......

ہاں خوف ۔۔۔

کیونکہ اس وقت تک اس نے یہ نہیں جانا تھا
کہ .....

ہاں وہ کون ہے ؟

گھنگھروؤں کا رستہ تو ہر عبادت گاہ تک
جاتا تھا ...

ہر دروازے تک ۔۔۔

وہ کون ہے ۔۔۔ ؟

اس وقت تو یہ آواز فن میں کہیں نہیں گونجی
تھی ۔۔۔ تب وہ صرف افروز تھی ۔۔ گوہر بائی کی لڑکی
۔۔ گوہر بائی ، جس کا کوٹھا سب کے لئے کھلا تھا ۔
کیا ہندو کیا مسلمان ۔۔۔

اور کوٹھے کی تو خوبی بھی یہی ہے ۔۔

ساری ندیوں کو پی کر سمندر بن جانا ۔۔۔

لیکن افروز ۔۔۔ وہ تو زہر پینے میں لگی تھی ۔

قطرہ قطرہ ۔۔۔

یادوں کی وادیاں گھنی ہوئیں تو ایک گورا گورا
مردانہ ہاتھ چمکا ۔۔ ایک ہاتھ سے لاٹھی تھامے ۔۔
براق سفید کرتا پائجامہ ۔۔۔ پیروں میں ناگرہ ۔۔
[illegible] آہستہ آہستہ

اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ۔

الطاف حسین ۔۔ نواب الطاف حسین ۔۔

وہ سر جھکائے نواب صاحب کو کن انکھیوں سے
دیکھ رہی تھی ۔

گوہر بائی کے چہرے پر رونق آگئی ۔۔ کمھلائے
چہرے کی خزاں رنگت ایک لمحے کو بہار میں تبدیل ہوئی
۔۔ مسکرائیں ۔۔

مسکرائے نواب صاحب بھی ۔۔ پھر آہستہ
سے اٹھے ۔۔

" اچھا ۔ چلتا ہوں گوہر جان ۔۔ "

بہار پھر خزاں میں کھو گئی ۔۔

" یہ بھی کوئی آنا ہوا نواب صاحب ۔"

" آنے اور جانے کا سلسلہ تو لگا ہی رہتا ہے گوہر
جان ۔۔ "

وہی مسکراہٹوں کا تبادلہ ۔۔

خاموشی ۔۔

اٹھتی گرتی سانسیں اور ۔۔۔

دبا دبا سوال ۔۔

" پھر کب آئیں گے نواب صاحب ؟"

اس نے محسوس کیا ، بائی اماں کی آنکھوں کی
پتلیاں لرزی تھیں ۔ زمین پر لاٹھی گھماتے ہوئے
مسکرائے تھے الطاف حسین ۔

" آتا ہی رہتا ہوں ۔۔ "

بائی اماں کی آواز بوجھل ہوگئی ۔۔

" بہت زیادہ ان آنکھوں کو انتظار نہ کرایئے
گا نواب صاحب "

نواب صاحب اس بار پھر مسکرائے ، ایسی مسکراہٹ

جس کے بارے میں وہ سوچ میں پڑ گئی کہ آیا یہ مسکراہٹ
بے بھی یا نہیں ــــ اتنی پر اسرار ... اتنی عجیب سی ۔
نواب صاحب نے لاٹھی دھیرے سے گھمائی
اور چپ سے دروازے سے نکل گئے ۔
خالی دروازہ ــــ ٹھنڈی سانس لے کر اس
خالی خالی دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھیں بائی اماں ۔
پھر کمرے سے چلی گئیں ــــ
نواب صاحب کا گورا چہرہ دیر تک ننھی افروز
کی آنکھوں میں جھلملاتا رہا ــــ
اور ــــ
پھر وہی خوف ــــ
وہ خوف سے الگ کیوں نہیں ہوتی ــــ
وہی بے جان سے ــــ گلی کے کسی کونے میں پھینکے
ہوئے ماہواری کے خون آلودہ ٹکڑے کی طرح ــــ
گھناؤنے، اُلٹی کرنے جیسے کچھ منظر ــــ
وہی الگنی پر ٹنگے بائی اماں کے گندے میلے کپڑے
ــــ برا، جانگھیائیں ــــ سایہ ــــ
وہ غور سے دیکھتی ہے ــــ جیسے اچانک یہ
کپڑے سنڈاس میں بدل گئے ہوں اور ان پر ہزاروں
مکھیاں بھنبھنانے لگی ہوں ....
انہیں بائی اماں ... پہنتی ہیں نا ؟ ہر روز ؟
اور ہر دوسرے دن یہ گندہ بھی ہو جاتی ہے ــــ
دھیرے سے آگے بڑھ کر وہ ہاتھ کی ننھی ننھی
انگلیوں سے کپڑوں کو مَس کرتی .... کپڑوں پر پڑے
بے شمار داغ ــــ لیکن داغ کہاں تھے ..... سب
تو وہم تھا اس کا ــــ لیکن اسے گھن کیوں آتی ہے ؟

کیوں ؟
وہ دالان خانے سے ہوتی ہوئی باہر آئی تو اسے
پتھروں کے اونچے فرش کے پاس بدری ماما نظر آتے ،
بے زبان گائے کی طرح سر جھکائے ــــ بائی اماں کے
چہیتے دالان ــــ
بائی اماں کے زیر جامہ کو صابن کے جھاگوں سے
نچوڑتے، کپڑے پیٹنے والے لٹھ سے پیٹتے ــــ
انہماک سے اپنے کام میں کھوئے ــــ گائے
جیسے سدھے بدری ماما ــــ
بائی اماں کی جھڑکیاں ان کے کانوں سے ایسے
گزرتیں جیسے اندھا پاس سے گزرتے کسی آدمی یا سواری
سے ٹکراتے ٹکراتے بچ جاتا ہے ــــ اور اسے کوئی حس
نہیں ہوتی ــــ
" کیوں رے بدری ــــ کھانا تو تینوں وقت
ٹھونستا ہے اور کپڑے دھونے میں جان نکلتی ۔ یہ تیرا
یہ کپڑے دھوئے ہیں ۔ کیوں رے موئے ۔ کیڑے پڑیں
تیری قبر میں ... گاہک بھی چن کر ایسے لاتا ہے جیسے
پیدائش سے انگی کا منہ تک نہیں دیکھا ہو ۔ ؟
اماں کے پاس لے جاتے میں شرم آتی ہے جو میرے پاس
لے آتا ہے ،
بائی اماں کا چہرہ غصے سے لال ہو جاتا ۔
کیوں رے بدری ــــ میں اتنا بولے جا رہی ہوں
ہوش بھی ہے یا نہیں ــــ
بدری ماما ویسے ہی گم صم کپڑے پیٹ رہے ہیں
وہ کسی کونے سے یہ پورا تماشہ دیکھ رہی ہو
اور وہی خوف ــــ

[illegible]

والا — خوف —

بڑی ماما چپ کیوں رہتے ہیں ؟

آخر — بائی اماں کی اتنی ساری گالیاں

کیسے پچا لیتے ہیں ؟

اور —

نواب صاحب ان کے یہاں روز روز کیوں آتے

ہیں —

اور —

بڑی ماما عجیب عجیب چہروں والے مرد کیوں لاتے

ہیں ؟

ان مردوں سے بائی اماں کا کیا رشتہ ہے ؟

اور —

الگنی پر ٹنگے بائی اماں کے گندے میلے کپڑے —

سوال سنڈاس کے پلوؤں کی طرح اسے گھیر کر

کھڑے ہو جاتے — کبھی نہ ختم ہونے والے سوال۔

ایک قطار سے کھڑے سوال سب — کبھی نہ ختم ہونے

والی قطار — یہ قطار بہت دور تک جاتی تھی — اتنی دور

— جہاں تصور کے اینڈھن کی ٹرین اسے جانے سے

روکتی تھی — تب آج کی طرح پاخانے نہیں بنے تھے —

موزیک — فلیش والے — چم چماتے — خوشبودار

— مہکتے —

تب — وہاں جانے کے تصور سے بھی وہ پناہ

مانگتی —

اسے گھن آتی —

جھنجھلانے لگتا — کھلا سنڈاس — پتھر کے

دو بڑے ٹکڑوں کے بیچ کافی چوڑا کھلا منہ — نیچے جہاں

ہوتا پاگخانہ — وہ اکڑوں بیٹھی ہوتی — کن انکھیوں

سے دیکھتی — پاخانے پر ڈھیر سارے پلو رینگ رہے ہوتے

ڈھیر ساری مکھیاں ہوتیں — جو ان پر بھن بھن کر

رہی ہوتیں —

تبھی .....

اسے اُبکائی محسوس ہوتی —

تیز تعفن —

بائی اماں نے نواب صاحب سے کتنی ہی بار کہا۔

کم از کم پاخانہ تو پکا کروا دیجئے نواب صاحب۔

بدلے میں نواب صاحب ایک جھوٹی تسلی اچھال

جاتے — "فکر کیوں کرتی ہو گوہر بائی — اس بار

آیا تو آدمی ساتھ لاؤں گا — ہو جائے گا"

سنڈاس — اور پاخانے پر رینگتے ڈھیر

سے پلو —

اٹھتی ہوئی تیز بدبو —

وہ ناک بند کرتی پھر سوچتی —

بڑی ماما بائی اماں کے لئے عجیب عجیب چہروں

والے مرد کیوں لاتے ہیں ؟

(انجو کو ایک بار پھر خوف محسوس ہوا —

کہیں دور آسمان میں ایک تارا ٹوٹا — اور ایک لکیر

سی بنتی چلی گئی — وہ اٹھ کر بالکنی پر آگئی —

میٹروپلیٹن شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی کئی

کئی منزلہ عمارتیں اور یہ بھوت بنگلہ —

جہاں وہ اکیلی رہتی ہے — اس بیچ اس نے

کتنے ہی [illegible] لوں، جادو ٹونا، اور واقعات [illegible]

کیسے جنگل سے گزری ــ

اکبار تو ــ اتر پردیش کے کسی گاؤں سے بھاگ
کر آئی ہوئی رسوتی بھی کچھ دن تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ پھر
ایک اکاؤنٹ کلرک سے دوستی۔ پھر شادی کر کے اسی کے ساتھ چلی گئی۔
رسوتی ہو یا شاہانہ۔ اس نے کتنے چہرے دیکھے ہیں۔ زندگی کے کتنے رنگ۔

اور یہ بھوت جنگل ــ تنہائی کا جان لیوا احساس۔

اکیلی لڑکی اور زمانے بھر کی گھورتی نگاہیں ــ

آہستہ آہستہ وہ اس اکیلے پن کی عادی ہوتی
چلی گئی ــ شروع شروع میں اس نے کوشش کی تھی کہ کسی
گرلس ہوسٹل میں کوئی جگہ مل جائے ــ لیکن یہاں بھی
سیاست کے داؤ پیچ ایسے تھے کہ اسے کامیابی نہیں
مل سکی ــ

ہاں وہی خوف ــ جب وہ سب کچھ چھوڑ کر
یہاں آگئی تھی، تب بھی یہ خوف اس کے ساتھ تھا۔

اس کے وجود سے دیمک کی طرح چپٹا ــ

بالکنی اور آسمان ــ پتہ نہیں، کتنی دیر تک
وہ اندھیرے کی آسمانی چادر کو گھورتی رہی ــ سب کچھ
حسب معمول رہتا تو شاید اس کی ضرورت نہیں پڑتی ــ
لیکن . . . . .

بالکنی سے نظر آنے والی کئی کئی منزلہ عمارتیں
بھی خوف کا احساس پیدا کر رہی تھی ــ

جیسے آدم قد بھوت ہوائیں لہرا لہرا رہے ہوں۔۔
اُسے نوچ رہے ہوں ــ
اُسے کشتی کر رہے ہوں ــ

اس نے لمبا سانس لیا ــ

شاید وقت بدلا تھا [illegible]

وقت کے ساتھ چہرے بدلے تھے
نظریے بدلے تھے ــ آدمی بدلے تھے۔
یہاں بھی وہی ــ لیکن آج کیا ہوا تھا؟
کوئی غیر معمولی واقعہ ــ؟ کیا ہوا تھا ــ بس
اتنا ــ؟

اس کا من کراہیت سے بھر گیا ــ

یہ کون سی صدی ہے انجو؟

یہ ملک اب کیا ہو گیا ہے؟ یہ آدمی آدمی
میں اُسے راکھشس کیوں نظر آنے لگے ہیں ــ
اس نے تو کتابوں میں غلامی سے لڑنے والے مجاہدوں کی
کہانیاں پڑھی تھیں ــ آپس کی دوستی کی، محبت
کی، بھائی چارگی کی؟

وہ سب کتابوں کا جھوٹ نہیں تھا تو یہ کیا
تھا ــ؟

جو آج ہوا۔

اور جو مستقل، ایک مدت سے وہ دیکھ رہی
ہے ــ بدلی ہوئی ہوا کو ــ بدلی بدلی آنکھوں کو،
بدلتے، بدلتے نظریے کو، اور ملک کے نقشے پر کسی
سادھو کی طرح دھونی رما کر جم جانے والے ایک ہی
موسم کو ــ خونی موسم کو ــ

مگر ــ آج کیا ہوا تھا انجو؟
تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟
تنہائی سے؟ اکیلے پن سے؟ یا . . . .

نہیں ــ اسے یاد آیا ــ آج بھی وہ ذرا
دیر سے گھر لوٹی تھی ــ لوٹتے وقت اچانک ہی اس نے
ان خونخوار چہروں کو دیکھا تھا ــ ہاتھوں میں مشعل
لئے ــ اندھیرے میں [illegible] نعرے لگاتے لوگوں کو ــ

بھیڑ کی شکل میں ___ وہ اپنے خونخوار نظر آئے کہ وہ
خوف سے بھر گئی۔ اور ایک طرف کنارے کھڑی ہو گئی
جلوس کچھ زیادہ ہی لمبا تھا۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں
تھی۔ ہلکا اندھیرا شہر کے آسمان پر پھیل چکا تھا۔
اور اسے فضا میں چاروں طرف معلق جلتی ہوئی مشعلیں
دکھ رہی تھیں۔

خونخوار نعرے اور تیز تیز بڑھتے قدم....

اسے محسوس ہوا، اگر یہ سچائی جان گئے تو...

تو.....؟

اچانک یہ ساری مشعلیں اس کے جسم میں پیوست
ہو جائیں گی۔ ایک ساتھ یہ سارے مل کر اس پر حملہ کر
دیں گے...

اس کا سارا بدن پسینے میں نہا گیا ___ اس نے
پھر خوف سے ہاتھ میں مشعل اٹھائے ان خونخوار چہروں
کو دیکھا جو نعرے لگاتے آگے بڑھ رہے تھے...

جس ہندو کا خون نہ کھولا
خون نہیں وہ پانی ہے
جنم بھومی کے کام نہ آئے
وہ بیکار جوانی ہے

مشعلیں دھیرے دھیرے اندھیرے میں کھوتی
چلی گئیں ___ سناٹے میں صرف وہ رہ گئی ___
اور خوف سے کانپتا اس کا جسم ___
مشعلیں آگے بڑھ گئیں ___
آگے ___ بہت آگے ___

وہ بالکنی پر تنہا رہ گئی ہے ___ رات ڈوبنے
لگی ہے۔ کتوں کے شور تھم گئے ہیں ___

وہ بھیڑیے کہیں نہیں ہیں ___
وہ بھیڑیے اب اسے کہیں نظر نہیں آر
ہے ___
وہ بھیڑیے ___ جن کی وجہ سے ا
نے خود کو اندھیرے کی چادر میں چھپا لیا ہے۔
وہ کون ہے؟
سناٹے میں سینے کی اتھل پتھل سانسوں نے گ
پیدا کی ___
وہ کون ہے؟
ہاں ___ وہ کون ہے......؟
وہ؟
اسے محسوس ہوا، وہ سچ بولنے لگی تو ا
چونک جائیں گے۔
اندھیرے میں ___ اس کے کانوں میں باقی اما
گھنگھروؤں کی آواز اب ___ تک سنائی دے
تھی ___

(جاری آئیگا)

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے دو جلد کتابوں کا آنا لازمی

نام کتاب :- غبارِ فکر
شاعر :- گوہر شیخپوروی = صفحات :- ۱۰۴
سن اشاعت :- جولائی ۹۱ء = قیمت :- ۴۰ روپے
پتہ :- ۲۸/۳۸ تیلیا باغ، بنارس ۲

"غبار فکر" گوہر شیخپوروی کی ۶۲ غزلوں کا مجموعہ ہے جو دلکش غازیپوری کے تعارف اور ذکی تاثاگلوی کے پیش لفظ کے ساتھ آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے جس میں معروف شخصیتا جناب پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر کلیم سہسرامی، پروفیسر عنوان چشتی، ناوک حمزہ پوری، ظہیر غازیپوری، فرحت قادری اور ڈاکٹر کمال الدین کی گراں قدر آرا شامل ہیں۔

جناب گوہر کا نام ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں۔ غزل گوئی موصوف کا خاص میدان ہے گرچہ موصوف نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ گوہر کے شعری سفر کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوا اور جولائی ۱۹۵۰ء سے رسائل میں اور اخبارات میں چھپنے کا سلسلہ شروع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔ گوہر کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۹ء میں "حصار فکر" شائع ہوا۔ "غبار فکر" موصوف کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔

گوہر نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات سے اردو شاعری کو اک منفرد رنگ و آہنگ برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی اور اس کا شعور بکھرا ہوا ہے۔ ان کے کلام میں غضب کی شگفتگی، گہرائی اور وسعت پائی جاتی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

دیکھو! امیر شہر کی میت ہے بے کفن
کون اس پہ اپنے اشکوں کی چادر چڑھائے گا

ہم نے جانا کس قدر سستی ہے اپنی زندگی
کھیت میں بوئے ہوئے جب آدمی کے سر ملے

کیا حادثہ گزرا ہے مرے شہر میں لوگو!
سنجیدہ ہے بچوں کا قبیلہ کئی دن سے

تمہیں سمجھ کے مسیحا کیا تھا درد بیاں
امید یہ نہ تھی بے موت مارے جاؤ گے

یہ کس سے کہے مفلس و نادار کی ممتا
بھوکا ہے مری گود کا پالا کئی دن سے

"غبار فکر" فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے عمدہ کاغذ، اچھی کتابت و طباعت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ چھپا ہے جو نہایت ہی پرکشش ہے علاوہ ازیں یہ خریدنے اور پڑھنے کے لائق بھی۔

اے۔ کریمی

شہرِ خیال

○ کل نئے سال کی آمد پر آپ کو، اہل خانہ کو اور ادارۂ سہیل کو مبارک کا پیغام لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا تھا مگر تبھی سرسوتی نے آگھیرا اور آپ کو خط لکھنا آج شام اس وقت یاد آیا جب آپ کا نئے سال کا کارڈ ملا۔ نیا سال آپ سب کو بھی مبارک ہو اور دعا گو ہوں کہ اللہ آپ حضرات کی سب مرادیں پوری کرے۔

آپ کا گذشتہ خط وقت پر مل گیا تھا اور سہیل کا تازہ شمارہ بھی۔ سہیل صرف ایک ادبی رسالہ نہیں بلکہ گذشتہ نصف صدی سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام بنائے ہوئے ہے اور ہمارے بعد بھی رہے گا۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کو بھی سہیل نے اپنے تاریخ ساز رول میں اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ لیکن اردو ادب کا مزاج بڑا ناشکرا ہے۔ اس نے اپنے سچے خادموں کو ہمیشہ تکلیف ہی دی ہے وہ خواہ ادب کی اشاعت کا کام انجام دے رہے ہوں خواہ اچھا ادب تخلیق کر رہے ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے صرف اقبال ایسے شاعر ہیں جنھیں اپنی شعری اور ادبی خدمات کا صلہ جیتے جی ہی نہیں بعد فنا بھی ملا اور مل رہا ہے۔ لیکن وجہ ادب سے زیادہ سیاسی ہے۔ مسلم لیگ کو بھی اقبال کی ضرورت تھی، مہاتما گاندھی کو بھی اور انگریز حکمرانوں [illegible]

واقعی اقبال مند تھے۔ ورنہ ان کی عظمت کے قافلوں پ بہت سے ایسے ہیں جو اقبال کی شعری عظمت کے متعلق ک پوچھے جانے پر خود سوالی سے جناب حقانی القاسمی کی طر شاعرانہ عظمت کے معیار کا نسخہ پوچھنے لگتے ہیں۔ بس یہ کہتے بنتی ہے کہ

حیرتؔ سوال کرنے سے پہلے یہ سوچ لو
ممکن ہے کیا جواب کسی لاجواب سے

مگر موضوع گفتگو اقبال نہیں بلکہ اردو کے ایک ادبی رسا کی اشاعت جاری رکھنا تھا۔ اردو کے ادبی رسالوں اشاعت ہمیشہ گھاٹے کا سودا رہی ہے۔ میں نے مرحو نیاز فتحپوری جیسے کج کلاہ کو اشتہارات کے لئے سرکاری حکام کے سامنے جھکتے اور ایسے خام ادیبوںؒ کی تنگارشا کو بھی نگار کی زینت بنتے ہوئے دیکھا ہے جن کا اعنوا نام بھی پڑھنا گوارا نہیں کیا۔ مجھے آپ کی پریشانی کا خود احساس ہے اور اگر بس میں ہوتا تو بغیر آپ کے کہے کی کچھ خدمت کرتا مگر قسمت میں یہی تھا کہ صرف قلمی خدم کر سکوں، اور اب ذہن اس قدر خراب رہتا ہے کہ اس حقیر تعاون کا ذمہ لیتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے

ہاں ایک بات بہت دنوں سے کھٹک رہی سہیل کی مجلس مشاورت میں کچھ ایسے حضرات کا نام بھ ہے جو سہیل سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ کیا ایسے حضرا کا نام دینا ضروری ہے۔

▲ بلراج حیرتؔ ۔ دہلی

○ اس شمارے سے سہیل بدلا بدلا سا نظر آیا۔ یہ نئی تبدیلی، بہت بہت مبارک ہو۔ دعا گو ہوں کہ اس [illegible] زیادہ [illegible] پاکستان کے

...کو سفر نامہ لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے
...ما ہے وہ سفر بھی اس لئے کرتے ہیں کہ سفر نامہ
...۔ لیکن جو سفر نامے پاکستانی ادیبوں کے میں
...، وہ مجھے اس لئے پسند نہیں آئے کہ وہ یا تو سفر
...لے احباب کے عقیدے ہوتے تھے یا پھر ادھر
...باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ جغرافیائی نقطۂ نظر کا تو
...فقدان ہوتا تھا — اور جزئیات پر بھی نگاہ کم
...تھی — علیم اللہ حالی صاحب کی نثر کی سب
...خوبی مجھے ان کے نثر کی سادگی اور شگفتگی معلوم
...نیز یہ کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی قلم زد کرنا
...لتے — بھائی، سچ پوچھئے۔ مجھے تو مزہ آ رہا
...۔ ہاں ایک بات کہنا چاہوں گا — اگر یہ سفر
...ے کی فسطین) وہاں کے حالات، پاکستان کے
...وز، وہاں عوام کی پسند نا پسند، شوق عادتیں
...ے ہو کر عالمی مسائل پر بھی غور و فکر کرتے ہوئے
...یں تو یہ سفر نامہ ادب میں کام کی چیز بن جائے

اب میں شمارہ کی دوسری اہم تخلیق یعنی ارشد کی نظموں
...ہوں۔ ارشد حسین وقت بہار کے "صدائے عام"
...پوں میں چھپ رہے تھے، مجھے ان سے کافی امید
...ی۔ لیکن ان کے ادھر اُدھر کے دو مضمون پڑھنے
...یا لگا کہ ارشد صاحب چینی ادب سے کچھ
...متاثر ہیں کہ دوستو فسکی، کافیڈے، وکٹر ہیوگو،
...ر لگانا بھی پسند نہیں کرتے۔ جس چینی ادیب کو
...ے بڑا ادیب (لوشون) ماننے کو تیار ہیں
...یا ہے لیکن سکیم گورکی تک پہنچنے میں بھی اسے
...خیر — یہ بہت لمبی بحث ہو جائے گی۔ یہاں

ان زیریں لہروں کی باتیں کروں گا جن کو وہ نظمیں کہنے سے گریز کر رہے ہیں۔ یہ نظمیں تو ہیں — لیکن لفظ زیادہ ہو اور احساس بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے ہیں sea amad ہیں۔ جذبات اور احساس مویشی کی طرح ہیں۔ جنہیں چراگاہ میں کر کے کھلا چھوڑ دیں تو وہ من مانی کرتے ہوئے ہرے بھرے باغ کو روند ڈالتے ہیں — ارشد نے ان ساری نظموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا ہے۔ وہ نقطۂ فکریہ نہیں لیتے — نہ ہی فکر کو سمیٹ پانے کی کوشش ان کے یہاں دیکھی — ہاں وہ ان احساسات کی زلف سنوار لیں تو اردو زبان کو مدت کے بعد ایک اچھا نظم نگار شاعر مل سکتا ہے۔

عطا عابدی کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نگار کی تخلیقات کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے۔ ابھی اردو میں ہر ماہ پابندی سے نکلنے والے پرچے بہت کم ہیں۔ سہیل ایک ایسا رسالہ بننے کی طاقت رکھتا ہے کہ اسے پابندی سے پڑھا جائے۔ اور انتظار کیا جائے —

▲ مشرف عالم ذوقی ، دہلی

○ میرے شاگرد علامہ رضی بدایونی کبھی کبھی دلی سے کئی کئی سہیل کے پرچے بھیج دیا کرتے تھے اس کے نثر کار میں چند نثری قلمکار بہت اچھے ہیں۔ حصہ نظم بھی غنیمت کی حدوں سے کبھی آگے بڑھ جاتا ہے۔

بہرحال سہیل عصر حاضر کی تازہ اڑانوں کا ایک اچھا نمائندہ ضرور ہے۔

فیروز نظامی ، لکھنؤ

○ آج تقویم عیسوی کے حساب سے سال کی آخری

تاریخ ہے۔ کل کے نکلنے والے سورج کی کرنیں نئے سال کے موقع پر اپنی نرم جپکیوں سے قبائے لیل و نہار کی گرہیں بھی کھول جائیں۔ آمین ثم آمین

▲ قیوم خضر، پٹنہ

○ سال نو مبارک ہو۔
سہیل مسلسل موصول ہو رہا ہے۔ اس دور انحطاط میں آپ اردو ادب کی جو بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں وہ قابل صد ستائش ہے۔ خدائے برتر و بزرگ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے۔ آمین
یہ گوشہ گیر فقیر کبر انسانی میں یقین نہیں رکھتا۔ کسی کے علم و عمل میں غلطیاں نکالنا اور ان کو اچھالنا سمجھداری نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کس نے کیا کہا ہے اور کیسے کہا ہے۔ کوئی ادیب یا فن کار فرشتہ تو ہوتا نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق "کلام اللہ" ہوتی ہے جو اغلاط سے مبّرا ہو۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ ہر ادیب کو ایک اچھا انسان ہونا بہت ضروری امر ہے۔ اس کا عین منشا ہوتا ہے سب کی بھلائی اور بھولے بھٹکوں کو راہ پر لانا۔ وہ ایک طرح کا پیغامبر ہوتا ہے اس لئے اس کی آواز اور کردار پیغمبرانہ ہونا چاہیئے جس کے کلام میں انسانیت کی بو نہیں ہوتی ہے وہ تضیع اوقات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ افسوس کہ اس دور میں اصحاب جوہر کا فقدان ہے۔

ہر فنکار اور ادیب ایک حساس دل رکھتا ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ ظلم و تشدد، بے ایمانی اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کرے نہ کہ پریم چند اور اقبال کو فرقہ پرست ٹھہرانے میں مصروف رہے۔
کہانی آپ کو مل گئی اچھا ہوا۔ شاید ہر تخلیق بالاستعاب مطالعہ فرمانے کے بعد ہی شائع کی جاتی ہوگی؟ غیر معیاری ہو تو واپس بھیج دیجئے گا۔ گھٹیا قسم کی چیز منظر عام پر نہیں آنا چاہئے۔ میں آپ کے تاثرات کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں —

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

اراکین "سہیل" کو سلام عرض کرتا ہوں۔ فی امان اللہ

▲ ارمان بلاروی، بلاری

○ آپ کا ارسال کردہ "سہیل" کا تازہ شمارہ ملا۔ مضامین اور شعری حصے بے حد پسند آئے۔ جناب ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، اصغر علی انجینیر اور علیم اللہ حالی کے مضامین فکر و فن کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ کا "اداریہ" سچائی پر مبنی ہے۔ اردو اکاڈمی بہار اور وزیر اعلیٰ لالو پرشاد کو آپ نے بہت درست مبارکباد پیش کیا ہے۔ صدیق مجیبی اور شاہد احمد شعیب صاحب کو وائس چیرمین منتخب کر کے اکاڈمی نے انصاف پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاہد احمد شعیب آپ کی مجلس ادارت میں شامل ہیں اس لئے ان کا انتخاب واقعی مسرت کی بات ہے۔ میں بھی ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

▲ کمال جعفری، نئی دہلی

○ "سہیل" میں نئے شعراء کے تعارف کا سلسلہ اچھا ہے لیکن اس کے لئے بہت Choosy ہونے کی ضرورت ہے ورنہ اس کی افادیت جاتی رہے گی۔ ویسے اپنے مقصد کے تئیں آپ کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے جیسے Daring لوگ اگر دوسرے رسالوں میں بھی ہوتے تو

... ہمارے ادب کی صورتحال اتنی دگرگوں نہ ہوتی۔ آج ... رسالے کو بھی اٹھا کر دیکھئے چند سکۂ رائج الوقت قسم ... اموں کی بھرمار ہوتی ہے اور ایسے لوگوں نے ہی ہر شعبہ ... اور بجنل اور ذہین لکھنے والوں کا حق مار رکھا ہے۔ حیرت ... ات یہ ہے کہ ہمارے مدیر حضرات بھی اب تک انہیں کے ... نوں کھیلتے رہے ہیں۔

▲ نعمان شوق، آرہ (بہار)

○ ایک عرصہ سے سہیل گیا' کا مطالعہ کر رہا ہوں ... ر ہر بار اس کی شائع کردہ تخلیقات میرے ادبی شوق ... ق کی تسکین کرتی رہی ہیں۔ شمارہ نمبر ۹ کافی انتظار کے بعد ... ۔ یوں تو تقریباً سبھی تخلیقات قابل قبول تھیں لیکن ... سانہ "آدھے دھڑ کا آدمی" بے حد پسند آیا۔ جناب ... شاد کریمی کا اسلوب نگارش بالکل ہی انوکھا اور ... ش ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی فنکاری کے ساتھ الفاظ ... ہانی کی شکل دی ہے۔ شاید یہی خاصیت قاری کو ... انی پڑھنے کے لئے بار بار مجبور کرتی ہے۔ ان کے اس ... انی کے بعض جملے تو دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ ایک ... دیکھئے ـــ "میں نے اب تک زندگی میں کیا ہی کیا ... ؛ اتنا بھی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ کہانیاں میں ... کھتا ہوں یا ـــــ ! میرے چاہنے والوں کا خیال ہے ... ہانیاں میں نہیں لکھتا بلکہ کہانیاں خود کو مجھ سے لکھواتی ... ہیں ـ" آگے چل کر ایک چبھتی ہوئی حقیقت کو یوں ... اگر کیا ہے ـ "میں تو واپس لوٹنے لگتا ہوں۔ جیب خالی ... تو کہیں رکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تخلیق کار زندگی ... یہ رخ پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے ـــ ... وں میں رام پرکاش راہی کی غزل خاص طور سے پسند

آئی۔ جناب اصغر علی انجینیر صاحب کا تحقیقی مضمون "مشرق و مغرب کی تہذیبیں" ہماری جانکاری میں اضافہ کرتا ہے۔

▲ وصال احمد خاں، دربھنگہ

○ بڑی مدت کے بعد آج میری نظر "ماہنامہ سہیل" پر پڑی۔ یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ "سہیل" آج بھی اتنا ہی معیاری ہے۔ "سہیل" کا وہ شمارہ جو اب دستاویزی حیثیت رکھتا ہے یعنی "جمیل مظہری نمبر" اور "سہیل عظیم آبادی نمبر" آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ویسے تو کتنے ہی نمبر شائع ہوئے ہوں گے۔

آپ تمام حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس گرانی کے دور میں بھی کم قیمت پر اتنا معیاری رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ یہ آپ حضرات ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ہمارے شہر میں بھی اس کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

▲ ارشد حسین ارشد، ڈالٹین گنج

سہیل گیا کی ایک اور تحریری پیشکش

ایک شمارہ رضا اشک کے نام

بہت جلد منظر عام پر

تحریر خوشخط اور مسودہ صاف ارسال کریں

(ادارہ)

ماہنامہ سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا "خوراک" جوگندر پال نے لکھا ہے۔ مجھے اس قدر متاثر کیا کہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ جوگندر پال کو کہانی کہنے کا اپنا اچھوتا انداز ہے۔ مرحوم شعیب احمد کاف کا جنٹلمین جو مسلسل کہانی کا ترجمہ ہے۔ آج کل کی طرز سفر اور ماحول کی سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے۔ تبصرے بہت جاندار ہونے لگے ہیں خدا کرے اس کی یہ انفرادیت برقرار رہے۔ جناب علیم صبا نویدی، ضیا انجم، قتیم سہسرامی، شباب للت کی غزلیں بطور خاص پسند آئیں۔

جناب عبد القوی دسنوی سکریٹری۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال کا مراسلہ پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ خدا ان کو اردو کی خدمت کرنے کا عزم پیدا کرے — آمین — ویسے ان دس برسوں میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اردو کی ترقی کے لئے کچھ بھی نہیں کیا — اردو کا عام قارئین سے زیادہ اردو اکادمی پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اردو کی ترقی کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھائے۔ ایسا نہیں کہ اپنے اور اپنے ہمنواؤں کی شکم پروری کرے۔ دیکھئے آئندہ کیا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی صرف بھوپال اندور، جبل پور میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اس کو باہر نکالنے میں جناب عبد القوی دسنوی صاحب کامیاب ہو سکتے ہیں؟ یا نہیں !!

▲ اظہر نیّر (بھلائی نگر)

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی لمنودیری پیاری لگی۔ بہت صحیح عکاسی [illegible] ہے۔ خدا کرے اسی طرح شہ رگ پر انگلی رکھتے رہیں۔ زمانہ چاہے کچھ بھی کہے۔

جوگندر پال کی کہانی "خوراک" نے دل کو چھو لیا۔ بالکل اچھوتی کہانی ہے جو پوری طرح اپنا سچائی پر خود شرمندہ ہے تاہم کہانی موضوع کے اعتبار سے پرانی ہو چکی یا یوں کہئے کہ ہم حبس کے عادی ہو چکے ہیں شاید اب تک ساؤتھ والے اس چاشنی سے آشنا تھے۔ وہ کچھ دنوں میں عادی ہو جائیں گے جس طرح ہم لوگ بے حس ہو گئے ہیں۔

▲ سہیل جامعی (دربھنگہ)

جناب اصغر علی انجینیئر سے ذاتی طور سے واقفیت ہے۔ ان کی تقریر اور وسعت مطالعہ اور شگفتہ تحریر کا مداح رہا اس بار بھی مشرق و مغرب کی تہذیبی اور سیاسی آمیزش آویزش۔

اس مقالہ کو اگر دستاویزی حیثیت دیدی جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

رام پرکاش راہی پر تارا چرن رستوگی صاحب کا تعارف انفرادی ہوتے بھی اجتماعی بن گیا ہے اور لائق مطالعہ بھی۔

▲ عبد المتین نیاز (بھوپال)

سہیل کا تازہ شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ سبھی شمارے پابندی کے ساتھ برابر موصول ہوتے ہیں۔ اردو دشمنی کے دور میں ایسا معیاری پرچہ نکالنا واقعی کسی معرکے سے کم نہیں۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں

تازہ شمارے میں کرم فرما استاد محترم جناب فرحت [illegible] صاحب کی غزل شائع فرمانے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

▲ اسلم طارق

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی

بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

فہرست

شمارہ ۲ جلد ۵

بدل اشتراک

فی شمارہ ---- ۵/= روپے
زر سالانہ ---- ۵۰/= روپے
لائف ممبری ---- ۱۵۰۰/= روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل
ریور سائڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر :- ۲۱۵۰۳

نمود

آنے والا ہندوستان

ہندوستان کا نظریہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔

اندر اندر اقتصادی طور پر کھوکھلا ہوتا ہوا ہندوستان کس سمت جائے گا اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے مگر آثار و قرائن کہتے ہیں کہ اب اقتصادیات ہی اس کی تمام تر سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں محرک ہوگی۔ ملک کا معاشی بحران داخلی صنعتوں کو متاثر کرے گا۔ دنیا کی بڑی اور اقتصادی طور پر ترقی یافتہ نیز صنعتی طور پر عظیم طاقتیں ہندوستان کی صنعتوں میں ہی نہیں دوسرے مسائل میں بھی دلچسپی لینے لگیں گی۔ اندرون ملک پیداواری طاقتوں کو غیر ملکی مالیات سے آگے بڑھانے کے معنی یہ ہوئے ہیں کہ قیمتوں کی سطح متعین کرنے سے ہم معذور ہو جائیں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ کاری اور محنت میں کشاکش کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔ اور ایک بار پھر اقتصادی طبقہ واری جدل سامنے آنے والا ہے۔ اس لئے کہ اس ملک کے محنت کش بھی وہی ہیں جو صارف ہیں۔

لہٰذا اقتصادیات کے راستے سے ہمارے ملک میں آئندہ دس برسوں کے اندر اندر جو انقلابات رونما ہوں گے ان سے ہمیں باخبر ہو جانا چاہئے۔ اس طوفان میں بڑی سیاسی طاقتوں بالخصوص امریکہ کے استحصالی منصوبہ کے پنپنے کا بھی اندیشہ ہے۔ طوفان آنے سے پہلے ہی ہمیں اپنے تحفظ کا انتظام کرنا ہے۔ اور کمزور ہوتے ہوئے ملک کے عوام کو اپنی اجتماعی قوت کو مضبوط کرنا ہے۔

(ادارہ)

اصغر علی انجینیئر

(قسط دوم)

پریم چند حیات اور فن

جیسا کہ پہلے بتایا گیا پریم چند اپنی تنہائی کی اذیت ناکیوں سے بھاگ کر طلسم ہوشربا کی داستانوں میں پناہ لیتے تھے۔ ان داستانوں نے لکھنے کی صلاحیت کو مہمیز لگائی۔ ان کے لکھنے کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کی کہانی ان ہی کی زبانی سنئے — "اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال رہی ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی والے اس وقت کے ہردلعزیز ناول نگار تھے ان کی کتابیں جہاں کہیں مل جاتی تھیں اسکول کی یاد بھول جاتی تھی اور کتاب ختم کرکے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانے میں رینالڈ کے ناولوں کی بھی دھوم تھی اردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔"

• اسی زمانے میں میرے ایک رشتے کے ماموں کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے۔ ادھیڑ ہوگئے تھے اور ابھی تک کنوارے تھے۔ رشتے داریوں میں گھومتے تھے اور سب سے یہی امید رکھتے تھے کہ کوئی ان کا بیاہ کرا دے۔ اس کے لئے سو دو سو بھی خرچ کرنے کو تیار تھے۔ ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی، تعجب ہے۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے آدمی تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں، اوسط قد، سانولا رنگ .... آخر ایک بار انہوں نے وہی کیا جو بن بیاہے لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ ایک چمارن کی ترچھی نظر کے گھائل ہوگئے۔ وہ ان کے یہاں گوبر پاتھنے، بیلوں کو سانی پانی دینے کے لئے اور اسی طرح کے دوسرے چھٹ پٹ کاموں کے لئے نوکر تھی۔ جوان تھی چھبیلی تھی، ماموں صاحب کا پیاسا دل میٹھے پانی کی دھار دیکھتے ہی پھسل پڑا۔ باتوں باتوں میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ ان کے من کا بھاؤ تاڑ گئی۔ ایسی الھڑ نہ تھی اور نخرے کرنے لگی۔ بالوں میں تیل بھی پڑنے لگا۔ چاہے سرسوں کا ہی کیوں نہ ہو۔ آنکھوں میں کاجل بھی چمکا۔ ہونٹوں پہ مستی بھی آئی اور کام میں ڈھیل بھی شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ

یہاں تک بڑھا کہ وہ چمارن ہی گھر کی مالکن بن گئی۔"
"ایک دن شام کے وقت چماروں نے آپس میں پنچایت کی۔ بڑے آدمی ہیں تو ہوا کریں۔ کیا کسی کی عزت لیں گے۔۔۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ لالہ صاحب کو ایسا سبق دینا چاہئے کہ ہمیشہ کے لئے یاد رہے۔ عزت کا بدلہ خون سے ہی چکتا ہے۔ لیکن مرمت سے بھی اس کی کمی پوری ہو ہی سکتی ہے۔ دوسرے دن شام کو جب چمپا ماموں کے گھر آئی تو انہوں نے اندر کا دروازہ بند کرا لیا۔۔۔ ادھر چماروں کا جتھا تاک میں تھا ہی، ادھر کواڑ بند ہوئے ادھر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔۔۔۔۔ کواڑ توڑے گئے۔ ماموں صاحب بھوسے کی کوٹھری میں چھپے ہوئے ملے۔۔۔ ماموں صاحب بھاگ کر کہاں جاتے۔۔۔ مار پڑنے لگی اور بے بھاؤ کی پڑی۔۔۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے۔ اس واردات کی خبر اڑتے اڑتے ہمارے یہاں بھی پہنچی۔ میں نے اس کا خوب مزا لیا۔ اگر انہوں نے کچھ عاجزی ظاہر کی ہوتی تو شاید ان سے ہمدردی ہو جاتی لیکن ان کے وہی دم خم تھے، مجھے کھیلتے یا ناول پڑھتے دیکھ کر بگڑنا یا رعب جمانا اور پتا جی سے شکایت کی دھمکی دینا۔ یہ اب میں کیوں سہنے لگا تھا۔"

"آخر میں نے یہ ساری واردات ایک ناٹک کی شکل میں لکھ ڈالی اور اپنے دوستوں کو سنائی۔ سب کے سب خوب ہنسے۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے اسے صاف کر کے اپنے ماموں صاحب کے سرہانے رکھ دی اور اسکول چلا گیا۔" ماموں صاحب نے ظاہر ہے ان کی یہ تصنیف ضائع کر دی اس لئے ان کے لکھے ہوئے پہلے ڈرامے کے متعلق ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہر حال اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ۱۱ سال کے اس لڑکے میں لکھنے کی طرف رغبت پیدا ہو چکی تھی اور ہمیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بچے بڑوں کے بیجا رعب جمانے کا بدلہ کس طرح لیا کرتے ہیں

پریم چند کو گلی ڈنڈا کھیلنے میں بھی خوب مزا آتا اور رام لیلا کے کھیل میں بھی انہیں کتنا مزہ آتا تھا انہیں کی زبانی سنئے۔ دیکھئے کیسے مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ "ادھر ایک عرصے سے رام لیلا دیکھنے نہیں گیا تھا۔ بندروں کے بھدے چہرے لگائے، آدھی ٹانگوں کا پاجامہ اور کالے رنگ کا اونچا کرتا پہنے آدمیوں کو دوڑتے، ہو ہو کرتے دیکھ کر اب ہنسی آتی ہے۔ لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے بھی رام لیلا میں مزہ آتا تھا۔ مزہ تو بڑا ہلکا لفظ ہے اسے جوش کہنا چاہئے۔ خوش قسمتی سے میرے گھر سے بہت نزدیک ہی رام لیلا کا میدان تھا اور اس گھر میں لیلا پاتروں کا روپ و رنگ بھرا جاتا تھا وہ تو میرے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔ دو بجے دن سے پاتروں کی سجاوٹ ہونے لگتی تھی۔۔۔ رنگ کی پیالیوں میں پانی لانا، رام رج پیسنا، پنکھا جھلنا میرا کام تھا۔

پریم چند کو رام لیلا کے ہیرو رام چندر جی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ انہیں سچ مچ رام چندر ہی سمجھ کر آدر کرتے۔ کہتے ہیں: "لیکن میری عقیدت ابھی تک جوں کی توں تھی۔ میری نظر میں وہ اب بھی رام چندر ہی تھے گھر پر مجھے کھانے کی کوئی چیز ملتی وہ لے کر رام چندر کو دے آتا۔ انہیں کھلانے سے مجھے جو خوشی ہوتی تھی اتنی آپ کھا جانے میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی مٹھائی یا پھل پاتے ہی بے تحاشا چوپال کی اور دوڑتا۔" وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ "ومان (سواری) نکلتا تو اسی پر رام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر مجھے فخر و مسرت کا جو احساس ہوتا وہ اب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی پر بیٹھ کر بھی

نہیں ہوتا ــــ :

(۲)

اس طرح کھلنڈرے پن میں بچپن بیتتا گیا اور یہ سارے واقعات ہمارے مصنف کے دل و دماغ پر اپنا نقش چھوڑ گئے۔ آگے چل کر یہی واقعات ان کی کئی کہانیوں اور ناولوں کے لئے کچا مواد ثابت ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر ہوتے ہوئے دھنپت رائے نویں جماعت میں پہنچ چکے تھے۔ پڑھائی ان کے لئے پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ اپنے گاؤں سے بنارس روزانہ جانا پڑتا۔ باپ سے صرف پانچ روپیہ مہینہ کے ملتے۔ ان دنوں خود اپنی حالت منشی جی نے یوں بیان کی ہے۔

"پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ مہنگائی الگ۔ دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی کاشی کے کوئینس کالج میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا تھا۔ پڑھا کر ۶ بجے چھٹی پاتا۔ وہاں سے میرا گھر دیہات میں پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے سے پہلے گھر سے چلنا پڑتا تھا۔ لیکن وقت پر اسکول نہ پہنچ پاتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ جانے کب سو جاتا۔ پھر بھی ہمت باندھے ہوئے تھا۔ تھے نا کتنے کٹھن دن! اور اس پر ماں باپ شادی کرانے کی فکر میں تھے۔ نویں جماعت کے سالانہ امتحان سے کچھ دن پہلے عجائب لال نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی۔ ویسے بھی پورب میں جلدی بیاہ رچانے کا چلن ہے۔ دھنپت رائے بھی خوش تھے۔ منڈپ کے بانس خود ہی کاٹے۔ یہ شادی عجائب لال کے سوتیلے نانا نے طے کی تھی۔ بستی شہر سے دس میل دور رموا پور سرکاری گاؤں کے ایک چھوٹے موٹے زمیندار کی بیٹی سے رشتہ طے ہوا تھا۔ دلھن کو دیکھنے کا چلن تو تھا نہیں بڑے گھر کی بیٹی تھی اچھی ہی ہوگی۔ دھنپت رائے نے بھی اپنے تخیل میں رنگ بھرے۔ قصے کہانیوں کی شہزادی تصور میں ناچ رہی تھی۔ کوئی مہ جبیں ہوگی سپنوں کی شہزادی۔ شادی ہوئی دلھن کو اونٹ گاڑی پر سوار اپنے گھر لائے۔ دلھن کا گھونگھٹ کیا اٹھا حقیقت عریاں ہوگئی۔ دلھن عمر میں نہ صرف بڑی تھی، کالی بھی تھی۔ صورت گوارا نہ تھی لیکن یہاں تو سیرت نے بھی دھوکا دیا۔ حقیقت نے دل ہلا دینے والا جھٹکا دیا تھا۔

زبان بھی دلہن نے کڑوی کسیلی پائی تھی۔ ساس سے نبھا نہ سکی۔ چاچی بات بات میں بہو کی شکائتیں کرتی۔ دھنپت رائے کی جان تنگ تھی۔ گھر میں یہ جھک جھک اور سارا دن اسکول اور ٹیوشن کی محنت۔ ادھر چند ہی دنوں میں پرانے سنگرہنی کے مرض سے عجائب لال ایسے بستر سے لگے کہ اٹھ نہ سکے۔ آمدنی ایک پیسے کی نہیں اور جو کچھ پونجی تھی بیماری پر خرچ ہوگئی۔ مرتے مرتے وہ اپنے جوان بیٹے کے سر، جس کے پاؤں میں جوتے اور بدن پر ثابت کپڑے بھی نہ تھے اپنی جوان بیوی اور دو بچوں کا بار بھی ڈال گئے۔

نتیجہ یہ کہ ۱۸۹۷ء میں انہیں میٹرک کا امتحان دینا تھا نہ دے سکے۔ اگلے سال بیٹھے تو دوسرے درجے میں پاس ہوئے۔ اور کوئینس کالج میں داخلہ لینا مشکل ہوگیا۔ ویسے بھی فیس معاف کرانے کے لئے اول درجے میں پاس ہونا ضروری تھا۔ اسی سال ہندو کالج کھلا داخلے کا تو یہاں انتظام ہوگیا لیکن سوال فیس کا تھا۔

سفارش بھی ممکن نہ تھی۔ اتنے بڑے شہر میں ایک دیہاتی لڑکے کو کون جانتا تھا۔ کہتے ہیں۔" روز گھر سے چلتا کہ کہیں سے سفارش لاؤں پر بارہ میل کی منزل پار کر شام کو گھر لوٹ آتا۔ کس سے کہوں کوئی اپنا پوچھنے والا نہ تھا۔" اور نواب کو جب اندر نارائن، کالج کے انتظامیہ کمیٹی کے ایک رکن کی سفارش ملی بھی تو قابلیت کے امتحان میں حساب نے بے وفائی کی۔ حساب کے خانے میں غیر اطمینان بخش لکھا کر فیس معاف کرانے سے تو رہے۔" منشی جی آگے کہتے ہیں۔" میں اتنا حواس باختہ تھا کہ پھر پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا گیا۔ حساب ـــیے لئے گوری شنکر کی چوٹی تھی۔ کبھی اس پر نہ چڑھ سکا۔

لیکن اس کے باوجود دھنپت رائے زندگی سے ؍رماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی دھن بھی سوار ھتی۔ حساب کے مضمون پر زور لگانے کی ٹھان لی تاکہ کالج یں داخلہ لے سکیں۔ اس کے لئے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ ؛نہیں دنوں خوش قسمتی سے ایک وکیل صاحب کے ؛ڑکے کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے مہینہ اجرت طے پائی۔ اس میں سے تین روپے گھر والوں کی نذر اور ؛و روپے کے وہ حقدار۔ وکیل صاحب نے اپنے صطبل کے اوپر کچی کوٹھری رہنے کے لئے عنایت کر ؛ی۔ اس میں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا۔ بازار سے ایک ؛انا لیمپ آیا اور شہر میں اسی شان سے زندگی کٹنے لگی۔ ؛س دور کا خاکہ خود پریم چند نے یوں کھینچا ہے۔" گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن ؛ھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا۔ ؛ل وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ کا فسانۂ آزاد ؛ہی دنوں پڑھا۔ چندر کانتا سنتتی بھی پڑھی۔ بنکم بابو کے ترجمے جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔"

ادھر پڑھنے کا شوق ادھر جیبوں کی کنگھالی۔ ادھار لئے بغیر نہ بنی اور ادھار لے کر ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کا کپڑا ادھار لیا کہ تین سال تک چکا نہ سکے۔ زندگی کی محرومیاں اتنی تھیں کہ مہینہ کے آخر میں کچھ روپے (یعنی دو ڈھائی یا تین) ہاتھ آتے تو من حلوائی کی دکان کی طرف کھینچتا اور کچھ آنے خرچ ہو ہی جاتے آخر پورا مہینہ کھچڑی پر گزر ہوتی تھی۔ خواہشوں کو مارنے کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ چکرورتی حساب کی کتاب جوان کو اپنے مستقبل کی کنجی نظر آتی تھی (کالج کا داخلہ جو اس پر منحصر تھا) اور جیسے دو سال تک سینے سے لگائے رکھا۔ آخر اونے پونے بیچنے کی نوبت آ ہی گئی۔ بھلا پیٹ کے دوزخ کے مقابلے میں کب کون جیتا ہے۔

زندگی جہد مسلسل ہے لیکن ہمارے ارادوں کے باوجود یہ جہد ہمیں ایک سیدھی دشا میں نہیں لے جا پاتا کئی رکاوٹیں ہماری دشا کو بدل دیتی ہیں، لیکن انسان ان حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی دشائیں بدل بدل کر سہی، ایک منزل کی طرف بڑھتے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض وقت کچھ عوامل ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہم غیر متوقع طور پر اپنے آپ کو منزل سے قریب پاتے ہیں۔ ان عوامل کا نام آپ کچھ بھی رکھ دیں اللہ کی مہربانی غیبی امداد، قسمت کے کھیل، زندگی کا جوا یا اپنی ہی انتھک کوشش کا نتیجہ، کچھ ایسی ہی غیر متوقع بات ہمارے دھنپت رائے کے ساتھ بھی پیش آئی۔ انہی کی زبانی سنئے۔

" تقدیر کا کھیل بھی عجب انوکھا ہے۔ کہاں تو

کیسے کیسے پاپڑ بیل رہے تھے، ایک وقت کی روٹی کا ٹھکانا نہ تھا۔ اور کہاں اب پروسی ہوئی تھالی سامنے رکھی تھی۔ سوال پوچھنے والے حضرت چنار کے ایک چھوٹے سے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہیں میٹرک پاس ایک ماسٹر کی تلاش تھی۔ تنخواہ بھی اٹھارہ روپے۔ کہنے بھر کی دیر تھی: اٹھارہ روپے اس سمے میرے مایوس تخیل کی اونچی سے اونچی اڑان سے بھی اوپر تھی؛ اندھا کیا چاہے دو آنکھ۔ اگلے ہی دن پریم چند نے اس اسکول ہیڈ ماسٹر سے "نوکری" پکی کرلی — یہ واقعہ ۱۸۹۹ء کا ہے۔ تین چار دن کے اندر ہی وہ چنار پہنچ گئے۔ ان کے سوتیلے بھائی دجے بہادر بھی ساتھ تھے۔ جب تک دجے زندہ رہے۔ دھنپت رائے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہی اس سنگت کو توڑا۔ اٹھارہ روپے جو اس وقت ان کی تخیل کی اونچی سے اونچی اڑان سے بھی اوپر تھے۔ بہت جلد زندگی کی ضرورتوں کے جبر نے ناکافی ثابت کر دیا۔ پھر ٹیوشن کی تلاش جس سے پانچ روپے اور ملنے لگے۔ دھنپت رائے کو زندگی کی اس جدوجہد سے اتنا وقت بھی نہ ملتا کہ گھر کا انتظام سنبھالیں۔ یہ فرض دجے بہادر جب تک زندہ رہے نبھاتے رہے۔ تنگدستی کا اب بھی یہ عالم تھا کہ جاڑوں کی چھٹیوں کے بعد ہی سے اسکول والے گاؤں لوٹنے کو بھی پیسے نہیں تھے۔ آخر اپنا گرم کوٹ بیچنے کی نوبت آگئی۔ ایک سال پہلے ہی یہ کوٹ بڑی مشکل سے بنا پائے تھے۔

ایک طرف زندہ رہنے کی جدوجہد اور دوسری طرف دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دلانے کی لڑائی پریم چند دوسروں کے ساتھ ہو رہی ناانصافی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس اسکول میں ابن علی نام کے ایک مولوی تھے۔ اسکول کے اعلیٰ عہدیدار ان کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔ یہ بات منشی جی کو سخت ناپسند تھی۔ اپنی نوکری داؤ پر لگا کر ابن علی کے لئے لڑے۔ نتیجے میں خود بھی اسکول سے نکالے گئے۔ اور ابن علی بھی۔ ان مساعد حالات میں منشی جی کے لئے یہ بڑی قربانی تھی۔ انصاف کے لئے لڑنے کا یہی جذبہ ان کو آزادی وطن کی جنگ میں بھی پورا جوش و خروش سے شریک کراتا ہے اور انہیں محنت کش کسانوں کی لڑائی لڑنے والوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

بڑی تلاش اور سفارش کے بعد ۱۹۰۰ء میں دھنپت رائے کو ضلع بہرائچ میں پانچویں ماسٹر کے عہدے پر بیس روپے ماہوار کی نوکری ملی۔ یہیں سے ان کی نوکری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ دنوں بعد بہرائچ سے تبادلہ ہو کر فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کے طور پر پرتاب گڑھ آگئے۔ گاؤں کے ٹھاکر کے مکان میں ہی ایک جو ان کے بچوں کو پڑھانے کے عوض ملا تھا رہنے لگے یہاں کچھ زیادہ لوگوں سے رسم و راہ نہ تھی۔ اسکول گھر اور گھر سے اسکول۔ زندگی میں اب قدرے اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اس فرصت کو غنیمت جان کر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جتنا پڑھتے اس سے زیادہ لکھتے۔

(جاری) ٭

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

غزل کیا ہے یہ سوال اٹھتا ہے۔ اس کا میدان بے حد محدود ہے۔ اور وہ ہے عشق مگر عشق کا بیان ہی کافی نہیں کہ ہر شعر غزل کا شعر کہا جائے یا ہر شعر میں تغزل کی روح جلوہ گر ہے۔ یہ حساس دل کی آواز جو مختلف تجربات کی پیداوار ہے اس کا شعر کے سانچے میں ڈھلنے کا نام ہے۔

جو پوچھو تو عزیزاں دل سے پوچھو یا کہ تم ہم سے
ہماری اور اس کی بات اغیاروں سے مت پوچھو

ابھی بھی قاری کے ذہن میں یہ بات صاف نہیں ہو سکی ہے کہ غزل کیا ہے۔ انشا کی تعریف کے مطابق کم و بیش یہ ساری غزلیں ہی ہیں۔ مگر جیسا میں نے کہا کہ عشق و محبت کی بنیاد پر ہی غزل کہی جاتی ہے۔ یعنی غزل کے اشعار کے لئے لازم ہے کہ ان میں اپنی محبت اور محبت کے دوسرے کوائف کا ذکر ہو۔ اچھا تو اس قسم کی شاعری بھی ملاحظہ کیجئے۔

(۱) سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ

جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد اے دوست
میں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا ہجر نے ناشاد کیا

(جوش ملیح آبادی)

(۲) افشائے رازِ عشق کا ساماں کئے ہوئے
پھر آگئے وہ بال پریشاں سے کئے ہوئے
پھر وہ مشقہ بر جبیں کوئی نکلا ہے دیر سے
آہنگ آزمائشِ ایماں کئے ہوئے
پھر بڑھ رہا ہے میری طرف مطرب جنوں
صحرا کو اپنے ساتھ غزل خواں کئے ہوئے
پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں
ہر شے کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہوئے
خنجر بہ کف بڑھا ہے مری سمت پھر جمال
کہنی تک اپنے ہاتھوں کو عریاں کئے ہوئے
پھر آ گئے ہیں وہ سامنے الٹے ہوئے نقاب
سو طور اک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے
پھر اس نے آکے کفر کا اقرار کر لیا
مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے
پھر آئے ہیں وہ جوشؔ سوئے مجرمانِ عشق
شعلے کی طرح تیغ کو عریاں کئے ہوئے
(جوش ملیح آبادی)

(۳) آغازِ محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو سہارے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے
متوالی رسیلی آنکھوں میں نیز ایسی گھتی کہ بس تو بہ
فتنے تو اٹھانا اک جانب جادو بھی جگانا مشکل ہے
طائر ہے نہ صید وحشی ہے دل ہے البتہ تڑپتا دل
دیکھو تو ادھر کوشش تو کرو کیا ایسا نشانہ مشکل ہے
جو عشق کے فن کے ماہر ہیں ان سے پوچھو تم کیا جانو
کچھ اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے
کچھ عشق ندامت ہوتی رہے کچھ عذرِ ستم بھی کرتے رہے
جا [illegible] کے کھانے والوں کو ہنس ہنس کے رلانا مشکل
موسم اور وقت کی باتیں ہیں۔ راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں
رونے میں کبھی طوفاں تھے اب دو اشک بہانا مشکل ہے
کہنے اور طول پہ کہنے کی حسرت تھی لیکن حبیب پوچھ
منہ اس کا تکتے رہ گئے یعنی حال سنانا مشکل ہے
میں تیر کا دم بھرتا ہوں آخر میں اس کے کمال کا قائل ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو۔ وہ بول بنانا مشکل ہے
(جعفر علی خاں اثر)

(۴) سدا ہے اس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو تم اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہ شعلہ رو ہے سوار توسن اور اس کا توسن عرق فشاں
عجب ہے اک سیر دوپہر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
کدھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سرد زمانہ مجھ کو
دکھائے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہ تیغ کھینچے ہوئے ہے سر پر میں سر جھکائے ہوں اشک ریزاں
دکھاؤں اے دل تجھے کدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نصیرؔ لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو
بندھی ہے یوں کب کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
(شاہ نصیر)

یہ بھی غزلیں نہیں ہیں ۱ اور ۲ میں تو غزل کا لب و لہجہ ہی نہیں۔ یہ بھی مسئلہ غور طلب ہے کہ غزل کہنے کے لئے غزل کا لب و لہجہ بھی ہو۔ غزل ۳ میں غزل کا لب و لہجہ تو ہے مگر باوجود زبان کی فصاحت اور قادر الکلامی غزل شدت احساس سے خالی ہے۔ تو وہ ہاتھی واضح ہو گئیں کہ غزل کا لب و لہجہ بھی ہو اور شدت احساس بھی لازمی ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہئے کہ "لب و لہجہ"

کا نمبرا ہے اور شدت احساس کا درجہ دوسرا ہے۔ بغیر شدت احساس تو شعر ہی کہے جانے کا مستحق نہیں ہوگا شدت احساس ہے تو شعر ہے پھر لب و لہجہ ہے تو غزل ہے۔ غزل ۲ میں بھی غزل کا لب و لہجہ تو ہے اگرچہ ۳ سے کمتر ہے۔ شدت احساس ۲ سے کچھ زیادہ ہے مگر قادر الکلامی کا جو مظاہرہ ہے اس سے غزل پر توجہ کم اور صنعت پر توجہ زیادہ یعنی ردیف کے نبھانے کی بات ہے۔ شاعر نے زور کلام ردیف نبھانے پر صرف کر دیا تو شدت احساس کی گنجائش بچا نہیں رہ گئی۔ شاید دھیرے دھیرے آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ میں آپ کو غزل کی صحیح تعریف سے آشنا کرا رہے ہیں۔ بغیر کسی ایک جملہ یا چند سطریں لکھے ہوئے ابھی تک یہ بات سامنے آئی ہے کہ کن باتوں کا اظہار اور کس قسم کی ادائیگی غزل کے حق میں سم قاتل ہے۔

پاکستان کے کسی پرچے میں غزل کی کیفیت کیا ہوگی اس کے بارے میں کسی کی رائے (کسی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ نام یاد نہیں) کافی پسند آئی۔ " ایک شکاری ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا ہے۔ ہرن چوکڑی بھرتا ہوا اپنی جان بچاتا ہے۔ مگر شکاری بھی ہارنے والا نہیں ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ ہرن بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے اس کی ٹانگیں اب جواب دینے لگتی ہیں اور شکاری قریب اور قریب تر ہو رہا ہے۔ ہرن رک جاتا ہے اور پلٹ کر شکاری کو دیکھتا ہے (آپ نے ہرن کی آنکھیں تو دیکھی ہوں گی بے حد خوبصورت ہوتی ہیں) اس وقت جو کیفیت اور تاثر ہرن کی آنکھوں میں ہوتا ہے وہی کیفیت جب غزل کے اشعار میں ہو جائے تو صحیح معنوں میں غزل ہوتی ہے یا ان اشعار میں تغزل کی روح جلوہ گر ہوتی ہے۔" یعنی محبت کے تجربے میں جو بے کسی یا بے بسی کا اظہار ہے۔ اپنی نارسائیوں کی وجہ سے یا معشوق کے جور و جفا کی وجہ سے یا تغافل سے یا غلط فہمی سے یا رنجش بے جا سے انہیں احساس کو شعری جامہ پہنانے کا نام غزل ہے۔

اب اس سے پہلے کہ میں ایسے اشعار پیش کروں جن میں تغزل بھرپور موجود ہے میں اس صنف (غزل) کی جو خامیاں اور کوتاہیاں ہمارے ناقدین یا کچھ شعراء نے بتائی ہیں اس طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ یہ سرسری ذکر نامناسب نہیں۔ اس لئے کہ قارئین خصوصاً طلبا ناقد حضرات کی رائے پڑھ کر اس کو خدا کا فرمان نہ سمجھ لیں کہ چوں چرا کی گنجائش نہیں۔ بلکہ خود بھی غور و فکر کریں اور اپنی سمجھ سے کسی نتیجہ پر خود پہنچ سکیں۔

غزل گوئی نسبتاً اور صنف کے ہر نو مشق کے لئے آسان ہے۔ غدر سے پہلے اور بعد بھی عموماً شعرا نے غزل کے میدان کو ہی چن لیا۔ ساری شاعری اسی صنف میں ہونے لگی۔ (نتیجہ یہ نکلا کہ سوائے انتشار فرسودہ خیالات اور صنائع اور زبان کی شاعری ہونے لگی) پڑھا لکھا طبقہ جس نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا۔ اور مغربی ادبا اور ناقدین کے سوچنے اور فکر کا ڈھنگ دیکھا تو رد عمل میں وہ طبقہ غزل سے نفرت کرنے لگا۔ جس طرح غزل گوئی بھی انتہا پسندی تھی۔ تنقید بھی رد عمل میں انتہا پسندی سے اپنا دامن نہ بچا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ شدت پسندی کے عقل کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ تو نہیں کہوں گا مگر یہ ضرور ہوا کہ عقل کی روشنی مدھم ہو گئی۔ آئیے سب سے پہلے کلیم الدین کی رائے کا جائزہ لیجئے۔ آپ نے کہا ہے کہ یہ نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اس رائے سے اتفاق

کرنے سے پہلے یا اس کے خلاف بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نیم وحشی صنف شاعری کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے وحشی صنف شاعری کیا ہے۔ انسان جب وحشی تھا تو کیسی شاعری کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا۔ اور پھر جب نیم وحشی کے مدارج طے کر رہا تھا تو اس وقت کیسی شاعری کرتا تھا یا اس نیم وحشی دور میں شاعری سرے سے کرتا ہی نہیں تھا۔ مگر جب کلیم الدین نے فرمایا ہے کہ "یہ نیم وحشی صنف شاعری ہے۔" تو چونکہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اس کی مثال بھی پیش کر دیتے تو اچھا تھا۔ اسلام سے پہلے عرب وحشی نہیں تو نیم وحشی تھے۔ ایران، روم اور ہندوستان کے مقابلے میں عرب تمدن و تہذیب میں بہت پیچھے تھا۔ پھر تو عرب کے لوگ غزل ضرور کہتے ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں۔ عربی زبان میں غزلیں ملتی ہیں مگر وہ اسلام سے قبل نہیں، بلکہ آخری دور امیہ میں یا دور عباسی کے اوائل میں عربی زبان میں غزلیں کہی گئیں۔ اس سے نتیجہ آپ خود نکالیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اب ایک دوسری بات کی طرف توجہ چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ انسان جب جسم ڈھاکنا شروع کیا تو بغیر سلائی کے چیزوں سے۔ سینے کا عمل تو جب انسانی ذہن اور تعلیم و تربیت ہوا ہوگا تو شروع ہوا ہوگا۔ اسی کی یادگار دھوتی اور ساڑی ہے۔ یہ بغیر سلا ہوا کپڑا یادگار ہے اس وقت کی جب انسان نے کپڑے سینا نہیں سیکھا بلکہ جب انسان سینے کے عمل سے ناآشنا تھا۔ یعنی نیم وحشی تھا۔ ساری نیم وحشی ادوار کی یادگار ہے تو اسی وجہ سے ہم ساری میں کپڑے نکالیں اور اسے بالکل ہی ترک کردیں۔ اس کا فیصلہ آپ کریں اور نتیجہ خود نکالیں (جاری)

(بقیہ: اس کے کردار میں)

ہاں۔ صحافت کے لئے موقع نہیں ملے گا۔ اس جگہ کو بھرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ معاش ڈھونڈ سکتے ہو۔ تمہارے اس اقدام سے تمہاری زندگی کا رُخ بدل جائے گا اور تمہاری صحت کو جلا ملے گی ـــــ پیارے تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں روشنی دکھا رہا ہوں۔ اندھیرے میں تم بھی تو چراغ جلاتے ہو۔۔۔۔۔

"تم گاؤں کب جا رہے ہو؟"

"کل"

"ٹھیک ہے ڈیئر، کل میں تمہاری رہائش گاہ پر صبح آٹھ نو بجے کے اندر آ جاؤں گا اور اپنا فیصلہ سناؤں گا۔" اور وہ یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اور میں اس کے جاتے ہوئے خدوخال اور کردار میں اسی کی طرح ان گنت اردو کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو دیکھتا رہا!

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

(قسط ۸)

میں نے پاکستان کے جس شعری مزاج اور ری رویہ کی بات کی ہے اسے ایک غالب رجحان ضرور جا سکتا ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ وہاں ایسے شعراء بھی کمی نہیں جو شاعری کو وسیلہ یا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ سے مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ جن کی شاعری ایک NON-COMMITTE فضا میں سانس لیتی ہے۔ ن کی شاعری میں عام انسانوں کا درد کلبلاتا ہے، تبدیلیوں پر یقین بھی رکھتے ہیں اور ان کا ذکر بھی تے ہیں، ایسے شعراء بھی ہیں جو ٹوٹتی بنتی قدروں پر نظر ھتے ہیں ایسے بھی ہیں جو اپنے ماضی بعید (REMOTE PAS- میں زندہ ہیں اور مہاجرت کو ایک المیہ سوس کرتے ہیں، ان کی شاعری سے اپنے گاؤں، کھیتوں ھلیانوں کی خوشبوئیں آتی ہیں، کہیں -URBA NISATI- اور اس سے پیدا ہونے والے تہذیبی ائل کا ذکر ہے۔ کہیں بے رنگ رشتوں کا مرثیہ ہے کہیں نئے رشتوں کی نئی تعبیریں ہیں۔ غرض ایسی فضا بھی ہے جہاں شاعری سینگ اٹھا کر کسی ایک سمت بھاگی نہیں جاتی بلکہ ان میں متعدد DIMENTIONS نظر آتے ہیں۔

کراچی میں محترمہ رعنا اقبال سے کئی ملاقاتیں رہیں، یہ خاتون وہاں کی ادبی و شعری اور تہذیبی ماحول میں خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اتنے بڑے شہر کی ادبی ہماہمی میں نئی نسل کی خواتین کا جتنا حصہ ہونا چاہیے تھا وہ مجھے کراچی میں نظر نہیں آیا۔ اس کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں مگر مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں آج خواتین پہلے کے مقابلے میں پرورش لوح و قلم سے غافل تو نہیں ہیں۔ پاکستان میں اردو ادب کے تخلیقی منظر نامے پر اس طبقے سے کئی نام نمایاں تو ہوتے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ فضائے شعر و ادب میں خواتین کی شرکت خال خال نظر آتی ہے۔ رعنا اقبال افسانے لکھتی ہیں۔ کالم نگاری

کرتی ہیں، ادبی اجتماعات میں، مذاکروں اور سیمیناروں میں حصہ لیتی ہیں، ادبی انٹرویوز کے ذریعہ فنکار اور قاری کو ملاتی رہتی ہیں۔ ابھی یہ نام ادب کے افق پر اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر تو نہیں ہو سکا ہے مگر ادبی مشغلوں میں ان کا انہماک بہت جلد انہیں آگے، اور آگے اور آگے لے جائے گا۔ غالب نے ایک جگہ یہ کہا ہے کہ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

غالب کا شعروں کے انتخاب نے جو حال کر دیا تھا کم و بیش وہی رعنا اقبال نے اپنے سوالات کے ذریعہ کر دیا۔ ہوا یوں کہ انہوں نے "ادبی ملاقات" کی ایک مخصوص نشست بلائی تو میں یہ سمجھ کر وہاں گیا کہ کچھ نئی ملاقاتوں کا موقع ملے گا۔ پہ تو وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہ اصطلاحی ادبی ملاقات تھی یعنی یہ محض انٹرویو لینے کے لئے کیا گیا تھا۔ یہاں رقیبوں کے جمع ہونے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ صرف دو تین احباب بطور مشاہدین، موجود تھے۔ صدابندی کے لئے ایک عدد ٹیپ ریکارڈر، ضیافت کا معقول انتظام۔ سوالات کے تیر پھینکنے کے لئے رعنا اقبال اور جوابات کے لئے سینہ سپر میں۔

یہی کچھ تھا ساقی متاع حیات

یہ تو میری نجی ملاقات تھی، اس آپ بیتی کی تفصیل تو پھر کبھی سنا دوں گا۔ مگر کراچی کے دوران قیام میں خواتین تخلیق کاروں میں سے ایک اور خاتون سے بھی ملاقات ہوئی جن کے فن پاروں سے ملتے رہنے کے مواقع ہند و پاک کے وسیع تر ادبی حلقے کو حاصل ہوتے رہے ہیں۔ میری مراد فاطمہ حسن سے ہے جنہوں نے پاکستان کی شعری تخلیقی فضا کو ایک نئی سمت دکھائی ہے۔ روایتی لے کو توڑ کر ایک

ایسا نیا صوتی نظام قائم کرنا جو اجتماعی سماعت کے لئے قابل قبول بنتے ہوئے قابل تحسین بن جائے ایک زبردست خلاقانہ اجتہاد کا کام ہے ——— اور یہ کام فاطمہ حسن نے بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے۔

فاطمہ حسن کی شاعری ذاتی ہوتے ہوئے ایک آفاقی جذبے اور کیفیت کی ترجمان ہے۔ شاعری کی ذات کی تکمیل بھی کرتی ہے اور اسے ظاہر بھی کرتی۔ انہیں اپنے رشتہ اور جذبے پر ایک غیر معمولی بھروسہ ہے۔ اس اعتماد اور بھروسہ کی وجہ سے ان کی نظموں وقار اور معنویت کے ساتھ ساتھ تفہیمی دروبست کا کھلتے ہیں۔ انہوں نے مروجہ ہیئتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ دراصل ثابتہ ہیئتوں کی شکست بھی فاطمہ حسن یہاں کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ شاعری کی روح اور اس کی آگہی کا بنیادی تصور ہی ان کے ذہن و دل میں غیر رسمی، غیر مصنوعی اور غیر مشروط طور پر قائم ہوتا ہے۔ اظہار کی آرائش و زیبائش بحور اوزان و بحور سے متشکل ہونے والا نغماتی نظام بھی ہے فاطمہ حسن کے لئے غیر اہم ہے ——— اور اہم بات یہ کہ جذبے کی عظیم ترین سچائی منتقل ہو جائے۔

فاطمہ اپنی شاعری میں اس اٹوٹ ذہنی ور رشتے کی بات کرتی ہیں جو غالباً کبھی اظہاری سطح پر قائم نہیں ہوا۔ ساری داستان آنکھ اور احساس کے رشتے سے پوری ہوتی ہے۔ ان کی ایک نظم "دوریوں کی دہلیز" ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ جذبے کس طرح فاطمہ حسن کے یہاں ماورائی لطافت اور عدم ارضیت کی فضا پیدا کر کے قاری کو ایک نئے جہانِ تعلق میں پہنچا دیتے ہیں۔

وہ مجھ سے کہ الفاظ میں

ڈھونڈتا ہے
میں اسے اس کی خاموشیوں میں
پالیتی ہوں
فاصلے صرف آنکھیں میں
یا
——— ہونٹ

فاطمہ حسن کی شاعری میں ثنویت کردار کا احساس ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا لگتا ہے کہ فن کار کے ساتھ ساتھ ایک اور شخصیت بھی ہے جو اس طرح ہے ——— اور اسی کی طرح تنہا بھی ہے۔ ان کے کلام میں خود کلامی اور خود جلیسی کی جو فضا ملتی ہے وہ اردو شاعری کے لئے ایک اجنبی لیکن پرکشش فضا ہے۔ فاطمہ حسن کا شعری کردار اپنے جیسی پرچھائیں کو ساتھ لئے لئے پھرتا ہے یہ بات ایک طرف منظومات میں ڈرامائی خصوصیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف تنہائی کی شدت کو کچھ اور تیز تر کر دیتی ہے۔ نظم انتظار، اکیلی، منتظر روشنی، ایک لڑکی، وہ اور دوسری تخلیقات میں ایک ہمزاد کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ فاطمہ حسن کی نظمیں ان کی داخلی شخصیت کے انعکاس کے لئے آئینہ در آئینہ کا نظام قائم کرتی ہیں اور اس طرح کبھی ایک پر ہجوم کا مغالطہ بھی ہونے لگتا ہے۔ یہاں اصل شہود و شاہد مشہود ایک ہے۔ یہ نظم بھی پڑھئے۔

آنکھوں کی وحشت سے
ایک مجسمہ تراشوں
اپنا جیسا ——— اور سجدہ کروں
ابھی کچھ اندیشہ
میری جبیں کو [illegible]

لڑکی نہیں

(نظم ،، میرا بت مجھ سے بہتر ہے)

فاطمہ حسن کی متعدد نظموں میں معصوم سوچوں کا ایک سلسلہ ہے لیکن یہ سوچیں اپنی انتہا میں دانشورانہ آگہی کا پتہ دیتی ہیں۔ ایک منفرد POETIC VISION کی تشکیل کرتی ہیں۔ لہجہ کی سادگی لبسا اوقات قاری کو فریب میں ڈال دیتی ہے۔ لگتا ہے نظم میں کوئی خاص بات ہوتے ہوتے رہ گئی ہو ——— مگر ذرا ٹھہر کر غور کر لیجئے تو معلوم ہوگا کہ فاطمہ حسن نے نظم میں اپنے موضوع سے کچھ زیادہ ہی کہہ دیا ہے ——— بہت کچھ زیادہ، آیئے ان کی دو تین نظمیں پڑھ کر اس حکایت لذیذ کو طوالت سے بچایئے۔

نئے دوستوں میں گھری
ہنستی رہتی ہوں
اور
ہنسی کی رو میں بہتی
ان حویلیوں میں پہنچ گئی
جہاں کی پرانی آنکھیں
ابھر ابھر کر ڈوب رہی ہیں
——— (بہتے ہوئے پھول)

جب میں نے ہر چہرے پر
اس کا دھوکا کھایا تھا
تب وہ کیوں نہ آیا تھا (انتظار)

لفظوں کا خوف اوڑھے ہوئے
سو گئی ہے
سوچتی ہوں
پہلے اس کو جگاؤں / یا چادر ہٹاؤں
(ایک لڑکی)

(جاری)

ساجدہ زیدی

شامِ الم

ہوا نے چھیڑا خوشی کا نغمہ
لوا نے پیکر تراشے
کیف و نشاط و غم کے
بس ایک لمحے کو ابھری آواز ـــــ عافیت کی فغاں آخر
(کہ جیسے کوہِ ندا کا جاں آفریں بلاوا)
افق کی لو تھرتھرائی
جاگی فضا
زمیں ہو گئی منور
پھر اس کے بعد ......
اوڑھ لی دلِ کائنات نے
بے پناہ خاموشیوں کی چادر

غزل

فضا ابن فیضی

مئوناتھ بھنجن

بے بصیرت ہوشمندی کا اعادہ کس لئے
لفظ پر معنی کا یہ کہنہ لبادہ کس لئے

میں تو خود اپنے تکلم کی زد میں ہوں، اک عمر سے
ہیں یہ حرفوں کی صفیں ایستادہ کس لئے

جیب میں، دنیا کا بخشیدہ زیاں، محفوظ ہے
لے کے پھرتا ہوں یہ کشکول افادہ کس لئے

ہفت خواں کا کون سا یہ مرحلہ ہے سامنے
میری خاطر، ساتوں دروازے کشادہ کس لئے

دو نفس کا یہ تعلق، اک اضافی چیز ہے
زندگی سے ربط اتنا بھی زیادہ کس لئے

رخت جاں، یہ جادۂ آشوب، زخموں کا سفر
اس سفر میں چل پڑے تم پا پیادہ کس لئے

میں تو خود منزل ہوں، ہے سب کا سفر میری طرف
میرے دامن سے ہے لپٹی خاک جادہ کس لئے

گرد پچھلے منظروں کی، میری پلکوں پر نہ رکھ
رفتہ و پامال خوابوں کا اعادہ کس لئے

کیا کہوں، ناگفتنی و گفتنی کے درمیاں
چپ رہا وہ داستاں کا شاہزادہ کس لئے

زندگی بھی ہے سراب و آب کا اک معرکہ
موج دریا اور ساحل افتادہ کس لئے

میں تو خود اپنی جگہ ہوں اک سمندر، اے فضا
درمیاں میں یہ خلیج استفادہ کس لئے

نصر قریشی

نئے سال کی دُعا

میرے مولا! دشتِ جاں کو موسمِ گُل کی راحت دے
پیاسی دھرتی کے ہونٹوں کو قطرہ قطرہ لذت دے
لمحہ لمحہ عمرِ رواں کی مدت گھٹتی جاتی ہے
روز و شب کو سالِ رواں میں روشن روشن مدت دے
سال گزشتہ جو بھی گزرا، وہ نہ گزرے ایک برس
بادِ حوادث، خون کی بارش کی لعنت سے فرصت دے
جینے والے، جیتے جیتے، کھو بیٹھے جینے کی سکت
وقت کا مقتل ہم کو پکارے، ٹکرانے کی ہمت دے
جنگ کے شعلوں میں نغموں کی فصلیں جلنے لگتی ہیں
امن و آشتی، صلحِ کل کی انسانوں میں چاہت دے
ورق ورق پر لفظوں کی قندیل جلائیں اہلِ قلم
کاغذ، قلم، سیاہی چمکے، تحریروں کو رفعت دے
ایک برس، نفرت کی آگ سے، کوئی نگر برباد نہ ہو
انسانوں میں انسانی رشتوں کی پاک محبت دے
ایک برس بھی فصلِ بہاراں، ویرانوں کو سبز کرے
کونپل، کونپل خوشبو جاگے، غنچہ و گُل کو نکہت دے
ایک برس مذہب کی آڑ میں، مذہب ہی کا خون نہ ہو
ظلمت ظلمت سورج چمکے، سب کو نور کی دولت دے
سب کے مولا! تیرے کرم سے نصر بھی دنیا میں چمکے
ملکِ شعر و ادب میں دھوم ہو، فکر و فن کو عظمت دے

غزلیں

شروین کمار ورما

ہم قفس والوں کو ذکرِ آشیاں اچھا لگا
تھا خیال و خواب پھر بھی یہ بیاں اچھا لگا

ساعتِ پرواز میں اب وسعتوں کا خوف ہے
پر نہیں نکلے تھے جب تک آسماں اچھا لگا

زندگی کی راہ میں حائل رہا اپنا مزاج
اک مصیبت تھا مگر کوہِ گراں اچھا لگا

اپنے ہونے کا ہمیں احساس تو ہوتا رہا
سچ تو یہ ہے ہر قدم پر امتحاں اچھا لگا

اک سلگتی آگ کی مل تو رہی ہے کچھ خبر
وسعتِ افلاک پر پھیلا دھواں اچھا لگا

یوں لگا اپنی زمیں سے آسماں نزدیک ہے
خواب میں دیکھا تھا لیکن آسماں اچھا لگا

جو رنج دل کو دیئے ہیں کس حساب میں رکھ
ستم نہ [illegible] لطف و کرم کے باب میں رکھ

مسافتوں میں اماں بھی ملے کہیں آخر
ترے ستارے ہمیں سایۂ آفتاب میں رکھ

کوئی خیال ہی تصویر بن کے ابھرے گا
کوئی تو روپ یہ لے گا، یقیں خواب میں رکھ

نہ جانے کون سے لمحہ کی یاد بن جائے
یہ پھول اس نے دیا ہے، اسے کتاب میں رکھ

مرے وجود کا احساس ہی دلا مجھ کو
تو فیصلہ نہ سنا، نگہہ انتخاب میں رکھ

نکال پھینک یہ کانٹا بھی یادوں کا دل سے
[illegible]

محمد ابراہیم کوثر

وہ میری آنکھ میں سب رہ گذار رکھ دیگا
ہر اک خیال ہر اک انتظار رکھ دے گا
وہ اپنے ساتھ میں لائے گا موسموں کا سفر
میری ہتھیلی پہ باغ و بہار رکھ دے گا
مجھے پڑھے گا وہی جو شعور رکھتا ہے
نظر سے دور مجھے کم شعار رکھ دیگا
مثالیہ یاد گے فنکار ہے یہ دیوانہ
بنا کے موت کو اک یادگار رکھ دیگا
ذرا بھی قرض نہیں دیگا دوست لاکھ سہی
وہ خالی جیب میں کچھ اعتبار رکھ دیگا
جو مل سکے تو سہارا بڑا ہے تنکے کا
پہاڑ کو بھی سمندر کے پار رکھ دیگا
جہاں میں اس کو نظر آؤں مثل آئینہ
سجا کے زخم وہیں بے شمار رکھ دے گا
میرے قدم تو بتائیں گے راستہ خود ہی
میرا سفر کئی گرد و غبار رکھ دے گا
میری طلب کا حسین سلسلہ ہی ایسا ہے
نظر میں خواب کی لمبی قطار رکھ دے گا
نہیں کرے گا وہ اپنی گرفت سے آزاد
ذرا قدم جو بڑھاؤں حصار رکھ دیگا
ہزار سجدے گزاروں گا پھر بھی وہ کوثر
میری جبیں پہ وہ تہمت ہزار رکھ دیگا

کرشن پرویز

نہ جانے کس لئے خوش ہیں یہ اہل کارواں یارو
اندھیروں کا تسلط ہے ابھی صبح بہاراں پر
کہیں اپنے لہو سے تو نہیں کھیلی یہاں ہولی
یہ کس کے خون کے چھینٹے ہیں دیکھو سب کے داماں پر
جسے سینچا تھا اپنا خون دیدے کر وطن والو
خزاں پھر چھا رہی ہے کیوں امڈ کر اس گلستاں پر
زمانے کے ہر اک غم کو ہے ہم نے اپنا غم سمجھا
گرے جب غیر کے آنسو سنبھالے اپنے داماں پر
قیامت ہی بپا ہوگی اگر یہ زلف سیدھی ہو
ہزاروں لوگ مرتے ہیں تری زلف پریشاں پر
زمانے سے کبھی ہم نے کوئی خوشیاں نہیں مانگی
مگر سب کیوں پریشاں ہیں مرے دل کے چراغاں پر
عجب یہ بیج نفرت کا یہاں کچھ لوگ بوتے ہیں
کہیں ہندو پہ شک ہوتا کہیں ہوتا مسلماں پر
گلستاں پھونک ڈالے گی نشیمن کو جلا ڈالے
بھروسہ کیا کریں پرویز اب ہم برق و باراں پر

رازؔ اعظمی

اہلِ ہوس کے سامنے تلوار" میں ہی تھا"
سینہ سپر تھا بیعتِ انکار میں ہی تھا
ناول کے پہلے باب میں جو قتل ہو گیا
اس قصہ طویل کا کردار" میں ہی تھا"
مرے ہی دسترس میں رہی شش جہت تمام
تیرے حضور پھر بھی گنہگار" میں ہی تھا"
سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے
تنہا ترے وجود کا اقرار" میں ہی تھا"
میرے ہی خوشہ چیں رہے اہلِ ہنر تمام
شہرِ سخن کی گرمیٔ بازار" میں ہی تھا"
اے راز سامنے تھی مری منزلِ مراد
خود اپنے راہِ شوق کی دیوار" میں ہی تھا"

زبیرؔ گورکھپوری

میں نے جب بھی ترے چہرے کی تلاوت کی
ایسا محسوس ہوا مجھ کو عبادت کی
سنگ نفرت کے عوض بانٹے محبت کے گلا
ہم تہی دستوں نے اس طرح سخاوت کی
کون چل سکتا ہے شطرنج کی چالیں ہم
ہم نے ایجاد زمانے میں سیاست کی
رہ کے گمنام بھی ممکن تھی ادب کی خد
جانے کیوں آپ نے تشہیر ذہانت کی
ہیں وہی لوگ میرے قتل کی سازش میں شا
میں نے جن لوگوں سے دنیا میں مروت کی
پالیا جسموں پہ تلوار سے تم نے فت
ہم نے اخلاق سے ہر دل پہ حکومت کی
جو ادا ہو گئیں تلوار کے سائے میں زبیر
ہم نے ایسی ہی نمازوں کی امامت کی

نیر انصاری

ے شعور کو سہنے کا تجربہ بھی دے
کھوں سے نمٹنے کا حوصلہ بھی دے
کھنا ہوا پھول ہی دا ہو گا ڈھول
احتیاط کی [illegible] کا جبا بھی دے
یا شہر شہر برہنہ قبا پھروں گا کب تک
تبسم بخشا ہے مجھ کو تو پیرہن قبا بھی دے
تو نے بخشی ہے جو دوشیزگی ہوا تا کر
ن کو سرخی [illegible] ہاتھ کو حنا بھی دے
سا نہ جاؤں کہیں احترام کی حد سے
اپنے قرب کو تھوڑا سا فاصلہ بھی دے
اعتدال ضروری نظام دنیا میں
رک پہ دوڑتی کاروں کو حادثہ بھی دے
بیر نیند کی شہزادی جاگ جائے گی
ے سکوت مسلسل کا سلسلہ بھی دے

اظہر نیر

سجا کے گاؤں کی دوشیزگی دکانوں میں
میں رنگ بھر نہ سکا شہر کے فسانوں میں
کسی نے کون سے لفظوں میں مدعا کہنا
گھلا ہے زہر ہلاہل سبھی زبانوں میں
چھتیں شکستہ ہیں دیواریں بھی بوسیدہ
پناہ لیتے ہیں آسیب اب مکانوں میں
انھیں سے پوچھئے رازِ شگفتگی کیا ہے
جو ابتدا ہی سے شامل ہیں سخت جانوں میں
جو لوگ خود سے بھی روپوش تھے یہاں نیر
انہیں کا نام نمایاں ہے داستانوں میں

عقیل گیاوی

آندھیوں کی زد پہ بام و در تمام
ہنستے گاتے شہر کے منظر تمام
میرے اندر کون یہ روتا رہا
آنسوؤں سے نم ہوا بستر تمام
قصرِ شاہی میں بغاوت کا دھواں
سرحدوں پہ ہمنوا لشکر تمام
ڈائری میں کیوں کروں محفوظ یہ
پھول، خوشبو اور صبا از بر تمام
میری ہی دہلیز تک محدود کیوں ؟
قہقہہ بردوش یہ منظر تمام

قسط ۲

مشرف عالم ذوقی

مُسَلمَان

ایک پناہ گاہ سے نکل کر دوسری پناہ گاہ میں۔

ایک چھوٹی سی عمر میں انسان کیسی کیسی پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ فرنگی بیڑیوں سے ملک آزاد ہونے کو ہوا تو مسلمانوں نے اپنی ایک الگ پناہ گاہ ڈھونڈ لی۔ پاکستان

منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ بھلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں فرق نہ کر پایا ہو، لیکن پاکستان جانے کی تیاریاں کرنے والے مسلمانوں کو پاکستان کے بارے میں بخوبی معلومات تھی — یعنی ان کا اپنا ملک، مسلمانوں کا ملک، اپنے بھائیوں کا ملک، اور تصور کی ایک سادہ کتاب تھی جس پر خیالوں کے نئے نئے گل بوٹے بنائے جا رہے تھے۔

چونٹرا بستی —

بہار — بھوجپور کے نقشے میں آج بھی یہ بستی موجود ہے۔ لیکن کل والی بات کہاں۔ اب تو یہاں کی دنیا ہی مختلف ہے۔ ۴۷ء کے آس پاس جب ہندو مسلم دنگے تیز ہوئے اور چاروں طرف مارکاٹ مچ گئی تو تباہی کا یہ طوفان رفتہ رفتہ چونٹرا بستی بھی پہنچا۔ تقریباً ۵۰-۵۲ گھر ہوں گے اس بستی میں — آگے لکھی پور ہے۔ یہاں پر بھی اتنی ہی آبادی ہوگی۔ ان دونوں بستیوں کو ایک چھوٹی سی ندی جوڑتی ہے۔ جہاں ڈباؤ بھر پانی ہے۔ اور مچھلیاں اس قدر، کہ زیادہ تر لوگ مچھلیاں پکڑنے اور شہر جا کر بیچنے کا روزگار کرتے ہیں۔ لکھی پور بستی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے تو چونٹرا بستی میں اہیروں کی۔ وہاں بس گنتی کے مسلمان ہیں۔ یہی لے دے کر بس دو چار گھر۔

لکھی پور کے مسلمانوں نے مارکاٹ کی تو چونٹرا بستی میں بھی تناؤ کی فضا بن گئی — وہاں کے پرمکھ بانکے چودھری نے دوپہر ڈھلے حالت کو نازک جانتے ہوئے مشنگ بلائی۔ لوگ جمع ہوئے۔ باتیں ہوئیں۔ آپسی رائے مشورہ ہوا، پھر طے پایا، چاروں گھر کے مسلمان مال و اسباب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا اپنا گھر چھوڑ دیں۔ اور پڑوس کے ہندو گھروں میں چلے جائیں۔ پناہ دینے کے لئے سب تیار ہو گئے پرمکھ کو خطرہ اس بات کا تھا کہ لکھی پور میں ہندوؤں کی بربادی کا سن کر مچھو ٹولہ کے ہندوؤں کا فرمان پہنچا تھا کہ چونٹرا بستی کے مسلمان صاف کر دیئے جائیں۔ عین وقت پر پرمکھ بانکے چودھری نے اپنے اپنے گھروں میں

مسلمانوں کو چھپانے اور پناہ دینے کا فیصلہ کرکے ایک بہت بڑا جوکھم اٹھایا تھا۔

ان میں سے ہی ایک خاندان تھا۔ شیخ سلیم کا۔ بیوی آمنہ کے علاوہ، جوانی کی دہلیز کو چھوتی ہوئی دو لڑکیاں ۔ عزیز النساء، امیر النساء۔ عزیزن کی عمر ابھی بمشکل اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ مگر جسم ایسا کہ اچھے اچھوں کا ایمان ڈول جاتا۔ امیرن اس سے چھوٹی تھی۔ اس پر بھی شباب بس جھوم کر آیا چاہتا تھا۔

شیخ سلیم کے مکان کے پاس ہی للن یادو کا مکان تھا۔ جن کے، کوئلے کی دلالی کرنے والے لڑکے ویریندر یادو کی نظر عزیزن پر تھی۔

بانکے چودھری نے خود بھی شیخ سلیم کے گھر جاکر مشورہ کیا تھا۔ سامان کی بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔

شام کا کوئی سات بجا ہوگا۔

چراغ ٹمٹما گئے تھے۔ سامان باندھے جارہے تھے، کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شیخ سلیم نے عزیزن کو اشارہ کیا۔ عزیزن آگے بڑھی اور اچانک ٹھٹھک گئی۔

ویرا تو؟

دروازے کی آڑ لے کر، ہونٹوں پر بھدی سی ہنسی سجائے ویریندر، جسے سب ویرا بھی کہتے تھے، کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟" عزیزن کو غصہ آگیا۔

"کیوں۔ کہاں کی تیاری ہے۔"

"جہنم کی ۔۔۔"

"اس سے بہتر جگہ تو میرا گھر ہے۔"

ویرا نے ایک بھدا سا قہقہہ بلند کیا۔

شیخ سلیم دروازے تک آتے آتے کانپ گئے۔ ویرا کی ناپاک نیت کو بھانپ گئے۔ مگر کیا کرتے۔ وقت نازک تھا ۔۔۔ زمانہ بدل چکا تھا ۔۔۔ وہ یہاں تعداد میں بھی کم تھے۔ پورے ملک میں دنگوں کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ جو جہاں زیادہ تھے۔ وہیں آبرو ریزی کا کھیل کھیل رہے تھے۔

شیخ سلیم کانپ گئے۔ یہاں تو وہ مٹھی بھر ہیں ۔۔۔ دروازے پر بھدی ہنسی ہنستا ویرا کھڑا ہے۔ صلح صفائی سے کام نہ لیں تو اور کیا کریں ۔۔۔ آگے بڑھے ۔۔۔

"کیا بات ہے ویرا؟"

"عزیزن میرے ساتھ جائے گی۔"

ویرا کے چہرے پر وہی آگ روشن تھی جو اس وقت ملک کے حاشیے پر سلگ رہی تھی۔

شیخ سلیم اس سے پہلے کچھ کہنے کی کوشش کرتے، ویرا نے انہیں دھکا دیا۔ عزیزن، امیرن کی تیز چیخ ایک ساتھ آسمان کے پردوں کو چیرتی چلی گئی۔

اور اچانک منٹوں میں وہ ہوگیا، جو ان کے خواب خیال میں نہ تھا۔ اچانک پورا نظارہ بدل گیا۔

دروازے پر لٹھ لئے للن یادو کے ساتھ بانکے چودھری اور گاؤں کے ہی ایک دو آدمی کھڑے تھے ۔۔۔ ویرا نے غصے میں اپنے پتا للن یادو کو دیکھا۔ پھر اندھا دھند بھاگتا چلا گیا ۔۔۔

للن یادو آگے بڑھے ۔۔۔ عزیزن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا ۔۔۔ شیخ سلیم سے بولا ۔۔۔

"بالکل مت گھبرائیے شیخ صاحب۔ آپ کی لڑکی ہماری لڑکی ہے۔ ویرا سے تو ہم بعد میں سمجھیں گے۔ آپ بالکل پریشان مت ہوں۔"

بانکے نے مسلمانوں کو پناہ تو دلوا دیا لیکن آن

ازمیں کچھ پورہ میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل
گئی کہ چونڑا بستی کے مسلمان بھاگے نہیں ہیں بلکہ وہاں
کے ہندوؤں نے انہیں اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔
ہتے ہیں یہ خبر پھیلانے والا ویرا تھا، جو پورے گاؤں
سے بیر لے بیٹھا تھا — اور انتقام کی آگ میں سلگ رہا
تھا۔

نفرت کے لاوے کچھ ختم گئے تو نئی پناہ گاہ کی
تلاش شروع ہوئی۔ افسران اعلان کرتے پھر رہے تھے
کسی پر بھی کوئی زور زبردستی نہیں ہے — جو جو لوگ
پنی مرضی سے پاکستان جانا چاہتے ہیں، جا سکتے ہیں۔
اس اعلان کا پاکستان جانے والے مسلمانوں نے
خیر مقدم کیا، یا ان مسلمانوں نے، جو اپنے سامنے اپنے گھر بار
اور اسباب کی تباہی دیکھ چکے تھے۔ جن کا دل ہندوستان
سے بھر گیا تھا اور اب وہ پاکستان میں اپنی نئی دنیا
بسا کر نئی زندگی شروع کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔
اس اعلان کے بعد بانکے چودھری نے گاؤں
کے چاروں مسلمان خاندان کے فردوں سے بات چیت
کی۔ دو خاندان تو یہیں رک گئے۔ لیکن شیخ سلیم اور باقی
بچا ایک خاندان پاکستان جانے پر بضد نظر آیا —
جبکہ بانکے چودھری اور دوسرے کئی لوگوں نے بہت
سمجھایا کہ اگنی پرکشا کی گھڑی ٹل چکی ہے۔ اب کوئی
[illegible] نہیں ہے۔ سب بھائی بھائی ہیں — سب مل جل
کر رہیں گے —
لیکن نفرت کی آندھی اپنا کام کر گئی تھی۔
سامان باندھے گئے —
گھر اونے پونے بیچ دیا گیا —
گٹھری، گٹھریاں بندھ گئیں —

بیل گاڑی ٹھیک ہوئی —
عزیزن نے آخری بار مکان پر نظر ڈالی۔ پیچھ
تھم سی گئی — سب کچھ چھوٹ جائے گا نا — یہ در و دیوار
.... یہ مٹی .... یہ پیڑ پودے ... یہ چاہتوں کے خزانے،
سب کچھ یہیں رہ جائے گا نا، وہاں پاکستان میں پتہ نہیں۔
سب کچھ کیسا ہوگا — ممکن ہے سب کچھ مل جائے — مگر یہ
گھر، یہ مٹی، یہ آنگن اور ان سے لگاؤ — پتہ نہیں تب
تک کتنا کچھ بدل چکا ہو .... اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔
آنکھیں نم ہو گئیں — دوسری طرف منہ سے بیڑی لگائے،
بھدّے ہونٹوں سے مسکراتا ویرا کھڑا تھا۔ اسے دیکھ
کر ویرا نے بیڑی پھینکی، پیروں سے مسلا اور پیچھے چل پڑا۔
عزیزن کا دل دھک سے رہ گیا۔

اسی قافلے کے مسافر تھے ہم
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے
کوئی رستہ تھا نہ منزل کوئی
کہیں کوئی بھی سائباں تک نہ تھا ....
کہیں دور تک آسماں تک نہ تھا ...
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے
پاکستان جانے والوں کا ایک لمبا قافلہ تھا —
اتنے سارے لوگ —
پورا پورا گھر اٹھائے۔ مال و اسباب
بوجھ لئے — حیران و پریشان — ایک خیمے سے دوسرے
خیمے سے — ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ —
یہ سب عزیزن کے لئے نیا تھا۔ اتنے سارے لوگ

ں نے کبھی ایک ساتھ دیکھے نہ تھے۔ پاکستان جانے
یں کا قافلہ اللہ اکبر، نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کرتا ہوا منزل
نزل رواں تھا۔ اچانک قافلے میں کسی بات سے بھگدڑ مچ
۔ کچھ لوگوں کے بیچ مار امار شی ہو گئی ـــــ

بھگدڑ مچی تو لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے ـ

بھیڑ میں عزیزن کا ہاتھ امیرن سے کب چھوٹا، کچھ پتہ
ے نہ چلا ـ عزیزن کو بس امیرن کی ایک زوردار چیخ یاد
ہی تھی۔ پھر دماغ جیسے ڈوبتا چلا گیا ــ کب، کیا ہوا،
یسے ہوا ـــ اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ
بھاگتے ہوئے لوگوں کے پیروں کے نیچے آ گئی تھی ـــــ
میرن کا کیا ہوا نہیں معلوم۔ شیخ سلیم کہاں گئے ـــ
ہ نہیں جانتی ـــــ

آنکھ کھلی تو ایک تنگ سی کوٹھری تھی ـ

چارپائی پر وہ بے سدھ پڑی تھی۔ اور پاس ہی
ویرا شراب کے نشے میں دُھت، بھدے انداز میں ہنستا ہوا
بیڑی پھونک رہا تھا ـ

ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ ـــــ
تم ذلت بھی دیکھو گے
اس لئے کہ تم نے تاج پہنا تھا
اس لئے کہ تم نے حکومت کی تھی
اس لئے کہ تم نے خوشحالی دیکھی ہے
تم ویرانی بھی دیکھو گے
تم زوال بھی دیکھو گے
تم اپنی شکست بھی دیکھو گے
اس لئے کہ تمہیں سکون میسر نہیں ہے
تم اپنی پناہ گاہیں بدلتے رہتے ہو

وقت نے عزیزن کی کہانی تو کب کی ختم کر دی
اس کے پیروں میں کب گھنگھرو کے چھلّے آئے۔ پتہ
نہ چلا۔ لیکن یہ چھلّے وہ زیادہ دن تک اپنے پیروں میں
باندھ سکی۔ تب رانی منڈلی میں عزیزن کی دو ایک
جھلک دیکھ کر ہی اس کے تذکرے زور و شور سے ہو
لگے تھے۔ لیکن عزیزن آخری وقت تک ان اداؤں
میں خود کو باندھ نہ سکی۔ شیخ گھرانے کے خاندانی پن
اتنا تو اثر باقی تھا، کہ جب پہلی بار ویرا نے اسے کوٹھے
پر بھیجا تھا تو اس نے غصہ میں اس کے منہ پر تھوک دیا تھا
ویرا، کوٹھے کی دلالی تجھے اس مقام تک لے آئے
گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ـ

وہ کوٹھے پر ویرا کا تین ماہ کا حمل لے کر آئی تھی۔
شہناز بائی سے اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ یہ بچہ
جیسے بھی ہوگا، وہ پیدا کرے گی۔ پھر اس کے بعد ساری
زندگی وہ اس کے اشاروں پر ناچے گی ـ

شہناز بائی نے حامی بھر لی تھی ـ

اس طرح عزیزن نے گوہر کو جنم دیا اور ہمیشہ
کے لئے آنکھیں موند لیں۔ شہناز بائی سے بھی جھوٹ بولی کہ
وہ ساری زندگی اس کے اشاروں پر ناچے گی ـــ شہناز بائی
نے صبر کیا اور ننھی سی جان گوہر کو پالنے، بڑا کرنے میں لگ گئیں۔
یہ قصہ ۱۹۴۹ء کی پت جھڑ کا ہے ـ جب ایک نئے
آزاد ملک کو نئے نئے منصوبوں سے سجانے سنوارنے کی تیاری
چل رہی تھی ـ

اور کچھ ایسی ہی تیاری شہناز بائی بھی کر رہی تھی،
گوہر کو مکمل طور پر بائی بنانے کی تیاری ـ

(جاری)

نشاط الایمان

اس کے کردار میں

"خرم!" اچانک کسی نے آواز دی۔

میں چلتے چلتے رک گیا اور دائیں طرف مڑ کر دیکھا وہاں میرا ایک دیرینہ رفیق تھا جو اب میری طرف آ رہا تھا۔

اس کا حلیہ کسی غار میں بسیرا کرنے والوں کی طرح ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تو وہ تہذیب اور شائستگی کے لبادے میں ملبوس اور حسنِ صحت سے منور تھا ——— اور اب اسے کوئی دیکھتا ہوگا تو اسے ہپی کے قبیلے کا فرد سمجھتا ہوگا ——— آج کل وہ ہر ناپ کے جریدوں میں نظر آتا تھا اور ناقدوں کی نگاہیں بھی اس کے فن اور فن پاروں پر اٹھ رہی تھیں۔

اس نے بڑی گرمجوشی اور مسرت سے ہاتھ ملایا اور بولا ——— "ارے تم ایک مدت سے دکھائی نہیں دیتے۔"

"مدت سے کیا مراد ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"یہی سال چھ مہینے۔ کیا تم نے لکھنا چھوڑ دیا ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے جواب دیا

"تو تم رسالوں اور اخباروں میں نظر آتے ہو اور نہ ......"

"اچھا یار، پہلے ہم اس ریستوران میں چلیں۔" میں نے اس کے اجاڑ اجاڑ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور جب ہم نے وہاں اپنی پسندیدہ چیزیں کھا لیں اور چائے کا آرڈر دے دیا تو اس سے پوچھا ——— "ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟" گرچہ اس کا آخری سوال میرے ذہن میں تھا۔

"یہی کہ تم بہت دنوں سے کسی ادبی مجلس میں نظر آتے ہو اور نہ تمہارا افسانہ کسی جریدہ میں دکھائی دیتا ہے؟"

"میں آج کل اپنی کہانی سنوانے اور اسے تحریری شکل دینے میں مصروف ہوں۔"

"جبکہ ابھی تک کسی کی نہیں لی اور ادبی جریدوں کے صفحات تمہاری اس مصروفیت سے بلینک ہیں؟"

" یہ بائیگرافی تو ہے نہیں کہ اس کی تشہیر ہو اور تم جانتے ہو میں ہر کام کی تشہیر کے خلاف رہا ہوں۔ اصل میں میری اس کہانی کا تعلق میرے خاندان اور اس کی عورتوں سے ہے اور چونکہ میں اس خاندان کا سربراہ ہوں اس لئے میری یہ کہانی میری اپنی کہانی ہے۔"

" تم تو اپنی اس بات کو گراف کی شکل میں کہہ رہے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ مجھے الجبرا اور علم ریاضی سے دم گھٹتا ہے۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

نہیں پیارے! بالکل کھلی ہوئی کتاب کی طرح بتا رہا ہوں — میں اب تک دوسروں پر فکشن اور طنزیہ خاکے لکھتا رہا ہوں اور اس جنون میں کن کن گلیوں اور شاہراروں کی خاک نہیں چھانی مگر اپنی کہانی لکھنا بھول گیا — پھر سوچا، ہم نے سماج کی زبوں حالی، گرد و پیش کے ہموار اور ناہموار ڈگر، صنف نازک کی خرید و فروخت، جنسی موشگافی، لذائذ نفسانی، سرمایہ داروں کی متلون چالوں اور صنعت کاروں کے استحصال پسند کارناموں جیسے موضوعات پر ڈھیروں چیزیں لکھ ڈالیں اور ہنوز لکھتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم جس رفتار سے حیات انسانی اور اس کے بام و در کو سنوارنے کے لئے خون جگر کھا رہے ہیں اسی رفتار سے سوسائٹی میں نت نئی گراوٹ اور انسانی کردار میں وحشی جانوروں کی طرح خود غرضی اور درندگی پیدا ہوتی جا رہی ہے — اور ہم یہ ہزاروں صفحات اپنے بیوی بچوں، اپنے عزیزوں اور ان کی جائز ضرورتوں کو فراموش کر کے سیاہ کرتے رہے۔ ظاہر ہے ہمارے اس اقدام میں اپنی شہرت اور ادب میں اعلیٰ مقام کی حصول یابی اور چاہ کو زیادہ دخل رہا ہے۔ اور یہ جذبہ اور خواہش آج بھی اسی طرح زندہ ہے!"

" لیکن پیارے! اگر ادیب، شاعر اور دانشور اپنے احساسات، تجربات اور مشاہدات کو عوام کے سامنے نہیں رکھیں گے اور ان پر اندھیرے اجالے کے نقوش کو عیاں نہیں کریں گے تو بتاؤ دنیا اور کتنی برائیوں کے جوہر میں ڈوبتی جائے گی — پھر ادب کرنا سب کے بس کی بات تو نہیں۔ یہ ہنر بھی خداداد ہوتا ہے۔"

" میں تمہارے خیالات سے سو فیصد متفق ہوں۔ لیکن جو افسانہ نگار، شاعر اور ادیب اپنی تخلیق کو بینر اور پرچم بنائے جبکہ ادب بینر اور پرچم نہیں ہوتا تو ایسے رائٹر اور شاعر کی نسبت تم کیا کہو گے — تم خوبصورت لفظوں، حسین جملوں اور نادر تشبیہوں سے حالات کو نہیں بدل سکتے۔ حالات کو بدلنے کے لئے اپنی ہستی کو اس قوت کے تابع کرنا ہوگا جو سب سے بڑا تخلیق کار ہے اور جسے سب پر قدرت حاصل ہے — ادب کے خود ساختہ خدا اور ادب کا استحصال کرنے والے انقلاب کیا لائیں گے۔ اور وہ ان فنکاروں کی کیا قدر کریں گے جو اپنے پرائے کے درد سے تڑپ اٹھتے ہیں اور جن کے اندر کوہ کن کی لگن اور سخت جانی ہوتی ہے۔ مگر جن کو صلہ میں ہمیشہ تنگدستی ملتی ہے۔"

" دیکھو خرم تبریزی اور ناصر شادانی وہاں بیٹھے ہیں۔"

میرے کانوں سے یہ جملے ٹکرائے۔ " بہت دنوں کے بعد خرم کو یہاں دیکھ رہا ہوں۔"

وہ دونوں بھی رائٹر اور ہمارے ساتھی تھے۔

" یار! اتنے دنوں کہاں رہے۔" شوکت جمیلی نے پوچھا۔

" کبھی گاؤں اور کبھی شہر میں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"لکھنا چھوڑ دیا ہے کیا ؟" یہ وسیم ولیشا لوی
جملہ تھا۔

"اسی موضوع پر شادانی سے باتیں ہو رہی تھیں۔"

"کچھ کر رہے ہو ؟"

"آجکل اپنی ساری توجہ اپنے خون کے قریبی رشتوں
.ان کی ضرورتوں پر دے رہا ہوں۔ جب ان سے مہلت
ہے اور موڈ بنتا ہے تو لکھ لیتا ہوں، بس"

"نہیں خرم ! اپنی ذاتی ضرورتوں کے پھیر میں ادب کو
موش نہ کرو۔ حالات کو تم جیسے قلم کاروں کی ضرورت
۔لہٰذا تم اپنی چیزیں کم از کم ان رسالوں میں بھیجواؤ جن
مدیر تمہاری تخلیقوں کے طلب گار ہوتے ہیں اور تم..."

"ڈیر ! میں نے شوکت کی بات کاٹی۔ "میں پریم چند
کے آخری دور کی زندگی کا مرقع نہیں بننا چاہتا
ں اور نہ میں ان ادبا اور شعراء کی طرح اپنی تاریخ
تیب دینا چاہتا ہوں جو اپنی شہرت اور معاشی بلندی
لئے جانے کیسے کیسے حربے استعمال کرتے ہیں، کیسے
سوں کی چمچہ گیری کرتے ہیں اور کس قدر اخلاقی گراوٹ
جوہڑ میں غوطہ لگاتے ہیں اور اس کے طفیل آخر
ایرکنڈیشن روم میں بیٹھتے ہیں اور وہاں مرغ و
ں، وہسکی اور حسن نوخیز سے لطف اندوز ہوتے
۔ رسوخ اور ذرائع کی بدولت سرکاری خطاب
۔اداروں کی طرف سے انعامات حاصل کرتے ہیں۔
کے ملک و قوم کا درد صرف ان کی تحریروں میں جھلکتا
جس پر ان کے عوامی صفحات کے صفحات سیاہ کرتے ہیں
کے اعمال ان کی تحریروں سے بالکل میل نہیں کھاتے
کے کردار بعینہ ان لیڈروں کی طرح ہیں جو ملک
و قوم کے غم میں داد عیش دیا کرتے ہیں۔

"تم اس عریاں حقیقت سے الگ اور اپنی نیک
مرضی کے تابع رہ کر ادب کی خدمت کر سکتے ہو۔ اگر
تم جیسے بے غرض اور صاف ذہن کے رائٹر حالات سے
مایوس ہو کر خاموشی اختیار کر لیں تو ہم لوگ انہیں فرار
پسندی کہیں گے۔ اور ہم چاہیں گے کہ...."

میں مسکرایا اور بولا ـــــ "کیا ہم جیسوں کی
خاموشی سے کوئی انقلاب آیا ہے ؟"

"خرم مہاراج ! انقلاب کی بات پوچھتے ہو تو کہنے
دو، آج کل روز ہی کوئی نہ کوئی انقلاب برپا ہوتا رہتا
ہے۔ ہماری ملکی سیاست تو سراپا انقلاب بن گئی ہے۔
جب اسمبلی اور پارلیمنٹ میں چور، ڈاکو، بدمعاش،
انتہا پسند مذہبی گرگے (جو دھرم کی آڑ میں ہی راج نیتی
کا رتھ چلاتے ہیں) اور بدترین قسم کے خود غرض افراد
وزارت کی کرسی پر آ بیٹھیں تو یہ انقلاب نہیں تو کیا
ہے۔ پھر یہ تو سیاست ہے۔ تعلیمی اور علمی دنیا کو دیکھو۔
کبھی پی ایچ ڈی کی سند نایاب اور باعث اعزاز تھی
آج گھاس بھوسے کی طرح فروخت ہو رہی ہے۔ کیا تم
اسے انقلاب نہیں کہو گے ؟"

میرا ساتھی یہ کہہ کر میری طرف بغور دیکھنے لگا۔
اس کا اس طرح دیکھنا بے معنی نہیں تھا اور میں کچھ
بولنے ہی والا تھا کہ یکایک میری نگاہ ایک سادہ ڈریس
میں ملبوس خاتون پر پڑی جو ذرا فاصلے پر ایک میز پر
بیٹھنے جا رہی تھی اور میرے بولے جانے والے الفاظ گویائی
کے پردے پر نہیں آئے۔ اس خاتون کے ساتھ اس کا
پتی بھی تھا۔ وہ اردو ہندی کی مقبول ادیبہ تھی اور اس
کا پتی ایک کالج میں انگریزی زبان کا لکچرر تھا۔ دونوں
بڑے با اخلاق، بامروت اور ملنسار تھے۔ ان

سے میرا کافی ربط ضبط تھا اور وہ دونوں میرا بہت احترام کرتے تھے۔

جب پردیپ نے آشا کو بتایا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں تو وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور فوراً میرے پاس پہنچی — ارے خرم بھیا! کہاں غائب رہے اتنے دنوں؟ اور پھر میرے رفیقوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ اگر آپ لوگوں کو ناگوار خاطر نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے ان کو اپنی میز پر لئے جاتی ہوں؟

ضرور لے جائیے آشا دیدی؟ شادانی بولا۔ وہ آشا سے اچھی طرح واقف تھا۔

ہم اس کی میز پر پہنچے۔ پردیپ نے اٹھ کر بڑے خلوص سے ہاتھ ملایا اور میرے بیٹھنے کے بعد ہی وہ اپنی کرسی پر بیٹھا۔

"کہاں تھے آپ اتنے دنوں؟" آشا نے پھر پوچھا۔

"چھٹی لے رکھی ہے۔ ویسے شہر آتا رہتا ہوں۔ مگر ادبی سرگرمیوں سے فی الحال دور ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے لوگوں سے اتفاقاً کہیں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اصل میں بچوں کے لئے گاؤں میں خستہ مکان کو توڑ کر نیا بنوا رہا ہوں۔ اتنے پیسے نہیں کہ شہر میں زمین خرید کر بنواتا۔ وہاں اباو اجداد کی زمینیں ہیں۔ کچھ پیسے پی۔ الیف۔ (پراویڈنٹ فنڈ) سے حاصل کئے، ایک قطعہ زمین گروی رکھ دی اور تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ دو کمرے تیار ہو چکے ہیں اور باقی رک رک کر بن رہے ہیں۔ اردو ادب نے تو صرف شہرت بخشی ہے۔ اس سے خاطر خواہ پیسا تو نہیں بیا سکتا۔ اس ادب سے وافر پیسے کی توقع فضول ہے ہاں درسی کتابوں کی تالیف سے پیسے ضرور ملے ہیں۔"

"لکھنا تو نہیں چھوڑا ہے؟"

مکان بنوانا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ کرنا بھی تو کہانی لکھنا ہوا؟ میں نے جواب دیا۔

دونوں بے ساختہ ہنس پڑے — بالکل درست کہا آپ نے" پردیپ جی نے کہا۔

میں بھی اس کا قائل نہیں کہ پریوار کے لوگوں کے حقوق کو فراموش کر کے اور اپنے وجود کی بنیادی ضروریات کو بھول کر دن رات لکھتے جاؤ۔ پڑھنے والوں کے خطوط اور پرکھنے والوں کی واہ واہ سے لیکھک کے عزیزوں کے پیٹ تو نہیں بھر سکتے، بھلے ہی لیکھک خوش ہو لیتا ہو۔ میں آشا کا شکر گزار ہوں کہ وہ لیکھک ہوتے ہوئے بھی اپنے پریوار کے فرائض سے غافل نہیں ہوتی ہے"

اس کے بعد کچھ دوسری باتیں ہوئیں۔

"اچھا پردیپ جی! کل اتوار ہے۔ میں صبح دس ساڑھے دس بجے تک آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ دیکھو آشا میرا لنچ بھی تیار رکھنا۔ تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد سیدھا گاؤں چلا جاؤں گا۔" اور ان کو آداب کر کے اپنے دوستوں کے پاس آیا جو میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے

ہم لوگ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے بل کے پیسے ادا کئے اور سبھوں کے ساتھ رستوران سے باہر نکل آیا—

شام کی انگلیاں شب کی زلفوں کو سنوارنے لگی تھیں۔ راستے اور دکانیں رنگا رنگ بتیوں اور قمقموں سے جگمگا رہی تھیں۔ چہل پہل امڈے ہوئے سیلاب کی طرح ہو گئی تھی۔ زندگی اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ سب اپنی اپنی دنیا میں غلطاں اور مگن تھے — ایسے لمحوں میں تو گاؤں دیہات کی فضا پر ایک سکوت کی چادر تن جاتی ہے — مگر شہر ایک ہنگامہ خیز اور تجریدی آرٹ کی کٹنگ سا لگ

ں تصویر نظر آتا ہے ۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے
یسے ایسے زنداں کی کوٹھڑی میں قید ہوں جہاں خضر
برم کو بھی رکھا جاتا ہے ۔ اگر میں شہر میں رہنے سہنے
ی نہیں ہوتا تو یقیناً اس قید خانے میں میرا دم
تا ۔

میں شادانی کے ساتھ چل رہا تھا ۔ شوکت اور
دوسری طرف چلے گئے تھے ۔

میں نے شادانی سے پوچھا ۔ " تم نے اپنے حلیہ
یوں بنا رکھا ہے ؟ "

" کیا ہوا ہے میرے حلیے کو ؟ "

" چوسا ہوا آم نظر آتے ہو ۔ "

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

" مجھے معلوم ہے کہ تم نے اچھی خاصی ملازمت کو
ت کی بنا پر چھوڑ دی ہے اور آجکل ایک اردو
ے سب ایڈیٹر ہو ۔ ظاہر ہے اس جاب سے تم
اندان کی نگہداشت تنگی سے کر رہے ہو ۔ اور اس
بوجھ نے تمہیں میخانے کا راستہ دکھا دیا ہے ۔
باز بننا چاہتے ہو ۔ مجاز تو غم عشق اور غم دوراں
نے کے لئے پینے پلانے کا شکار بن گیا تھا لیکن شاید
پنی معاشی الجھنوں کو فراموش کرنے کی خاطر
ع کیا ہے ـــــ اور کبھی کبھار اپنے بگڑے اور
ستوں کی جیب پر کسی کال گرل کا بستر بھی گرم
۔ شادانی صاحب ! یہ بیماری عام طور پر
اور امریکہ کے قلم کاروں میں پائی جاتی ہے کیونکہ
ہذیب اور معاشرت میں سکس لباس کے بدلنے
ہو گیا ہے ـــــ مگر تم کو مشرقی روایت کے مطابق
ینت سے تم ر ۔ تم اپنی تخلیقوں میں سماجی برائیوں

کی نشاندہی کر کے ان سے نفرت کی دعوت ہو ۔ لیکن تمہارا
کردار خود ان غلاظتوں سے اٹا ہوا ہے ۔ تم اپنے اس
اقدام کا جو نام دے ڈالو ۔ مگر میں تمہیں کمینہ کہوں گا ۔
اس سے زیادہ سخت لفظ میرے ذہن میں نہیں آ رہا ہے
ورنہ وہی استعمال کرتا اور ۔ ۔ ۔ ۔ "

" حرامی کیسا رہے گا ۔ مطلب یہ کہ ایسے ہی لوگ
تو دوغلا کردار کے ہوتے ہیں ۔ " شادانی مسکرا کر بولا ۔

میں اس کا منہ دیکھنے لگا اور بعد ازاں بولا ۔

" سنو پیارے ! شاید اردو ادیب کی اس تنگ
حالی کو دیکھ کر شین مظفر پوری کے ایک افسانوی
کردار نے کہا ہے کہ اگر میں اپنے کسی بچہ کو اردو ادب
کی طرف مائل دیکھوں گا تو اسے زہر دیدوں گا تاکہ وہ
اردو کا ادیب بن کر گھٹ گھٹ کر مرنے کی بجائے ایک
ہی مرتبہ موت کا مزہ چکھ لے ۔ "

" کیا تم اس کردار کے ہم خیال ہو ؟ " اس نے
پوچھا ۔

" میں بچہ کو زہر دینے کے بجائے کسی دوسری راہ
پر لگانے کی رائے دوں گا ۔ " اور یہ کہہ کر اس سے پوچھا ۔
" تم کو ابھی کہیں جانا ہے ؟ "

" بس ایک دو گھنٹہ کے اندر اخبار کے دفتر جاؤں
گا ۔ "

" اچھا تو سنو ۔ میرے گاؤں کے ہائی اسکول میں ایک
جگہ خالی ہوئی ہے ۔ تنخواہ مناسب ہے ۔ تم اس جگہ کے
لئے موزوں ہو ۔ تم اس پر چلے جاؤ ۔ اسکول پڑھنا
مقام پر ہے اور وہاں کے اشخاص کے افراد نیک سیرت ،
سمجھدار اور محنتی [illegible] نہیں بلکہ باصلاحیت ہیں ۔
تم وہاں [illegible] انجام دے سکتے ہو ۔

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلد آنا لازمی)

نام :- تنویرات
نام مصنف :- قیوم خضر
نوعیت :- نثری تخلیق (منتخب مضامین کا مجموعہ)
ضخامت :- ۱۲۰ صفحات = قیمت :- ۱۲/ روپے
سنہ اشاعت :- ۱۹۸۸ء
ملنے کا پتہ :- اشارہ پرکاشن پٹنہ ۶ (۲) مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی ۲۵ (۳) بک امپوریم پٹنہ (۴) کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴

"تنویرات" اردو کے جانے پہچانے ادیب قیوم خضر کے ان مضامین کا منتخب مجموعہ ہے جو شائع یا نشر ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں کل ۴۰ مضامین ہیں۔ جن میں ۲۷ مضامین آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہو چکے ہیں۔ ۶ مضامین مختلف سیمیناروں میں پڑھے جا چکے ہیں۔ یا کہیں اور شائع ہوئے ہیں۔ صرف ۷ ہی ایسے ہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ غیر شائع شدہ ہیں یا کسی نشریے میں نشر نہیں ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صاحب مضمون نے اپنی تحقیقات اور اپنے نام کو دوام بخشنے کی سعی کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے اس جذبے کا بھی احساس ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کتاب کا مطالعہ کر کے افکار و پیغامات سے مستفیض ہو سکیں۔

زیر نظر مجموعہ میں مصنف نے اپنے تمام تر مضامین کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "تنبیہ" ہے جس کے معنی سرزنش، آگاہی، تاکید اور خبرداری کے ہیں۔ عنوان کی مناسبت سے اس میں دس مضامین ہیں جو مضمون نگار کی دور رسی، دور بینی، اس کے عمیق مطالعہ اور کھلے ذہن و فکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہمارے دل و دماغ کے تاریک دریچوں کو روشن کرتے ہیں اور ہماری زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے والے پیغامات سے لبریز ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان "تنویرات" ہے جو اپنے مواد کی مناسبت سے اس کتاب کا بھی نام ہے۔ اس کے معنی نور اور روشنی کے ہیں۔ اس باب میں بیس مختصر مگر اہم مضامین ہیں۔ یہ مضامین نہ صرف معلوماتی ہیں بلکہ ان کے زیریں لہروں میں اور ان کی تہوں میں چھپا پیغام جہاں ایک طرف ہمارے دل و دماغ اور افکار و ذہن کو اپنے نور سے

منور کرتا اور دل و دماغ پر چھائے گہرے کہر کو صاف کرتا ہے وہیں دوسری طرف ہمیں اپنی ذات اور کائنات کو پرکھنے کا موقعہ دیتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر زندگی کا پیغام چھپائے ہوئے ہیں جو مصنف کی عالمانہ صلاحیت اور الفاظ و بیان پر اس کی گرفت کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان "تنزہات" ہے جس کے معنی تفریح کے ہیں اس باب میں کل سات مضامین ہیں۔ یہ مضامین دیومالائی قصوں کے علاوہ دسہرہ، ہولی، راکھی، بھگوان مہابیر، اور فراق گورکھپوری کی شاعری کے متعلق ہیں۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے تہواروں کا مذہبی، سیاسی اور سماجی پس منظر پیش کیا ہے۔ فراق کی شاعری پر اپنے طویل مضمون میں مصنف نے جن نکات پر روشنی ڈالی ہے اس سے اس کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں "بقول غالب" مضمون نگار کے مزاج اور طرز نگارش پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد معروضات کے عنوان سے عرض حال یا پیش لفظ پیش کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بہت ہی صاف اور واضح ہے۔ مصنف نے اپنے فن اور اپنے افکار کو کھل کر پیش کیا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ

"میری ان تخلیقات میں ایجاز کا فن اتنا نمایاں ہے کہ آپ قطرہ میں دریا دیکھ سکتے ہیں"

یا

"زیادہ سے زیادہ خیالات کو کم سے کم لفظوں میں پیش کرنا کمال فن بھی ہے اور حسن کمال بھی۔ لفظوں کی بے جا بہتات اچھی نثر کے لئے بے حد مضر ہے۔ گٹھی اور سنجی ہوئی متناسب اور متوازن نثر لکھنا بے حد مشکل فنکارانہ عمل ہے۔ نثر کی کھلی اور وسیع فضا میں آہستہ سانس لینا بے حد نازک فن ہے۔ نزاکت فن کا یہ وجدان بہت ہی کم نثر لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے"

مگر افسوس کہ بعض موقعوں پر جذبات رو اور خیالات کے غلبہ کے باعث وہ خود بھی اس کے شکار ہو گئے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر ایجاز کا فن ان کی تحریروں میں نمایاں ہے اور ہر لفظ سے معنی کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مضمون نگار کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ "اکثر مجموعے مضامین کی یکسانیت اور سپاٹ پن کی بنا پر قارئین کے لئے اکتاہٹ کا سبب بن جاتے تھے" میرے خیال میں صد فی صد درست نہیں ہے کیونکہ ایک مصنف اپنے مجموعہ مضامین کو کسی خاص نظریے کے تحت پیش کرتا ہے اس لئے اس کے مواد اور پیش کش پر بھی دھیان دینا چاہئے جس کا فقدان ادیبوں کے ایسے بے شمار مجموعے ہمارے یہاں ہیں جن میں مضامین کی یکسانیت اور سپاٹ پن بدرجہ اتم موجود ہیں مگر وہ اپنے مواد اور پیش کش کی فنی چابکدستی کے باعث قاری کے لئے اکتاہٹ کا سبب نہیں ہیں۔ جہاں تک صاحب مضمون کا تعلق ہے ان کے سامنے اپنی مختلف ریڈیائی تقریروں اور شائع شدہ مضامین یا غیر مطبوعہ مضامین کی حفاظت اور اسے ابدی زندگی دینے کا اہم مسئلہ تھا (جس کا اعتراف وہ خود ہی کر چکے ہیں۔) اس لئے اس مختلف عنوانات کے تحت رنگا رنگ ہونا لازمی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے تمام ابواب "ترشحات" کے تحت درج کئے گئے ہیں۔ ہاں ایک خوبی جو مجھے اپنی انفرادیت کے ساتھ نظر آرہی ہے وہ یہ کہ تمام ابواب

کی فہرست اور صفحات پر حواشی ہیں اور ان کے لئے عربی کے حروف کا استعمال کیا گیا ہے جو مصنف موصوف کی عرق ریزی، محنت اور فنی بصارت کا ثبوت ہے۔ بعض مضامین کے آخر میں جلی حروف میں جملے ... مضمون کا ماحصل اور ہماری زندگی کے ... ہیں۔

اس کتاب میں شامل ہر مضمون اپنی افادیت اور اساسی عظمت کی وجہ کر اتنا اہم ہے کہ اس پر اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ایک طویل اور بھاری بھرکم مضمون ہو جائے گا جس کی گنجائش تبصرے میں نہیں ہے۔ لہذا اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "تنویرات" قیوم خضر کی وہ شاہکار تصنیف ہے جس کا مطالعہ ہر ذی علم اور ادبی ذوق رکھنے والے انسان کے لئے ضروری ہے۔ اس کتاب کا گیٹ اپ بھی خوبصورت اور طباعت بھی اچھی ہے ساتھ ہی اس وقت کی گرانی کے لحاظ سے قیمت بھی مناسب ہے۔

(ڈاکٹر) سید ابوالفیض سیدابادی

نام
نوعیت :۔ قومی یکجہتی سے متعلق ناولٹ
مصنف :۔ الیس شمس الحسن گیاوی
قیمت :۔ دس روپئے
سنہ اشاعت :۔ ۱۹۹۱ء ۔ تعداد صفحات :۔ ۳۲
ملنے کا پتہ :۔ (۱) ظفر بک ڈپو گوتم بدھ روڈ گیا۔ (۲) عزیز بک ڈپو بارِی روڈ گیا (۳) بہار بک ایجنسی باری روڈ گیا

سید شمس الحسن اردو دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ہے جنہوں نے اپنی اشاعت کا سفر اپنی کہانی "احسان" مطبوعہ ماہنامہ "نگینہ" کشمیر ماہ جون ۱۹۶۶ء سے شروع کیا کے بعد سے آج تک سرگرم سفر ہے۔ اس سفر کے دوران جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات کا اظہار کہانیوں اور افسانوں کے ذریعہ کر چکا ہے۔

زیر نظر کتابچہ "سپنے بکھر گئے" جسے مصنف نے ناولٹ بتایا ہے انہیں تجربات کا ایک حصہ ہے جو قومی یکجہتی کے تحت ہندو مسلم دوستی ہے، ایک ایسی دوستی جو زندگی کے پرپیچ و خاردار راہوں سے گذرتی چتا کی انتم سنسکار تک قائم رہتی ہے۔ ساجد اور ... ایک جان دو قالب ہیں۔ رتن کی انتم اکچھا کے مطابق رتن کی لاش (نعش) کو آگ دیتا ہے۔

اس سبق آموز اختتام میں مصنف نے جس مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے اسے پڑھ کر عش عش کرنے لگتا ہے۔ قومی یکجہتی کی اس سے بڑی کوئی مثال شاید ہی ہمارے بڑے سے بڑے ادیب کر سکے ہوں۔

ناولٹ کا لکھنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ اس میں بڑی ہوش گوش سے کام لینا پڑتا ہے اور ہمیشہ چوکنا اور چوبند رہنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی فن ناول نگاری کے التزامات کو برتتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر کے سامنے پیش کرنا بھی جو فنی طور پر ایک مشکل کام ہے جہاں کبھی کبھی تو اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔

زبان و بیان اور طباعت کی خامی کے باوجود ناولٹ قابل مطالعہ ہے مگر اس کی قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

(ڈاکٹر) سید ابوالفیض سیدا[بادی]

نام کتاب :- منشی راج رہبر کے منتخب افسانے

ایک تعارف

مرتب :- [illegible]

پبلشر :- پنجابی [illegible]

طبع :- [illegible]

[illegible] سنہ اشاعت :- ۱۹۹۱ء

قیمت :- [illegible] تعداد صفحات :- ۱۴۴

افسانہ نگار کی حیثیت سے ہنس راج رہبر کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی اور انگریزی زبان میں بھی افسانہ، ناول، خاکہ نگاری، سوانح اور تحقیق و تنقید پر مجموعے اور کتابیں تحریر کی ہیں [illegible] میں ۲۹ افسانوی مجموعے اور ناول ہیں۔ اس طرح یہ بجا طور پر ایک پختہ اور بالغ الذہن افسانہ نگار اور ناول نگار سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔

رہبر بنیادی طور پر اشتراکی ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں اشتراکی ذہنیت۔ مزدوروں کے مسائل، استحصال، ظلم جبر و تشدد کے واقعات کی جھلکیاں۔ محنت کی اہمیت، روزانہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل۔ نفسیاتی اور ذہنی کشمکش کے واقعات و حالات کا کرب ان سے عہدہ برا ہونے کی سعی، بدلتے ہوئے سماج اور اس کے زیر اثر [illegible] تبدیلیوں کا ذکر، انداز فکر میں تبدیلیوں کے اشارے۔ شخصی کردار کے بلندی و پستی کے واقعات۔ عورت کی نفسیات۔ حالات سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب، تنگ نظری اور مفاد پرستی کے خلاف لڑنے کی ترغیب اور سیاسی و سماجی بے راہ روی اور برائیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہبر کے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر وضع کئے ہوئے اصول و حقائق اور بعض قیمتی نصائح بھی ملتے ہیں جن سے ہم اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو بہتر سنوار [illegible] سکتے ہیں۔

رہبر کا اپنا نصب العین اور آدرش ہے جو کہ چاپلوسی اور مصلحت آمیزی سے مبرا ہے۔ وہ اپنے قلم کے جادو اور فنی چابکدستی سے اپنے ہر افسانے میں نہایت خوبصورت انداز میں اپنے نصب العین کو حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی ان کا معراج اور کمال فن ہے جو انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔

رہبر کہانی میں پریم چند کے مقلد ہیں۔ اس لئے ان کی کہانیوں میں حقیقت پسندی، ذاتی تجربات اور ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے تمام تر افسانے ہماری روزمرہ کی زندگی کے عکاس ہیں اس لئے قاری کو اجنبیت اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

رہبر کا اسلوب بیان سیدھا سادا اور عام فہم ہے۔ وہ الفاظ کی بازیگری اور بیان کی پیچیدگی سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ ان کی کہانی آغاز سے انجام تک دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے۔ ان میں کہانی اور مختصر افسانے کی ساری فنی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ ان کا نقطۂ عروج انتہائی اعلیٰ درجے کا اور واضح ہوتا ہے۔ کہیں کسی رکاوٹ یا بوجھل پن کا احساس قاری کو نہیں ہوتا۔ ہم ان کے افسانے پڑھنے کے بعد غیر ارادی طور پر خود بخود ان کے پیغامات کو دل کی گہرائیوں سے قبول کر لیتے ہیں۔ ان کے افسانے دیر تک قاری کے دل و دماغ [پر] [illegible]



گھنے بادلوں کی طرح چھائے رہتے ہیں۔

ان کے کامیاب ترین افسانوں میں "قب اور ب" "زخم" "لاکٹ" "سالگرہ" "کٹولنا" "راجا رام" اور "وہ نا چیز نہیں تھا" ہیں۔ اس مجموعے میں کل ۱۶ افسانے ہیں۔ مرتب نے ان افسانوں پر بیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔

اس کتاب کی طباعت اچھی، سرورق اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ مگر قیمت عام آدمیوں کی پہنچ سے زیادہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی تروتیج و اشاعت کے لئے کم قیمت پر کتابوں کی اشاعت کا جامع منصوبہ بنایا جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اچھے سے اچھے ادیب کی تحریروں کے مطالعہ سے مستفیض ہو سکیں۔

● ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی

شہر خیال

پرسوں شام کی ڈاک سے سہیل کا خاص نمبر ملا۔
نے جس خلوص و مہربانی سے یہ نمبر شائع کیا اس کے لئے
ن میں۔ مشمولات سبھی معیاری ہیں۔ لیکن رستوگی صاحب
عارف کے علاوہ مجھے پروفیسر علیم اللہ حالی کا مضمون بطور
سا پسند آیا۔ موصوف نے وقت نظر اور گہری بصیرت
ورت بھی دیا ہے اور نقد و نظر میں معروضی فکر کا دامن
ہ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ مزید برآں ایک مخصوص نکتہ
اکیا ہے۔ آپ کا [illegible] اول' مختصر لیکن جامع ہے۔
اس نمبر کے سلسلے میں چند اغلاط کی تصحیح کی طرف
مارے ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔ جو چند غلط فہمیوں کا
ذکر سکیں۔

میں انگریزی زبان و ادب کی پروفیسر نہیں ہوں، جیسا
یرے کرم فرما جناب تارا چرن رستوگی صاحب کے تعارف
اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان کے گراں قدر مضمون "اردو شعر
ب میں ساجدہ زیدی کا مقام (مشمولہ روح ادب جنوری
ہ ۱۹۹۱ء) سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ میں تو تعلیمات کی
لب علم اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات کی
پروفیسر ہوں (شعبہ سے ریٹائر تو ضرور ہو چکی ہوں لیکن
پروفیسر تعلیمات ہی کی ہوں)

(۲) کتابت و طباعت کی غلطیاں یوں تو جا بجا
ہیں (یہ اعتراض نہیں صرف اظہار واقعہ ہے) لیکن حصۂ
نظم۔ اور نظموں کے اقتباسات میں جہاں یہ غلطیاں
در آئی ہیں۔ اس کا اغلاط نامہ شائع کرنا ضروری ہے۔
کیونکہ فی زمانہ اوزان و بحور کی پابندی نظم آزاد میں
کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ نثری نظم کا چلن بھی عام
ہے۔ میں اوزان اور بحروں کی پابندی کو نظم آزاد میں لازمی
قرار دیتی ہوں اور نہیں چاہتی کہ میری نظمیں قارئین اس
طور پر پڑھیں کہ اغلاط کو سقم وزن سمجھیں۔ چند اس
نوع کی غلطیوں کی نشاندہی پیش ہے۔

صفحہ۸۔ "میں کیا ہوں؟ / کون ہوں / کیوں
ہوں" یہ صحیح ہے۔ یعنی "کیوں ہوں" کا اضافہ

(۲) سطر ۱۴۔ "میرے چاروں جانب"۔ یعنی چاروں
کا اضافہ

(۳) سطر ۲۴۔ "بے معنی ہے" یعنی ہے کا اضافہ
صفحہ ۱۱۔ آخر سطر کے بعد "میرے اطراف"
کا اضافہ۔

صفحہ ۱۵، سطر ۱۷ میں۔ "رات کٹ جائے" کے بعد
"تو" زائد ہے اس کا اخراج۔

صفحہ ۲۶۔ سطر ۱۹ میں "میں اپنا دیرینہ اضطراب"
یعنی میں کے بعد "اپنا" کا اضافہ۔

صفحہ ۲۸۔ سطر ۱۔ "انگارے" کے بعد "سے" زائد
ہے۔ اس کا اخراج۔

صفحہ ۳۰۔ سطر ۴۔ "میں اس کے ہمراز کی امین
ہوں" ہمراز غلط چھپ گیا ہے۔

صفحہ ۴۳ سطر ۱۱ - "ہستیاں ڈوب جاتی ہیں" "مستیاں" غلط چھپا ہے۔

صفحہ ۴۴ سطر ۵ "بے کراں گہرا اندھیرا" "گہرا" چھوٹ گیا ہے۔

صفحہ ۴۴ - سطر ۱۲ "کارگاہِ ہنر" ہنر غلط چھپا ہے۔

صفحہ ۷۸ - سطر ۲۲ "موت ہر لمحہ ہستی کے تعاقب میں رواں" صحیح لفظ ہستی ہے۔ نیستی چھپ گیا ہے۔

ایک آخری بات۔ سید احمد قادری صاحب کے مضمون کے سلسلے میں بہ کمال انکساری عرض کرنا ہے۔

"آتشِ سیال" کے تعارف میں۔ میں نے جن مشاہیر کے نام درج کئے ہیں۔ میں نہ تو ان کے "فلسفیانہ خیالات" کی اسیر رہی (قادری صاحب کا جملہ) کہ ان میں سے کئی تو فلسفی یا ادیب نہیں محض مصور ہیں یا سنگ تراش۔ اور نہ ہی ان کے خیالات کا اثر قبول کیا۔ ان ناموں کے ضمن میں "متاثر" کا لفظ میں نے اثر قبول کرنے کے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا بلکہ پسندیدگی کے معنی میں کیا تھا۔ انگلش میں دو لفظ ان الگ الگ مفاہیم کے لئے استعمال ہوتے ہیں AFFECTED - (متاثر ہونا) اور INFLUENCED - (اثر قبول کرنا) میرا مفہوم AFFECTED تھا جسے موصوف نے Influenced سمجھ کر مجھے ان مشاہیر کے خیالات کا اسیر گردانا، فلسفے کا اسیر سمجھا اور یہ بھی حکم لگا دیا کہ "سیلِ وجود" تک پہنچتے پہنچتے میں نے "فلسفے کی اسیری سے نکلنے کی کوشش" کی وغیرہ۔ قادری صاحب کے خلوص کی قدر افزائی کے ساتھ ان سے عرض یہ کرنا ہے کہ اگر وہ اپنے مطالعے کی بنا پر یہ کہتے ہیں تو اس "اثر پذیری" کی نشاندہی کرنے کی زحمت کریں اور اس "اسیری" کا پتہ بتلا دیں۔ اگر میرے تعارفی نوٹ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے تو میری وضاحت پر غور کریں۔ میں نے شاعری میں کوئی فلسفہ منظوم نہیں کیا بلکہ میری اعتقاد [illegible] انسانی تقدیر اور ماحول و کائنات کے [illegible] مظاہر کو جب تک اپنا ذاتی تجربہ نہ بنا لوں۔ اس میں ڈوب نہ جاؤں انہیں شعر کا جامہ پہنا ہی نہیں سکتی۔ اب اگر اس سلسلے میں کسی خاص پہلو کی غور و خوض کے نتیجے میں کوئی فلسفیانہ نکتہ پیدا ہو جائے تو اسے میری ہی کمزوری (یا قوت) سمجھئے۔ اس نوع کے REFLECTIONS مستعار نہیں لئے جاتے۔

اور سب مقالہ نگاروں کے ساتھ میں قادری صاحب کی بھی از حد ممنون ہوں اور ان سب کی خواہش اور عنایت کی قدر کرتی ہوں۔ یہ اشارے تو محض غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے دیئے ہیں۔

ایک بار پھر آپ کی قدردانی کا شکریہ ادا کرتی ہوں، ان الفاظ کے ساتھ کہ مجھ ناچیز کے لئے "سہیل" کا یہ نمبر مخصوص کر کے آپ نے میری ادبی خدمات کے افہام و تفہیم کے لئے جو راہ کھولی ہے وہ بہت اہم ہے۔ آپ کی ادب نوازی کی غماز ہے اور آپ کے خلوص کی آئینہ دار ہے۔ ادب میرے لئے زندگی کرنے کا وسیلہ ہے — اور آئندہ نسلوں کے لئے میرا ادبی تحفہ۔ آپ جیسے حضرات اس کی قدر افزائی کرتے ہیں یہ میری خوش بختی ہے۔

▲ ساجدہ زیدی، علی گڑھ

"سہیل" کا ایک شمارہ ساجدہ زیدی کے نام دستیاب ہوا۔ بہت بہت شکریہ!

آپ تو اردو ادب کے بیش بہا موتی اور لال کو سامنے لاتے ہیں جن پہ تمام ہندوستان اردو کے نقاد نے "نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی اور وہ کوڑے کرکٹ کو ہی "جولان گاہ" بنائے رہے۔ خدا کی قسم اگر میں کسی رسالہ کا مدیر ہوتا تو آپ کے اس اقدام پر رشک کرتا۔ بہرحال رشک نہیں دلی مبارکباد تو ضرور دوں گا۔ یہ نمبر مختصر سہی مگر جامع ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کوزہ میں دریا کو بند کرنا۔ زیدی صاحبہ پر اتنی چیزوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کی شاعرہ اور فنکار ہیں۔ پھر اس میں خود ان کی تخلیقوں نے ان کے فن اور ان کی ادبی شخصیت کو جلا بخشا ہے اور ان سے ان کے فن اور فن پاروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

محترم رستوگی صاحب کسی شخصیت پر لکھتے لکھتے بلا وجہ اقبال کا ذکر غیر ضروری انداز میں کر بیٹھتے ہیں۔ کیا اس سے اقبال کی عظمت میں کمی ہوگی؟

مسعود سبزواری صاحب نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کی صداقتوں کو بوسیدہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ زندگی اور موت کی حقیقت پر کون سا جملہ رقم کریں گے۔

اور رفیعہ منور حالی صاحب کے اس مفہوم پر کہ جدید روشنی نے عورت کو صحیح مقام بخشا ہے، ماتم کرتے کرتے رہ گیا۔ کیا خوب! یہ کہی ہے جناب حالی نے۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اسلام کا مطالعہ صرف موجودہ دور کی روشنی میں کیا ہے۔ جدید روشنی نے عورت کو کون سا مقام عطا کیا ہے اور اس سے وہ کیا فائدہ پا رہی ہے ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں۔

▲ نشاط الایمان، کلکتہ

سہیل برابر موصول ہو رہا ہے، شکریہ!

سہیل کا تازہ شمارہ "ساجدہ زیدی کے نام" اپنے وقت کی بہترین شاعرہ کے فکر و فن کو خراج تحسین ادا کر کے شعر و ادب کی خاموشی سے خدمت کرنے والوں کی قدر افزائی کی دستاویز ہے۔

محترم ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اور جناب علیم اللہ حالی نے شخصیت کے مختلف گوشوں کو قارئین کے لئے روشن کیا ہے۔ دیگر مشمولات بھی معلوماتی ہیں، میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

▲ نصر قریشی، الہ آباد

سہیل کا ساجدہ زیدی نمبر کے ملنے اور اس پہ تبصرہ لکھنے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ عام شمارہ بھی آگیا۔ مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے اور لیس مولسی صاحب آگیا۔ ممکن ہے اب مل جائے یا ڈاک کی نذر ہوگیا ہو۔

ساجدہ زیدی نمبر اچھا اور بہت خوب ترتیب دیا ہے۔ تمام مضامین اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے منفرد اور بھرپور محترمہ کے فن اور شخصیت کے اچھوتے گوشوں کی آسودگی میں معاونت کرتے ہیں۔ اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ایک طرح سے سہیل کے وقار میں آپ نے مزید اضافہ کیا ہے۔ دیگر قارئین کے ساتھ موصوفہ کے فن پاروں کا تنوع اور اسلوب کے تیکھے پن کا میں بھی مداح ہوں۔

▲ حمید المتین نیّاز، بھوپال

سہیل کا شمارہ "ساجدہ زیدی" نمبر پسند آیا۔ کم صفحات میں آپ نے بھرپور مواد دیا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ ایک موضوعی شمارہ اور بہتر

شائع کرتے رہیں تاکہ اس کی اہمیت دستاویزی رہے اس طرح کہ ایک موضوعی شمارہ سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے۔

ادھر سہیل پابندی سے مل رہا ہے اور کتابت و طباعت کا معیار بلند ہوا ہے۔

▲ مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ایک طویل عرصے کے بعد سہیل کا شمارہ ۱۲ دیکھنے کا موقع ملا۔ بے حد مسرت ہوئی کہ "سہیل" کا چراغ آپ روشن کئے ہوئے ہیں۔ ادبی رسالوں کی حالت کسے نہیں معلوم، دھیرے دھیرے سارے رسالے بند ہو رہے ہیں، ان حالات میں سہیل کو زندہ رکھنا قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مضمون دکنی کلچر کافی معلوماتی ہے۔ علیم اللہ حالی کا سفرنامہ تو افسانہ ہے (حقیقت ہے مگر افسانوں کی طرح دلچسپ)

مجموعی طور پر سہیل اپنی سابقہ روایات کا پاس رکھ رہا ہے، یہ مسرت کی بات ہے۔

▲ ایس۔ شفیع مشہدی، پٹنہ

پرچہ واقعی خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور قابل مبارکباد تو یہ امر ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے حق میں صحت، توانائی، تابناکی اور حیاتِ جاودانی کی دعاؤں کے ساتھ۔

شیفتہ فرحت، بھوپال

جلد ۱۵ کا شمارہ ۱۲ ملا بشکریہ۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون اس شمارے کی جان ہے۔ ان جیسے لوگوں سے ایسے ہی جاندار مضامین کی امید قارئین کرتے ہیں ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا سفرنامہ بھی بڑی دلچسپی کا حامل ہے۔ شعری حصے میں شباب للت، ضیاء الانجم اور حلیم صبا نویدی نے بالخصوص متاثر کیا۔ آپ کا نمود (اداریہ) بھی پچھلے شماروں کی طرح بڑا قیمتی اور جان افروز ہے۔

▲ ظفر امام، بتیا

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ روز بروز جاندار ہوتا ہے۔ بالخصوص اداریہ مختصر مگر بے حد سلجھا ہوا رہتا ہے۔ اس مرتبہ کا اداریہ دیدوری کا عمدہ نمونہ ہے۔ مجھے ہندوستان کے مستقبل کے لئے نوشتہ دیوار دکھائی دے رہا ہے۔ غفلت، مصلحت پسندی تو عام شعار ہوگیا ہے۔ جس میں تبدیلی دشوار ہے۔ وقت ہی اس میں تبدیلی لائے تو لائے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون "مغلیہ تہذیب عروج و زوال، صاحب موصوف کے ذوقِ فکر اور وسعت مطالعہ کی ناقابل فراموش دستاویز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اتنی بڑی سچائی جس اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے وہ قابل تحسین ہی نہیں قابل قدر ہے۔ اگر ہندی زبان کے دانشور اس کو تسلیم کریں تو فکر و نظر کا زاویہ بدل جائے کیونکہ بقول ڈاکٹر صاحب "اس دور کی بصیرتیں آج تک ہماری رہنمائی کرتی رہیں اور کرتی رہیں گی۔

▲ محمد عبد القادر ادیب

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی

بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

جلد ۵۲
شمارہ ۳

بدل اشتراک

فی شمارہ ـــــ ۵/= روپے
زرسالانہ ـــــ ۵۰/= روپے
لائف ممبری ـــــ ۱۵۰۰/= روپے

فہرست

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل
ریور سائڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر :- ۲۱۵۷۲

نمود

آنے والا ہندوستان

ہندوستان کا منظر یہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے ۔
اندر اندر اقتصادی طور پر کھوکھلا ہوتا ہوا ہندوستان کس سمت جائے گا اس کا صحیح اندازہ
لگانا مشکل ہے مگر آثار و قرائن کہتے ہیں کہ اب اقتصادیات ہی اس کی تمام تر سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں
محرک ہوگی۔ ملک کا معاشی بحران داخلی صنعتوں کو متاثر کرے گا ۔ دنیا کی بڑی اور اقتصادی طور پر ترقی یافتہ نیز
صنعتی طور پر عظیم طاقتیں ہندوستان کی صنعتوں میں ہی نہیں دوسرے مسائل میں بھی دلچسپی لینے لگیں گی ۔ اندرون ملک
پیداواری طاقتوں کو غیر ملکی مالیات سے آگے بڑھانے کے معنی یہ ہوئے ہیں کہ قیمتوں کی سطح متعین کرنے سے ہم
معذور ہو جائیں گے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ کاری اور محنت میں کشاکش کا ایک نیا باب شروع ہونے
والا ہے ۔ اور ایک بار پھر اقتصادی طبقہ واری جدل سامنے آنے والا ہے ۔ اس لئے کہ اس ملک کے محنت کش
ہی وہی ہیں جو صارف ہیں ۔
لہٰذا اقتصادیات کے راستے سے ہمارے ملک میں آئندہ دس برسوں کے اندر اندر
جو انقلابات رونما ہوں گے ان سے ہمیں باخبر ہو جانا چاہئے ۔ اس طوفان میں بڑی سیاسی طاقتوں بالخصوص امریکہ
کے استحصالی منصوبہ کے پنپنے کا بھی اندیشہ ہے ۔ طوفان آنے سے پہلے ہی ہمیں اپنے تحفظ کا انتظام کرنا ہے۔
اور کمزور ہوتے ہوئے ملک کے عوام کو اپنی اجتماعی قوت کو مضبوط کرنا ہے ۔

(۵۹۱۲۲)

اصغر علی انجینئر

(قسط دوم)

پریم چند حیات اور فن

جیسا کہ پہلے بتایا گیا پریم چند اپنی تنہائی کی اذیت ناکیوں سے بھاگ کر طلسم ہوشربا کی داستانوں میں پناہ لیتے تھے۔ ان داستانوں نے لکھنے کی صلاحیت کو مہمیز لگائی۔ ان کے لکھنے کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کی کہانی ان ہی کی زبانی سنئے ۔۔ "اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال رہی ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی والے اس وقت کے ہردلعزیز ناول نگار تھے ان کی کتابیں جہاں کہیں مل جاتی تھیں اسکول کی یاد بھول جاتی تھی اور کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانے میں رینالڈ کے ناولوں کی بھی دھوم تھی اردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔"

اسی زمانے میں میرے ایک رشتے کے ماموں کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے۔ ادھیڑ ہو گئے تھے اور ابھی تک کنوارے تھے۔ رشتے داریوں میں گھومتے تھے اور سب سے یہی امید رکھتے تھے کہ کوئی ان کا بیاہ کرا دے۔ اس کے لئے سو دو سو بھی خرچ کرنے کو تیار تھے۔ ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی، تعجب۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے آدمی تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں، اوسط قد، سانولا رنگ .... آخر ایک بار انہوں نے وہی کیا جو بن بیاہے لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ چمارن کی ترچھی نظر کے گھائل ہو گئے۔ وہ ان کے یہاں گوبر پاتھنے، بیلوں کو سانی پانی دینے کے لئے اور اسی طرح کے دوسرے چھوٹ پٹ کاموں کے لئے آتی تھی۔ جوان تھی چھبیلی تھی، ماموں صاحب کا پیاسا دل میٹھے پانی کی دھار دیکھتے ہی پھسل پڑا۔ باتوں باتوں میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ ان کے بھاؤ تاڑ گئی۔ ایسی الھڑ نہ تھی اور نخرے کرنے لگی۔ بالوں میں تیل بھی پڑنے لگا۔ چاہے سرسوں کا ہی کیوں نہ ہو۔ آنکھوں میں کاجل بھی چمکا۔ ہونٹوں پر مسی بھی آئی اور کام میں ڈھیل بھی شروع ہو گئی۔ یہ سلسلہ

ہاں تک بڑھا کہ وہ چمارن ہی گھر کی مالکن بن گئی۔"
"ایک دن شام کے وقت چماروں نے آپس میں
پایت کی۔ بڑے آدمی ہیں تو ہوا کریں۔ کیا کسی کی عزت
ا گے... اس لئے فیصلہ ہوا کہ لالہ صاحب کو ایسا
سبق دینا چاہئے کہ ہمیشہ کے لئے یاد رہے۔ عزت کا بدلہ
ون سے ہی چکتا ہے۔ لیکن مرمت سے بھی اس کی کمی پوری
ہو ہی سکتی ہے۔ دوسرے دن شام کو جب چیپا ماموں کے
ھر آئی تو انہوں نے اندر کا دروازہ بند کرالیا... ادھر
ماروں کا جتھا تاک میں تھا ہی، ادھر کواڑ بند ہوئے
ادھر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا..... کواڑ
توڑے گئے۔ ماموں صاحب بھوسے کی کوٹھری میں چھپے
ہوئے ملے.... ماموں صاحب بھاگ کر کہاں جاتے...
ار پڑنے لگی اور بے بھاؤ کی پڑی.... یہاں تک کہ بے ہوش
ہوگئے۔ اس واردات کی خبر اڑتے اڑتے ہمارے یہاں
بھی پہنچی۔ میں نے اس کا خوب مزا لیا۔ اگر انہوں نے کچھ
عاجزی ظاہر کی ہوتی تو شاید ان سے ہمدردی ہوجاتی
لیکن ان کے وہی دم خم تھے، مجھے کھیلتے یا ناول پڑھتے
دیکھ کر بگڑنا یا رعب جمانا اور پتاجی سے شکایت کی دھمکی
دینا۔ یہ اب میں کیوں سہنے لگا تھا۔"

"آخر میں نے یہ ساری واردات ایک ناٹک کی
شکل میں لکھ ڈالی اور اپنے دوستوں کو سنائی۔ سب کے
سب خوب ہنسے۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے اسے صاف کرکے
کاپی ماموں صاحب کے سرہانے رکھ دی اور اسکول چلا
گیا۔" ماموں صاحب نے ظاہر ہے ان کی یہ تصنیف ضائع
کردی اس لئے ان کے لکھے ہوئے پہلے ڈرامے کے متعلق
ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ
۱۲ سال کے اس لڑکے میں لکھنے کی طرف رغبت پیدا
ہوچکی تھی اور ہمیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بچے
بڑوں کے بیجا رعب جمانے کا بدلہ کس طرح لیا کرتے ہیں

پریم چند کو گلی ڈنڈا کھیلنے میں بھی خوب مزا آتا اور
رام لیلا کے کھیل میں بھی انہیں کتنا مزہ آتا تھا انہیں کی زبانی
سنئے۔ دیکھئے کیسے مزے لے لے کر سناتے ہیں۔" ادھر ایک
عرصے سے رام لیلا دیکھنے نہیں گیا تھا۔ بندروں کے بھدے
چہرے لگائے، آدھی ٹانگوں کا پاجامہ اور کالے رنگ
کا اونچا کرتا پہنے آدمیوں کو دوڑتے، ہو ہو کرتے دیکھ
کر اب ہنسی آتی ہے۔ لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب
مجھے بھی رام لیلا میں مزہ آتا تھا۔ مزہ تو بڑا ہلکا لفظ ہے
اسے جوش کہنا چاہئے۔ خوش قسمتی سے میرے گھر سے
بہت نزدیک ہی رام لیلا کا میدان تھا اور اس گھر میں
لیلا پاتروں کا روپ رنگ بھرا جاتا تھا وہ تو
میرے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔ دو بجے دن سے پاتروں
کی سجاوٹ ہونے لگتی تھی... رنگ کی پیالیوں میں پانی
لانا، رام رج پیسنا، پنکھا جھلنا میرا کام تھا۔

پریم چند کو رام لیلا کے ہیرو رام چندر جی سے
بڑی عقیدت تھی۔ وہ انہیں سچ مچ رام چندر ہی سمجھ کر
آدر کرتے۔ کہتے ہیں" لیکن میری عقیدت ابھی تک جوں
کی توں تھی۔ میری نظر میں وہ اب بھی رام چندر ہی تھے
گھر پر مجھے کھانے کی کوئی چیز ملتی وہ لے کر رام چندر
کو دے آتا۔ انہیں کھلانے سے مجھے جو خوشی ہوتی تھی اتنی
آپ کھا جانے میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی مٹھائی یا پھل
پاتے ہی بے تحاشا چوپال کی اور دوڑتا۔" وہ ہمیں یہ
بھی بتاتے ہیں کہ" وماں (سواری) نکلتا تو اسی پر
رام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر مجھے فخر و مسرت کا جو احساس
ہوتا وہ اب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی پر بیٹھ کر بھی

نہیں ہوتا ۔

(۲)

اس طرح کھلنڈرے پن میں بچپن بیتا گیا اور یہ سارے واقعات ہمارے مصنف کے دل و دماغ پر بہت اثر چھوڑ گئے۔ آگے چل کر یہی واقعات ان کی کئی کہانیوں اور ناولوں کے لئے کچا مواد ثابت ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر ہوتے ہوئے دھنپت رائے نویں جماعت میں پہنچ چکے تھے۔ پڑھائی ان کے لئے پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ اپنے گاؤں سے بنارس روزانہ جانا پڑتا۔ باپ سے صرف پانچ روپیہ مہینہ کے ملتے۔ ان دنوں خود اپنی حالت کمنشی جی نے یوں بیان کی ہے۔

• پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ مہنگائی الگ۔ دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی کاشی کے کوئینس کالج میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا تھا۔ پڑھا کر ٦ بجے چھٹی پاتا۔ وہاں سے میرا گھر دیہات میں پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے سے پہلے گھر سے چلنا پڑتا تھا۔ لیکن وقت پر اسکول نہ پہنچ پاتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ جانے کب سو جاتا۔ پھر بھی ہمت باندھے ہوئے تھا۔ تھے نا کتنے کٹھن دن! اور اس پر ماں باپ شادی کرانے کی فکر میں تھے۔ نویں جماعت کے سالانہ امتحان سے کچھ دن پہلے عجائب لال نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی۔ ویسے بھی پورب میں جلدی بیاہ رچانے کا چلن ہے۔ دھنپت رائے بھی خوش تھے۔ منڈپ کے بانس خود ہی کاٹے۔ یہ شادی عجائب لال کے سوتیلے نانا نے طے کی تھی۔ بستی شہر سے دس میل دور ہوا پور سرکاری گاؤں کے ایک چھوٹے موٹے زمیندار کی بیٹی سے رشتہ طے ہوا تھا۔ دلہن کو دیکھنے کا چلن تو تھا نہیں بڑے گھر کی بیٹی تھی اچھی ہی ہوگی۔ دھنپت رائے نے بھی اپنے تخیل میں رنگ بھرے۔ قصے کہانیوں کی شہزادی تصور میں ناچ رہی تھی۔ کوئی مہ جبیں ہوگی سپنوں کی شہزادی۔ شادی ہوئی دلہن کو اونٹ گاڑی پر سوار اپنے گھر لائے۔ دلہن کا گھونگھٹ کیا اٹھا حقیقت عریاں ہوگئی۔ دلہن عمر میں نہ صرف بڑی تھی، کالی بھی تھی، صورت گوارا نہ تھی لیکن یہاں تو سیرت نے بھی دھوکا دیا۔ حقیقت نے دل ہلا دینے والا جھٹکا دیا تھا۔

زبان بھی دلہن نے کڑوی کسیلی پائی تھی۔ ساس سے نبھا نہ سکی۔ چاچی بات بات میں بہو کی شکائتیں کرتی۔ دھنپت رائے کی جان تنگ تھی۔ گھر میں یہ جھک جھک اور سارا دن اسکول اور ٹیوشن کی محنت۔ ادھر چند ہی دنوں میں پرانے پتھری کے مرض سے عجائب لال ایسے بستر سے لگے کر اٹھ نہ سکے۔ آمدنی ایک پیسے کی نہیں اور جو کچھ پونجی تھی بیماری پر خرچ ہوگئی۔ مرتے مرتے وہ اپنے جوان بیٹے کے سر، جس کے پاؤں میں جوتے اور بدن پر ثابت کپڑے بھی نہ تھے اپنی جوان بیوی اور دو بچوں کا بار بھی ڈال گئے۔

نتیجہ یہ کہ ۱۸۹۷ء میں انہیں میٹرک کا امتحان دینا تھا نہ دے سکے۔ اگلے سال بیٹھے تو دوسرے درجہ میں پاس ہوئے۔ اور کوئینس کالج میں داخلہ لینا مشکل ہوگیا۔ ویسے بھی فیس معاف کرانے کے لئے اول درجہ میں پاس ہونا ضروری تھا۔ اسی سال ہندو کالج کھلا داخلے کا تو یہاں انتظام ہوگیا لیکن سوال فیس کا تھا۔

سفارش بھی ممکن نہ تھی۔ اتنے بڑے شہر میں ایک دیہاتی لڑکے کو کون جانتا تھا۔ کہتے ہیں۔" روز گھر سے چلتا کہ کہیں سے سفارش لاؤں پر بارہ میل کی منزل پار کر شام کو گھر لوٹ آتا۔ کس سے کہوں کوئی اپنا پوچھنے والا نہ تھا" اور نواب کو جب اندر نارائن، کالج کے انتظامیہ کمیٹی کے ایک رکن کی سفارش ملی بھی تو قابلیت کے امتحان میں حساب نے بے وفائی کی۔ حساب کے خانے میں غیر اطمینان بخش لکھا کر فیس معاف کرانے سے تو رہے۔" منشی جی آگے کہتے ہیں۔" میں اتنا حواس باختہ تھا کہ پھر پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا گیا۔ حساب میرے لئے گوری شنکر کی چوٹی تھی۔ کبھی اس پر نہ چڑھ سکا۔

لیکن اس کے باوجود دھنپت رائے زندگی سے ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی دھن بھی سوار تھی۔ حساب کے مضمون پر زور لگانے کی ٹھان لی تاکہ کالج میں داخلہ لے سکیں۔ اس کے لئے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ انہیں دنوں خوش قسمتی سے ایک وکیل صاحب کے لڑکے کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے مہینہ اجرت طے پائی۔ اس میں سے تین روپے گھر والوں کی نذر اور دو روپے کے وہ حقدار۔ وکیل صاحب نے اپنے اصطبل کے اوپر کچی کوٹھری رہنے کے لئے عنایت کر دی۔ اس میں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا۔ بازار سے ایک پرانا لیمپ آیا اور شہر میں اسی شان سے زندگی کٹنے لگی۔ اس دور کا خاکہ خود پریم چند نے یوں کھینچا ہے"۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا۔ ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ کا فسانۂ آزاد انہی دنوں پڑھا۔ چندر کانتا سنتتی بھی پڑھی۔ بنکم بابو کے ترجمے جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔"

ادھر پڑھنے کا شوق ادھر جیون کی کٹھنائیاں ادھار لئے بغیر نہ بنی اور ادھار لے کر ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کا کپڑا ادھار لیا کہ تین سال تک چکا نہ سکے۔ زندگی کی محرومیاں اتنی تھیں کہ مہینہ کے آخر میں کچھ روپے — (یعنی دو ڈھائی یا تین) ہاتھ آتے تو من حلوائی کی دکان کی طرف کھینچتا اور کچھ آنے خرچ ہو ہی جاتے آخر پورا مہینہ کھچڑی پر گذر ہوتی تھی۔ خواہشوں کو مارنے کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ چکرورتی حساب کی کتاب جوان کو اپنے مستقبل کی کنجی نظر آتی تھی (کالج کا داخلہ جو اس پر منحصر تھا) اور جیسے دو سال تک سینے سے لگائے رکھا۔ آخر اونے پونے بیچنے کی نوبت آ ہی گئی۔ بھلا پیٹ کے دوزخ کے مقابلے میں کب کون جیتا ہے۔

زندگی جہد مسلسل ہے لیکن ہمارے ارادوں کے باوجود یہ جہد ہمیں ایک سیدھی دشا میں نہیں لے جا پاتا کئی رکاوٹیں ہماری دشا کو بدل دیتی ہیں، لیکن انسان ان حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی دشائیں بدل بدل کر سہی، ایک منزل کی طرف بڑھتے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض وقت کچھ عوامل ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہم غیر متوقع طور پر اپنے آپ کو منزل سے قریب پاتے ہیں۔ ان عوامل کا نام آپ کچھ بھی رکھ دیں اللہ کی مہربانی غیبی امداد، قسمت کے کھیل، زندگی کا جوا یا اپنی ہی انتھک کوشش کا نتیجہ، کچھ ایسی ہی غیر متوقع بات ہمارے دھنپت رائے کے ساتھ بھی پیش آئی۔ انہی کی زبانی سنئے۔

" تقدیر کا کھیل بھی عجب انوکھا ہے۔ کہاں تو

کیسے کیسے پاپڑ بیل رہے تھے، ایک وقت کی روٹی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اور کہاں اب پروسی ہوئی تھالی سامنے رکھی تھی" سوال پوچھنے والے حضرت چنار کے ایک چھوٹے سے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہیں میٹرک پاس ایک ماسٹر کی تلاش تھی۔ تنخواہ بھی اٹھارہ روپے۔ کہنے بھر کی دیر تھی: "اٹھارہ روپے اس سمے میرے مایوس تخئیل کی اونچی سے اونچی اڑان سے بھی اوپر تھی۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھ۔ اگلے ہی دن پریم چند نے اس اسکول ہیڈ ماسٹر سے نوکری پکی کرلی --- یہ واقعہ ۱۸۹۹ء کا ہے۔ تین چار دن کے اندر ہی وہ چنار پہنچ گئے۔ ان کے سوتیلے بھائی وجے بہادر بھی ساتھ تھے۔ جب تک وجے زندہ رہے۔ دھنپت رائے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہی اس سنگت کو توڑا۔ اٹھارہ روپے جو اس وقت ان کی تخئیل کی اونچی سے اونچی اڑان سے بھی اوپر تھے۔ بہت جلد زندگی کی ضرورتوں کے جبر نے ناکافی ثابت کر دیا۔ پھر ٹیوشن کی تلاش جس سے پانچ روپے اور ملنے لگے۔ دھنپت رائے کو زندگی کی اس جدوجہد سے اتنا وقت بھی نہ ملتا کہ گھر کا انتظام سنبھالیں۔ یہ فرض وجے بہادر جب تک زندہ رہے سنبھالتے رہے۔ تنگدستی کا اب بھی یہ عالم تھا کہ جاڑوں کی چھٹیوں کے بعد ہی سے اسکول والے گاؤں لوٹنے کو بھی پیسے نہیں تھے۔ آخر اپنا گرم کوٹ بیچنے کی نوبت آگئی۔ ایک سال پہلے ہی یہ کوٹ بڑی مشکل سے بنا پائے تھے۔

ایک طرف زندہ رہنے کی جدوجہد اور دوسری طرف دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دلانے کی لڑائی پریم چند دوسروں کے ساتھ ہو رہی ناانصافی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس اسکول میں ابن علی نام کے مولوی تھے۔ اسکول کے اعلیٰ عہدیدار ان کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔ یہ بات منشی جی کو سخت … تھی۔ اپنی نوکری داؤ پر لگا کر ابن علی کے لئے لڑے میں خود بھی اسکول سے نکالے گئے۔ اور ابن علی بھی۔ … مساعد حالات میں منشی جی کے لئے یہ بڑی قربانی … انصاف کے لئے لڑنے کا یہی جذبہ ان کو آزادی کی جنگ میں بھی پورا جوش و خروش سے شریک … اور انہیں محنت کش کسانوں کی لڑائی لڑنے و… صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس پر ہم آگے چل … ڈالیں گے۔

بڑی تلاش اور سفارش کے بعد ۱۹۰۰ دھنپت رائے کو ضلع بہرائچ میں پانچویں ماسٹر … پر بیس روپے ماہوار کی نوکری ملی۔ یہیں سے نوکری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ دنوں بعد بہرا… تبادلہ ہو کر فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کے طور پر … گڑھ آگئے۔ گاؤں کے ٹھاکر کے مکان میں ہی … جو ان کے بچوں کو پڑھانے کے عوض ملا تھا۔ یہاں کچھ زیادہ لوگوں سے رسم و راہ نہ تھی۔ گھر اور گھر سے اسکول۔ زندگی میں اب قدر… محسوس ہو رہا تھا۔ اس فرصت کو غنیمت … پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جتنا … اس سے زیادہ لکھتے۔

(جاری)

مسودہ صاف اور خوش خط ارسال …

سیّد علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

غزل کیا ہے یہ سوال اٹھتا ہے۔ اس کا میدان بے حد محدود ہے۔ اور وہ ہے عشق مگر عشق کا بیان ہی کافی نہیں کہ ہر شعر غزل کا شعر کہا جائے یا ہر شعر میں تغزل کی روح جلوہ گر ہے۔ یہ حساس دل کی آواز جو مختلف تجربات کی پیداوار ہے اس کا شعر کے سانچے میں ڈھلنے کا نام ہے۔

جو پوچھو تو عزیزاں دل سے پوچھو یا کہ تم ہم سے
ہماری اور اس کی بات اغیاروں سے مت پوچھو

کبھی کبھی قاری کے ذہن میں یہ بات صاف نہیں ہو سکی ہے کہ غزل کیا ہے۔ انشا کی تعریف کے مطابق کم و بیش یہ ساری غزلیں ہی ہیں۔ مگر جیسا میں نے کہا کہ عشق و محبت کی بنیاد پر ہی غزل کہی جاتی ہے۔ یعنی غزل کے اشعار کے لئے لازم ہے کہ ان میں اپنی محبت اور محبت کے دوسرے کوائف کا ذکر ہو۔ اچھا تو اس قسم کی شاعری بھی ملاحظہ کیجئے۔

(۱) سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ

جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائے کہا آپ نے ارشاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد اے دوست
میں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا ہجر نے ناشاد کیا

(جوش ملیح آبادی)

(۲) افشائے رازِ عشق کا ساماں کئے ہوئے
پھر آگئے وہ بال پریشاں کئے ہوئے
پھر وہ مشقہ بر جبیں کوئی نکلا ہے دیر سے
آہنگ آزمائشِ ایماں کئے ہوئے
پھر بڑھ رہا ہے میری طرف مطرب جنوں
صحرا کو اپنے ساتھ غزل خواں کئے ہوئے
پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں
ہر شے کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہوئے
خنجر بکف بڑھا ہے مری سمت پھر جمال
کہنی تک اپنے ہاتھوں کو عریاں کئے ہوئے
پھر آگئے ہیں وہ سامنے الٹے ہوئے نقاب
سو طور اک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے
پھر اس نے آکے کفر کا اقرار کر لیا
مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے
پھر آئے ہیں وہ جوش سوئے مجرمان عشق
شعلے کی طرح تیغ کو عریاں کئے ہوئے

(جوش ملیح آبادی)

(۳) آغاز محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو سہے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے
متوالی رسیلی آنکھوں میں نیز ایسی گھتی کر لبس تو بہ
فتنے تو اٹھانا اک جانب جادو بھی جگانا مشکل ہے
طائر ہے نہ صید وحشی ہے دل ہے البتہ تڑپتا دل
دیکھو تو ادھر کوشش تو کرو کیا ایسا نشانہ مشکل ہے
جو عشق کے فن کے ماہر ہیں ان سے تو پوچھو تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے
کچھ عشق ندامت ہوتی رہے کچھ عذر ستم بھی کرتے رہیے

جا لالہ کے کھپانے والوں کو ہنس ہنس کے رلا
موسم اور وقت کی باتیں ہیں۔ راتیں ہیں نہ وہ
رونے میں کبھی طوفاں تھے اب دو اشک بہانا
کہنے اور طول پہ کہنے کی حسرت تھی لیکن جب
منہ اس کا تکتے رہ گئے یعنی حال سنانا مشکل
میں تیر کا دم بھرتا ہوں آخر میں اس کے کمال
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو۔ وہ بول بنانا مشکل

(جعفر علی خا

(۴) سدا ہے اس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی
نکل کے دیکھو تم اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں
وہ شعلہ رو ہے سوار توسن اور اس کا توسن
عجب ہے اک سیر دوپہر سے فلک پہ بجلی زمیں
کدھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سرد
دکھائے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی ز
وہ تیغ کھینچے ہوئے ہے سر پر میں سر جھکائے ہوں
دکھاؤں اے دل تجھے کدھر سے فلک پہ بجلی زم
نصیر لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن
بندھی ہے یوں کب کسی بشر سے فلک پہ بجلی ز

(شاہ نصی

یہ بھی غزلیں نہیں ہیں ۱ اور ۲ میں تو
لب ولہجہ ہی نہیں۔ یہ بھی مسئلہ غور طلب ہے کہ غز
لئے غزل کا لب ولہجہ بھی ہو۔ غزل ۳ میں غزل کا لہ
ہے مگر باوجود زبان کی فصاحت اور قادر الکلا
شدت احساس سے خالی ہے۔ تو وہ باتیں و
کہ غزل کا لب ولہجہ بھی ہو اور شدت احساس
ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہئے کہ لہ

کا نمبر ۱ ہے اور شدت احساس کا درجہ دوسرا ہے۔ بغیر شدت احساس تو شعر ہی کہے جانے کا مستحق نہیں ہوگا شدت احساس ہے تو شعر ہے پھر لب ولہجہ ہے تو غزل ہے۔ غزل ۲ میں بھی غزل کا لب ولہجہ تو ہے اگرچہ ۳ سے کمتر ہے۔ شدت احساس ۲ سے کچھ زیادہ ہے مگر قادر الکلامی کا جو مظاہرہ ہے اس سے غزل پر توجہ کم اور صنعت پر توجہ زیادہ یعنی ردیف کے نبھانے کی بات ہے۔ شاعر نے زور کلام ردیف نبھانے پر صرف کر دیا تو شدت احساس کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی۔ شاید دھیرے دھیرے آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ میں آپ کو غزل کی صحیح تعریف سے آشنا کرا رہے ہیں۔ بغیر کسی ایک جملہ یا چند سطریں لکھے ہوئے ابھی تک یہ بات سامنے آئی ہے کہ کن باتوں کا اظہار اور کس قسم کی ادائیگی غزل کے حق میں سم قاتل ہے۔

پاکستان کے کسی پرچے میں غزل کی کیفیت کیا ہوگی اس کے بارے میں کسی کی رائے (کسی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ نام یاد نہیں) کافی پسند آئی۔ "ایک شکاری ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا ہے۔ ہرن چوکڑی بھرتا ہوا اپنی جان بچاتا ہے۔ مگر شکاری بھی ہارنے والا نہیں ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ ہرن بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے اس کی ٹانگیں اب جواب دینے لگتی ہیں اور شکاری قریب اور قریب تر ہو رہا ہے۔ ہرن رک جاتا ہے اور پلٹ کر شکاری کو دیکھتا ہے (آپ نے ہرن کی آنکھیں تو دیکھی ہوں گی۔ بے حد خوبصورت ہوتی ہیں) اس وقت جو کیفیت اور تاثر ہرن کی آنکھوں میں ہوتا ہے وہی کیفیت جب غزل کے اشعار میں ہو جائے تو صحیح معنوں میں غزل ہوتی ہے یا ان اشعار میں تغزل کی روح جلوہ گر ہوتی ہے۔" یعنی محبت کے تجربے میں جو بے کسی یا بے بسی کا اظہار ہے۔ اپنی نارسائیوں کی وجہ سے یا معشوق کے جور و جفا کی وجہ سے یا تغافل سے یا غلط فہمی سے یا رنجش بے جا سے انہیں احساس کو شعری جامہ پہنانے کا نام غزل ہے۔

اب اس سے پہلے کہ میں ایسے اشعار پیش کروں جن میں تغزل بھرپور موجود ہے میں اس صنف (غزل) کی جو خامیاں اور کوتاہیاں ہمارے ناقدین یا کچھ شعراء نے بتائی ہیں اس طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ یہ سرسری ذکر نامناسب نہیں۔ اس لئے کہ قارئین خصوصاً طلبا ناقد حضرات کی رائے پڑھ کر اس کو خدا کا فرمان نہ سمجھ لیں کہ چوں چرا کی گنجائش نہیں۔ بلکہ خود بھی غور و فکر کریں اور اپنی سمجھ سے کسی نتیجہ پر خود پہنچ سکیں۔

غزل گوئی نسبتاً اور صنف کے ہر نو مشق کے لئے آسان ہے۔ غدر سے پہلے اور بعد بھی عموماً شعراء نے غزل کے میدان کو ہی چن لیا۔ ساری شاعری اسی صنف میں ہونے لگی۔ (نتیجہ یہ نکلا کہ سوائے انتشار فرسودہ خیالات اور مضامین اور زبان کی شاعری ہونے لگی) پڑھا لکھا طبقہ جس نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا۔ اور مغربی ادبا اور ناقدین کے سوچنے اور فکر کا ڈھنگ دیکھا تو ردعمل میں وہ طبقہ غزل سے نفرت کرنے لگا۔ جس طرح غزل گوئی بھی انتہا پسندی تھی۔ تنقید بھی ردعمل میں انتہا پسندی سے اپنا دامن نہ بچا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ شدت پسندی کے عقل کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ تو نہیں کہوں گا مگر یہ ضرور ہوا کہ عقل کی روشنی مدھم ہو گئی۔ آئیے سب سے پہلے کلیم الدین کی رائے کا جائزہ لیجئے۔ آپ نے کہا ہے کہ یہ نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اس رائے سے اتفاق

کرنے سے پہلے یا اس کے خلاف بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نیم وحشی صنف شاعری کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے وحشی صنف شاعری کیا ہے۔ انسان جب وحشی تھا تو کیسی شاعری کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا۔ اور پھر جب نیم وحشی کے مدارج طے کر رہا تھا تو اس وقت کیسی شاعری کرتا تھا یا اس نیم وحشی دور میں شاعری سرے سے کرتا ہی نہیں تھا۔ مگر جب کلیم الدین نے فرمایا ہے کہ "نیم وحشی صنف شاعری ہے" تو چونکہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اس کی مثال بھی پیش کر دیتے تو اچھا تھا۔ اسلام سے پہلے عرب وحشی نہیں تو نیم وحشی تھے۔ ایران، روم اور ہندوستان کے مقابلے میں عرب تمدن و تہذیب میں بہت پیچھے تھا۔ پھر تو عرب کے لوگ غزل ضرور کہتے ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں۔ عربی زبان میں غزلیں ملتی ہیں مگر وہ اسلام سے قبل نہیں بلکہ آخری دور امیہ میں یا دور عباسی کے اوائل میں عربی زبان میں غزلیں کہی گئیں۔ اس سے نتیجے آپ خود نکالیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اب ایک دوسری بات کی طرف توجہ چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ انسان جب جسم ڈھاکنا شروع کیا تو بغیر سلائی کے چیزوں سے۔ سینے کا عمل تو جب انسانی ذہن اور تعلیم و تربیت ہوا ہوگا تو شروع ہوا ہوگا۔ اسی کی یادگار دھوتی اور ساڑی ہے۔ یہ بغیر سلا ہوا کپڑا یادگار ہے اس وقت کی جب انسان نے کپڑے سینا نہیں سیکھا بلکہ جب انسان سینے کے عمل سے ناآشنا تھا۔ یعنی نیم وحشی تھا۔ ساری نیم وحشی ادوار کی یادگار ہے تو اسی وجہ سے ہم ساری میں کیڑے نکالیں اور اسے بالکل ہی ترک کر دیں۔ اس کا فیصلہ آپ کریں اور نتیجہ خود نکالیں (جاری)

(بقیہ:- اس کے کردار میں)

ہاں۔ صحافت کے لئے موقع نہیں ملے گا۔ ا
بھرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ معاش ڈھونڈ
تمہارے اس اقدام سے تمہاری زندگی کا رُخ
گا اور تمہاری صحت کو جلا ملے گی ـــ پیارے تم
سمجھا کر میں تمہیں روشنی دکھا رہا ہوں۔ اندھ
میں تم بھی تو چراغ جلاتے ہو۔۔۔۔۔

"تم گاؤں کب جا رہے ہو؟"

"کل"

"ٹھیک ہے ڈیئر کل میں تمہاری رہا
صبح آٹھ نو بجے کے اندر آ کر ملوں گا اور اپنا فیصلہ
گا" اور وہ یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اور میں اس کے جاتے ہوئے خدوخال او
میں اسی کی طرح ان گنت اردو کے افسانہ نگا
شاعروں کو دیکھتا رہا!

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

(قسط ۸)

میں نے پاکستان کے جس شعری مزاج اور فکری رویہ کی بات کی ہے اسے ایک غالب رجحان ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ وہاں ایسے شعراء کی بھی کمی نہیں جو شاعری کو وسیلہ یا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ اسے مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ جن کی شاعری ایک NON-COMMITTED فضا میں سانس لیتی ہے۔ جن کی شاعری میں عام انسانوں کا درد کلبلاتا ہے، جو تبدیلیوں پر یقین بھی رکھتے ہیں اور ان کا ذکر بھی کرتے ہیں، ایسے شعراء بھی ہیں جو ٹوٹتی بنتی قدروں پر نظر رکھتے ہیں ایسے بھی ہیں جو اپنے ماضی بعید (REMOTE PAST) میں زندہ ہیں اور مہاجرت کو ایک المیہ تصور کرتے ہیں، ان کی شاعری سے اپنے گاؤں، کھیتوں اور کھلیانوں کی خوشبوئیں آتی ہیں، کہیں URBANISATION اور اس سے پیدا ہونے والے تہذیبی مسائل کا ذکر ہے۔ کہیں بے رنگ رشتوں کا مرثیہ ہے کہیں نئے رشتوں کی نئی تعبیریں ہیں۔ غرض ایسی فضا بھی ہے جہاں شاعری سینگ اٹھا کر کسی ایک سمت بھاگی نہیں جاتی بلکہ ان میں متعدد DIMENTIONS نظر آتے ہیں۔

کراچی میں محترمہ رعنا اقبال سے کئی ملاقاتیں رہیں، یہ خاتون وہاں کی ادبی و شعری اور تہذیبی ماحول میں خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اتنے بڑے شہر کی ادبی سماجی میں نئی نسل کی خواتین کا جتنا حصہ ہونا چاہیے تھا وہ مجھے کراچی میں نظر نہیں آیا۔ اس کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں مگر مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں آج خواتین پہلے کے مقابلے میں پرورش لوح و قلم سے غافل تو نہیں ہیں۔ پاکستان میں اردو ادب کے تخلیقی منظر نامے پر اس طبقے سے کئی نام نمایاں تو ہوتے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ فضائے شعر و ادب میں خواتین کی شرکت خال خال نظر آتی ہے۔ رعنا اقبال افسانے لکھتی ہیں۔ کالم نگاری

کرتی ہیں، ادبی اجتماعات میں، مذاکروں اور سیمناروں میں حصہ لیتی ہیں، ادبی انٹرویوز کے ذریعہ فنکار اور قاری کو ملاتی رہتی ہیں۔ ابھی یہ نام ادب کے افق پر اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر تو نہیں ہو سکا ہے مگر ادبی مشغولیت میں ان کا انہماک بہت جلد انہیں آگے، اور آگے اور آگے لے جائے گا۔ غالب نے ایک جگہ یہ کہا ہے کہ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

غالب کا شعروں کے انتخاب نے جو حال کر دیا تھا کم و بیش وہی شاہتہ انیرا نے اپنے سوالات کے ذریعہ کر دیا۔ ہوا یوں کہ انہوں نے "ادبی ملاقات" کی ایک مخصوص نشست بلائی تو میں یہ سمجھ کر وہاں گیا کہ کچھ نئی ملاقاتوں کا موقع ملے گا۔ یہ تو وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہ اصطلاحی ادبی ملاقات تھی یعنی یہ محض انٹرویو لینے کے لئے کیا گیا تھا۔ یہاں رقیبوں کے جمع ہونے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ صرف دو تین احباب بطور مشاہدین موجود تھے۔ صدا بندی کے لئے ایک عدد ٹیپ ریکارڈر، ضیافت کا معقول انتظام۔ سوالات کے تیر پھینکنے کے لئے رعنا اقبال اور جوابات کے لئے سینہ سپر میں۔

یہی کچھ تھا ساقی متاع حیات

یہ تو میری نجی ملاقات تھی، اس آپ بیتی کی تفصیل تو پھر کبھی سنا دوں گا۔ مگر کراچی کے دوران قیام میں خواتین تخلیق کاروں میں سے ایک اور خاتون سے بھی ملاقات ہوئی جن کے فن پاروں سے ملتے رہنے کے مواقع ہندو پاک کے وسیع تر ادبی حلقے کو حاصل ہوتے رہے ہیں۔ میری مراد فاطمہ حسن سے ہے جنہوں نے پاکستان کی شعری تخلیقی فضا کو نظم کی نئی سمت دکھائی ہے۔ روایتی لے کو توڑ کر ایک ایسا نیا صوتی نظام قائم کرنا جو اجتماعی سماعت کے لئے قابل قبول بنتے ہوئے قابل تحسین بن جائے ایک زبردست خلاقانہ اجتہاد کا کام ہے —— اور یہ کام فاطمہ حسن نے بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے۔

فاطمہ حسن کی شاعری ذاتی ہوتے ہوئے ایک آفاقی جذبے اور کیفیت کی ترجمان ہے۔ شاعری ان کی ذات کی تکمیل بھی کرتی ہے اور اسے ظاہر بھی کرتی ہے انہیں اپنے رشتہ اور جذبے پر ایک غیر معمولی بھروسہ ہے۔ اس اعتماد اور بھروسہ کی وجہ سے ان کی نظموں میں وقار اور معنویت کے ساتھ ساتھ تفہیمی دروبست بھی کھلتے ہیں۔ انہوں نے مروجہ ہیئتوں کی کبھی پروا ہی نہیں کی۔ دراصل ثابتہ ہیئتوں کی شکست بھی فاطمہ حسن کے یہاں کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ شاعر کی روح اور اس کی آگہی کا بنیادی تصور ہی ان کے ذہن و دل میں غیر رسمی، غیر مصنوعی اور غیر مشروط طریقے پر قائم ہوتا ہے۔ اظہار کی آرائش و زیبائش عروض اوزان و بحور سے متشکل ہونے والا نغماتی نظام بھی ثانوی ہے فاطمہ حسن کے لئے غیر اہم ہے —— اور اہم بات یہ کہ جذبے کی عظیم ترین سچائی منتقل ہو جائے۔

فاطمہ اپنی شاعری میں اس اٹوٹ ذہنی و روحانی رشتے کی بات کرتی ہیں جو غالباً کبھی اظہاری سطح پر قائم نہیں ہوا۔ ساری داستان آنکھ اور احساس کے راستے سے پوری ہوتی ہے۔ ان کی ایک نظم "دوریوں کی دہلیز" ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ جذبے کس طرح فاطمہ حسن کے یہاں ماورائی لطافت اور عدم ارضیت کی فضا پیدا کر کے قاری کو ایک نئے جہانِ تعلق میں پہنچا دیتے ہیں۔

وہ مجھے میرے الفاظ میں

ڈھونڈتا ہے
میں اسے اس کی خاموشیوں میں
پا لیتی ہوں
فاصلے صرف آنکھیں ہیں
یا
——— ہونٹ

فاطمہ حسن کی شاعری میں ثنویت کردار کا احساس ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا لگتا ہے کہ فن کار کے ساتھ ایک اور شخصیت بھی ہے جو اس طرح ہے ——— سی کی طرح تنہا بھی ہے۔ ان کے کلام میں خود کلامی دجلیسی کی جو فضا ملتی ہے وہ اردو شاعری کے لئے اجنبی لیکن پرکشش فضا ہے۔ فاطمہ حسن کا شعری ۔ اپنے جیسی پرچھائیں کو ساتھ لئے لئے پھرتا ہے ت ایک طرف منظومات میں ڈرامائی خصوصیت کرتی ہے تو دوسری طرف تنہائی کی شدت کو ور تیز تر کر دیتی ہے۔ نظم انتظار، اکیلی، منتظر ی، ایک لڑکی، وہ اور دوسری تخلیقات میں ایک ر کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ فاطمہ حسن کی نظمیں ں داخلی شخصیت کے انعکاس کے لئے آئینہ در آئینہ نام قائم کرتی ہیں اور اس طرح کبھی ایک پر ہجوم کا طہ بھی ہونے لگتا ہے۔ یہاں احساس شہود و شاہد رد ایک ہے۔ یہ نظم بھی پڑھئے۔

آنکھوں کی وحشت سے
ایک مجسمہ تراشوں
اپنا جیسا ——— اور سجدہ کروں
اس کے اندر
میری جیسی کوئی

لڑکی نہیں
(نظم، میرا بت مجھ سے بہتر ہے)

فاطمہ حسن کی متعدد نظموں میں معصوم سوچوں کا ایک سلسلہ ہے لیکن یہ سوچیں اپنی انتہا میں دانشورانہ آگہی کا پتہ دیتی ہیں۔ ایک منفرد POETIC VISION کی تشکیل کرتی ہیں۔ لہجہ کی سادگی بسا اوقات قاری کو فریب میں ڈال دیتی ہے۔ لگتا ہے نظم میں کوئی خاص بات ہوتے ہوتے رہ گئی ہو ——— مگر ذرا ٹھہر کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ فاطمہ حسن نے نظم میں اپنے موضوع سے کچھ زیادہ ہی کہہ دیا ہے ——— بہت کچھ زیادہ، آئیے ان کی دو تین نظمیں پڑھ کر اس حکایت لذیذ کو طوالت سے بچالیں

نئے دوستوں میں گھری
ہنستی رہتی ہوں
اور
ہنسی کی رو میں بہتی
ان ہتھیلیوں میں پہنچ گئی
جہاں کی پرانی آنکھیں
ابھر ابھر کر ڈوب رہی ہیں
——— (بہتے ہوئے پھول)

جب میں نے ہر چہرے پر
اس کا دھوکا کھایا تھا
تب وہ کیوں نہ آیا تھا (انتظار)

———

لفظوں کا خوف اوڑھے ہوئے
سو گئی ہے
سوچتی ہوں
پہلے اس کو جگاؤں
یا چادر ہٹاؤں
(ایک لڑکی)

(جاگی)

ساجدہ زیدی

شامِ الم

ہوا نے چھیڑا خوشی کا نغمہ
لوانے پیکر تراشے
کیف و نشاط و عزم کے
بس ایک لمحے کو ابھری آواز —— عافیت کی فغان آخر
(کہ جیسے کوہِ ندا کا جاں آفریں بلاوا)
افق کی لو تھرتھرائی
جاگی فضا
زمیں ہو گئی منوّر
پھر اس کے بعد ......
اوڑھ لی دلِ کائنات نے
بے پناہ خاموشیوں کی چادر

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن

غزل

بے بصیرت ہوشمندی کا اعادہ کس لئے
لفظ پر معنی کا یہ کہنہ لبادہ کس لئے

میں تو خود اپنے تکلم کی زد میں ہوں، اک گہر سے
ہیں یہ حرفوں کی صفیں ایستادہ کس لئے

جیب میں، دنیا کا گنجینۂ زیاں، محفوظ ہے
لے کے پھرتا ہوں یہ کشکول افادہ کس لئے

ہفت خواں کا کون سا یہ مرحلہ ہے سامنے
میری خاطر، ساتوں دروازے کشادہ کس لئے

دو نفس کا یہ تعلق، اک اضافی چیز ہے
زندگی سے ربط اتنا بھی زیادہ کس لئے

رخت جاں، یہ جادۂ آشوب، زخموں کا سفر
اس سفر میں چل پڑے تم پاپیادہ کس لئے

میں تو خود منزل ہوں، ہے سب کا سفر میری طرف
میرے دامن سے ہے لپٹی خاک جادہ کس لئے

گرد پچھلے منظروں کی، میری پلکوں پر نہ رکھ
رفتہ و پامال خوابوں کا اعادہ کس لئے

کیا کہوں، ناگفتنی و گفتنی کے درمیاں
چپ رہا جو، داستاں کا شاہزادہ کس لئے

زندگی بھی ہے سراب و آب کا اک معرکہ
موج دریا اور ساحل افتادہ کس لئے

میں تو خود اپنی جگہ ہوں اک سمندر اے فضا
درمیاں میں یہ خلیج استفادہ کس لئے

نصر قریشی

نئے سال کی دعا

میرے مولا! دشتِ جاں کو موسمِ گل کی راحت دے
پیاسی دھرتی کے ہونٹوں کو قطرہ قطرہ لذت دے

لمحہ لمحہ عمرِ رواں کی مدت گھٹتی جاتی ہے
روز و شب کو سالِ رواں میں روشن روشن ساعت دے

سالِ گزشتہ جو بھی گزرا، وہ نہ گزرے اگلے برس
بادِ حوادث، خون کی بارش کی لعنت سے فرصت دے

جینے والے، جیتے جیتے، کھو بیٹھے جینے کی سکت
وقت کا مقتل ہم کو پکارے، ٹکرانے کی ہمت دے

جنگ کے شعلوں میں نغموں کی فصلیں جلنے لگتی ہیں
امن و آشتی، صلحِ کل کی انسانوں میں چاہت دے

ورق ورق پر لفظوں کی قندیل جلائیں اہلِ قلم
کاغذ، قلم، سیاہی چمکے، تحریروں کو رفعت دے

اگلے برس، نفرت کی آگ سے، کوئی نگر برباد نہ ہو
انسانوں میں انسانی رشتوں کی پاک محبت دے

اگلے برس بھی فصلِ بہاراں، ویرانوں کو سبز کرے
کونپل، کونپل خوشبو جاگے، غنچہ و گل کو نکہت دے

اگلے برس مذہب کی آڑ میں، مذہب ہی کا خون نہ ہو
ظلمت ظلمت سورج چمکے، سب کو نور کی دولت دے

سب کے مولا! تیرے کرم سے نصر بھی دنیا میں چمکے
ملکِ شعر و ادب میں دھوم ہو، فکر و فن کو عظمت دے

غزلیں

شرون کمار ورما

ہم قفس والوں کو ذکرِ آشیاں اچھا لگا
تھا خیال و خواب پھر بھی یہ بیاں اچھا لگا

ساعتِ پرواز میں اب وسعتوں کا خوف ہے
پر نہیں نکلے تھے جب تک آسماں اچھا لگا

زندگی کی راہ میں حائل رہا اپنا مزاج
اک مصیبت تھا مگر وہ کارواں اچھا لگا

اپنے ہونے کا ہمیں احساس تو ہوتا رہا
سچ تو یہ ہے ہر قدم پر امتحاں اچھا لگا

اک سلگتی آگ کی مل تو رہی ہے کچھ خبر
وسعتِ افلاک پر پھیلا دھواں اچھا لگا

یوں لگا اپنی زمیں سے آسماں نزدیک ہے
خواب میں دیکھا تھا لیکن یہ سماں اچھا لگا

جو رنج دل کو دیے ہیں کس حساب میں رکھ
ستم نہ مان تو صفتِ کرم کے باب میں رکھ

مسافتوں میں اماں بھی ملے کہیں آخر
ترے نثار ہمیں سایۂ سحاب میں رکھ

کوئی خیال ہی تصویر بن کے ابھرے گا
کوئی تو روپ یہ لے گا، یقیں کو خواب میں رکھ

نہ جانے کون سے لمحہ کی یاد بن جائے
یہ پھول اس نے دیا ہے، اسے کتاب میں رکھ

مرے وجود کا احساس ہی دلا مجھ کو
تو فیصلہ نہ سنا، نگہہ انتخاب میں رکھ

نکال پھینک یہ کانٹا بھی یاد کا دل سے
یونہی نہ جھیل یہ غم، جاں مت عذاب میں رکھ

محمد ابراہیم کوثر

وہ میری آنکھ میں سب رہ گذار رکھ دیگا
ہر اک خیال ہر اک انتظار رکھ دے گا

وہ اپنے ساتھ میں لائے گا موسموں کا سفر
میری ہتھیلی پہ باغ و بہار رکھ دے گا

مجھے پڑھے گا وہی جو شعور رکھتا ہے
نظر سے دور مجھے کم شعار رکھ دیگا

نشانہ پاؤ گے فنکار ہے یہ دیوانہ
بنا کے موت کو اک یادگار رکھ دیگا

ذرا بھی قرض نہیں دیگا دست لاکھ سہی
وہ خالی جیب میں کچھ اعتبار رکھ دیگا

جو مل سکے تو سہارا بڑا ہے تنکے کا
پہاڑ کو بھی سمندر کے پار رکھ دیگا

جہاں میں اس کو نظر آؤں مثل آئینہ
سجا کے زخم وہیں بے شمار رکھ دے گا

میرے قدم تو بتائیں گے راستہ خود ہی
میرا سفر کئی گرد و غبار رکھ دے گا

میری طلب کا حسین سلسلہ ہی ایسا ہے
نظر میں خواب کی لمبی قطار رکھ دے گا

نہیں کرے گا وہ اپنی گرفت سے آزاد
ذرا قدم جو بڑھاؤں حصار رکھ دیگا

ہزار سجدے گزاروں گا پھر بھی وہ کوثر
میری جبیں پہ وہ تہمت ہزار رکھ دیگا

کرشن پرویز

نہ جانے کس لئے خوش ہیں یہ اہل کارواں یارو
اندھیروں کا تسلط ہے ابھی صبح بہاراں پر

کہیں اپنے لہو سے تو نہیں کھیلی یہاں ہولی
یہ کس کے خون کے چھینٹے ہیں دیکھو سب کے داماں پر

جسے سینچا تھا اپنا خون دیدے کر وطن والو
خزاں پھر چھا رہی ہے کیوں اسی گلستاں پر

زمانے کے ہر اک غم کو ہے ہم نے اپنا غم سمجھا
گرے جب غیر کے آنسو سنبھالے اپنے داماں پر

قیامت ہی بپا ہوگی اگر یہ زلف سیدھی ہو
ہزاروں لوگ مرتے ہیں تری زلف پریشاں پر

زمانے سے کبھی ہم نے کوئی خوشیاں نہیں مانگی
مگر سب کیوں پریشاں ہیں مرے دل کے چراغاں پر

عجب یہ بیج نفرت کا یہاں کچھ لوگ بوتے ہیں
کہیں ہندو پہ شک ہوتا کہیں ہوتا مسلماں پر

گلستاں پھونک ڈالے گی نشیمن کو جلا ڈالے
بھروسہ کیا کریں پرویز اب ہم برق و باراں پر

راز اعظمی

اہلِ ہوس کے سامنے "تلوار" میں ہی تھا
سینہ سپر تھا بیعتِ انکار میں ہی تھا

ناول کے پہلے باب میں جو قتل ہو گیا
اس قصۂ طویل کا "کردار" میں ہی تھا

مرے ہی دسترس میں وہی کشش جہت تمام
تیرے حضور پھر بھی "گنہگار" میں ہی تھا

سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے
تنہا ترے وجود کا "اقرار" میں ہی تھا

میرے ہی خوشہ چیں رہے اہلِ ہنر تمام
شہرِ سخن کی "گرمیٔ بازار" میں ہی تھا

اے راز سامنے تھی مری منزلِ مراد
خود اپنے راہِ شوق کی "دیوار" میں ہی تھا

زبیر گورکھپوری

میں نے جب بھی ترے چہرے کی تلاوت کی ہے
ایسا محسوس ہوا مجھ کو عبادت کی ہے

سنگِ نفرت کے عوض بانٹے محبت کے گلاب
ہم تہی دستوں نے اس طرح سخاوت کی ہے

کون چل سکتا ہے شطرنج کی چالیں ہم سے
ہم نے ایجاد زمانے میں سیاست کی ہے

رہ کے گمنام بھی ممکن تھی ادب کی خدمت
جانے کیوں آپ نے تشہیرِ ذہانت کی ہے

ہیں وہی لوگ میرے قتل کی سازش میں شریک
میں نے جن لوگوں سے دنیا میں مروت کی ہے

پا لیا جسموں پہ تلوار سے تم نے قابو
ہم نے اخلاق سے ہر دل پہ حکومت کی ہے

جو ادا ہو گئیں تلوار کے سائے میں زبیر
ہم نے ایسی ہی نمازوں کی امامت کی ہے

زبیر انصاری

مرے شعور کو بچپن کا تجربہ بھی دے
مجھے جنون سے لڑنے کا حوصلہ بھی دے
[illegible] ابھر کی ڈھول
اب احتیاط [illegible] بھی دے
یہ شہر شہر [illegible] کب تک
جو جسم بخشا ہے مجھ کو تو پھر قبا بھی دے
جو تو نے بخشی ہے دوپہر کی تو اتنا کر
لبوں کو صبر کی [illegible] کو حنا بھی دے
نکل نہ جاؤں کہیں احترام کی حد سے
تو اپنے قرب کو تھوڑا سا فاصلہ بھی دے
[illegible] ضروری نظام دنیا میں
[illegible] کو حادثہ بھی دے
زبیر نیند کی شہزادی جاگ جائے گی
اسے سکوت [illegible] کا سلسلہ بھی دے

اظہر نیّر

سجا کے گھاؤں کی دوشیزگی دکانوں میں
میں رنگ بھر نہ سکا شہر کے فسانوں میں
کسی نے کون سے لفظوں میں مدعا کہتا
گھلا ہے زہر ہلاہل سبھی زبانوں میں
چھتیں شکستہ ہیں دیواریں بھی بوسیدہ
پناہ لیتے ہیں آسیب اب مکانوں میں
انہیں سے پوچھئے راز شکستگی کیا ہے
جو ابتدا ہی سے شامل ہیں سخت جانوں میں
جو لوگ خود سے بھی روپوش تھے یہاں نیّر
انہیں کا نام نمایاں ہے داستانوں میں

عقیل گیاوی

آندھیوں کی زد پہ بام و در تمام
ہنستے گاتے شہر کے منظر تمام
میرے اندر کون یہ روتا رہا
آنسوؤں سے نم ہوا بستر تمام
قصر شاہی میں بغاوت کا دھواں
سرحدوں پہ ہمنوا لشکر تمام
ڈائری میں کیوں کروں محفوظ یہ
پھول، خوشبو اور صبا ازبر تمام
میری ہی دہلیز تک محدود کیوں ؟
قہقہہ بردوش یہ منظر تمام

قسط ۲

مشرف عالم ذوقی

مسلمان

ایک پناہ گاہ سے نکل کر دوسری پناہ گاہ میں۔
ایک چھوٹی سی عمر میں انسان کیسی کیسی پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ فرنگی بیڑیوں سے ملک آزاد ہونے کو ہوا تو مسلمانوں نے اپنی ایک الگ پناہ گاہ ڈھونڈ لی۔ پاکستان
منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ بھلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں فرق نہ کر پایا ہو، لیکن پاکستان جانے کی تیاریاں کرنے والے مسلمانوں کو پاکستان کے بارے میں بخوبی معلومات تھی — یعنی ان کا اپنا ملک، مسلمانوں کا ملک، اپنے بھائیوں کا ملک، اور تصور کی ایک سادہ کتاب تھی جس پر خیالوں کے نئے نئے محل بوٹے بنائے جا رہے تھے۔

چونترا بستی —

بہار — سمستی پور کے نقشے میں آج بھی یہ بستی موجود ہے۔ لیکن کل والی بات کہاں۔ اب تو یہاں کی دنیا ہی مختلف ہے۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس جب ہندو مسلم دنگے تیز ہوئے اور چاروں طرف مار کاٹ مچ گئی تو تباہی کا یہ طوفان رفتہ رفتہ چونترا بستی بھی پہنچا۔ تقریباً ۵۰۰-۵۲ گھر ہوں گے اس بستی میں — آگے لکھی پور ہے۔ یہاں پر بھی اتنی ہی آبادی ہوگی۔ ان دونوں بستیوں کو ایک چھوٹی سی ندی جوڑتی ہے۔ جہاں ڈبالو سبزیانی ہے۔ اور مچھلیاں اس قدر، کہ زیادہ تر لوگ مچھلیاں پکڑنے اور شہر جا کر بیچنے کا روزگار کرتے ہیں۔ لکھی پور بستی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے تو چونترا بستی میں اہیروں کی۔ مسلمان بس گنتی کے مسلمان ہیں۔ یہی کوئی دس بیس دو چار گھر۔

لکھی پور کے مسلمانوں نے [illegible] کی [illegible] بستی میں بھی تناؤ کی فضا بن گئی — وہاں کے [illegible] نے دوپہر ڈھلے حالت کو نازک جانتے ہوئے [illegible] لوگ جمع ہو گئے۔ باتیں ہوئیں [illegible] راستے [illegible] ہوا، پھر طے پایا، چاروں گھر کے مسلمان مال و اسباب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا اپنا گھر چھوڑ دیں۔ اور [illegible] کے ہندو گھروں میں چلے جائیں۔ پناہ دینے کے لئے سب تیار ہو گئے پر سنگھ کو خطرہ اس بات کا تھا کہ لکھی پور میں ہندوؤں کی بربادی کا سن کر تحیم ٹولہ کے ہندوؤں کا فرمان پہنچا تھا کہ چونترا بستی کے مسلمان صاف کر دیئے جائیں۔ عین وقت پر پرسنگھ باسکے چودھری نے اپنے اپنے گھروں میں

سلمانوں کو چھپانے اور پناہ دینے کا فیصلہ کر کے ایک بہت بڑا جوکھم اٹھایا تھا۔

ان میں سے ہی ایک خاندان تھا۔ شیخ سلیم کا۔ بیوی آمنہ کے علاوہ، جوانی کی دہلیز کو چھوتی ہوئی دو لڑکیاں — عزیز النساء، امیر النساء۔ عزیزن کی عمر ابھی بہت اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ مگر جسم ایسا کہ اچھے اچھوں کا ایمان ڈول جاتا۔ امیرن اس سے چھوٹی تھی۔ اس پر بھی شباب بس جھوم کر آیا چاہتا تھا۔

شیخ سلیم کے مکان کے پاس ہی للن یادو مکان تھا۔ جن کے، کوئلے کی دلالی کرنے والے لڑکے ویریندر یادو کی نظر عزیزن پر تھی۔

بانکے چودھری نے خود بھی شیخ سلیم کے گھر جا کر مشورہ کیا تھا۔ سامان کی بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔

شام کا کوئی سات بجا ہوگا۔

چراغ ٹمٹما گئے تھے۔ سامان باندھے جا رہے تھے، کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شیخ سلیم نے عزیزن کو اشارہ کیا۔ عزیزن آگے بڑھی اور اچانک ٹھٹھک گئی۔

ویرا تو؟

دروازے کی آڑ لے کر، ہونٹوں پر بھدی سی ہنسی سجائے ویریندر، جسے سب ویرا بھی کہتے تھے، کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟" عزیزن کو غصہ آگیا۔

"کیوں۔ کہاں کی تیاری ہے۔"

"جہنم کی —"

"اس سے بہتر جگہ تو میرا گھر ہے۔"

ویرا نے ایک بھدا سا قہقہہ بلند کیا۔

شیخ سلیم دروازے تک آتے آتے کانپ گئے۔ ویرا کی ناپاک نیت کو بھانپ گئے۔ مگر کیا کہتے۔ وقت نازک تھا — زمانہ بدل چکا تھا — وہ یہاں تعداد میں بھی کم تھے۔ پورے ملک میں دنگوں کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ جو جہاں زیادہ تھے۔ وہی آبرو ریزی کا کھیل، کھیل رہے تھے۔

شیخ سلیم کانپ گئے۔ یہاں تو وہ مٹھی بھر ہیں — دروازے پر بھدی ہنسی ہنستا ویرا کھڑا ہے۔ صلح صفائی سے کام نہ لیں تو اور کیا کریں — آگے بڑھے —

"کیا بات ہے ویرا؟"

"عزیزن میرے ساتھ جائے گی۔"

ویرا کے چہرے پر وہی آگ روشن تھی جو اس وقت ملک کے حاشیے پر سلگ رہی تھی۔

شیخ سلیم اس سے پہلے کہ کچھ کہنے کی کوشش کرتے، ویرا نے انہیں دھکا دیا۔ عزیزن، امیرن کی تیز چیخ ایک ساتھ آسمان کے پردوں کو چیرتی چلی گئی۔

اور اچانک منٹوں میں وہ ہو گیا، جو ان کے خواب و خیال میں نہ تھا۔ اچانک پورا نظارہ بدل گیا۔

دروازے پر لٹھ لئے للن یادو کے ساتھ بانکے چودھری اور گاؤں کے ہی ایک دو آدمی کھڑے تھے — ویرا نے غصے میں اپنے پتا للن یادو کو دیکھا۔ پھر اندھا دھند بھاگتا چلا گیا —

للن یادو آگے بڑھے — عزیزن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا — شیخ سلیم سے بولا —

"بالکل مت گھبرایئے شیخ صاحب۔ آپ کی لڑکی ہماری لڑکی ہے۔ ویرا سے تو ہم بعد میں سمجھیں گے۔ آپ بالکل پریشان مت ہوں۔"

بانکے نے مسلمانوں کو پناہ تو دلوا دیا لیکن آن

آن میں پچم پورہ میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ چوہنڑا بستی کے مسلمان بھاگے نہیں ہیں بلکہ وہاں کے ہندوؤں نے انہیں اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ پتہ ہی یہ خبر پھیلانے والا ویرا تھا، جو پورے گاؤں سے بیر لے بیٹھا تھا — اور انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔

نفرت کے لاوے کچھ تھم گئے تو نئی پناہ گاہ کی تلاش شروع ہوئی۔ افسران اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ کسی پر بھی کوئی زور زبردستی نہیں ہے — جو جو لوگ اپنی مرضی سے پاکستان جانا چاہتے ہیں، جا سکتے ہیں۔

اس اعلان کا پاکستان جانے والے مسلمانوں نے خیر مقدم کیا، یا ان مسلمانوں نے، جو اپنے سامنے اپنے گھربار اور اسباب کی تباہی دیکھ چکے تھے۔ جن کا دل ہندوستان سے بھر گیا تھا اور اب وہ پاکستان میں اپنی نئی دنیا بسا کر نئی زندگی شروع کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

اس اعلان کے بعد بانکے چودھری نے گاؤں کے چاروں مسلمان خاندان کے فردوں سے بات چیت کی۔ دو خاندان تو یہیں رک گئے۔ لیکن شیخ سلیم اور باقی بچا ایک خاندان پاکستان جانے پر بضد نظر آیا — جبکہ بانکے چودھری اور دوسرے کئی لوگوں نے بہت سمجھایا کہ اگنی پرکشا کی گھڑی ٹل چکی ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ سب بھائی بھائی ہیں — سب مل جل کر رہیں گے —

لیکن نفرت کی آندھی اپنا کام کر گئی تھی۔

سامان باندھے گئے —
گھر اونے پونے بیچ دیے گئے —
گٹھری، گٹھریاں بندھ گئیں —

بیل گاڑی ٹھیک ہوئی —

عزیزن نے آخری بار مکان پر نظر ڈالی۔ کچھ تھم سی گئی — سب کچھ چھوٹ جائے گا نا — یہ در و دیوار .... یہ مٹی .... یہ پیڑ پودے .... یہ چاہتوں کے خزانے سب کچھ یہیں رہ جائے گا نا۔ وہاں پاکستان میں پتہ نہیں سب کچھ کیسا ہوگا — ممکن ہے سب کچھ مل جائے — مگر یہ گھر، یہ مٹی، یہ آنگن اور اس سے لگاؤ — پتہ نہیں تب تک کتنا کچھ بدل چکا ہو .... اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ آنکھیں نم ہو گئیں — دوسری طرف منہ سے بیڑی لگائے، بھدے ہونٹوں سے مسکراتا ویرا کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ویرا نے بیڑی پھینکی، پیروں سے مسلا اور پیچھے چل پڑا۔

عزیزن کا دل دھک سے رہ گیا۔

اسی قافلے کے مسافر تھے ہم
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے
کوئی رستہ تھا نہ منزل کوئی
کہیں کوئی بھی سائباں تک نہ تھا....
کہیں دور تک آسماں تک نہ تھا...
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے

پاکستان جانے والوں کا ایک لمبا قافلہ تھا —
اتنے سارے لوگ —

پورا پورا گھر اٹھائے۔ مال و اسباب کا بوجھ لئے — حیران و پریشان — ایک خیمے سے دوسرے خیمے — ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ — یہ سب عزیزن کے لئے نیا تھا۔ اتنے سارے لوگ

تو اس نے کبھی ایک ساتھ دیکھے تھے۔ پاکستان جانے والوں کا قافلہ اللہ اکبر، نعرۂ تکبیر کی گونج بلند کرتا ہوا منزل بہ منزل رواں تھا۔ اچانک قافلے میں کسی بات سے بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگوں کے بیچ مار دھاڑ ہو گئی —

بھگدڑ مچی تو لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

بھیڑ میں عزیزن کا ہاتھ امیرن سے کب چھوٹا، کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ عزیزن کو بس امیرن کی ایک زوردار چیخ یاد رہی تھی۔ پھر دماغ جیسے ڈوبتا چلا گیا۔ کب، کیا ہوا، کیسے ہوا — اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ بھاگتے ہوئے لوگوں کے پیروں کے نیچے آگئی تھی —

امیرن کا کیا ہوا نہیں معلوم۔ شیخ سلیم کہاں گئے — وہ نہیں جانتی —

آنکھ کھلی تو ایک تنگ سی کوٹھری تھی۔

چارپائی پر وہ بے سدھ پڑی تھی۔ اور پاس ہی ویرا شراب کے نشے میں دُھت، بھدے انداز میں ہنستا ہوا بیڑی پھونک رہا تھا۔

ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ —
تم ذلت بھی دیکھو گے
اس لئے کہ تم نے تاج پہنا تھا
اس لئے کہ تم نے حکومت کی تھی
اس لئے کہ تم نے خوشحالی دیکھی ہے
تم ویرانی بھی دیکھو گے
تم زوال بھی دیکھو گے
تم اپنی شکست بھی دیکھو گے
اس لئے کہ تمہیں سکون میسر نہیں ہے
تم اپنی پناہ گاہیں بدلتے رہتے ہو

وقت نے عزیزن کی کہانی تو کب کی ختم کر دی۔ اس کے پیروں میں کب گھنگھرو کے چھالے آئے۔ پتہ بھی نہ چلا۔ لیکن یہ چھالے وہ زیادہ دیر تک اپنے پیروں میں نہ باندھ سکی۔ تب رانی منڈلی میں عزیزن کی دو ایک جھلک دیکھ کر ہی اس کے تذکرے زور و شور سے ہونے لگے تھے۔ لیکن عزیزن آخری وقت تک ان اداؤں میں خود کو باندھ نہ سکی۔ شیخ گھرانے کے خاندانی پن کا اتنا تو اثر باقی تھا، کہ جب پہلی بار ویرا نے اسے کوٹھے پر بٹھایا تھا تو اس نے غصہ میں اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

دیا۔ کوٹھے کی دلالی تجھے اس مقام تک لے آئے گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ کوٹھے پر ویرا کا تین ماہ کا حمل لے کر آئی تھی۔

شہناز بائی سے اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ یہ بچہ جیسے بھی ہوگا، وہ پیدا کرے گی۔ پھر اس کے بعد ساری زندگی وہ اس کے اشاروں پر ناچے گی۔

شہناز بائی نے حامی بھر لی تھی۔

اس طرح عزیزن نے گوہر کو جنم دیا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ شہناز بائی سے کبھی جھوٹ بولی کہ وہ ساری زندگی اس کے اشاروں پر ناچے گی — شہناز بائی نے صبر کیا اور ننھی سی جان گوہر کو پالنے، بڑا کرنے میں لگ گئیں۔

یہ قصہ ۱۹۴۷ء کی بیت جھڑ کا ہے — جب ایک نئے آزاد ملک کو نئے نئے منصوبوں سے سجانے سنوارنے کی تیاری چل رہی تھی۔

اور کچھ ایسی ہی تیاری شہناز بائی بھی کر رہی تھی، گوہر کو مکمل طور پر بائی بنانے کی تیاری۔

(جاری)

نشاط الایمان

اس کے کردار میں

"خرم!" اچانک کسی نے آواز دی۔
میں چلتے چلتے رک گیا اور دائیں طرف مڑ کر دیکھا وہاں میرا ایک دیرینہ رفیق تھا جو اب میری طرف آ رہا تھا۔

اس کا حلیہ کسی غار میں بسیرا کرنے والوں کی طرح ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تو وہ تہذیب اور شائستگی کے لبادے میں ملبوس اور حسن صحت سے معمور تھا — دور سے اسے کوئی دیکھتا ہوگا تو اسے ہپی کے قبیلے کا فرد سمجھتا ہوگا — آج کل وہ ہر ماہ کے جریدوں میں نظر آتا تھا اور ناقدوں کی نگاہیں بھی اس کے فن اور فن پاروں پر اٹھ رہی تھیں۔

اس نے بڑی گرمجوشی اور مسرت سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "ارے تم ایک مدت سے دکھائی نہیں دیتے"
"مدت سے کیا مراد ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔
"یہی سال چھ مہینے۔ کیا تم نے لکھنا چھوڑ دیا ہے؟"
"نہیں تو۔" میں نے جواب دیا
"تو تم رسالوں اور اخباروں میں نظر آتے ہو اور نہ......"

"اچھا یار، پہلے ہم اس ریستوران میں چلیں" میں نے اس کے اجاڑ اجاڑ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور جب ہم نے وہاں اپنی پسندیدہ چیزیں کھا لیں اور چائے کا آرڈر دیدیا تو اس سے پوچھا — "ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟" گرچہ اس کا آخری سوال میرے ذہن میں تھا۔

"یہی کہ تم بہت دنوں سے کسی ادبی مجلس میں نظر آتے ہو اور نہ تمہارا افسانہ کسی جریدہ میں دکھائی دیتا ہے؟"
"میں آج کل اپنی کہانی سنوانے اور اسے تحریری شکل دینے میں مصروف ہوں۔"
"مگر کبھی اس کی کسی کو نہیں ملی اور ادبی خبروں کے صفحات تمہاری اس مصروفیت سے بلینک ہیں؟"

"یہ ہائیگرافی تو ہے نہیں کہ اس کی تشہیر ہو اور تم جانتے ہو میں ہر کام کی تشہیر کے خلاف رہا ہوں۔ اصل میں میری اس کہانی کا تعلق میرے خاندان اور اس کی عورتوں سے ہے اور چونکہ میں اس خاندان کا سربراہ ہوں اس لئے میری یہ کہانی میری اپنی کہانی ہے۔"

"تم تو اپنی اس بات کو گراف کی شکل میں کہہ رہے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ مجھے الجبرا اور علم ریاضی سے دم گھٹتا ہے۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

نہیں پیارے! بالکل کھلی ہوئی کتاب کیطرح بتا رہا ہوں — میں اب تک دوسروں پر فکشن اور طنزیہ خاکے لکھتا رہا ہوں اور اس جنون میں کن کن گلیوں اور شاہراروں کی خاک نہیں چھانی مگر اپنی کہانی لکھنا بھول گیا — پھر سوچا، ہم نے سماج کی زبوں حالی، گرد و پیش کے ہموار اور ناہموار ڈگر، صنف نازک کی خرید و فروخت، جنسی موشگافی، لذائذ نفسانی، سرمایہ داروں کی متعفن چالوں اور صنعت کاروں کے استحصال پسند کارناموں جیسے موضوعات پر ڈھیروں چیزیں لکھ ڈالیں اور ہنوز لکھتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم جس رفتار سے حیات انسانی اور اس کے بام و در کو سنوارنے کے لئے خون جگر کھا رہے ہیں اسی رفتار سے سوسائٹی میں نت نئی گراوٹ اور انسانی کردار میں وحشی جانوروں کی طرح خود غرضی اور درندگی پیدا ہوتی جا رہی ہے — اور ہم یہ ہزاروں صفحات اپنے بیوی بچوں، اپنے عزیزوں اور ان کی جائز ضرورتوں کو فراموش کر کے سیاہ کرتے رہے۔ ظاہر ہے ہمارے اس اقدام میں اپنی شہرت اور ادب میں اعلیٰ مقام کی حصول یابی اور جاہ کو زیادہ دخل رہا ہے۔ اور یہ جذبہ اور خواہش آج بھی اسی طرح زندہ ہے!

"لیکن پیارے! اگر ادیب، شاعر اور دانشور اپنے احساسات، تجربات اور مشاہدات کو عوام کے سامنے نہیں رکھیں گے اور ان پر اندھیرے اجالے کے نقوش کو عیاں نہیں کریں گے تو بتاؤ دنیا اور کتنی برائیوں کے جوہر میں ڈوبتی جائے گی — پھر ادب کرنا سب کے بس کی بات تو نہیں۔ یہ ہنر بھی خداداد ہوتا ہے۔"

"میں تمہارے خیالات سے سو فیصد متفق ہوں۔ لیکن جو افسانہ نگار، شاعر اور ادیب اپنی تخلیق کو بہتر اور پرچم بنائے جبکہ ادب بہتر اور پرچم نہیں ہوتا تو ایسے رائٹر اور شاعر کی نسبت تم کیا کہو گے — تم خوبصورت لفظوں، حسین جملوں اور نادر تشبیہوں سے حالات کو نہیں بدل سکتے۔ حالات کو بدلنے کے لئے اپنی ہستی کو اس قوت کے تابع کرنا ہوگا جو سب سے بڑا تخلیق کار ہے اور جسے سب پر قدرت حاصل ہے — ادب کے خود ساختہ خدا اور ادب کا استحصال کرنے والے انقلاب کیا لائیں گے۔ اور وہ ان فنکاروں کی کیا قدر کریں گے جو اپنے پرائے کے درد سے تڑپ اٹھتے ہیں اور جن کے اندر کوہ کن کی لگن اور سخت جانی ہوتی ہے۔ مگر جن کو صلہ میں ہمیشہ تنگدستی ملتی ہے؟"

"دیکھو خرم تبریزی اور ناصر شادانی وہاں بیٹھے ہیں۔" میرے کانوں سے یہ جملے ٹکرائے۔ "بہت دنوں کے بعد خرم کو یہاں دیکھ رہا ہوں۔"

وہ دونوں بھی شعرا اور ہمارے ساتھی تھے۔

"یار! اتنے دنوں کہاں رہے۔" شوکت جمیلی نے پوچھا۔

"کبھی گاؤں اور کبھی شہر میں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"لکھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟" یہ وسیم ولیشا لوی کا جملہ تھا۔

"اسی موضوع پر شادانی سے باتیں ہو رہی تھیں۔"

"کچھ کر رہے ہو؟"

"آجکل اپنی ساری توجہ اپنے خون کے قریبی رشتوں اور ان کی ضرورتوں پر دے رہا ہوں۔ جب ان سے مہلت ملتی ہے اور موڈ بنتا ہے تو لکھ لیتا ہوں۔ بس"

"نہیں خرم! اپنی ذاتی ضرورتوں کے پھیر میں ادب کو فراموش نہ کرو۔ حالات کو تم جیسے قلم کاروں کی ضرورت ہے۔ لہذا تم اپنی چیزیں کم از کم ان رسالوں میں بھیجو۔ جن کے مدیر تمہاری تخلیقوں کے طلب گار ہوتے ہیں اور تم..."

"ڈیر!" میں نے شوکت کی بات کاٹی۔ "میں پریم چند جی کے آخری دور کی زندگی کا مرقع نہیں بننا چاہتا ہوں اور نہ میں ان ادبا اور شعراء کی طرح اپنی تاریخ ترتیب دینا چاہتا ہوں جو اپنی شہرت اور معاشی بلندی کے لئے جانے کیسے کیسے حربے استعمال کرتے ہیں، کیسے لیسوں کی چمچہ گیری کرتے ہیں اور کس قدر اخلاقی گراوٹ کے جوہڑ میں غوطہ لگاتے ہیں اور اس کے طفیل آخر میں ایرکنڈیشن روم میں بیٹھتے ہیں اور وہاں مرغ و ماہی، وہسکی اور حسن نوخیز سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رسوخ اور ذرائع کی بدولت سرکاری خطاب اور اداروں کی طرف سے انعامات حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ملک و قوم کا درد صرف ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے جس پر ان کے جھوٹی صفحات کے صفحات سیاہ کرتے ہیں ان کے اعمال ان کی تحریروں سے بالکل میل نہیں کھاتے ان کے کردار بعینہ ان لیڈروں کی طرح ہیں جو ملک اور قوم کے غم میں داد عیش دیا کرتے ہیں۔

"تم اس عریاں حقیقت سے الگ اور اپنی نیک مرضی کے تابع رہ کر ادب کی خدمت کر سکتے ہو۔ اگر تم جیسے بے غرض اور صاف ذہن کے رائٹر حالات سے مایوس ہو کر خاموشی اختیار کر لیں تو ہم لوگ انہیں فرار پسند ہی کہیں گے۔ اور ہم چاہیں گے کہ..."

میں مسکرایا اور بولا ——— "کیا ہم جیسوں کی خاموشی سے کوئی انقلاب آیا ہے؟"

"خرم مہاراج! انقلاب کی بات پوچھتے ہو تو کہو دو، آج کل روز ہی کوئی نہ کوئی انقلاب برپا ہوتا رہتا ہے۔ ہماری ملکی سیاست تو سراپا انقلاب بن گئی ہے۔ جب اسمبلی اور پارلیمنٹ میں چور، ڈاکو، بدمعاش، انتہا پسند مذہبی گرگے (جو دھرم کی آڑ میں ہی راج نیتی کا رتھ چلاتے ہیں) اور بدترین قسم کے خود غرض افراد وزارت کی کرسی پر آ بیٹھیں تو یہ انقلاب نہیں تو کیا ہے۔ پھر یہ تو سیاست ہے۔ تعلیمی اور علمی دنیا کو دیکھو کبھی پی ایچ ڈی کی سند نایاب اور باعث اعزاز تھی آج گھاس بھوسے کی طرح فروخت ہو رہی ہے۔ کیا تم اسے انقلاب نہیں کہو گے؟"

میرا ساتھی یہ کہہ کر میری طرف بغور دیکھنے لگا۔ اس کا اس طرح دیکھنا بے معنی نہیں تھا اور میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ یکایک میری نگاہ ایک سادہ لباس میں ملبوس خاتون پر پڑی جو ذرا فاصلے پر ایک میز پر بیٹھنے جا رہی تھی اور میرے بولے جانے والے الفاظ گویا کے پردے پر نہیں آئے۔ اس خاتون کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی۔ وہ اردو ہندی کی مقبول ادیبہ تھی اور اس کا پتی ایک کالج میں انگریزی زبان کا لیکچرر تھا۔ دونوں بڑے با اخلاق، بامروت اور انسانیت نواز۔ [illegible]

سے میرا کافی ربط ضبط تھا اور وہ دونوں میرا بہت احترام کرتے تھے۔

[illegible] نے آشا کو بتایا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں تو وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور فوراً میرے پاس پہنچی — "ارے خرم بھیا! کہاں غائب رہے اتنے دنوں؟" اور پھر میرے رفیقوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اگر آپ لوگوں کو ناگوار خاطر نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے ان کو اپنی میز پہ لئے جاتی ہوں؟"

"ضرور لے جائیے آشا دیدی!" شادانی بولا۔ وہ آشا سے اچھی طرح واقف تھا۔

ہم اس کی میز پہ پہنچے۔ پردیپ نے اٹھ کر مجھ سے خلوص سے ہاتھ ملایا اور میرے بیٹھنے کے بعد ہی وہ اپنی کرسی پر بیٹھا۔

"کہاں تھے آپ اتنے دنوں؟" آشا نے پھر پوچھا۔

"چھٹی لے رکھی ہے۔ ویسے شہر آتا رہتا ہوں مگر ادبی سرگرمیوں سے فی الحال دور ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن بنا کے لوگوں سے اتفاقاً کہیں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اصل میں بچوں کے لئے گاؤں میں خستہ مکان کو توڑ کر نیا بنوا رہا ہوں۔ اتنے پیسے نہیں کہ شہر میں زمین خرید کر بنوا لیتا۔ وہاں آباؤ اجداد کی زمینیں ہیں۔ کچھ پیسے پی۔ ایف (پراویڈنٹ فنڈ) سے حاصل کئے، ایک قطعہ زمین گروی رکھ دی اور تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ دو کمرے تیار ہو چکے ہیں اور باقی رک رک کر بن رہے ہیں۔ اردو ادب نے صرف شہرت بخشی ہے۔ اس سے خاطر خواہ پیسا تو نہیں کمایا جا سکتا۔ اس ادب سے وافر پیسے کی توقع فضول ہے۔ البتہ ہندی کتابوں کی تالیف سے پیسے [illegible]"

"لکھنا تو نہیں چھوڑا ہے؟"

— "مکان بنوانا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ کرنا بھی تو کہانی لکھنا ہوا!" میں نے جواب دیا۔

دونوں بے ساختہ ہنس پڑے — "بالکل [illegible] کہا آپ نے۔" پردیپ جی نے کہا۔

"میں بھی اس کا قائل نہیں کہ پریوار کے [illegible] حقوق کو فراموش کر کے اور اپنے وجود کی بنیادی ضرورتوں کو بھول کر دن رات لکھتے جاؤ۔ پڑھنے والوں کے خطوط اور پرکھنے والوں کی واہ واہ سے لیکھک کے عزیزوں کے پیٹ تو نہیں بھر سکتے، بھلے ہی لیکھک خوش ہو لیا ہو۔ میں آشا کا شکر گزار ہوں کہ وہ لیکھک ہوتے ہوئے بھی اپنے پریوار کے فرائض سے غافل نہیں ہوتی ہے۔"

اس کے بعد کچھ دوسری باتیں ہوئیں۔

"اچھا پردیپ جی! کل اتوار ہے۔ میں صبح دس ساڑھے دس بجے تک آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ دیکھو آشا میرا اپنے لئے بھی تیار رکھنا۔ تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد سیدھا گاؤں چلا جاؤں گا۔" اور ان کو ادب کر کے اپنے دوستوں کے پاس آیا جو میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

ہم لوگ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے بل کے پیسے ادا کئے اور سبھوں کے ساتھ ریستوران سے باہر نکل آیا —

شام کی انگلیاں شب کی زلفوں کو سنوارنے لگی تھیں۔ راستے اور دکانیں رنگا رنگ بتیوں اور قمقموں سے جگمگا رہی تھیں۔ جیسے بہیں امڈے ہوئے سیلاب کی طرح ہو گئی تھی۔ زندگی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ رواں تھی۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ سب اپنی اپنی دنیا میں غلطاں اور مگن تھے — ایسے لمحوں میں تو شاید دیہات کی فضا پہ ایک سکوت کی چادر تن جاتی ہے۔ مگر شہر ایک ہنگامہ خیز اور تجریدی آرٹ کی کنگ [illegible]

عریاں تصویر نظر آتا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک ایسے زنداں کی کوٹھڑی میں قید ہوں جہاں خطرناک مجرم کو بھی رکھا جاتا ہے۔ اگر میں شہر میں رہنے سہنے کا عادی نہیں ہوتا تو یقیناً اس قید خانے میں میرا دم گھٹنے لگتا۔

میں شادانی کے ساتھ چل رہا تھا۔ شوکت اور وسیم دوسری طرف چلے گئے تھے۔

میں نے شادانی سے پوچھا "تم نے اپنے حلیہ ایسا کیوں بنا رکھا ہے؟"

"کیا ہوا ہے میرے حلیے کو؟"

"چوسا ہوا آم نظر آتے ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم نے اچھی خاصی ملازمت کو اختلاف کی بنا پر چھوڑ دی ہے اور اب کل ایک اردو اخبار کے سب ایڈیٹر ہو۔ ظاہر ہے اس حساب سے تم اپنے خاندان کی نگہداشت تنگی سے کر رہے ہو اور اس تنگی کے بوجھ نے تمہیں میخانے کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کیا تم مجاز بننا چاہتے ہو۔ مجاز تو غم عشق اور غم دوراں کو بھلانے کے لئے پینے پلانے کا شکار بن گیا تھا لیکن شاید تم نے اپنی معاشی الجھنوں کو فراموش کرنے کی خاطر پینا شروع کیا ہے ـــ اور کبھی کبھار اپنے بگڑے ہوئے ہمراہ دوستوں کی جیب پر کسی کال گرل کا بستر بھی گرم کرتے ہو۔ شادانی صاحب! یہ بیماری عام طور پر یورپ اور امریکہ کے قلم کاروں میں پائی جاتی ہے کیونکہ ان کی تہذیب اور معاشرت میں سکس اسی طرح عام ہے جیسے [illegible] کی طرح ہو گیا ہے ـــ مگر تم کو [illegible] ہونا۔ لعنت ہے تم پر [illegible]

کی نشاندہی کر کے ان سے نفرت کی دعوت ہو۔ لیکن تمہارا کردار خود ان غلاظتوں سے اٹا ہوا ہے۔ تم اپنے اس اقدام کا جو نام دے ڈالو۔ مگر میں تمہیں کمینہ کہوں گا۔ اس سے زیادہ سخت لفظ میرے ذہن میں نہیں آ رہا ہے ورنہ میں استعمال کرتا ہوں ..."

"حرامی کیسا رہے گا۔ مطلب یہ کہ ایسے ہی لوگ تو دوغلا کردار کے ہوتے ہیں۔" شادانی مسکرا کر بولا۔

میں اس کا منہ دیکھنے لگا اور بعد ازاں بولا۔

"سنو پیارے! شاید اردو ادیب کی اس تنگ حالی کو دیکھ کر شین مظفر پوری کے ایک افسانوی کردار نے کہا ہے کہ اگر میں اپنے کسی بچہ کو اردو ادب کی طرف مائل دیکھوں گا تو اسے زہر دے دوں گا تاکہ وہ اردو کا ادیب بن کر گھٹ گھٹ کر مرنے کی بجائے ایک ہی مرتبہ موت کا مزہ چکھ لے۔"

"کیا تم اس کردار کے ہم خیال ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں بچہ کو زہر دینے کے بجائے کسی دوسری راہ پر لگانے کی رائے دوں گا۔" اور یہ کہہ کر اس سے پوچھا۔ "تم کو ابھی کہیں جانا ہے؟"

"بس ایک دو گھنٹے کے اندر اخبار کے دفتر جاؤں گا۔"

"اچھا تو سنو [illegible] ان کے ہائی اسکول میں ایک جگہ خالی ہے۔ تنخواہ مناسب ہے۔ تم اس جگہ کے لئے [illegible] تم اس پر چلے جاؤ۔ اسکول پڑھانا [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلد آنا لازمی)

نام :- تنویرات
نام مصنف :- قیوم خضر
نوعیت :- نثری تخلیق (منتخب مضامین کا مجموعہ)
ضخامت :- ۱۴۰ صفحات ، قیمت :- ۴۰ روپے
سنہ اشاعت :- ۱۹۸۸ء
ملنے کا پتہ :- اشارہ پرکاشن پٹنہ ۶ (۲) مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی ۲۵ (۳) بک امپوریم پٹنہ (۴) کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴

"تنویرات" اردو کے جانے پہچانے ادیب قیوم خضر کے ان مضامین کا منتخب مجموعہ ہے جو شائع یا نشر ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں کل ۲۰ مضامین ہیں۔ جن میں ۲۷ مضامین آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہو چکے ہیں — ۶ مضامین مختلف سیمیناروں میں پڑھے جا چکے ہیں۔ یا کہیں اور شائع ہوئے ہیں۔ صرف ۴ ہی ایسے ہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ غیر شائع شدہ ہیں یا کسی نشریے میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صاحب مضمون نے اپنی تخلیقات اور اپنے نام کو دوام بخشنے کی سعی کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے اس جذبے کا بھی احساس ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کتاب کا مطالعہ کر کے افکار و پیغامات سے مستفیض ہو سکیں۔

زیر نظر مجموعہ میں مصنف نے اپنے تمام تر مضامین کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "تنبیہات" ہے جس کے معنی سرزنش، آگاہی، تاکید اور خبرداری کے ہیں۔ عنوان کی مناسبت سے اس میں ذہن مضامین ہیں جو مضمون نگار کی دور رسی، دور بینی، اس کے گہرے مطالعہ اور کھلے ذہن و فکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہمارے دل و دماغ کے تاریک دریچوں کو روشن کرتے ہیں اور ہماری زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے والے پیغامات سے لبریز ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان "تنویرات" ہے جو اپنے مواد کی مناسبت سے اس کتاب کا بھی نام ہے۔ اس کے معنی نور اور روشنی کے ہیں۔ اس باب میں بیس مختصر مگر اہم مضامین ہیں۔ یہ مضامین صرف معلوماتی ہی نہیں بلکہ ان کی زیریں لہریں ہیں اور ان کی تہوں میں چھپا پیغام جہاں ایک طرف ہمارے دل و دماغ اور افکار و ذہن کو اپنے نور سے

منور کرتا اور دل و دماغ پر چھائے گہرے کہر کو صاف کرتا ہے وہیں دوسری طرف ہمیں اپنی ذات اور کائنات کو پرکھنے کا موقعہ دیتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر زندگی کا پیغام چھپائے ہوئے ہیں جو مصنف کی عالمانہ صلاحیت اور الفاظ و بیان پر اس کی گرفت کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان "تنزیات" ہے جس کے معنی تفریح کے ہیں اس باب میں کل سات مضامین ہیں۔ یہ مضامین دیو مالائی قصوں کے علاوہ دسہرہ، ہولی، راکھی، بھگوان مہابیر، اور فراق گورکھپوری کی شاعری کے متعلق ہیں۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے تہواروں کا مذہبی، سیاسی اور سماجی پس منظر پیش کیا ہے۔ فراق کی شاعری پر اپنے طویل مضمون میں مصنف نے جن نکات پر روشنی ڈالی ہے اس سے اس کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں "بقول غالب" مضمون نگار کے مزاج اور طرز نگارش پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد معروضات کے عنوان سے عرض حال یا پیش لفظ پیش کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بہت ہی صاف اور واضح ہے۔ مصنف نے اپنے فن اور اپنے افکار کو کھل کر پیش کیا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ

"میری ان تخلیقات میں ایجاز کا فن اتنا نمایاں ہے کہ آپ قطرہ میں دریا دیکھ سکتے ہیں"

یا

"زیادہ سے زیادہ خیالات کو کم سے کم لفظوں میں پیش کرنا کمال فن بھی ہے اور حسن کمال بھی۔ لفظوں کی بے جا بہتات اچھی نثر کے لئے بے حد مضر ہے۔ گھٹی اور منجھی ہوئی متناسب اور متوازن نثر لکھنا بے حد مشکل فنکارانہ عمل ہے۔ نثر کی کھلی اور وسیع فضا میں آہستہ سانس لینا بے حد نازک فن ہے۔ نزاکت فن کا یہ وجدان بہت ہی کم نثر لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے"

مگر افسوس کہ بعض موقعوں پر جذبات رو اور خیالات کے غلبہ کے باعث وہ خود بھی اس کے شکار ہو گئے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر ایجاز کا فن ان کی تحریروں میں نمایاں ہے اور ہر لفظ سے معنی کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مضمون نگار کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ "اکثر مجموعے مضامین کی یکسانیت اور سپاٹ پن کی بنا پر قارئین کے لئے اکتاہٹ کا سبب بن جاتے ہیں" میرے خیال میں صد فی صد درست نہیں ہے کیونکہ ایک مصنف اپنے مجموعہ مضامین کو کسی خاص نظریے کے تحت پیش کرتا ہے اس لئے اس کے مواد اور پیش کش پر بھی دھیان دینا چاہئے۔ معتبر ادیبوں کے ایسے بے شمار مجموعے ہمارے یہاں ہیں جن میں مضامین کی یکسانیت اور سپاٹ پن بدرجہ اتم موجود ہیں مگر وہ اپنے مواد اور پیش کش کی فنی چابکدستی کے باعث قاری کے لئے اکتاہٹ کا سبب نہیں ہیں۔ جہاں تک صاحب مضمون کا تعلق ہے ان کے سامنے اپنی مختلف ریڈیائی تقریروں اور شائع شدہ مضامین یا ناخواندہ مضامین کی حفاظت اور اسے ابدی زندگی دینے کا اہم مسئلہ تھا (جس کا اعتراف وہ خود ہی کر چکے ہیں۔) اس لئے اس کا مختلف عنوانات کے تحت رنگارنگ ہونا لازمی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے تمام ابواب "ترشحات" کے تحت لائے گئے ہیں۔ ہاں ایک خوبی جو مجھے اپنی انفرادیت کے ساتھ نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ تمام ابواب

کی فہرست اور عنوانات ہم قوافی ہیں اور ان کے لئے عربی
کے جمع کا استعمال کیا گیا ہے جو مصنف موصوف کی
عربی زبان پر گرفت اور فنی بصارت کا ثبوت ہے۔

بعض مضامین کے آخر میں جلی حروف لکھے جملے
قابل غور ہیں۔ یہ مضمون کا ماحصل اور ہماری زندگی کے
لئے پیام ہیں۔

اس کتاب میں شامل ہر مضمون اپنی ادبیت اور اسای
عظمت کی وجہ کر اتنا اہم ہے کہ اس پر اگر تفصیل سے لکھا
جائے تو ایک طویل اور بھاری بھرکم مضمون ہو جائے گا جس
کی گنجائش تبصرے میں نہیں ہے۔ لہٰذا اختصار سے کام لیتے
ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "تنویرات" قیوم خضر کی
وہ شاہکار تصنیف ہے جس کا مطالعہ ہر ذی علم اور ادبی
ذوق رکھنے والے انسان کے لئے ضروری ہے۔ اس کتاب
کا گیٹ اپ بھی خوبصورت اور طباعت بھی اچھی ہے
ساتھ ہی اس وقت کی گرانی کے لحاظ سے قیمت بھی مناسب
ہے۔

ڈاکٹر سید ابوالفیض سید ابادی

نام
نوعیت :۔ قومی یکجہتی سے متعلق ناولٹ
مصنف :۔ ایس شمس الحسن گیاوی
قیمت :۔ دس روپئے
سنہ اشاعت :۔ ۱۹۹۱ء = تعداد صفحات :۔ ۳۲
ملنے کا پتہ :۔ (۱) ظفر بک ڈپو گوتم بدھ روڈ گیا۔ (۲) عزیز بک ڈپو باری روڈ گیا (۳) بہار بک ہاؤس باری روڈ گیا

سید شمس الحسن اردو دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ہے
انہوں نے اپنی شاعت کا سفر اپنی کہانی "احساس" مطبوعہ
ماہنامہ "نگینہ" کشمیر ماہ جون ۱۹۶۶ء سے شروع کیا۔ اس
کے بعد سے آج تک سرگرم سفر ہے۔ اس سفر کے دوران اپنے
جذبات، احساسات اور مشاہدات و تجربات کا اظہار کئی
کہانیوں اور افسانوں کے ذریعہ کر چکا ہے۔

زیر نظر کتاب "سپنے بکھر گئے" جیسے مصنف
نے ناولٹ بتایا ہے انہیں تجربات کا ایک حصہ ہے جس کا موضوع
قومی یکجہتی کے تحت ہندو مسلم دوستی ہے۔ ایک ایسی مثالی
دوستی جو زندگی کے پرپیچ و خاردار راہوں سے گذرتی ہوئی
چتا کی انتم سنسکار تک قائم رہتی ہے۔ ساجد اور رتن
ایک جان دو قالب ہیں۔ رتن کی انتم اکچھا کے مطابق ساجد
رتن کی لاش (نعش) کو آگ دیتا ہے۔

اس سبق آموز اختتام میں مصنف نے جس فنی
مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے اسے پڑھ کر دل
عش عش کرنے لگتا ہے۔ قومی یکجہتی کی اس سے بڑھ کر
کوئی مثال شاید ہی ہمارے بڑے سے بڑے ادیب پیش
کر سکے ہوں۔

ناولٹ کا لکھنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ اس میں
بڑی ہوش گوش سے کام لینا پڑتا ہے اور ہمیشہ چاق و
چوبند رہنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی فن ناول نگاری کے تمام
التزامات کو برتتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر کے قاری
کے سامنے پیش کرنا بھی جو فنی طور پر ایک مشکل کام ہے اور
جہاں کبھی کبھی تو اچھے اچھوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔

زبان و بیان اور طباعت کی خامی کے باوجود
ناولٹ قابل مطالعہ ہے۔ مگر اس کی قیمت زیادہ معلوم ہوتی
ہے۔

ڈاکٹر سید ابوالفیض سید ابادی

مارسہیل گیا

کتاب :۔ ہنس راج رہبر کے منتخب افسانے
ایک تعارف

بے :۔ ... کرم

شر :۔ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

بع :۔ سنجیو آرٹ پرنٹرز کرشن نگر دہلی

یت افسانوی مجموعہ ▲ سنہ اشاعت ۱۹۹۱ء

ت :۔ ۵۰ روپیہ ▲ تعداد صفحات :۔ ۱۸۴

افسانہ نگار کی حیثیت سے ہنس راج رہبر کا نام
اج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے اردو کے علاوہ ہندی
بی اور انگریزی زبان میں بھی صنف افسانہ، ناول نگاری
نگاری، سوانح اور تحقیق و تنقید پر جو مجموعے اور
یں تحریر کی ہیں ان کی تعداد ۶۰ سے زیادہ ہیں ان
۲۹ افسانوی مجموعے اور ناول ہیں۔ اس طرح
بجا طور پر ایک پختہ اور بالغ الذہن افسانہ
ر اور ناول نگار سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔

رہبر بنیادی طور پر اشتراکی ہیں اس لئے ان
افسانوں میں اشتراکی ذہنیت۔ مزدوروں کے مسائل،
تحصال، ظلم جبر و تشدد کے واقعات کی جھلکیاں۔ محنت
اہمیت، روزانہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل۔
نیاتی اور ذہنی کشمکش کے واقعات، حالات کا کرب
نسے عہدہ برا ہونے کی سعی، بدلتے ہوئے سماج اور
ما کے زیر اثر معاشی تبدیلیوں کا ذکر، انداز فکر میں
بدیلیوں کے اشارے۔ شخصی کردار کے بلندی و پستی
لے واقعات۔ عورت کی نفسیات۔ حالات سے نبرد آزما
رنے کی ترغیب، تنگ نظری اور مفاد پرستی کے خلاف
لڑنے کی ترغیب اور سیاسی و سماجی بے راہ روی اور برائیوں

کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہبر کے
اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر وضع کئے ہوئے
اصول و حقائق اور بیش قیمتی نصائح بھی ملتے ہیں جن
سے ہم اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو بنا سنوار اور سدھار
سکتے ہیں

رہبر کا اپنا نصب العین اور آدرش ہے جو کسی
چاپلوسی اور مصلحت آمیزی سے مبرا ہے۔ وہ اپنے قلم کے
جادو اور فنی چابکدستی سے اپنے ہر افسانے میں نہایت
خوبصورت انداز میں اپنے نصب العین کو حاصل کر
لیتے ہیں۔ یہی ان کا معراج اور کمال فن ہے جو انہیں
دوسرے افسانہ نگاروں سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔

رہبر کہانی میں پریم چند کے مقلد ہیں۔ اس لئے ان
کی کہانیوں میں حقیقت پسندی، ذاتی تجربات اور ماحول
کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے تمام تر افسانے ہماری روزمرہ
کی زندگی کے عکاس ہیں اس لئے قاری کو اجنبیت اور
بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

رہبر کا اسلوب بیان سیدھا سادا اور عام
فہم ہے۔ وہ الفاظ کی بازیگری اور بیان کی پیچیدگی
سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان صاف اور سلجھا ہوا
ہے۔ ان کی کہانی آغاز سے انجام تک دھیرے دھیرے
آگے بڑھتی ہے۔ اس میں کہانی اور مختصر افسانے کی ساری
فنی خصوصیات ہمیں ملتی ہیں۔ ان کا نقطۂ عروج انتہائی
اعلیٰ درجے کا اور واضح ہوتا ہے۔ کہیں کسی رکاوٹ
یا بوجھل پن کا احساس قاری کو نہیں ہوتا۔ ہم ان کے
افسانے پڑھنے کے بعد غیر ارادی طور پر خود بخود ان کے
پیغامات کو دل کی گہرائیوں سے قبول کر لیتے ہیں۔
ان کے افسانے دیر تک قاری کے دل و دماغ اور ذہن



پر گھنے بادلوں کی طرح چھائے رہتے ہیں۔

ان کے کامیاب ترین افسانوں میں "تب اور اب" "زخم" "الاکٹ" "سالگرہ" "گڈو لنا" "راجا رام" اور "موہ ناپیز نہیں تھا" ہیں۔ اس مجموعے میں کل ۱۶ افسانے ہیں۔ مرتب نے ان افسانوں پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔

اس کتاب کی طباعت اچھی، سرورق اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ مگر قیمت عام آدمیوں کے پہنچ سے زیادہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کم قیمت پر کتابوں کی اشاعت کا جامع منصوبہ بنایا جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اچھے سے اچھے ادیب کی تحریروں کے مطالعہ سے مستفیض ہو سکیں۔

● ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی

شہر خیال

پرسوں شام کی ڈاک سے سہیل کا خاص نمبر ملا۔ آپ نے جس خلوص و مہربانی سے یہ نمبر شائع کیا اس کے لئے ممنون ہوں۔ مشمولات سبھی معیاری ہیں۔ لیکن رستوگی صاحب کے تعارف کے علاوہ مجھے پروفیسر علیم اللہ حالی کا مضمون بطور خاص پسند آیا۔ موصوف نے وقت نظر اور گہری بصیرت کا ثبوت بھی دیا ہے اور نقد و نظر میں معروضی فکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ مزید برآں ایک مخصوص نکتہ پیدا کیا ہے۔ آپ کا "حرف اول" مختصر لیکن جامع ہے۔

اس نمبر کے سلسلے میں چند اغلاط کی تصحیح کی طرف اشارے ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔ جو چند غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں۔

میں انگریزی زبان و ادب کی پروفیسر نہیں ہوں۔ جیسا کہ میرے کرم فرما جناب تارا چرن رستوگی صاحب کے تعارف سے اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان کے گراں قدر مضمون "اردو شعر و ادب میں ساجدہ زیدی کا مقام (مطبوعہ روح ادب جنوری۔ مارچ ۱۹۹۱ء) سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ میں تو تعلیمات کی طالب علم اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات کی پروفیسر ہوں (شعبہ سے ریٹائر تو ضرور ہو چکی ہوں لیکن پروفیسر تعلیمات ہی کی ہوں)

(۲) کتابت و طباعت کی غلطیاں یوں تو جا بجا ہیں (یہ اعتراض نہیں صرف اظہار واقعہ ہے) لیکن حمد، نظم اور نظموں کے اقتباسات میں جہاں یہ غلطیاں در آئی ہیں اس کا اغلاط نامہ شائع کرنا ضروری ہے کیونکہ فی زمانہ اوزان و بحور کی پابندی نظم آزاد میں کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ نثری نظم کا چلن بھی عام ہے۔ میں اوزان اور بحروں کی پابندی کو نظم آزاد میں لازم قرار دیتی ہوں اور نہیں چاہتی کہ میری نظمیں قارئین اس طور پر پڑھیں کہ اغلاط کو سقم وزن سمجھیں۔ چند اس نوع کی غلطیوں کی نشاندہی پیش ہے۔

صفحہ ۵ - "میں کیا ہوں؟/کون ہوں/کیوں ہوں" یہ صحیح ہے۔ یعنی "کیوں ہوں" کا اضافہ

(۲) سطر ۱۱ - "میرے چاہنے جانب"۔ یعنی چاہنے کا اضافہ

(۳) سطر ۲۴ - "بے معنی ہے" یعنی ہے کا اضافہ

صفحہ ۱۱ - آخر سطر کے بعد "میرے اعتراف" کا اضافہ۔

صفحہ ۱۵، سطر ۱۷ میں - "رات کٹ جائے" کے "تو" زائد ہے اس کا اخراج۔

صفحہ ۲۶۔ سطر ۱۹ میں "میں اپنا دیرینہ انتظار" یعنی میں کے بعد "اپنا" کا اضافہ۔

صفحہ ۲۸۔ سطر ۱۷ "انکار ہے" کے بعد "سے": ہے۔ اس کا اخراج۔

صفحہ ۳۰۔ سطر ۴ — "میں اس کے پیرہن ہوں" "ہر راز" غلط چھپ گیا ہے۔

صفحہ ۳۰ سطر ۱۱ "صدیاں ڈوب جاتی ہیں" "صدیاں" غلط چھپا ہے۔

صفحہ ۳۴ سطر ۱۵ "بے کراں گہرا اندھیرا" "گہرا" چھوٹ گیا ہے۔

صفحہ ۴۴ سطر ۱۲ "کارگاہِ ہنر" "ہنر" غلط چھپا ہے۔

صفحہ ۵۷ سطر ۲۳ "موت ہر لمحہ ہستی کے تعاقب میں زوال" صحیح لفظ "ہستی" ہے۔ "نیستی" چھپ گیا ہے۔

ایک آخری بات۔ سید احمد قادری صاحب کے مضمون کے سلسلے میں بہ کمال انکساری عرض کرنا ہے۔

"آتش سیال" کے تعارف میں۔ میں نے جن مشاہیر کے نام درج کئے ہیں۔ میں نہ تو ان کے "فلسفیانہ خیالات کی اسیر رہی (قادری صاحب کا جملہ) کہ ان میں سے کئی تو فلسفی یا ادیب نہیں محض مصور ہیں یا سنگ تراش۔ اور نہ ہی ان کے خیالات کا اثر قبول کیا۔ ان ناموں کے ضمن میں "متاثر" کا لفظ میں نے اثر قبول کرنے کے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا بلکہ پسندیدگی کے معنی میں کیا تھا۔ انگلش میں دو لفظ الگ الگ مفاہیم کے لئے استعمال ہوئے ہیں AFFECTED ۔ (متاثر ہونا) اور INFLUENCED ۔ (اثر قبول کرنا) میرا مفہوم AFFECTED تھا جسے موصوف نے Influenced سمجھ کر مجھے ان مشاہیر کے خیالات کا اسیر گردانا، فلسفے کا اسیر سمجھا اور یہ بھی حکم لگا دیا کہ "سیلِ وجود" تک پہنچتے پہنچتے میں نے "فلسفے کی اسیری سے نکلنے کی کوشش" کی وغیرہ۔ قادری صاحب کے خلوص کی قدر افزائی کے ساتھ ان سے عرض یہ کرنا ہے کہ اگر وہ اپنے مطالعے کی بنا پر یہ کہتے ہیں تو اس "اثر پذیری" کی نشاندہی کرنے کی زحمت کریں اور اس "اسیری" کا پتہ بتلا دیں۔ اگر میرے تعارفی نوٹ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے تو میری وضاحت پر غور کریں۔ میں نے شاعری میں کوئی فلسفہ منظوم نہیں کیا بلکہ میری افتادِ طبع کچھ ایسی ہے کہ میں انسانی تقدیر اور ماحول و کائنات کے جملہ کوائف و مظاہر کو جب تک اپنا ذاتی تجربہ نہ بنا لوں۔ اس میں ڈوب نہ جاؤں انہیں شعر کا جامہ پہنا ہی نہیں سکتی۔ اب اگر اس سلسلے میں کسی خاص نہج کی غور و خوض کے نتیجے میں کوئی فلسفیانہ نکتہ پیدا ہو جائے تو اسے میری ہی کمزوری (یا قوت) سمجھئے۔ اس نوع کے REFLECTIONS مستعار نہیں لئے جاتے۔

اور سب مقالہ نگاروں کے ساتھ میں قادری صاحب کی بھی از حد ممنون ہوں اور ان سب کی خواہش اور عنایت کی قدر کرتی ہوں۔ یہ اشارے تو محض غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے دیئے ہیں۔

ایک بار پھر آپ کی قدر دانی کا شکریہ ادا کرتی ہوں، ان الفاظ کے ساتھ کہ مجھ ناچیز کے لئے "سہیل" کا یہ نمبر مخصوص کرکے آپ نے میری ادبی خدمات کے افہام و تفہیم کے لئے جو راہ کھولی ہے وہ بہت اہم ہے، آپ کی ادب نوازی کی غماز ہے اور آپ کے خلوص کی آئینہ دار ہے۔ ادب میرے لئے زندگی کرنے کا وسیلہ ہے اور آئندہ نسلوں کے لئے میرا ادبی تحفہ۔ آپ جیسے حضرات اس کی قدر افزائی کریں یہ میری خوش بختی ہے۔

▲ ساجدہ زیدی، علی گڑھ

"سہیل" کا ایک شمارہ ساجدہ زیدی کے نام دستیاب ہوا۔ بہت بہت شکریہ!

آپ تو اردو ادب کے ایسے ایسے موتی اور لال کو سامنے لا رہے ہیں جن پر نام نہاد اردو کے نقاد نے "نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی اور وہ کوڑے کرکٹ کو ہی "جولان گاہ" بنائے رہے۔ خدا کی قسم اگر میں کسی رسالے کا مدیر ہوتا تو آپ کے اس اقدام پر رشک کرتا۔ بہرحال رسماً نہیں دلی مبارک باد تو ضرور دوں گا۔ یہ نمبر مختصر سہی مگر جامع ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کوزہ میں دریا کو بند کرنا۔ زیدی صاحبہ پر اتنی چیزوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کی شاعرہ اور فنکار ہیں۔ پھر اس میں خود ان کی تخلیقوں نے ان کے فن اور ان کی ادبی شخصیت کو جلا بخشتا ہے اور ان سے ان کے فن اور فن پاروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

محترم رستوگی صاحب کسی شخصیت پر لکھتے لکھتے بلاوجہ اقبال کا ذکر غیر ضروری انداز میں کر بیٹھتے ہیں۔ کیا اس سے اقبال کی عظمت میں کمی ہوگی؟

منصور سبزواری صاحب نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کی صداقتوں کو بوسیدہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ زندگی اور موت کی حقیقت پر کون سا حکم رقم کریں گے۔

اور فیاض حالی صاحب کے اس مفہوم پر کہ جدید روشنی نے عورت کو صحیح مقام بخشا ہے، ماتم کرتے کرتے رہ گیا۔ کیا خوب بات کہی ہے جناب حالی نے۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اسلام کا مطالعہ صرف نماز روزہ کی روشنی میں کیا ہے۔ جدید روشنی نے عورت کو کونسا مقام عطا کیا ہے اور اس سے وہ کیا فیض پا رہی ہے، ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں۔

▲ نشاط الایمان، کلکتہ

سہیل برابر موصول ہو رہا ہے۔ بہت بہت شکریہ!

سہیل کا تازہ شمارہ "ساجدہ زیدی کے نام" اپنے وقت کی بہترین شاعرہ کے فکر و فن کو خراج تحسین ادا کر کے شعر و ادب کی خاموشی سے خدمت کرنے والوں کی قدر افزائی کی دستاویز ہے۔

محترم ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اور جناب علیم اللہ حالی نے فنکار کے مختلف گوشوں کو قارئین کے لئے روشن کیا ہے۔ دیگر مشمولات بھی معلوماتی ہیں میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

▲ نصر قریشی، الہ آباد

سہیل کا ساجدہ زیدی نمبر کے ملنے اور اپنے تاثرات لکھنے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ عام شمارہ بھی آ گیا۔ گو کہ مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے اور لیس موتلق صاحب کے یہاں آ گیا۔ ممکن ہے اب آ جائے یا ڈاک کی نذر ہو گیا ہو۔

ساجدہ زیدی نمبر اچھا اور بہت اچھا ترتیب دیا ہے۔ تمام مضامین اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے منفرد اور بھرپور محترمہ کے فن اور شخصیت کے اظہار و تعین کی آسودگی میں معاونت کرتے ہیں۔ اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ایک طرح سے سہیل کے وقار میں آپ نے مزید اضافہ کیا ہے۔ دیگر قارئین کے ساتھ موضوعات، فن پاروں کا تنوع اور اسلوب کے تیکھے پن کا میں بھی معترف ہوں۔

▲ عبد المتین نیاز، بھوپال

سہیل کا شمارہ "ساجدہ زیدی" نمبر پسند آیا۔ کم صفحات میں آپ نے بھرپور مواد دیا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ ایک موضوعی شمارہ اکثر و بیشتر

شائع کرتے رہیں تاکہ اس کی اہمیت دستاویزی رہے اس طرح کہ یک موضوعی شمارہ سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے۔

ادھر سہیل پابندی سے مل رہا ہے اور کتابت و طباعت کا معیار بلند ہوا ہے۔

▲ مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ایک طویل عرصے کے بعد سہیل کا شمارہ ۱۱-۱۲ دیکھنے کا موقع ملا۔ بے حد مسرت ہوئی کہ "سہیل" کا چراغ آپ روشن کئے ہوئے ہیں۔ ادبی رسالوں کی حالت کسے نہیں معلوم، دھیرے دھیرے سارے رسالے بند ہو رہے ہیں، ان حالات میں سہیل کو زندہ رکھنا قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مضمون دکنی کلچر کافی معلوماتی ہے۔ علیم اللہ حالی کا سفرنامہ تو افسانہ ہے (حقیقت ہے مگر افسانوں کی طرح دلچسپ)

مجموعی طور پر سہیل اپنی سابقہ روایات کا پاس رکھ رہا ہے یہ مسرت کی بات ہے۔

▲ الیس۔ شفیع مشہدی، پٹنہ

پرچہ واقعی خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور قابل مبارکباد تو یادامر ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے حق میں صحت، توانائی، تابناکی اور حیات جاودانی کی دعاؤں کے ساتھ۔

شگفتہ فرحت، بھوپال

جلد ۷۸ کا شمارہ ۱۱-۱۲ ملا۔ شکریہ۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون اس شمارے کی جان ہے۔ ان جیسے لوگوں سے ایسے ہی جاندار مضامین کی امید قارئین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا سفرنامہ بھی بڑی دلچسپی کا حامل ہے۔ شعری حصے میں شباب للت، ضیاء الانجم اور علیم صبا نویدی نے بالخصوص متاثر کیا۔ آپ کا نوٹ (اداریہ) بھی پچھلے شماروں کی طرح بڑا قیمتی اور جان افروز ہے۔

▲ ظفر امام، بتیا

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ روز بروز جاندار ہوتا ہے۔ بالخصوص اداریہ مختصر مگر بے حد مفید بنتا جا رہا ہے۔ اس مرتبہ کا اداریہ دیدوری کا عمدہ نمونہ ہے۔ مجھے ہندوستان کے مستقبل کے لئے نوشتۂ دیوار دکھائی دے رہا ہے۔ غفلت، مصلحت پسندی تو عام شعار ہو گیا ہے۔ جس میں تبدیلی دشوار ہے۔ وقت ہی اس میں تبدیلی لائے تو لائے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون "مغلیہ تہذیب کا عروج و زوال، صاحب موصوف کے ذوق فکر اور وسعت مطالعہ کی ناقابل فراموش دستاویز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اتنی بڑی سچائی جس اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے وہ قابل تحسین ہی نہیں قابل قدر ہے۔ اگر ہندی زبان کے دانشور اس کو تسلیم کریں تو فکر و نظر کا زاویہ بدل جائے کیونکہ بقول ڈاکٹر صاحب ــ" اس دور کی بصیرتیں آج تک ہماری رہنمائی کرتی رہیں اور کرتی رہیں گی۔

▲ محمد عبدالقادر ادیب

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں۔

ادارہ

بانی: محمد عبدالرحمٰن سہیل سنسہاروی ✱ بیلگام: زین العابدین احمد وادریس سنسہاروی

سہیل گیا

ماہنامہ

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر
ایڈیٹر: جمیل منظر
معاونین: شکیل احمد حالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
▲ کتابت۔ سید عبدالاحد گیاوی ▲

شمارہ ۱ جلد ۵۲

بدلِ اشتراک
▲ فی شمارہ ...... =/۵ روپئے
▲ زرِ سالانہ ...... =/۵۰ روپئے
▲ لائف ممبری ...... =/۱۰۰۰ روپئے

فہرست

▲ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل گیا
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا (بہار)
فون نمبر ۲۱۵۰۳

کالا آزار پہچانئے

مرض کی شناخت :- رک رک کر تیز بخار آنا، بخار کسی قسم کا ہو سکتا ہے ▲ کمزوری محسوس کرنا ▲ جسم میں خون کی
▲ جسم کا وزن گھٹنا ▲ بھوک میں کمی ہونا ▲ تلی (سپلین) اور جگر کا بڑھنا ▲ پیٹ کا بڑھ جانا ▲ پرانے مریضوں
کے ہاتھ پاؤں اور چہرے کا کالا پڑ جانا

آپ اسے پھیلنے سے روک سکتے ہیں :- بالو مکھی اس مرض کے ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ یہ مرطوب اور نمی والی گھر کی دیواروں کے پھٹے ہوئے دراروں یا چھیدوں، گوبر کے ڈھیر یا جمع کوڑا کرکٹ پر انڈے دیتی ہے۔ اور اپنا خاتمہ

علاج :- کالا آزار ہونے کا شبہ ہو تو مریض کو نزدیک کے اسپتال یا ہیلتھ سنٹر میں ڈاکٹروں کی صلاح کے مطابق علاج کرانا چاہیے۔ اگر جانچ کرنے پر کالا آزار نکلے تو اس کا وقت سے پورا علاج کرانا چاہیے۔ کم از کم 20 سوئیاں لگوانی چاہیے لگاتار۔ سرکاری اسپتالوں اور ہیلتھ سنٹروں میں مفت علاج ہوتا ہے ۔ ڈی۔ڈی۔ٹی کا ۵ گھول چھڑکاؤ کے لئے استعمال میں لائیں اس لئے تین تین پونڈ ڈی ڈی ٹی (۵۰ فیصد) پاؤڈر کے تین گیلن میں گھول تیار کریں۔

بچاؤ کے اقدام :-

(۱) گھر کو صاف ستھرا رکھیں (۲) گھر میں جہاں تک ممکن ہو روشنی کا انتظام کریں۔

(۳) زمین پر نہ سو کر چوکی یا کھاٹ پر سوئیں (۴) ننگے بدن نہ رہیں

(۵) رات کو مہین مچھر دانی کا استعمال کریں۔

(۶) گھر کے آس پاس پانی کا جماؤ نہیں ہونے دیں

(۷) سونے والے گھر سے مویشیوں کو دور رکھیں

(۸) گھر کے آس پاس گوبر کا ڈھیر جمع نہ کریں۔

(۹) سرسوں تیل سے بنائے گئے چکنی لوشن کا رات میں استعمال کرنے سے بھی اس مرض سے آپ کی حفاظت ہو سکتی

PR. 9 270 (H-9) 92-93

سنموی

بہار کا تعلیمی نظام

یوں تو آج پورے ہندوستان میں تعلیمی نظام انتشار کا شکار ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں لگتا ہے کہ اس کا بدترین نمونہ بہار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینوں سطحوں پر افراتفری اور زوال کا یہ منظرنامہ آج کے اور مستقبل کے نوجوانوں کو کہاں پہنچا رہا ہے۔ اس کی طرف سے اعلیٰ حکام بھی بے خبر ہیں اور وزراء بھی۔

اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کا کام کتنا ہو رہا ہے یہ تو پڑھنے پڑھانے والے ہی جانیں مگر امتحانات جس انداز سے لئے جا رہے ہیں وہ تو ہم سب پر عیاں ہے۔

امتحانات میں نقل کرنے اور چوری چھپے پرزوں اور کاغذوں کے استعمال کی روایت تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ پرانی ہو چکی ہے لیکن اب تو صورت حال یہ ہے کہ اس چوری کو طلبا اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔ اساتذہ جو امتحانات کے دوران نگرانی کرتے ہیں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز اور دوسرے اعلیٰ حکام خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ انتظامیہ اور پولیس کو لگتا ہے کہ سانپ سونگھ گیا ہے۔ گویا نقشہ یہ ہے کہ یہ تمام عناصر طے کر چکے ہیں کہ امتحانات کے معیار کو جس قدر گرایا جا سکتا ہے گرایا جائے۔

ایسے بھی معلوم ہوا ہے کہ وائس چانسلروں اور دیگر ارباب تعلیم کا پہلا اور آخری مقصد یہ ہے کہ کسی طرح امتحان ہو جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے امتحانات، ان کے نتائج اور ان ڈگریوں کی کیا معنویت ہے۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ وزرائے تعلیم اور ریاست کے چیف منسٹر کو اس صورت حال کی خبر نہ ہو، سبھوں کو خبر ہے لیکن ان میں سے کوئی ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس طرح ریاست میں تعلیم کے نام پر کروڑوں روپے خرچ کر کے تیزی کے ساتھ جہالت کو عام کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔

ممکن ہے یہ لوگ اس مجرمانہ بے توجہی کے نتائج سے ابھی پورے طور پر واقف نہ ہوں لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر چند برسوں تک یہی صورتحال رہی تو پھر مستقبل قریب میں تہذیبی انارکی، انتشار، بدنظمی، قتل و غارت گری، جماعتی مجادلوں اور تخریب کارانہ اقدامات کا ایک نہایت خطرناک اور وحشت انگیز نقشہ ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

کیا ہمارے دانشور حضرات، ہمارے معلمین، ہمارا انتظامیہ، ہمارے تعلیمی اداروں کے اراکین اور سیاست و اقتدار کے نمائندے آنے والے دور کی کوئی دھندلی سی تصویر بھی دیکھ رہے ہیں ——— مسعود منظر

اصغر علی انجینیر

پریم چند ـ حیات اور فن

قسط ۴

ادب میں جمالیات کا بہت اہم مقام ہے اور کوئی ادبی بحث جمالیاتی اقدار کا تعین کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی لیکن ان اقدار کے تعین میں ادیبوں اور نقادوں میں بڑا بنیادی نظریاتی اختلافات رہا ہے۔ ہم آگے چل کر پریم چند کے جمالیاتی موقف پر کچھ تفصیل سے گفتگو کریں گے ہی لیکن یہاں بھی اس کے متعلق چند باتیں کہنا مناسب ہوگا۔ جیسا کہ اوپر ہم کہہ چکے ہیں پریم چند کی سماجی اور طبقاتی حیثیت نے ان کے سماجی، مذہبی اور ادبی نظریات پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ پریم چند اوپری طبقوں کے ادیبوں اور تخلیق کاروں کی طرح ادب کو محض ذہنی عیاشی یا زندگی سے فرار کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں جمالیات کا تصور سماوی نہیں ارضی تھا۔ وہ اسے محض ہیئت کے کھوکھلے تصور تک محدود کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کا ناتا عوام کی زندگی سے جوڑنا ادیب کا بنیادی فرض سمجھتے تھے۔ ادب کے سماجی فرض کا احساس ان کے یہاں کتنا گہرا تھا اس کا اندازہ ہمیں اس خط سے ہوتا ہے جو ۱۹۲۹ء میں انہوں نے دیا نرائن نگم کو بڑے طیش میں آکر لکھا تھا۔ یہ تو ہم پڑھ چکے ہیں کہ دیا نرائن سے ان کے ذاتی مراسم بہت گہرے تھے اور وہ ان کا بڑا احترام بھی کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء کا دور ہندوستان کے لئے آزادی کی جدوجہد کے شباب کا دور تھا۔ ایسے بحرانی دور میں "زمانہ" کا نومبر ۱۹۲۹ء میں آتش نمبر شائع ہوا تو پریم چند بپھر گئے اور اسی بپھرے ہوئے تیور سے دیا نرائن نگم کو خط لکھا۔ یہ خط اس لئے اہم ہے کہ یہ پریم چند کے ادبی اور جمالیاتی نظریئے پر روشنی ڈالتا ہے۔ خط میں چونکہ غصے کا اظہار ہے اس لئے اس کی ابتدا "برادرم" جو وہ عام طور پر نگم صاحب کو لکھا کرتے تھے کی بجائے بڑے رسمی انداز میں کی ہے۔

مکرم بندہ نواز جناب ایڈیٹر صاحب "زمانہ" تسلیم
رسالہ "زمانہ" کا ماہ نومبر کا پرچہ دیکھ کر
میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے جنہیں
عرض کر دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ امید
ہے کہ جناب کو ناگوار نہ ہوگا۔ اس زمانے

یا گیا

میں جب کہ گوناگوں اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ رسالہ زمانہ کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرے کی نذر ہو گیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنؤ شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔ مگر پھر بھی اعتراف یہ ہے کہ بہ استثنا، ان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور سبھی طبعاد کو موجودہ معیار اور ذوق صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع ہے۔ تہذیب، اخلاق، مشاہدہ، جذبات، انکشافِ حقائق، واردات و کیفیت قلب کا اظہار جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانا، خنجر و محشر، بشری و خطا، ذہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں۔ جن کی افتاد طبیعت اس رنگ کی ہے انہیں اختیار ہے آتش یا ناسخ، رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں لیکن زمانہ کے مختلف الطبع ناظرین کو اس ورد اور وظیفے میں شریک ہونے کے لئے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ مرزا جعفر علی خاں صاحب نے اپنے تبصرے میں آتش کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے مگر اس انتخاب میں بھی بیشتر ایسے اشعار ہیں جنہیں ذوق لطیف ہرگز قابل ستائش نہ سمجھے گا۔ ملاحظہ ہو۔

بھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا

اور بھی طویل ہے لیکن کہنے کا مطلب یہی ہے کہ ایسا زور انحطاط کا ادب ہے اور قوموں کو سلانے والا عیش و عشرت کی طرف موڑنے والا ادب ہے۔ یہ ادب انسان کو میدان عمل سے منہ موڑ کر کاخ و کو میں پناہ لینے اور حسن و عشق کے چٹخارے لینے کی دعوت دے کر اس کی جدوجہد کی قوت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ منشی جی نے جس بپھرے ہوئے انداز میں اپنے عزیز ترین دوست کو خط لکھا ہے اس سے زندگی اور زندگی کی جدوجہد سے ان کے ادبی کمٹ منٹ کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خیر یہ خط تو انہوں نے ۱۹۲۹ء میں لکھا ہے مگر ۱۹۰۵ء کے آس پاس ہی پریم چند ادب کا یہ نیا نظریہ اپنا چکے تھے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کے مجموعے سوز وطن کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ بھی ہماری پوری توجہ چاہتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ دیباچے میں منشی جی رقمطراز ہیں۔

ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہئے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور

تجدید ہی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب الوطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے ہیں کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا ادب پر اثر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائینگے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمالیں۔"

یہی وہ زمانہ ہے جب پریم چند وطن عزیز کی جدوجہد آزادی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ سوز وطن حب وطن کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس مجموعے میں یہ کہانیاں شامل تھیں (۱) دنیا کا سب سے انمول رتن (۲) شیخ مخمور (۳) یہی میرا وطن (۴) صلہ ماتم (۵) عشق دنیا اور حب وطن۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ " دنیا کا سب سے انمول رتن " ایک عاشق نوجوان دلفگار کے عشق کی کہانی ہے جو اپنی محبوبہ دلفریب کے عشق میں گرفتار ہے۔ اور دلفگار سے اپنے عشق کے صلے میں دنیا کا سب سے انمول رتن طلب کرتی ہے۔ دلفگار اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ کئی چیزیں مثلاً اپنا بچپن، بیوی کی اپنی شوہر کی لاش پر جل کر خاکستر ہو جانے والی قربانی وغیرہ۔ لیکن دلفریب ان کو دنیا کی سب سے قیمتی شئے نہیں سمجھتی۔ آخر عاشق نامدار ایک بزرگ کی رہنمائی میں ہندوستان آتا ہے جہاں سے ایک میدان میں جنگ کا منظر نظر آیا۔ یہاں اسے کئی بہادر نوجوان کے سینے سے خون ابل رہا تھا اور وہ دم توڑنے کو تھا۔ دلفگار نے اس سے پوچھا " اے جواں مرد تو کون ہے۔ جواں مرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجے میں بولا۔

" کیا تو نہیں جانتا میں کون ہوں کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لخت جگر ہوں" کچھ اور جواب سوال کے بعد سپاہی دلفگار سے کہتا ہے: " افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیش ہمارے ہاتھ نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں مگر ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیش کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کی گھاٹ اترے ہیں اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں مر رہا ہوں۔ سینے پر کیا تو نے مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی ارض میں غلامی کرنے کے لئے زندہ ہوں؟ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں"

اس طرح ایک سچے وطن پرست نے غلامی کے خلاف اپنے وطن پر جان دیدی۔ اور اس کے سینے سے خون کا آخری قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے جلدی سے اس قطرۂ خون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے دنیا کی بیش قیمت شئے سمجھ کر محبوبہ دلفریب کی طرف چل پڑا اور جب محبوبہ کو دکھایا اور ساری روداد سنائی تو دلفریب مسرت و خوشی سے جھوم اٹھی اور شدت جذبات سے دلفگار کے ہم آغوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے صندوقچے میں سے ایک لوح نکالا جس پر لکھا تھا۔ " وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت پر گرے دنیا کا سب سے قیمتی شئے ہے۔"

فنی اعتبار سے کہانی بڑی کمزور ہے اور ویسے
داستان طرز میں لکھی گئی ہے۔ پریم چند ابھی تک
ان کے لئے نئی راہ بنا نہیں سکے تھے۔ لیکن یہ داستان
بھی ایک معنی میں مختلف تھی۔ اس میں حسن و عشق کی
شنی ہوتے ہوئے بھی کہانی کا مقصد "حب وطن کے
نت کا نقش" جمانا تھا۔ اس مجموعے کی دوسری
انی صلہ ماتم تکنک کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے
داستان طرازی سے الگ راستہ بناتی ہے۔ "عشق
یا اور حب وطن" کا پس منظر تاریخ سے ابھرتا ہے۔
کے محب وطن میزلسنی کی زندگی پر اس کہانی کی بنیاد
ی گئی ہے۔

ظاہر ہے یہ کہانیاں انگریزی حکومت کے خلاف
تھیں۔ اور پریم چند نے اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر
یں لکھا بھی تھا۔ اس وقت وہ نائب ڈپٹی انسپکٹر
ف اسکولز تھے۔ اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتے
"سوز وطن" کی کہانیاں انگریزی حکومت کے غیظ و
ب کا باعث ہوئیں اور بہت جلد پتہ لگا لیا گیا کہ نواب
ے ایک سرکاری ملازم دھنپت رائے کا قلمی نام ہے
مت نے "سوز وطن" کی تمام کاپیوں کی ضبطی کا حکم
ری کیا۔ دھنپت رائے کو مجسٹریٹ کے سامنے حاضر
نے کا حکم دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے جانے کی تفصیل خود
چند نے لکھی ہے۔

"ایک دن میں رات کو اپنی راوٹی میں بیٹھا ہوا
کہ میرے نام ضلع کے حاکم اعلیٰ کا پروانہ پہنچا کہ
ان سے فوراً ملوں۔ جاڑوں کے دن تھے، صاحب
رے پر تھے۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں
ت چالیس میل طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔
حب کے سامنے "سوز وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی

میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت میں نواب رائے کے نام سے
لکھا کرتا تھا مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ چل چکا تھا کہ خفیہ
پولس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا
کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا۔ اور اس کی جواب دہی کے
لئے مجھے بلایا گیا ہے۔

صاحب بہادر نے مجھ سے پوچھا۔ کیا یہ کتاب تم
نے لکھی ہے؟

میں نے تسلیم کیا۔ صاحب نے مجھ سے ایک
ایک کہانی کا نفس مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے۔

تمہاری کہانیوں میں باغیانہ خیالات بھرے
ہوئے ہیں۔ اپنی خوش نصیبی سمجھو کہ انگریزی عملداری میں
ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ
لئے جاتے۔ تمہاری کہانیاں جانبدارانہ ہیں، تم نے انگریز
سرکار کی توہین کی ہے۔"

جب پریم چند کانپور سے مہوبے کے لئے روانہ
ہو رہے تھے تو انڈین پریس الہ آباد کے مالک چنتامنی گھوش
نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ ایک اردو ماہنامے کی
ایڈیٹری قبول فرمائیں گے جو انڈین پریس سے جاری ہونے
والا تھا۔ اس ملاقات میں ماہنامے کے نام کے بارے میں
گفتگو ہوئی۔ پریم چند نے "فردوس" نام تجویز کیا۔
لیکن انہیں سرکاری نوکری کی دقتوں اور دشواریوں کے
پیش نظر ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات آڑے آئی۔ وہ
بار بار سرکاری نوکری چھوڑنے پر آمادہ ہوتے مگر
آخری لمحے میں ہمیشہ ہچکچا گئے۔ یہی صورت حال "زمانہ"
کے معاملے میں بھی سامنے آئی۔ وہ زمانہ کے لئے کام اور
کانپور میں قیام کرنے پر تیار تھے۔ مگر اس کے لئے ایک کم
رقم کی مالی ضمانت چاہتے تھے۔ لیکن اس میں بھی وہ آخری
لمحے میں ڈگمگا گئے۔ اور انکار کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے

مارواڑی اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے نگم صاحب کو لکھا کہ وہ ہیڈ ماسٹری سے کم پر کسی طرح جانے کو تیار نہیں۔

ادھر انگریزی سرکار کی طرف سے دھنپت رائے پر پابندی عائد کی گئی۔ ان کو سرکار سے عہد کرنا پڑا کہ اب وہ جو کچھ لکھیں گے اسے کلکٹر کو دکھائے بغیر اور ان کی اجازت حاصل کئے بغیر چھپوائیں گے نہیں۔ جب بیوی نے یہ قصہ سنا تو بولیں: "تو پھر لکھنا بھی بند ہی سمجھو"

لیکن دھنپت رائے اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ بولے۔ "لکھوں گا کیوں نہیں فرضی نام رکھنا پڑے گا۔" اس کے بعد "زمانہ" مارچ ۱۹۱۰ء کے شمارے میں ان کی کہانی "گناہ کا اگن کنڈ" چھپی جس پر لکھنے والے کا نام "افسانہ کہن" دیا گیا ہے۔ اس کہانی سے اس زمانے میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نگم کے نام ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "نواب رائے تو غالباً کچھ دنوں کے لئے اس جہان سے گئے۔ دوبارہ یاد دہانی ہوتی ہے کہ تم نے معاہدے میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کے تحریرے تھا۔ گویا میں کوئی مضمون خواہ ہاتھی دانت پر ہی کیوں نہ ہو۔ لکھوں تو مجھے پہلے وہ جناب فیضیاب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا اور مجھے چھپتے چھ ماہے لکھنا نہیں یہ تو میرا روز کا دھندہ ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون جناب والا کی خدمت میں پہونچے گا تو وہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں اور کام میرے سر پر تھوپا جائے گا۔ اس لئے کچھ دنوں کے لئے نواب رائے مرحوم ہوئے ان کے جانشیں کوئی اور صاحب ہوں گے"

نواب رائے کچھ دنوں کے لئے ہی نہیں ہمیشہ کے لئے مرحوم ہو گئے۔ اگلی کہانی "رانی سارندھا" زمانہ کے اگست ستمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں بغیر مصنف کے نام کے چھپی۔ ایک مضمون "ادیب" الہ آباد کے اگست ۱۹۱۰ء کے شمارے میں چھپا۔ جس پر لکھنے والے کا نام صرف "د۔" لکھا ہوا ہے۔ ایک اور کہانی "بے غرض محسن" بھی اس زمانے کی ہے مگر شمارہ دستیاب نہیں ہوا اس لئے کہنا مشکل ہے کہ کس نام سے چھپی۔ "سوز وطن" کے قضیے کے بعد بھی دھنپت رائے اپنا مجموعہ چھپوانا چاہتے تھے۔ اس لئے اب کسی نام کی تلاش ہوئی۔ آخر دیا نارائن نگم نے ہی پریم چند نام تجویز کیا، دھنپت رائے کو پسند آیا نگم کو لکھتے ہیں۔

> "پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہی گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ نواب رائے ہمیشہ کے لئے قسمت کے لنڈورے ہو گئے اور پریم چند کی قسمت ایسی چمکی کہ آج بھی اردو اور ہندی ادب کی تاریخ میں یہ نام روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ پہلی کہانی جو پریم چند کے نام سے چھپی اس کا عنوان تھا "بڑے گھر کی بیٹی" یہ کہانی "زمانہ" کے دسمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں شائع

ہوئی تھی۔ لیکن یہ بات بھی یہاں نوٹ کرنا ضروری ہے کہ ابتدا میں پریم چند کے فرضی نام سے کہانیاں صرف "زمانہ" میں ہی شائع ہوتی رہیں۔ دوسرے رسالوں مثلاً ادیب وغیرہ میں وہ کچھ عرصے تک پرانے نام سے ہی لکھتے رہے جس کے لئے انہیں کلکٹر کی اجازت لینا ہوتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ کلکٹر یہی سمجھتا رہے کہ نواب رائے ان کی اجازت حاصل کرکے ہی کہانیاں اور مضامین چھپواتے ہیں۔ خود پریم چند نے "ادیب" کے ایڈیٹر پیارے لال شاکر کو ایک خط میں یہ وجہ بتائی ہے۔

"میں منشی دیا نرائن نگم سے وعدہ کر
چکا ہوں کہ پریم چند کے نام سے کسی اور
پرچے میں نہ لکھوں گا۔ بلا وجہ ان کا دل
دکھانا مجھے منظور نہیں۔"

پریم چند محض نام کی ہی تبدیلی ثابت نہیں ہوا بلکہ ان کے کہانی کے فن میں ایک نیا موڑ بھی یہ نام اپنانے کے بعد جو کہانیاں لکھیں ان میں داستان طرازی کا اثر کم ہوتا گیا اور ان کے فن میں پختگی آتی گئی۔ ویسے "بڑے گھر کی بیٹی" کو بھی ان کی اچھی کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ دنیا کی اچھی کہانیوں سے ٹکر لے سکتی ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے "بے غرض محسن" "آہ بے کس" "وکرما دتیہ کا تیغہ" "راج ہٹ" "منزل مقصود" "عالم بے عمل" "نمک کا داروغہ" "ممتا" وغیرہ کہانیاں لکھیں۔ ان میں سے کچھ کہانیوں پر راجستھانی تاریخ کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

(جاری)

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط ۲

نظم ہو یا غزل قصیدہ ہو یا مثنوی، مرثیہ ہو یا ہزل گوئی شدت احساس تو پہلی شرط ہے۔ شاعر نے شراب پی نہیں، مینا بدوش، کس کو بے ہوش لکھ دینے سے شراب پینے یا شراب پینے کی خواہش یا شراب کے بعد نشہ کے افرکی کیفیت کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ساری زندگی ریاض خیرآبادی نے شراب کے متعلق شاعری کی مگر شراب کی لذت یا تاثیر یا نشہ کی بات سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ کم از کم حفیظ جالندھری کے اس بند میں بہتر کیفیت ہے۔

حواس گم، قیاس گم، نظر سے آس پاس گم
لعید اور پاس گم، ہمہ بجز گلاس گم

یہاں "ہمہ بجز گلاس گم" ایک مصرعہ میں جو تاثیر ہے وہ کلیم صاحب کی پوری نظم میں نہیں۔ اس طرح عزیز لکھنوی کا ایک شعر دیکھئے۔ حالانکہ عزیز لکھنوی بھی ثقہ مستم کے الشان تھے۔ پہلا مصرعہ تو معمولی ہے مگر ثانی مصرعہ سے شعر میں کیا جان آئی ہے ملاحظہ کریں۔

وہ جام آتے ہی گردش میں مقدر آگیا
آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آگیا

کلیم صاحب کی نظم باقاعدہ سوچ و فکر کی پیداوار ہے۔ یہ نظم جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کہی گئی۔ سوچ سمجھ کر لکھی گئی کہ ایسا ایسا ہونا چاہئے۔ آورد اظہر من الشمس ہے۔ حالانکہ ہر اچھا شعر آورد کا ہوتا ہے۔ سوچ سمجھ کر لکھا جاتا ہے۔ مگر حسن یہ ہونا چاہئے کہ آورد کے شعر پر آمد کا اطلاق ہو۔ یہ بھی سن لیجئے کہ صرف آمد کے اطلاق ہی سے اچھا شعر نہیں تخلیق ہو سکتا ہے اگر ایسا ہوتا تو داغ سے بہتر شاعر کوئی نہیں ہوتا اگر کچھ شعرا اس صنف میں لائے بھی جاتے تو داغ صف اول کے شاعر ہوتے۔ جو وہ نہیں ہیں ـــ میں بہک گیا ـــ دراصل شراب اور نشہ کی بات جو شروع ہو گئی۔ خیر صاحب آیئے نفس مضمون پر یعنی کلیم صاحب کی نظم۔ جس طرح جوش قافیہ سے مضمون تلاش کرکے رباعی مکمل کرتے ہیں یہاں نظم مکمل کی گئی۔ قافیہ کی مدد سے نہیں۔ بلکہ علم حساب کی مدد سے۔ آپ الجھیں نہیں کہ علم حساب یا اقلیدس سے نظم کا کیا واسطہ۔ ہے صاحب۔ دیکھئے ـــ شاعر نے یہ سوچا کہ ابتدا میں

ہیں منظر ہو جو طربیہ ہے کیونکہ عید کا موقع ہے پھر عوام
شی ہیں مینے والا بھی اس خوشی میں مست ہے پھر دکھا
یا دل معشوق کی یاد میں بے کل ہے اس پر عید کا اثر
ہیں اس لئے عید بھی محرم ہے۔ یہ نظم جیسا کہ عرض کر چکا
ں۔ الجبرا کا FARMOLA ہے $(a+b)^3$ کا نتیجہ بہرحال
$a^3+3a^2b+3ab^2+b^3$ ہی ہوگا۔ شاعر نے
ریزی شاعری کا بے حد مطالعہ کیا ہے اور اسی سانچہ
کامیاب نظم کا فارمولا بنا یا ہے اور اسی پر نظم کہہ دی
شاعر صاحب سے دست بستہ گزارش ہے کہ حضور عالی
عری الجبرا یا اقلیدس نہیں کہ جواب حاضر ہے۔ یہ شاعری
تجربات اور حسیات کا اظہار خیال۔ شراب جب
ہی نہیں تو شراب کے کوائف آپ کیسے جان سکتے ہیں۔

یہ مزہ پاک باز کیا جانیں

ت کی نہیں تو محبت کے مختلف تجربات کا صحیح احساس
ہی نہیں سکتا۔ محبت تو والدین سے بھی ہوتی ہے اولاد
بھی مگر معشوق کی محبت کے تجربات بے حد وسیع ہوتے
محبت میں صحیح یا غلط جلن اس میں بھی وہ لطف ہے کہ
تاؤں۔ پہلے محبت کیجئے۔ معشوق کے بے وفا ہونے کا
ہے۔ یہ کیسا جان لیوا ہوتا ہے خواہ یہ شک اپنی جگہ
یت رکھتا ہو یا بے بنیاد ہو یہ الفاظ میں کیسے بتاؤں۔
ے کو مختلف رنگوں کا فرق کیسے بتایا جا سکتا ہے۔
شخص کو سونگھنے کی قوت نہ ملی ہو اسے شمامۃ العنبر
رتیا چمیلی کے عطروں کا فرق کیسے سمجھایا جائے۔ اسی
غزل کے ہر شاعر اور ہر ناقد سے یہ میری استدعا ہے
ور جب تک محبت سے کما حقہ واقف نہ ہوں اس
ان سے کنارہ کریں تو آپ ہی کی صحت کے لئے
ت مفید ہوگی۔ اس لئے کہ عشق کی آگ میں جلے بغیر
کے متعلق اپنے قلم کو کاغذ پر گھسیٹ کر روشنائی

کو بے رنگ اور کاغذ کو وہ کاغذ بننے کی سعادت کا موقع
نہ فراہم کریں جس کا استعمال عام طور پر ہندوستانی
نہیں جانتے ہیں۔ پرانے اساتذہ کا بھی فارمولا تھا۔
اور اس فارمولا کو آپ لائق اعتنا نہیں سمجھتے پھر آپ
نیا فارمولا جو غیر ملک سے درآمد کر کے نظم کے لئے نسخۂ مجرب
کی شکل میں پیش کر رہے ہیں وہ بھی ویسا ہی ہے بلکہ کم تر۔
اب ایک غزل جو پرانے فارمولا پر کہی گئی ملاحظہ کیجئے۔

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر
کیا ڈھونڈے دشت گم شدگی میں مجھے کہ ہے
عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر
اس مرغ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
عرفان کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر
کرتا ہے دل کا قصد کماں دار تیر اے تیر
پر ہے نشان داغ سے دور اور شکستہ پر
اے ذوق میرے طائر دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

پرانا فارمولا اور وہ بھی کہنہ مشق اور قادر الکلام اساتذۂ
سخن کا (شاعر نہیں۔ شاعر تو محسوس کر کے شعر موزوں کرتا
ہے۔ یا کم از کم ایسے آورد کا شعر کہتا ہے جس پر آمد کا یقین
ہوتا ہے مگر شدت احساس پھر بھی شرط اولین ہے) یہ
رہا ہے کہ ردیف پر زور دیتے ہیں۔ اب یہاں ردیف سے
دور اور شکستہ پر ہے تو ہر مصرعہ میں کسی پردار (طائر چیز
کی ضرورت ہوتی تو مطلع میں بلبل اور پروانے اور اسی رعایت
سے باغ اور چراغ جو قوافی ہیں۔ یہاں تک کہ چوتھے مصرعے
میں تیر۔ چونکہ تیر میں بھی پر کی شکل کے ہوتے ہیں۔ کم از کم یہاں
شدت احساس کی کمی کے باوجود قاری اس شاعری فن اور
شاعر کی مشاقی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مبتدی شاعر

سا ملہ یہیں گیا

کے لئے یہ ایک سبق بھی ہے۔ یہاں ایک شعر میں نے قصداً نہیں شامل کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تغزل کی جھلک آجاتی ہے اور وہ یہ ہے۔

ساقی بغیر لوں ہے بعلائے پڑی ہوئی
خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

نظمیں بھی خوبصورت ہوتی ہیں اور اچھی نظمیں بھی کہی گئیں ہیں۔ مثلاً ایک نظم پیش کرتا ہوں۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں کوئی حرف آخر نظم پیش کر رہا ہوں بس ایک اچھی نظم ہے۔

خدائے عالم بلند و برتر
سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
محبتوں کے لطیف دامن
مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں
یہ وادیاں ہیں گلوں کا مسکن
سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
زمیں کے سینے سے پھوٹتے ہیں
نئے شگوفے، نئی بہاریں
فرازِ کوہِ گراں سے گرتی
ہیں تند اور تیز آبشاریں
مگر مجھے کیا دیا یہ تو نے
شباب اک زہر زمیں بجھا کر
خراب آنکھیں لہو رلا کر
خدائے عالم۔ بلند و برتر
نہ ایک مونس بھی ایسا تھا
کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر
سکون کے ساتھ میں سکوں میں

کلیم الدین کی نظم اور اختر الایمان کی نظم میں بعد المشرقین ہے۔ اس لئے نہیں کہ موخر الذکر ایک جانے مانے ہوئے شاعر ہیں بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ شدت احساس اختر الایمان کے یہاں موجود ہے جو کلیم الدین کی نظم میں عنقا صفت ہے۔

آیئے اب پھر غزل گوئی کی طرف۔ اگر غزل گو شعرا[1] کی فہرست مرتب کرنی ہو تو میرا خیال ہے کہ یہ فعل تقریباً ناممکن دکھائی دے گا کیوں کہ ان کی تعداد شاید آسمان میں جتنے ستارے ہیں اس سے زیادہ نہیں تو شاید اتنی ہی ہو۔ مگر میرے خیال میں ابھی تک صرف دس بارہ غزل گو شعراء گزرے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان دس بارہ غزل گو شعراء نے جو کچھ کہا ان کا سارا کلام اور ہر شعر تغزل کا حامل ہے یا غزل کا کوئی شعر موزوں کیا ہی نہیں۔ یا یہ ہے کہ یہ دس بارہ غزل گو شعراء نے جو کچھ کہا ان کا سارا کلام اور ہر شعر تغزل کا حامل ہے یا غزل کی پوری طور سے نمائندگی کرتا ہو۔ ایسی بات نہیں۔ بلکہ یہ دس بارہ شعرا ایسے ہیں کہ انہوں نے غزل کے مزاج، تیور، لب و لہجہ کو اپنا کر شدت احساس کے ساتھ غزلیں کہیں ہیں۔ ان دس بارہ کے علاوہ بھی اکثر شعراء ایسے ملیں گے جن کے بعض اشعار میں تغزل بھرپور جلوہ گر ہے۔ پہلے میں یہ بتا دوں کہ میں کن شعراء کو غزل گو سمجھتا ہوں۔ میری فہرست ملاحظہ کیجئے۔ یہ فہرست درجہ بدرجہ نہیں۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر، آتش، مومن، غالب، شاد، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر، فراق، اور فیض۔ ایک بار مکرر عرض کر دوں کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ ان مذکورہ بالا شعراء نے جو کچھ کہا ہے یا ان کا ہر شعر تغزل کا آئینہ دار ہے۔ پہلے ان شعراء کے اشعار پیش کرتا ہوں جن کو میں نے غزل گو شعراء گردانا ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد

[1] غزل گو سے مراد وہ جو عام مفہوم ہے

یہ غزل کے اشعار ایسے شعرا کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

قصہ دار و رسن بازیٔ طفلانہ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانہ دل
تو سمجھتا ہی نہیں واعظِ ناداں اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
(اقبال)

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

آخر شبِ دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

وہی میری بے نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ مقام نے نوازی
(اقبال)

اقبال اور جوش دونوں فطرتاً نظم گو ہیں۔ اگرچہ دونوں کے مقام میں بعد المشرقین ہیں۔ اقبال نے بھی کافی غزلیں کہی ہیں لیکن غزل کے وہ مردِ میداں نہ تھے پھر بھی غزل، غزل گو اور غزل پسند کرنے والوں کی حجامت اقبال نے نہ بنائی۔ جوش نے یہ فعل مذموم کیا۔ دراصل اپنی ہی حجامت بنائی۔ یہ بھی سن لیجئے کہ اگر میں نے کوئی شعر اقبال کی نظم سے چن کر غزل کا شعر بنا کر پیش کیا تو یہ کوئی بدعت نہیں کی۔ کسی بھی نظم میں خواہ کسی کی ہو کوئی شعر یا کوئی مصرعہ بھی ایسا ہو سکتا ہے جو بالکل غزل کا شعر یا غزل کا مصرعہ کہا جا سکتا ہے مثلاً

آئیں گے مرے گیتوں کی طرف نفرت ہے جنہیں ناداری سے
مردانہ وار جو کھیل سکیں ہر مشکل میں دشواری سے
گیتوں کی زمیں وہ جنت ہے محفوظ ہے جو غداری سے
ہوتے ہیں تلنگانے پیدا ہر بیگھ سے ہر کیاری سے
زنجیرِ گراں کی بے رحمی اے عشق بہاراں اور سہی
(نیاز حیدر)

یہ ایک بند نظم سے ہے اس کے شروع کے چار مصرعے ایسے ہیں کہ ان پر ایک مبتدی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ غزل کا مصرعہ ہو سکتا ہے۔ مگر پانچواں مصرعہ زنجیرِ گراں ..... بالکل سو فیصد غزل کا مصرعہ ہے۔ خیر آئیے اور شاعروں کے اشعار جو غزل کے اشعار ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

ولی اس گوہر حیا کا واہ کیا کہنا
وہ دل میں اس طرح آوے کہ جیوں سینے میں راز آوے
(ولی)

شاید ترے برتاؤ سے رنجیدہ ہوا وہ
اب تیری مجالس میں ولی کو نہیں پاتے
(ولی)

ہائے جس دن سے گیا ہو کر خفا وہ تند خو
غنچۂ دل کی کھلی پھر میں نہ کلیاں دیکھیاں
کس کے گھر میں چھپ گیا اے شوخ تو کیا جانئے
ہم نے سارے شہر کی دن رات گلیاں دیکھیاں

کب سے اے سودا خراب اس بزم میں بیٹھے ہیں یار
تو نے اے کم ظرف کی پہلے ہی پیمانے میں دھوم

تمہارا نہ روز ہجر ہے سودا یہ یہ ستم
پروانہ ساں وصال کی ہر شب جلا کرے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیتا کہ چلا میں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

آخری شعر تغزل کی اعلیٰ مثال میں سے ہے۔
جرأت نے اسی مضمون پر شعر کہا ہے جو سودا کے شعر کے سامنے پھیکا ہے بلکہ جرأت نے اس مضمون پہ حالی کا شعر بہتر ہے۔ دونوں اشعار دیکھئے

کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ دل
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں

(جرأت)

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

(حالی)

مگر تو بہ کیجئے۔ سودا کے شعر میں (سودا جو ترا حال...) جو تغزل ہے اس نے جرأت اور حالی بھی میلوں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب ذرا دوسروں کا کلام ملاحظہ کریں

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کچھ نہیں آتی
گلا بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

یہ شعر بھی تغزل کی اچھی مثال ہے۔

کوئی یاں اس کو لے آوے بہانے بلا کے
بہانے سے کسی اور آشنا کے

(جرأت)

ہم نشیں ہو گئے رقیب اپنے
کیا گلہ کیجئے نصیب اپنے

(جرأت)

اس مطلع پر یہ مطلع بھی سُن لیجئے۔ قافیہ بھی یہی دونوں ہیں

تم اور فریب کھاؤ بیانِ رقیب سے
تم سے تو کم گلہ ہے زیادہ نصیب سے

اس شعر میں بناؤ سنگھار زیادہ سہی مگر جس قدر شدتِ احساس جرأت کے شعر میں ہے۔ اس میں نہیں۔

گیا ہے چھوڑ کر تو جس کو اے آبادیٔ عالم
وہ مضطر کیا درونِ خانۂ ویران لوٹے ہے

اس شعر میں بھی تغزل ہے

ترے خیال میں دونوں جہاں سے ہم گزرے
نہ اس جہاں کی خبر ہے نہ اس جہاں کی خبر

(جرأت)

علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

(قسط ۱۰)

رعنا اقبال کا طویل انٹرویو ایک تو اس
ت سے اہم ہے کہ اس میں مختلف علمی ادبی لسانی
جی مسائل کے بارے میں میرے خیالات سامنے آگئے
سرے یہ کہ اس میں وہ سوالات بھی سامنے آئے
کستان کے دانشوروں کے ذہن میں اٹھتے رہتے
ان سوالات تو خیر مخاطب کو سمجھنے کے لئے اٹھانے
یا لیکن ادبی و فلمی نیز لسانی و تہذیبی سوالات سے
خطے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ رعنا اقبال
ے ہی نشست میں بہت کچھ جان لینے کی کوشش کی۔
ال انہوں نے یہ کیا

ش۔ گذشتہ چند برسوں میں جو اصناف سخن متعارف ہوئی ہیں ان کے بارے میں کچھ اظہار خیال کریں گے آپ

ع۔ دیکھئے کبھی میں تو آزاد غزل کے سخت خلاف
تو میں اس وقت لکھتا تھا جب میں شاعری کے بارے
میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔ غزل صرف غزل ہوتی ہے۔ اس
میں یوں بھی بڑی آزادی ہے۔ اس کی ہیئت پر غور کیجئے
غزل اشعار کا مجموعہ ہے۔ ہر شعر آزاد ہوتا ہے۔ فکر و خیال
اور احساس و تاثر کی الگ الگ اکائیاں ہر شعر میں موجود
ہوتی ہے اس سے بڑھ کر اور آزادی کیا ہو سکتی ہے۔
کسی شعر میں کجی پیدا کر دینے اور ارکان کو کم و بیش کر دینے
سے کوئی بات نہیں بنتی۔ غزل کا ایک طویل تہذیبی پس منظر
ہے۔ اسے اس سے کاٹ کر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت
پہلے مستزاد وغیرہ کی ہیئتی کوشش ہو چکی ہیں لیکن یہ سب
تجربات سے آگے نہیں بڑھیں۔ آزاد غزل، غزل کی حرمت
کو چھیننے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ آزاد غزل کا تجربہ
ہیئت پرستوں اور فیشن زدہ ذہنوں کی ایجاد ہے۔ میں
اسے غیر تخلیقی اقدام سمجھتا ہوں۔ ہائیکو، سانیٹ اور
دوسرے تجربات کی اہمیت ان معنوں میں ضرور ہے کہ
تجربات سے تخلیقی جہتیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ہر تجربہ

ومعیار نہیں مانا جا سکتا۔ ہم اپنی ان اصناف سے تو بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں جن میں اساتذہ کرام نے گراں بہا تخلیقی سرمایہ پیش کیا ہے اور نئے تجربوں کی طرف لپک رہے ہیں۔ ان تجربوں میں زیادہ تر وہ لوگ شریک ہیں جو میدان سخن میں اجنبی فضا پیدا کر کے جلد سے جلد اپنی شہرت کے طلب گار ہیں۔ بہر حال اسی بہانے کچھ نئی چیزیں آ رہی ہیں ہمیں نئی چیزوں کا استقبال کرنا چاہئے۔ لیکن اسے سرمایۂ افتخار سمجھ لینا بھی غلط ہے۔ یہی حال نثری نظم کا ہے۔ میری سمجھ میں یہ ترکیب ہی نہیں آتی۔ شاعری شاعری اور نثر نثر ہے۔ یہ ترکیب ان ذہنوں کی پیداوار ہے جو شاعری کو خواہ مخواہ ہیئتوں کی اسیر سمجھتے ہیں۔ شاعری اور نثر میں اتنا ہی تو فرق ہے کہ شاعری میں الفاظ عام لغوی معانی اور مروجہ مفاہیم سے ہٹا کر استعمال کئے جاتے ہیں۔ نثر ہمیں افکار کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ شاعری احساس و افکار دونوں اقالیم پر دسترس رکھتی ہے۔ شاعری میں الفاظ بالکل نئی معنوی دنیا پیدا کرتے ہیں۔ نثر میں جانی پہچانی دنیا ہوتی ہے۔ نثر راست بیان سے کام لے کر فکر و احساس کی افزائش کا کٹھن کام کرتی ہے۔ دونوں کا طریقۂ اظہار الگ ہے۔ اگر فنکار نثر اور شاعری میں الگ الگ تخلیقی رویہ اور اظہاری انداز نہ اپنائے تو نہ اچھی شاعری ہو سکتی ہے نہ اچھی نثر۔

رعنا اقبال صاحبہ نے متعدد سوالات کے ساتھ بعض نئی قسم کے مسائل بھی چھیڑ دیئے۔ دوسرے سوالات کو تو چھوڑیئے صرف ایک سوال سنئے۔

س۔ ؟ ۔۔ رافعہ رباب کے حوالے سے آپ کے مجموعۂ کلام "تحمل جنوں" میں دو نظمیں شامل ہیں۔ کیا آپ ہمیں یہ بتانا پسند کریں گے کہ یہ رافعہ رباب ہیں کون ؟

ع۔ ح ۔۔ ارے ارے یہ تو انتہائی ذاتی سوال ہو گیا۔ دراصل یہاں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ میں دراصل وابستگیوں کا قائل رہا ہوں۔ وابستگی انسان کو اندر اندر توڑتی رہتی ہے۔ یہاں میرا اقبال جرم بھی ہے لیکن فن کی سطح پر یہ وابستگی مفید کار بھی ہوتی۔ رافعہ رباب ایک فرضی نام ہے۔ ہماری آپ کی مجبوری ہے کہ فرض بھی کسی اصل کا عکس ہے۔ بہر حال یہ نام ایک شخصیت کی طرف اشارہ ہے جس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ اب دیکھئے تاثرات کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ میں ہر وابستگی اور تعلق کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں یہ جانتا ہوں کہ سارے جذبے عارضی اور لمحاتی ہوتے ہیں۔ کسی جذبے کی عمر طویل ہوتی ہے کوئی شعلۂ مستعجل کی طرح لمحوں میں بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ وابستگی چند لمحوں کی ہو یا چند مہینوں یا برسوں کی ہوتی بہر حال عارضی ہے۔ چنانچہ جب اس فرضی نام کی اصل شخصیت نے مجھے چند لمحوں کے لئے متاثر کیا تو یہ تخلیقات وجود میں آگئیں۔ ان چیزوں کو الگ خانے میں رکھا گیا ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ ان تخلیقات   نسائی جذبہ اور نسائی آواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیشتر شعراء اپنی بیتی گاتے رہے ہیں۔ آں جانب کی کیفیات اور نفسی پیچیدگیوں کو محسوس کرنے اور انہیں سرحد اظہار میں لانے کی فرصت ہمارے شعراء کو اس لئے بھی نہیں ملتی کہ وہ اپنے ہی جذبوں سے سرشار رہتے ہیں اور یوں بالعموم ذہنی رفاقتوں کا ایک ہی پہلو بار بار پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں آپ کو ان تخلیقات میں الفاظ و اظہار تو میرے ملیں گے لیکن محسوسات دوسروں کے۔ غالب نے ایک جگہ ایک اہم نکتہ یوں

ن کیا ہے کہ

اپنے پہ ہے قیاس مجھے اہل دیر کا

لیکن فن کاری کی سطح پر شعرائے کرام نے عموماً
ن اپنے اظہار سے کام لے کر یہ سمجھ لیا کہ اہل دیر کی
جبانی ہو چکی، ہونا تو یہ چاہئے کہ اہل دیر کا قیاس
کے ان کے تموجات، فکر و احساس کو معروضی انداز
اس طرح پیش کیا جائے کہ فن کار اپنے جذبے سے
الیور بھی نظر نہ آئے اور دوسروں کے محسوسات
پوری شدت کبھی فن پارے کا حصہ بن جائے۔ میں اپنی
ند منظومات و تخلیقات جذبوں کے اظہار میں اسی
ر وضی انداز سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔

غرض رعنا اقبال نے فکر و فن، شعر و ادب اور
نصیت کی بہت سی گرہیں کھولنے کی کوشش کی اور سچ
ہے کہ کئی بار میں ان کے سوال کے جال میں جکڑ کر بے بس
بیا اور مجھے نہ جانے کیا کیا اعتراف و اظہار کرنا پڑا۔

کراچی کے دوستوں اور قلم کاروں نے بہت سی
بوں اور رسائل کے تحفے بھی پیش کئے۔ یہ ذخیرہ اتنا
دہ ہو گیا کہ انہیں ڈھو کر لانے کا مسئلہ سامنے آگیا۔
ہر ہے میں ان قیمتی تحفوں کو چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔
یارڈ ریپ گرفت کا بھی خوف تھا مگر خیر سے کتابوں
عظیم الشان کارون صحیح و سلامت آگیا۔ ان کتابوں
ر رسائل سے پاکستان کے ادب و شعر کی رفتار کا اندازہ
تا ہے۔ وہاں کے معیار کا پتہ چلتا ہے۔ کتابیں وہاں
م طور پر بڑی حسین و جمیل چھپتی ہیں۔ اب تو ہندوستان
ا قلم کاروں کے ساتھ یہ آسانی ہے کہ کتابوں کی اشاعت
لئے سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری متعدد ادارے
ا تعاون کرتے ہیں۔ یہاں ترقی اردو بورڈ، فخرالدین علی

احمد میموریل کمیٹی، بیشتر ریاستوں کی اردو اکادمیاں
وغیرہ آسانیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ پاکستان میں یہ آسانیاں
حاصل نہیں ہیں یا حد درجہ کم ہیں۔ اس لئے شعراء و ادبا
کے سامنے اپنی تخلیقات کی پیشکش اہم مسئلہ نہیں رہتی
ہے۔ اس کے باوجود کتابیں خوب خوب چھپتی ہیں اس
کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہاں قارئین کا حلقہ وسیع تر ہے۔
ادبی و شعری تخلیقات بھی خرید کر پڑھی جاتی ہیں۔ اس لئے
جو لاگت کتابوں کی اشاعت پر آتی ہے وہ جلد یا دیر سے
واپس آجاتی ہے۔ ادبی اور نیم ادبی رسائل کی تعداد بھی
وہاں زیادہ ہے۔ یہ رسالے کتنے فروخت ہوتے ہیں اور
کیا فائدہ دیتے ہیں ان کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن
ظاہر ہے خسارے میں رسالہ تو شائع نہیں کیا جا سکتا۔
ممکن ہے ان رسالوں کی اشاعت میں مالی تعاون ان
اشتہارات سے حاصل ہو جاتا ہو جو حکومت کے مختلف
اداروں، پرائیویٹ کمپنیوں، بنکوں اور دوسرے تجارتی
یونٹوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان اشتہارات کی تقسیم سخاوت
سے کی جاتی ہے لہذا کوئی رسالہ کسمپرسی کے عالم میں
گرفتار محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ متعدد اشاعتی
اداروں نے GROUP OF PUBLICATION کا
انتظام کر رکھا ہے۔ ادبی رسائل کے ساتھ ساتھ عام
ذوق و مزاج کے رسالے اور ڈائجسٹ کی کئی قسمیں شائع
کر کے یہ ادارے نفع و نقصان کا توازن ٹھیک کر لیتے ہیں۔

کراچی کے دوران قیام میں خلیق احمد شفیق سے
کئی نشستوں میں ملاقات ہوئی۔ کسی انگریزی روزنامے
سے تعلق ہے مگر اردو میں تنقید لکھتے ہیں، ادب
مسائل پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔ تجزیہ اچھا کرتے ہیں۔

تنقیدی مقالات مختلف جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں، ابھی حال ہی میں ان کا مجموعہ "ادراک" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انہوں نے ماہنامہ "کندن" میں ملاقات کی ایک نشست کا اہتمام کیا۔ میں کندن والوں سے پہلے سے واقف نہیں تھا، صرف پروفیسر آفاق صدیقی کو جانتا تھا۔ شفیق صاحب خود آکر مجھے وہاں لے گئے۔ دفتر دیکھ کر اور وہاں موجود ارباب ادارہ سے مل کر خوشی ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ یہ پوری ٹیم بڑی امنگ کے ساتھ "کندن" اور دوسرے جرائد کی اشاعت کر رہی ہے۔ چیف ایڈیٹر لیاقت قریشی ہیں۔ پروفیسر آفاق صدیقی اور انوار عزمی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد افراد ہیں جو ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں رسائل کو بہتر سے بہتر بنانے میں منہمک ہیں۔ جناب لیاقت قریشی نے استقبال کیا۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ اسی وقت ندا فاضلی بھی دفتر "کندن" میں پہنچ گئے۔ وہ بھی ان دنوں پاکستان گئے ہوئے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔ غرض خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ رخصت کرتے وقت جناب قریشی نے کندن کے متعدد رسالے بطور تحفہ عطا کئے۔ اس کے علاوہ۔ پیپر ویٹ وغیرہ کا وہ خوبصورت تحفہ بھی عطا کیا جو ادارہ کی طرف سے تیار کرایا گیا تھا۔ دفتر کی عملی تگ و دو، ارباب ادارہ کے امنگ و حوصلہ اشاعت کی باقاعدگی وغیرہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا: رفیقان اردو کا یہ حوصلہ مستحق مبارکباد ہے۔ تادیر دفتر کی خوش سلیقگی دیکھتا رہا۔ ندا فاضلی کی خوش گفتاری اور زندہ دلی نے نشست کو اور بھی دلچسپ بنا دیا۔ شفیق احمد شفیق نے مجھے واپس میری قیام گاہ تک پہنچا دیا۔ ان ملاقاتوں کے لئے ان کا ممنون ہونا چاہئے چنانچہ ممنون ہوں

کراچی میں جن دوستوں اور اہل قلم حضرات کی کتابیں بطور تحفہ حاصل ہوئیں ان کی ایک لمبی فہرست بن سکتی ہے۔ مگر ان میں مندرجہ ذیل مطبوعات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ (۱) پانی پتھر (شعری مجموعہ از یٰسین افضال) پیش لفظ از احمد ہمیش بعنوان "ایک نئے حسیاتی موڑ پر" فلیپ پر حق نواز اختر کی رائے۔ چند اشعار

میرا گھائل جسم ہے میری رہائش کا پتہ
میں جہاں رہتا ہوں رہتے ہیں وہاں پتھر کے لوگ

تلوار بے یقینی کے ہاتھوں میں آگئی
اپنے مقابلے میں ہر اک شخص ڈٹ گیا

مخدوش مکانوں میں کوئی میرا نہیں ہے
دل سے مرے انجام کا ڈر کیوں نہیں جاتا

فنی شخصیت کا مضبوط حصہ منظومات میں نمایاں ہے۔ عروج/صدائے بازگشت/بھولا ماجھی/لویان اور جوئے شیر وغیرہ کامیاب منظومات ہیں۔

(۲) ضرب تیشہ (مجموعہ کلام خواجہ منظر حسن منظر) دیباچہ از مختار زمن۔ نصر اللہ خاں کا تعارفی مقالہ بعنوان "خواجہ منظر حسن صرف تیشہ کے آئینے میں" برسبیل تذکرہ تخلیق کی مختصر تمہیدی تحریر۔ فلیپ پر سید ضمیر جعفری کی رائے۔ ضمیر جعفری لکھتے ہیں:۔

" دروبینی، دردمندی اور تبسم ریزی کا اتنا خوبصورت امتزاج میری نظر سے بہت ہی کم گزرا ہے۔ فنی محاکمہ اور تنقید و تبصرہ نہ میرا منصب ہے اور نہ ہی میری طبیعت کا اقتضا۔ میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ شعر یا فن پارہ زندگی کے کتنے کام آیا۔ روتی ہنستی بسورتی زندگی کے کتنے لمحوں کو خوشگواری اور تازہ کاری عطا کر گیا۔ مقام مسرت ہے کہ ضرب تیشہ کے شاعر خواجہ منظر حسن منظر نے

بلراج حیرت

نیا سال

چھلک کر ہر اک جام کہنے لگا
ہزار آفریں آفریں آفریں
نیا سال پھر آگیا دوستو
نیا اس میں حالانکہ کچھ بھی نہیں
وہی حلقۂ روز و شب ہے جو تھا
وہی آسماں ہے وہی ہے زمیں
وہی ابن آدم کی مکاریاں
وہی اس کی محرومیاں ہیں جو تھیں
مگر پھر بھی اس کو مبارک کہیں
سبھی اہل دنیا سبھی اہل دیں
کہ اک سال کا فاصلہ طے ہوا
ذرا موت سے دوریاں کم ہوئیں

ستیہ پرکاش ذاکی

آمدِ سحر

نقاب شب کو الٹ کر وہ آئی آئی سحر
افق کے فانوس جھرو کے سے مسکرائی سحر
مچل اٹھی جو اجالے کی شوخ انگڑائی
دھند لکے چیر کے ساری فضا پہ چھائی سحر
ذرا جو رات کی خاموشیوں نے دم توڑا
سرود ساز عمل بن کے گنگنائی سحر
خمار کذب صداقت کے رنگ بھرنے لگا
فلک کے اوندھے پیالے میں جھلملائی سحر
ابھی یہ غنچۂ نو تھی، ابھی گل تر ہے
کچھ اس ادائے مقرر سے کھلکھلائی سحر
کرن کرن کا تصادم ہے شبستاں میں
چمن کے آئینہ خانے میں جگمگائی سحر
مہکتے پھول، پرندوں کے چہچہے کر
وفور رقص و ترنم میں لہلہائی سحر
عمل کی محفل رنگیں میں پھر سبو کھنکے
ذرا جو اہل تمنا کے ہاتھ آئی سحر
وہ زندگی کی سحر کیا یگانہ کھتی راہی
سحر تو آئی مگر وہ کبھی نہ آئی سحر

قیوم خضر

رحمٰن شاہ !

[مندرجہ ذیل انشائیے میں عام بہاری بول چال کے کچھ
الفاظ علاقائی لب ولہجہ کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں
اور ان الفاظ کے اردو معانی آخر میں دیدیئے گئے ہیں]

رحمٰن شاہ اپنے بیٹھکے میں جائے نماز پر بیٹھے، سر جھکائے، آنکھیں بند کئے، دائیں ہاتھ میں ہزار دانوں والی تسبیح لئے کسی مخصوص دعا کا ورد کر رہے تھے کہ یکایک گھر کے بھیتر سے بیگم کی چنچناہٹ سن کر چونک پڑے۔ دس بیس مرید جو حلقہ باندھے، پیر و مرشد کا فیض حاصل کرنے کی غرض سے دو زانو سامنے بیٹھے ہوئے تھے، وہ بھی اچانک رونما ہونے والی کیفیت سے چھپا گئے — ہڑبڑی میں "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کہتے ہوئے رحمٰن شاہ جھٹ پٹ اٹھے اور جیسے ہی گھر کے اسارا میں پہونچے تو دیکھا کہ بیگم کے ہاتھ کی بچلی انگلی سے ترتر خون بہہ رہا ہے۔ اور خادمہ جلا کھی کو ٹک کر کٹی ہوئی انگلی پر رکھ رہی ہے۔ مگر لہو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ دیکھ کر رحمن شاہ بولے کہ "گگروندھا کا رس ٹپکا دو لہو ترنت رک جائے گا۔ یہ سننا تھا کہ بیگم اور بھی بھکار پار پار کر رونے لگیں اور بھنگتے ہوئے بولیں۔ "جورو کھو کے کو مرہم ورہم جوڑے نہیں تو گھانس کا رس ٹپکا دے کو کہے ہے" — رحمٰن شاہ کی یہ تیسری بیگم پٹاٹ جیبھی بکبکیاں تھیں، میکے سے نئی ماروتی کار کی طرح آئی تھیں، مگر اب تو پرانے ٹرک کی طرح ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور ایسی منہ پھٹ کہ نہ رحمٰن شاہ کے منصب کا خیال کرتیں اور نہ ان سے سیدھے منہ بات ہی کرتیں —— گھر کے باہر تو رحمٰن شاہ کی بے حد قدر و منزلت تھی، لوگ ہاتھ پاؤں چومتے تھے، مگر گھر کے اندر یہ حال تھا کہ بھیگی بلی بنے رہتے۔ اور رات کو نئی بیوی کا پاؤں دباتے دباتے ان کا ہاتھ تھرتھرانے لگتا۔ بقول شاعر

اک برہمن کی دعا تھی جو خدا نے سُن لی

مل گیا شیخ کو ایسا بتِ طنّاز کہ بس!

واقعہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بیگم پیڑھا پر بیٹھ کر چلو ہی سے بھی پرور کاٹتے ہوئے خادمہ کو، جو نیوڑھے نیوڑھے ال بگھار رہی تھی، ہدایت کرنے لگیں کہ اُدھن ہو گیا ہے، چاول کو میرا کر ڈال دے اور اسی میں آلو بھی چھوڑ دے، اکر سیجھ جائے۔" یہ کہنے میں ذرا توجہ جو بٹی تو بیچ سے بکلی انگلی تھوڑی سی کٹ گئی۔ یہ سارا واویلا اسی وجہ ے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

رحمٰن شاہ بیگم کو اٹھا کر کمرہ میں لے گئے، اور پلنگ پر لٹا دیا، خود بھی سرہانے بیٹھ کر کٹی ہوئی انگلی پر کچھ پڑھ کر پھونکتے ہوئے ہولے ہولے پیار سے ہاتھ سہلانے لگے۔ پیار کا یہ مخصوص انداز دیکھ کر بیگم ہاتھ جھٹک کر اُلجھنے لگیں۔ "تور مطلب ہم سب سمجھیں ہیں، جاؤ، دُر، جھُو جھُو، رتیا کو کہاں اُدھیارے رہو ہو۔ جو ای بیلا جھوٹ موٹ بہروپیاپن کر رہے ہو"۔ یہ سُن کر رحمٰن شاہ کھسیا کر ہنستے ہوئے باہر چلے گئے —— مریدوں نے بیگم کی خیریت پوچھی تو فرمانے لگے: "بیگم کی انگلی کٹ گئی تھی، میں نے پڑھ کر جیسے ہی پھونک ماری، فوراً خون بند ہو گیا، اور اب اچھی ہیں۔ مریدوں نے اس فعل کو بھی پیر میاں کی کرامت ہی سمجھا۔

ایک روز رحمٰن شاہ ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ بیگم نے کواڑ کی اوٹ سے دیکھا تو ریگھا ریگھا کر یہ شعر پڑھنے لگیں۔

شیخ اللہ رے تیری عیّاری
کیسی توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز!

کسی مریدنے بیگم کی آواز سُن لی مگر کچھ سمجھ نہ سکا۔ نماز پڑھ کر جب رحمٰن شاہ فارغ ہوئے تو اس مریدنے بیگم کی خوش آوازی کا تذکرہ کیا، تو انہوں نے جواباً اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر پڑھا۔

انہیں شوق عبادت ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

یہ شعر سن کر مریدوں کو بیگم صاحبہ کی بھی ولایت کا گمان ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد رحمٰن شاہ قیلولہ کرنے کی غرض سے گھر کے اندر والے کمرے میں جب گئے تو دیکھا کہ بیگم غصّے سے تُم تُم ہو رہی ہیں۔ وجہ پوچھنے پر ساون بھادوں کی طرح برس پڑیں۔ "جرا ای تو کہو کہ ہم مرُیا خون ہیں کہ ٹھمری گاویں ہیں، توری بہنیاں ہی ٹھمری گاوت ہوں گی"۔ رحمٰن شاہ یہ سُن کر ہنسنے لگے، تو بیگم اور بھی آگ بگولا ہو کر بولیں: "بے شرم کو خیر کتو لاج نہ آوے ہے۔ اور لٹے ٹھٹی رہی ہنسے ہے۔" رحمٰن شاہ سونے کے بہانے سے جب چادر تان لی تو طنز کی برچھی اور بھی تیز ہو گئی۔ "نہ کام، نہ کاج، نکھٹو کہیں کا، دن بھر سووے ہے، کبھی کبھار رتیا کو سویرے پہر اُٹھ مطلب سے آوے ہے۔ نہیں تو رات بھر بیٹھکے میں یار دوست سے گپ ہانکے ہے یا بڑ بڑ بڑ بڑ، اُڑی پوڑی سر و اجھکا کے بکتے رہے ہے۔ نہ گھر نہ دوار، ساری عمریا کٹ گئی کرائے کے مکان میں، اور کرایہ بھی مہینے مہینے دیوے کو نہیں، ہمری قسمت اُلیسِ پھوٹی کہ ای منہ جھولنے مولوی کے گھر میں آگیلی، ہمرے بادا بھی تنکو نہ سوچیں کہ اُلیسے بدھے کھوسٹ سے بیاہ دیہیں۔ اُترا سے تو اچھا ہوتی کہ ہمرا پوکھروا میں کاٹ کر ڈال دیتے۔ سات برس بیت گیلِ پہونچی میں کانچ کی چوڑی کے علاوہ: تانبا، پیتل کے کنگن بھی نہ پہن لی۔ مہینوں سے ناک کی ایک کیل لاوے لا کہہ رہی ہے، سو، آج تک نہ لا دیہیں

یک شیخ پورہ والے پیر میاں ہیں کہ جھاڑ پھونک اور دعا
تعویذ ہی سے مکان پر مکان بنوا لیے ہیں، آنکھ جو ورد،
دیکھو تو پورے پور میں سونا چاندی کے گہنا لدا ہی ہے۔
مر میں کھانے پینے کا سامان بھی اَن پھیل، کوئی دن دستر
ھان، گوشت مچھلی سے خالی نہیں، یہاں تو پندرہ پندرہ
ن بیت جاتے ہیں کہ آلو کے بھرتا، اور کھچیا کے سوا کوئی
سری ترکاری دیکھنے کو بھی نہ ملے ہے، انہیں گھر کو تو چولہا
جھونک دے ہوئے کو ہی چاہے ہے — ان باتوں کو
سن کر رحمن شاہ، جو منشیا کے سوئے ہوئے تھے، اٹھ
سمجھانے لگے۔ بیگم! شیخ پورہ والے پیر میاں، اللہ
لے نہیں بلکہ دنیا دار ہیں، اور اللہ رسول کے نام پر اپنا
زخ بھرتے ہیں، یہ دنیا تو آنی جانی ہے۔ یہاں مسافر کی
ح ہلکی پھلکی رہوگی، صبر و شکر کی زندگی گزارو گی اور
وہر کا حق ادا کرو گی، تو انشاء اللہ جنت میں بھی میرے
تھ رہو گی۔" یہ سننا تھا کہ بیگم نے برجستہ کہا کہ "لو،
ر سنو، یہ مصیبت یہاں بھی اور وہاں بھی"۔ وہ زیرلب
بڑبڑاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں، جیسے کہ
شعر پڑھ رہی ہوں۔

بہشت میں بھی ملے گا مجھے عذاب شدید
وہاں بھی مولوی صاحب ہی ہوں گے ہمسائے

رحمن شاہ، جب بھی اپنا بیگم کو سمجھانے کی کوشش
تے تو ان کی بیگم غصے سے اور بھی بدوت ہو جاتیں۔ انہوں نے
ت بار اپنی بزرگی اور عظمت کی دھاک بیگم پر جمانا چاہی
ان کی بیگم کسی قیمت پر بھی ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتیں۔ آخر
بی تو تھوڑی بہت اردو فارسی پڑھی ہوئی تھیں، یہ
سری بات ہے کہ بول چال میں پابندی کے ساتھ اپنی
ی زبان استعمال کرتی تھیں، مگر تھیں بڑی ہوشیار
ٹ کھٹ، سب داؤ پیچ کو سمجھتی تھیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ جاڑے کی دوپہر کو ان کی بیگم چھت پر بیٹھی اپنے بھیگے بالوں کو سکھا رہی تھیں کہ یکایک آسمان کی طرف نظر اٹھی تو دیکھا کہ ایک قالین اڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس قالین پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ ڈر سی گئیں، اور چھت سے دوڑی دوڑی مکان کے نیچے میں آ گئیں اور سہمے ہوئے لہجے میں رحمن شاہ کو آواز دی مگر وہ بیٹھکے میں موجود نہ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب رحمن شاہ آئے تو بیگم نے پھبتی کستے ہوئے کہا کہ "تم کا ہے کو بزرگ رہو گے، البتہ، آج دوپہریا کو ایک اصلی بزرگ پر نظر پڑی ہے۔ قالین پر بیٹھے اڑل چلے جا رہے تھے۔" رحمن شاہ نے سنا تو مسکراتے ہوئے بولے، "بیگم تم نے غور سے نہیں دیکھا، وہ بزرگ تو میں ہی تھا۔" اس پر بیگم ٹھنک کر بولیں: "اچھا تم ہی تھے۔ تب نا دیکھا کہ ٹیڑھے بیٹھے ہوئے اڑے چلے جا رہے تھے۔"

اُن بہاری الفاظ کے اردو
معانی جو مندرجہ بالا انشائیے میں
استعمال کئے گئے ہیں۔

---

(۱) بھیتر = اندر
(۲) چینچیانا = زور زور سے بولنا
(۳) بڑس = گھبراہٹ
(۴) چہانا = چونکنا
(۵) اَسارا = دالان
(۶) جلاٹھی = جلے ہوئے تمباکو کی ٹکیا
(۷) بکنا = باریک پیسنا
(۸) ترو ترو = لگاتار

ککروندھا = ایک قسم کا پودا، جس کا رس
بہتے ہوئے خون کو روکنے کے کام میں آتا ہے۔
تڑنت = فوراً
بھکار پاڑ پاڑ کر رونا = چلّا چلّا کر رونا
بھوڑنا = میسّر ہونا
بمکنا = غصے میں بولنا
جورو کھوکھا = اس مرد کو کہتے ہیں جس کی کئی
بیویاں مرچکی ہوتی ہیں۔
) تجم تلاث = موٹا تازہ
) بمپال = شوخ و طرّار
) تڑ تڑانا = درد سے تکلیف کی ایک کیفیت
(ا پیڑھا = لکڑی کی بنی ہوئی ایک خاص قسم کی
بہت چھوٹی سی تختی جس پر عورتیں بیٹھ کر گھر کا
کام کاج کرتی ہیں۔
(۱ چلوبی = ترکاری وغیرہ کاٹنے کا منبوا۔
(۲ کچا = بے حد نرم اور ملائم
(۲۱) بیزور = ایک قسم کی سبزی جسے ترالن بھی کہتے ہیں
(۲۲) ادھن = چاول پکانے کے لئے گرم اور کھولا ہوا پانی
(۲۳) پیرانا = ہانڈی میں چاول دینے سے پہلے
پانی سے صاف کرنا
(۲۴) سیجھانا = کسی چیز کو آگ پر اس طرح پکانا کہ
وہ کچا نہیں رہے
(۲۵) کچ کچ سے = کٹنے کی آواز
(۲۶) بچلی انگلی = بیچ والی انگلی
(۲۷) سنبھے سنبھے = آہستہ آہستہ
(۲۸) ہولے ہولے = ہلکے ہلکے
(۲۹) اٹکھنا = طنزاً پچھلی باتوں کو دہرانا

(۳۰) جوجھنا = مسلسل تکلیف اٹھانا
(۳۱) تنکو = ذرا سا
(۳۲) اکو = ایک بھی
(۳۳) کھسیادنا = شرما کر کھسیا جانا
(۳۴) رگھاریگھا کر پڑھنا = ایک مخصوص لب و لہجہ سے
گانے کے طور پر پڑھنا
(۳۵) تُم تُم = غصے کی وجہ سے چہرے پر تمتماہٹ کی کیفیت
(۳۶) ٹھی ٹھی = ہنسنے کی ایک مخصوص آواز
(۳۷) بدر بدر = آہستہ آہستہ بڑبڑانا
(۳۸) اوڑی بوڑی = لاطائل اور فضول بات
(۳۹) منہ جھولسا = جلا ہوا کالا چہرہ
(۴۰) اکراسے = اس سے
(۴۱) پہونچی = کلائی
(۴۲) پوکھر = تالاب
(۴۳) ذرکنا = مٹی کے برتن کا اس طرح ٹوٹنا کہ
دو لخت تو نہ ہو مگر کام کے قابل بھی نہ رہے
(۴۴) مٹیانا = جان بوجھ کر نظر انداز کرنا۔
(۴۵) اُن کر = ان کے۔
(۴۶) اَن تھیل = وافر۔
(۴۷) نیوڑھے نیوڑھے بہارنا = جھک جھک کر
بہار دینا۔
(۴۸) اُہار بدن = ننگا بدن۔
(۴۹) اُلار ہونا = ایک طرف کو جھک جانا۔

▲▲

فیضا ابن فیضی

گردشِ حالات، دنیا، اور میں
تیرے ہوتے، اتنا تنہا، اور میں

منزلیں کمخواب پہلو، اور تو
راستے خود آبلہ پا، اور میں

مشکبو نافے کا محمل، اور تو
جلتے زخموں کا دریچا، اور میں

کسوتِ دستِ زلیخا، اور تو
زخم چاقوئے زلیخا، اور میں

دامنِ سروِ کشیدہ، اور تو
سایۂ نخلِ بریدہ، اور میں

اک بساطِ نامی و نغمہ، اور تو
اک صلیبِ ایستادہ، اور میں

قاف کی دلکش کہانی، اور تو
اک حدیثِ دیدہ فرسا، اور میں

شوخیٔ اظہارِ تمکیں، اور تو
کاوشِ عرضِ تقاضا، اور میں

اپنے ظاہر کا خم و چم، اور تو
اپنے باطن کا سلیقہ، اور میں

خواب کا موہوم پیکر، اور تو
سر سے پا تک، آنکھ چہرا، اور میں

پشتِ آئینہ کا منظر، اور تو
روئے آئینہ کا جلوہ، اور میں

خواب اندر خواب ساعت، اور تو
کائناتِ آشوب لمحہ، اور میں

ایک بے چہرہ ہیولا، اور تو
ایک بے دانش عقیدہ، اور میں

فقرہ الخناب آگئیں، اور تو
جملۂ ایجاز پیدا، اور میں

بند ہوں یہ کس حویلی میں فضا
دشتِ امکانِ تمنا، اور میں

کالی داس گپتا رضا

جل کے صحرا جب دھواں دینے لگا
دل نوید کارواں دینے لگا!

عدل قاتل، منصفی خنجر بہ کف
ملزم ہستی بیاں دینے لگا

جب بگولے نقشِ پا بھی لے اُڑے
خار خونخوردہ نشاں دینے لگا

لذت عصیاں کہ بج اُٹھے ہیں سنکھ
اور موذّن بھی اذاں دینے لگا

کوئی کہہ بیٹھا حدیث زندگی
اک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

ہم کو نوک خار سے لینا تھا کام
دل پیام گل رخاں دینے لگا

اے رضاؔ پاتے ہی خرقہ فقر کا
دل دیرو پر نیاں دینے لگا

دل کو پل بھر کے لئے وقف اُلم کبھی نہ کیا
ہم خوشی بھول گئے، آپ نے غم بھی نہ کیا

کر دیئے شہر کے شہر اشک بلا نے تہہ آب
وقت نے تنکے کے بہہ جانے کا غم بھی نہ کیا

ہم نہ قاتل ہی بنے اور نہ مسیحا ٹھہرے
زیست بھی دے نہ سکے، سر کو قلم بھی نہ کیا

جاوداں بن کے یہیں لطفِ تمنا لیتے
خود سری نے ہمیں ہمراہ عدم بھی نہ کیا

غصے ہوتا تھا کہ پیروں سے لپٹ لی دنیا
ہم نے بے دردیہ جی بھر کے ستم بھی نہ کیا

دیکھی جو نہ بڑھایا مرے بیتے کو رضاؔ
میرے شعروں نے مری قدر کو کم بھی نہ کیا

غزلیں

کرشن موہن

ایک تمثیل ہے، تکمیل ہے رعنائی کی
دلربائی کی ادا شاہد ہرجائی کی

یہ تری بے خودیِ ناز کا انداز لطیف
ایک دنیا ہے فدائی تیری انگڑائی کی

میرا احساس ہے رفتارِ زماں کا عکاس
یہ کرامت ہے مری چشمِ تماشائی کی

دل افسردہ چہک اٹھا یکایک اے دوست
جب تری یاد نے روشن مری تنہائی کی

دہر میں خوار ہوئے، بے حس و بیزار ہوئے
مان کر بات دلِ وحشی و سودائی کی

ہر زباں پہ ہے ترے حسنِ دل آرا کا ذکر
اور ہر لب پہ حکایت مری رسوائی کی

گو جوانی کی چہک اور کھنک ہے ناپید
گونج ہے دل میں ابھی شوق کی تنہائی کی

رہ گئی میرے دل و جاں میں سما کر یکسر
"اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی"

اپنے مطلب کی ہر اک بات سمجھ لیتا ہے
دلِ ناداں نے ادا پائی ہے دانائی کی

وا دریغا کہ ذرا قدر نہ کی دنیا نے
کرشن موہن ترے عرفان کی گہرائی کی

کوئی امید نہ بر آئی شکیبائی کی
اس نے باتوں میں بہت حاشیہ آرائی کی

عشق دن رات رہا کیف و طرب میں سرشار
حسن نے سلطنتِ عشق پہ دارائی کی

تنگ ظرفی ہے مرے وہم کا ٹھہرا پانی
ٹھہرے پانی پہ جمی کائی ہے خود رائی کی

نہ ملا پیرِ نہ ملا اپنے مسائل کا حل
آستانوں پہ بہت ہم نے جبیں سائی کی

آہ اے سوزِ دروں، مرے جنوں سے اب تک
منزلیں سر نہ ہوئیں بادیہ پیمائی کی

سوچ کا لوچ کبھی ان کو میسر نہ ہوا
بعض لوگوں نے فقط قافیہ پیمائی کی

کار بیکار ہوئی، بس میں سفر کرتا ہوں
یہ بھی اک صورتِ بے کیف ہے مہنگائی کی

شعر کہتا رہوں، بہتا رہوں اپنی رو میں
چھیڑ چلتی رہے احساس کی پروائی کی

ایک شعر اور سنا دے کہ زمانے بھر میں
دھوم ہے تیرے تغزل کی توانائی کی

اپنی ہستی ہی مٹا ڈالی ہے کرشن موہن
ہم نے بھی حسن سے کیا خوب شناسائی کی

اختر شاہجہانپوری

اب مکیں ہی نہیں مکانوں میں
کچھ پرندے ہیں آشیانوں میں
دوڑتا ہی نہیں رگوں میں لہو،
شعلگی رہ گئی بیانوں میں
سارے کھلیان شہر میں لاکر
بھوک بانٹی گئی کسانوں میں
زندگی کے عزیز تر لمحے
ہم گزار آئے بدگمانوں میں
پھڑپھڑاتے ہو اب پرندو کیوں
دام بھی دیکھنا تھا اڑانوں میں
جو حقیقت کے ترجمان تھے کبھی،
اب وہ کردار ہیں فسانوں میں
محوِ پرواز ہم بھی ہیں اختر
فکر کے تازہ آسمانوں میں

سید شکیل دسنوی

نشانِ راہ، نہ منزل، نہ فاصلہ کوئی
یہ کس سفر میں ہوں، ساحل نہ حادثہ کوئی
اسی امید میں سارے سراب جیتے ہیں
رکے گا ایک دن خوابوں کا قافلہ کوئی
ہر ایک موڑ پہ خنجر بکف حوادث ہیں
کھلے تو ہم پہ کبھی جینے کا راستہ کوئی
یہ دل سے آتی ہے کس شے کے ٹوٹنے کی صدا
کسی سے آج بھی باقی ہے رابطہ کوئی
اتار لاتے ستارے حسین آنچل میں
ہمیں بھی پیار کا دیتا تو واسطہ کوئی
نہیں ہے گر وہ مقدر میں اس کا خواب سہی
شکیل چاہیے جینے کا سلسلہ کوئی

غزلیں

ضیاء الانجم

عجب ہوتا ہے میرے گھر کا منظر شام ہوتے ہی
بلائیں گھیر لیتی ہیں مرا گھر شام ہوتے ہی
نہ جانے کیوں برس پڑتے ہیں دل پر شام ہوتے ہی
اترتے ہیں تری یادوں کے لشکر شام ہوتے ہی
سسکتے بام و در آزردہ خاطر کھڑکیاں گھر کی
عجب رہتا ہے اک تیا آسیبی شام ہوتے ہی
سمٹتے پھیلتے سائے تعاقب کرتے رہتے ہیں
یہی ہوتا ہے میرے ساتھ اکثر شام ہوتے ہیں
گذر اوقات میری روز و شب کے غم میں ہوتی ہے
لپٹ جاتی ہے محرومی کی چادر شام ہوتے ہی
فضا کو چیرتی چیخیں کہیں شعلوں کی گلکاری
یہ کیا ماحول بن جاتا ہے اکثر شام ہوتے ہی
سلگتی شب کے سناٹے میں دم گھٹنے لگا اپنا
عجب اک بوجھ سا رہتا ہے دل پر شام ہوتے ہی
سحر مایوس دن افسردہ بیتی شب کا سناٹا
یہ کیسے غم جھیلے ہیں دل پر شام ہوتے ہی
گلابوں کی ہنسی معصوم مسکانوں کی ضو باری
مچادیتی ہے ہلچل ہول میں بس کر شام ہوتے ہی
ضیا کب تک مقدر ہے یہ عالم اس کو رب جانے
بہت رہتا ہے دل بیتاب و مضطر شام ہوتے ہی

شاہد عزیز

میرے سینے میں خنجر دیکھ لے تو
میرے دل کا یہ منظر دیکھ لے تو
بہت آسان تھی یہ زندگی تو
ہوئی دشوار کیوں کر دیکھ لے تو
مسلسل میں صدائیں دے رہا ہوں
کبھی اے زیست مڑ کر دیکھ لے تو
کھلے تھے خواہشوں کے پھول جس پر
اسی دھرتی کو بنجر دیکھ لے تو
مسلسل بھاگتے رہتے ہیں لمحے
کہیں رستہ میں رک کر دیکھ لے تو

مشرف عالم ذوقی

ترجمہ:- تبسم فاطمہ

مُسلمان*

قسط ۲

شہناز بائی کی کتاب تو کب کی بند ہو چکی تھی۔

شہناز بائی نے گوہر جان کا بچپن تو دیکھا تھا، لیکن جوانی نہ دیکھ سکیں۔ رخصت ہو گئیں۔ اب یہاں گوہر بائی کا راج تھا۔ گوہر بائی کا سکّہ چلتا تھا۔ یعنی سب کچھ بائی اماں تھیں۔ اور بائی اماں نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی طرح اس کے پیروں میں بھی گھنگھروؤں کے جوڑے سج جائیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہاں جاگیرا آیا کرتا تھا۔ بائی اماں کے دلالوں میں جاگیرا کی نہ بڈی ماما سے پٹی کھاتی تھی نہ ہی یہ نواب الطاف حسین اسے پھوٹی آنکھ بھاتے تھے۔ افروز کے نوخیز شباب نے ابھی کروٹ ہی لیا تھا کہ جاگیرا کی آنکھوں میں مدہوشی کے ڈورے تیرنے لگے۔

بھری محفل میں اس نے گوہر بائی کا آنچل تھام لیا — گوہر بائی سن سے رہ گئیں۔ وہ دلال تو تھا لیکن تھا بائی اماں کا منہ لگا۔

جاگیرا نے ہنس کر کہا —

تمہارا شباب تو اب چند دنوں کا مہمان ہے گوہر بائی — افروز جان کو بھی اس دھندے سے کیوں نہیں لگا دیتیں —

بس اتنا کہنا تھا کہ گوہر جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا —

دفعتاً ایک تیز آواز ہوئی — چٹاخ ....

محفل کا رنگ بدل گیا — سازندے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجرا بند ہو گیا — لوگ سناٹے میں آ گئے — جاگیرا کی آنکھوں میں خون اُبل آیا۔

جب بدلی ہٹی تو محفل سونی پڑی تھی، سامنے تھے صرف، نظر جھکائے ہوئے نواب الطاف حسین — اور بائی اماں۔

نواب صاحب خوفزدہ تھے۔

گوہر جان! تم نے یہ کیا کیا؟

برسوں سے نفرت کے لاوے جیتی آئی گوہر جان نے جیسے بارود اُگل دیا:

وہی نواب صاحب۔ جو آپ کو کرنا چاہئے تھا۔

نواب صاحب ایک بار پھر سن سے تھے۔۔۔
تمہیں یہ زیب نہیں دیتا گوہر جان۔۔۔ آخر تم۔۔۔
برسوں سے نواب جاندانی ہی اور قوم کی دہائی دیتے آئے تھے۔ اس جملے پر گوہر جان کسی زخمی شیرنی کی طرح دہاڑ اٹھیں۔
بڑے مرد بنتے ہو نواب صاحب۔۔۔ صاف کیوں نہیں کہتے۔۔۔ کہ گوہر جان۔۔ آخر تم ایک طوائف ہو۔۔۔ چھنال ہو۔۔۔ رنڈی ہو۔۔۔ کیوں نہیں کہتے نواب صاحب۔۔۔ ایسے گوہر جان کے کوٹھے سے تو شہر کا بچہ بچہ واقف ہے۔۔۔ تم کیسے شریف پوش ہو جو گھر کی عورتوں سے پردہ کرکے رات کے وقت چھپتے چھپاتے گوہر جان کے بدنام کوٹھے پر چلے آتے ہو۔
گوہر ــــ ذرا دھیرے بولو۔
نواب الطاف حسین کانپ گئے۔
بائی اماں نے آگے بڑھ کر ان کے کرتے کا گریبان تھام لیا ـــــ
نواب صاحب ـــ میں پڑھی لکھی نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ جو کام چھپ چھپا کر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے۔ میرے پاس تو لائسنس ہے اور تمہارے پاس ؟ جرم تم کرتے ہو۔۔۔ زمانے سے نظریں چار کرنے کی ہمت تمہارے پاس نہیں ہے۔ ارے ہمت کیسے ہوگی ـــ ہمت ہوتی تو جاگیرے کی طرف سے صفائی نہیں دے رہے ہوتے ـــ غیرت ہوتی تو ایک باپ کے ناطے، بیٹی کے بارے میں غلط لفظ منہ سے نکالنے والے کی زبان کھینچ چکے ہوتے۔۔۔ لیکن تم بے ہمت بھی ہو اور بے غیرت بھی ہو ـــ اس لئے میرے سامنے سر جھکائے کھڑے ہو ـــ
بائی اماں کے لفظ، لفظ نہیں تھے۔ آسمان سے گرنے والے بڑے بڑے اولے تھے۔ اور دروازے کے دوسرے چھور پر گم سم کھڑی افروز پے در پے گرنے والے ان اولوں کی زد میں تھی۔
یہ خاموشی تو اس وقت ٹوٹی جب اس نے پہلی بار ایک بے زبان جانور کو خوف سے سہمے ہوئے اور بولتے ہوئے پایا تھا۔
یہ بدی ماما تھے۔ جو تیزی سے بھاگتے گھر میں داخل ہوئے۔ اور ایک بھیانک چیخ ماری۔
غضب خدا کا ـــ فساد ہو گیا۔
فساد ـــ نواب صاحب جیسے خواب سے چونک کر بڑبڑا کر جانے کو مڑے۔ بائی اماں تھوڑی نرم ہوئیں۔
اس وقت کہاں جائیں گے آپ ـــ سنا نہیں بدی کیا خبر لایا ہے۔
لے۔۔۔ کن۔۔۔۔
نواب صاحب کی آواز میں دم کہاں بچا تھا۔
بائی اماں کی آواز پھر ذرا اونچی ہوئی۔
بیوی بچوں کی پڑی ہے آپ کو ـــ راستے میں خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوگیا تو یہ عیش میں جینے والیاں دو دن بھی آپ کا ماتم نہیں کرنے والیں۔ تب بھی بائی گوہر جان ہوگی۔
گوہر جان نے ایک زوردار ٹھہاکا لگایا۔
وقت کے ساتھ یادیں کتنی دھندلی ہو جاتی ہیں۔
اسے یاد ہے ـــ فساد کا سن کر نواب صاحب کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگے تھے۔ بائی اماں کے طنز میں ڈوبے تیر لگاتار ان پر حملہ کر رہے تھے۔۔۔۔ نواب صاحب کی زبان آخر کب تک چپ رہتی۔ غصے میں نواب صاحب اپنے خاندان کی دہائی دی تھی۔ پھر مسلمانوں کے نصیب کی بات چھیڑ دی تھی۔ کہ زمانہ بدل گیا ـــ وقت بھی مجرا

بنا ہے، کہہ لو گوہر جان ۔۔ نہ اب وہ نوابیت ہے نہ وہ
لمان بچے ہیں، جو کیا شاہانہ زندگی گزارا کرتے تھے اور
،کے انکی شان آن بان میں رتی برابر بھی فرق آجائے
،کے کسی کے منہ سے ایک کلمۂ غلط بھی نکل آئے ۔ سر
سے قلم ہو جاتے تھے ۔

گوہر جان نے ایک زبردست قہقہہ اچھالا ۔ نواب
ب کے قریب آئیں، چہرے کا رنگ بدلا اور لفظوں سے
دپھر اپنا رنگ دکھانے لگے ۔

تھوڑی بہت تاریخ مجھے بھی آتی ہے نواب صاحب ۔
ب آپ تھے نواب صاحب ۔ آپ ؟ آپ مرد ؟
لمان ؟ ایک بار آپ نے طوائف کہہ کر مجھے گالی دی
۔اس وقت میں مصلحتاً خاموش رہی تھی، آج آپ
بی زبان میں وہی گالی دوبارہ دہرائی ہے ۔۔ میں
ئف ہوں، اس لئے آپ کی گالی، مجھے گالی نہیں
نواب صاحب ۔ لیکن پوچھتی ہوں آپ سے ۔ آپ
ہیں ؟ کل سے آج تک صرف بربادی کی داستان
ر آئے ہیں آپ ۔۔۔۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی
آپ کو صرف ان کے گھنونے جرموں کی کہانیاں ہی
ہیں ۔ حرم کے قصے یاد ہیں ۔۔ عیش و عشرت کے افسانے
ہیں ۔ اور آپ ۔۔ آپ کتنے پانی میں ہیں نواب صاحب ۔
سلمانوں کی دہائیاں دیتے ہیں نا آپ، قوم کا درد جاگتا
نا آپ کے سینے میں ۔۔ تو مجھ سے سنئے ۔ ہاں ایک
الف سنئے ۔ آپ سب ایک طوائف سے بھی گرے
لوگ ہو ۔ آپ نے صرف اور صرف عیاشیاں کی ہیں
ر سینکڑوں برسوں کی حکومت خاک میں ملا دی ۔۔
اگیریں لٹوا دیں ۔۔ ملک کے ٹکڑے کروا دیئے ۔ اور
ب دیکھ کر وار ہے ہیں آپ ۔۔۔ ہاں دنگے کروا
ہے ہیں آپ ۔۔۔۔۔۔

گوہر جان پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا ۔

نواب صاحب یکایک زور سے چیخے ۔

تم ہوش میں تو ہو گوہر جان ۔ یہ کیا بکے جا رہی ہو ۔

گوہر جان جیسے اچانک ہوش میں آگئیں ۔ ہاں، سچ مچ وہ یہ ہذیان میں کیا کیا بولے جا رہی تھیں ۔ بڑی تو فساد کی خبریں لے کر آئے تھے ۔۔ نواب صاحب آہستہ آہستہ چھڑی گھما رہے تھے ۔۔ بڑی ماما نے یکایک آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا ۔۔

ولی گنج تحصیل کے پاس ایک خالی بیکار زمین کو لے کر دو فرقوں میں تصادم ہو گیا ۔۔ شہر میں دھارا ۱۴۴ ہے ۔

کیا ؟ گوہر جان نے خوفزدہ ہو کر بڑی ماما کو گھورا ۔

نواب صاحب ایک بار پھر سر جھکائے چھڑی کی نوک سے زمین کریدنے لگے تھے ۔

جاری ہے

ڈاکٹر اُدے سن ارمان بلاری

کسی سے کہنا مت

"آؤ بھئی نرنجن بیٹھو۔" ایک خبر پر نشان لگا کر اخبار کو ایک طرف رکھتے ہوئے جاگن نے اپنے دوست نرنجن سے کہا

"شکریہ" سلگتی ہوئی بیڑی کا باقی حصہ باہر پھینکتے ہوئے تخت پر بیٹھ کر نرنجن نے شکریہ ادا کیا اور کمرہ کی دیواروں پر ٹنگی دیوی دیتاؤں کی تصویروں کو بغور دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر میں کچھ سوچ کر وہ پھر بولا۔ "جاگن ہر دیوی دیوتا کے چار چار آٹھ آٹھ ہاتھ ہیں اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی ہتھیار ہے کیا ان کا بھی کوئی دشمن ہوتا ہے۔؟"

"نہ ان کا کوئی دشمن ہوتا ہے نہ یہ کسی کے دشمن ہوتے ہیں۔ راکششوں کے یدھ کے لئے ہتھیار باندھتے ہیں ––– دھارمک باتوں پر بحث نہیں وشواس کیا کرتے ہیں۔ سنو ایک مزیدار خبر۔" جاگن نے اخبار اٹھا کر خبر پڑھنا شروع کر دی۔

"مندر جاتے وقت ایک سناری کے کانوں سے کوئی بدمعاش کنڈل کھینچ کر بھاگ گیا۔ سنار نے ایف آئی آر درج کرا دی۔ دو تین دن کے بعد بدمعاش ان کنڈلوں کو سنار کی دوکان پر فروخت کرنے لے گیا۔ اتفاق سے یہ وہی سنار نکلا۔ اور اپنے کنڈل پہچان کر سنجیدگی سے بولا۔ بھائی صاحب یہ کنڈل تو پیتل کے ہیں۔ کہیں آپ کو کسی نے ٹھگ تو نہیں لیا؟ یہ سن کر بدمعاش کا چہرہ فق پڑ گیا اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اور وہ چپ چاپ دکان سے کھسکنے لگا۔ تبھی سنار نے پیچھے سے دامن پکڑ کر کھینچا اور کہا۔ "تم نے یہ کنڈل مندر جاتے وقت میری بیوی کے کانوں سے نکالے ہیں۔ میں نے اس معاملے کی ایف آئی آر بھی درج کرا دی ہے۔ اب تم گھر نہیں تھانے جاؤ گے میں پولس انسپکٹر کو بلاتا ہوں۔ یہ سنتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ سن ہو گیا اور ہاتھ پیر جوڑنے لگا، معافی مانگنے لگا۔ سنار نے بہت سی باتیں کہتے ہوئے اس کو معاف کر دیا کیونکہ اس کی دکان داری بھی تو ایسے ہی لوگوں سے پھول پھل رہی تھی۔"

"خبر تو واقعی مزیدار ہے۔ اس دور میں جینے کے لئے ہوشیاری ضروری ہے۔ بھولا پن بھی آدمی کا دشمن ہوتا ہے۔"

"آج کیسے کشٹ کیا؟" جاگن نے سوال داغا۔

"سُنا ہے تمہاری شادی ہونے جا رہی ہے سوچا چل کوئی خدمت ہی پوچھ آؤں۔" ماحول میں بسی لپٹے ہوئے سنگھاڑوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے نرگن نے کہا۔

"اس ہمدردی کے لئے شکریہ۔ میں تو کیا بتاؤں گا ماتا جی سے ملائے دیتا ہوں آپ کے لائق کوئی کام ہو گا بتا دینگی۔" جاگن نے جواب دیا اور دونوں دوست اندر داخل ہوئے۔ ماں سنگھاڑے ابال رہی تھی نرگن نے کہا۔ سنگھاڑا ایک گھٹیا قسم کا پھل ہے مگر خوشبو کتنی بڑھیا ہے۔"

"دنیا میں کوئی چیز گھٹیا نہیں ہوتی ہے گھٹیا ہوتا ہے انسان کا نظریہ۔" جاگن نے ریمارک کسا۔

"بالکل صحیح بات ہے۔" نرگن نے کہا اور آگے بڑھ کے نمستے کی۔ ماں نے اوپر نظر اٹھا کے دیکھا اور آشیرواد دی

"ماتا جی آپ نے تعلیم بالغان کے پرچار سے پربھاوت لکھنا پڑھنا شروع کر دیا ہے کیا۔" ہاتھ میں کوئلہ لئے لکھتے ہوئے دیکھ کر نرگن نے کہا اور آگے جھک کر زمین دیکھنے لگا پھر خود ہی بولا۔ "ارے یہ تو لکیریں ہیں۔"

"ہاں بیٹا یہ لکیریں ہیں۔ کتنی ہیں گنتا۔"

"بارہ ہیں۔" نرگن نے کہا

"دشمن تو ایک بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ بارہ ہیں۔" گمبھیر سبھاؤ بنا کر بولی۔

"ماتا جی میں سمجھا نہیں بارہ کون ہیں۔"

"ہر لکیر پہ ہاتھ رکھ کر گنو۔ بیڑی، سگریٹ، حقہ، تمباکو، افیون، ہیروئن، سلفہ، کوکین، گانجا، [illegible] شراب کتنے ہو گئے۔"

"پورے بارہ ہو گئے ماتا جی۔" اب میں سمجھا یہی یہ سوچ کر آپ لکیریں کھینچ رہی تھیں۔"

"ہاں بیٹا، یہ وہ دوست نما دشمن ہیں جن کو ہوشیار ہو کر آدمی گلے لگا لیتا ہے کوئی ماں اپنے ہاتھ سے کسی بچے کو ان میں سے کچھ نہیں دیتی۔"

"ماتا جی آدمی اپنے غم بھلانے کے لئے ان نشوں کو اپنا لیتا ہے بچپن میں ان کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔"

"آدمی جس ماحول میں سانس لیتا ہے اور جن غموں سے دوچار ہوتا ہے کیا عورت اس سب کچھ سے اچھوتی رہ جاتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ آدمی سے کہیں زیادہ غم جھیلتی ہے اور بنا کسی نشے کا سہارا لئے صرف صبر کے ساتھ پہاڑ جیسی عمر کاٹ دیتی ہے۔ ہمارے ہی گھر کو دیکھو جاگن کا باپ پی۔ ڈبلیو ڈی کی کوٹھی پر چوکیدار ہے ڈھیر سارے روپیہ ہر مہینہ ملتے ہیں کچھ شراب میں بہا دیتا ہے کچھ گھر کے خرچوں میں سواہ ہو جاتے ہیں۔ مہینے کے آخر میں ٹھن ٹھن گوپال رہ جاتے ہیں۔ ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح جاگن کی شادی سر پہ چڑھی چلی آ رہی ہے کیسے آبرو رہے گی بندے کو کوئی چنتا ہی نہیں ہے۔ اب بھی شراب پئے کہیں نالے پر پڑا ہوگا۔ یہ گھر کے چلانے کے لچھن ہیں۔ ایسے غموں سے مکتی ملتی ہے۔ گھر میں چٹکی بھر آٹا نہیں ہے مجبوراً سنگھاڑے ابال رہی ہوں پیٹ تو بھرنا ہی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ماتا جی، غم کے سادھن سے غم مٹتا ہے نشہ کرنے سے نہیں۔" نرگن نے رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

"جاگن، یہ لڑکا کون ہے۔ میں اسے پہچانتی نہیں یہاں پہلی ہی بار دیکھا ہے۔"

"ہاں ماتا جی، آپ ٹھیک کہتی ہیں یہ ادھر پہلی ہی بار آیا ہے اکثر باہر ہی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔"

"ماتا جی میں نے سُنا ہے جاگن کی شادی ہے کوئی کام میرے لائق ہو تو بتلایئے۔"

"بیٹا غریبوں سے دوستی اور ہمدردی رکھنے والے اس دور میں کہاں ملتے ہیں تم بہت بھلے لڑکے ہو۔ تم کوئی تکلیف مت اٹھاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شادی میں زیور ہی بھاری ہو جاتے ہیں سو ان کا میرے پاس انتظام ہے باقی خرچ اس کے ماما کریں گے۔"

"ہم بھی تو دیکھیں کیسے گہنے ہیں تمہارے پاس۔"

"گھر میں نہیں ہیں ماما کے پاس رکھے ہیں۔" ماں نے بات بنائی اور حقیقت پر پردہ ڈالا۔ نرنجن چلا گیا تب جاگن نے کہا۔

"ماتا جی گہنے نہ دکھانے کی وجہ سے آپ نے ماما کے گھر ہونے کا بہانا تراشا۔ بڑے بوڑھوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔"

"بیٹے کسی بھی شخص پر فوراً بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور جو آدمی بات کرتے کرتے ایک آنکھ مینچتا ہو اس پر تو کبھی بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسے آدمی غدار اور بے وفا ہوتے ہیں۔ اس لڑکے میں یہ عیب ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا۔" یہ سنتے ہی جاگن سنجیدہ ہو گیا اور طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ وہ شروع سے لے کر اب تک نرنجن کے برتاؤ کا جائزہ لینے لگا۔ ماں اس کو خاموش بیٹھا دیکھ کر بولی

"کیا تمہیں میری بات پر شک ہے؟"

"نہیں ماتا جی بڑے بوڑھے اور تجربہ کار لوگوں کی باتوں پر شک کرنا بے وقوفی ہے میں سوچ رہا تھا کہ روپئے پیسے کی کمی سے اگر شادی میں پریشانی ہو تو ہم اگلے سال کے لئے ملتوی کیوں نہ کر دیں تب تک میں ہائی اسکول بھی پاس کر لوں گا۔"

"نہیں بیٹے ایسا نہیں ہوگا شادی کی تاریخ لڑکی والوں کی طرف سے طے ہوئی ہے اور ہم نے رضامندی دیدی ہے۔ اس لئے اب کوئی بھی تبدیلی ہوئی تو ہماری بات خراب ہو جائے گی۔ تم پڑھائی پر دھیان رکھو باقی کام ہم خود چھوڑ دو جس کے ماں باپ زندہ ہوتے ہیں اس کو ان باتوں کی کیا فکر۔" ماں نے سنگارا ٹٹولتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد جاگن کچھ دیر کو گمبھیر ہو گیا ہے جیسے وہ بھی اپنے ماں باپ کے کام کو ہلکا کرنے کی جگت سوچ رہا تھا اور قرض کے بوجھ سے بچنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ بچار کے جاگن نے اپنی ماں سے کہا

"اب تو کوئی نہیں ہے کتنے گہنے ہیں مجھے تو دکھا دو"

یہ سنتے ہی ماں نے سارے گہنے اس کے سامنے لا کر رکھ دیئے جاگن پوٹلی کو اچھال اچھال کر وزن کا اندازہ لگاتا رہا

دھیرے دھیرے دن گذرتے گئے اور شادی کے صرف دو ہی دن باقی رہ گئے نرنجن پھر آ ٹپکا اور بولا۔

"کہو بھئی جاگن اب تو شادی آ ہی گئی۔ گہنے وہنے سے نپٹ گئے کیا؟"

"وہ بالکل نپٹ گئے وہ گہنے ماما کے گھر رکھے ہوئے ہیں لتے کپڑے یہیں ہیں۔" یہ سن کر نرنجن مشنوئی مسکان کے ساتھ چلا گیا۔

جاگن نے اب کی بار بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا واقعی وہ بات کرتے کرتے ایک آنکھ مینچ لیتا تھا۔ پہلے تو اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ آج جاگن کو ایک بات اس نے آتے ہی گہنوں ہی کو کیوں پوچھا۔ پہلے بھی وہ گہنوں ہی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ کسی اور چیز کا ذکر کیوں نہیں کرتا تھا۔ شادی میں تو اور بھی انیکوں باتیں ہوتی ہیں۔ اب جاگن کو اس کی ہمدردی میں شک کی گندھ آنے لگی مگر اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اس کو کھوٹا سکہ قرار دیدیتا۔

شادی بخیر و خوبی ہو گئی مہمان اپنے اپنے گھر چلے

لئے۔ دلہن کو بھی وداع ہونے میں دو دن ہی رہ گئے تھے۔ رات کے بارہ بجے کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ "جاگن جلدی اٹھو چور سرکاری پائیوں کو گاڑی میں بھر کے لئے جا رہے ہیں اور تمہارے پتا جی کو باندھ کر ڈال دیا ہے۔" یہ سنتے ہی جاگن ہڑبڑا کر اٹھا۔ آواز جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ اس نے جیسے ہی کواڑ کھولی دیوار سے سٹے کھڑے بدمعاشوں نے اس کو دھر دبوچا باقی لوگ گھر میں گھس گئے جس نے کواڑ کھلوائی تھی وہ جا چکا تھا۔ ان کی آن میں ڈکیت تمام گھر کے لتے کپڑے برتن بھانڈے اور دلہن کے گہنے لے کر چمپت ہو گئے۔ لٹ پٹ پر جب جاگن کے دماغ میں پھر شک نے سر اٹھایا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ آواز درجن کی سی تھی کہیں اس نے مل کر دغا تو نہ کی ہو۔ ہمارے لیس میں دغا بازوں کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ کہیں ماں کی ات صحیح ثابت نہ ہو جائے۔ ادھر دلہن پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ماں سمجھا رہی تھی۔ دکھی مت ہو بیٹی جو ہونا تھا ہو گیا۔ یہ بھی خیر مناؤ کہ عزت آبرو بچ گئی جس بھگوان نے سب کچھ دیا تھا وہ پھر دے گا۔ دولت ہاتھ پاؤں میل ہوتی ہے۔ تندرستی چاہئے سب کچھ پیدا ہو جاتا ہے۔" اپنے اپنے طریقے سے سبھی نے دلہن کو سمجھایا لیکن جس سب کچھ لٹ جاتا ہے اس کو صبر آسانی سے نہیں آتا ہے۔ وہ برابر سسک سسک کر رو رہی تھی۔

جاگن کے باپ مکٹ نے تھانے میں جا کر الیف آئی درج کرائی چوری ہی کی رات میں گشت کے سپاہیوں نے م کے باغ میں حصے بانٹ پر جھگڑتے کچھ ڈکیتوں کو پکڑ لیا بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن مال اسباب کوئی نہ لے سکا۔ سپاہیوں نے ڈکیتوں کو مع مال اسباب کے تھانے پہنچا دیا۔ داروغہ جی نے جب سختی کی تو ڈکیتوں نے جرم اقبال کرنے کے بعد باقی تمام لوگوں کے نام بھی بتا دیئے جاگن کا دوست نرنجن بھی مشورہ دینے کے جرم میں پکڑا گیا۔ بن کی آگ کی طرح یہ بات تمام بستی میں پھیل گئی۔ ایک سپاہی مکٹ کے گھر پہنچا اور خوش خبری دیتے ہوئے بولا۔

"مکٹ تم بہت خوش نصیب ہو۔ تمہارے گھر ڈکیتی ڈالنے والے معہ مال اسباب کے پکڑ لئے گئے ہیں۔"

"گہنے بھی" مکٹ نے متعجب ہو کر پوچھا؟

"ہاں گہنے بھی مل گئے ہیں۔" سپاہی نے دونوں ہاتھ ہولے پر ٹیکتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت اچھا ہوا، ہمارا مال کب تک ہمیں مل جائے گا؟"

"مل تو جائے گا مگر ہاتھی کے منہ میں گنا ہے۔"

"کیا مطلب؟" مکٹ نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا:

"ایک قانون ہے جس کے تحت ہم الیف آئی آر میں درج تمام گہنوں کی ٹو ٹو چیزیں اور بنوائیں گے بالکل ہم وزن اور اور ہم شکل ڈیزائن بھی سب کی ایک ہی جیسی ہوگی۔ ان میں سے دلہن کو اپنی چیزیں پہچان کر اٹھانی ہوں گی اگر وہ اصلی کو اٹھانے میں چوک گئی تو چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔" سپاہی نے پیٹی سنبھالتے ہوئے کہا

"پھر اس کا کیا ہوگا۔" مکٹ نے ادھیڑ بن سے کہا

"ہوتا کیا مال خانے میں جمع ہو جائے گی پھر کوئی کانیاں محرر اس کی جگہ نقلی رکھ کر اصل کو نکال لے گا۔"

شناخت کا معاملہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے دیوان جی بیچاری دلہن نے تو ابھی اپنے گہنوں کو سنبھال کر دیکھا بھی نہیں ہے لیکن جن عورتوں کو بیسوں سال گہنے پہنتے ہو جاتے ہیں وہ بھی اس طرح شناخت کرنے میں چوک جائیں گی۔" مکٹ نے پریشان ہو کر کہا۔

"مشکل کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ ہم اس کی ترکیب میں گے تم داروغہ جی سے مل لو۔ بھئی تمہارے گہنے تو گئے من جاتا دیکھئے آدھا لیجئے بانٹ زیور کتنے کا تھا۔"

"جاگن خرید کر لایا تھا اسی کو معلوم ہوگا۔" جاگن باپ نے مرے من سے کہا۔

"کہو صاحبزادے کتنے کا خریدا تھا۔" پاس ہی کھڑے ن سے مخاطب ہو کر سپاہی نے کہا۔

"ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں قریب بیس ہزار کا تھا۔"

"رسید کہاں ہے۔" سپاہی حاکمانہ انداز میں بولا۔

"مال اسباب کے ساتھ ہی چوری چلی گئی۔" بھولے پن جاگن نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں دس ہزار روپے داروغہ جی کی جیب و شناخت کے وقت اصل چیز پر ہاتھ رکھنے کا شارہ کر دیا جائے گا۔ اول تو ایسی نوبت ہی نہیں آئے داروغہ جی بہت شریف یا مذاق افسر ہیں کسی کو بے جا تے نہیں ہیں۔ غریبوں کا تو وہ خاص خیال رکھتے ہیں ں کا شادی کا معاملہ آپ کے حق میں کر کے سب کچھ ارے حوالے کر دیں گے۔" سپاہی کی یہ بات سن کر مکٹ شکش میں پڑ گیا۔ بےچارے کے پاس کانی کوڑی بھی نہیں دس ہزار کہاں سے لاتا۔ غریب لوگ تو شادی بیاہ بعد پیسے پیسے کو تنگ ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی دلہن کے ہاگ کی چیزوں کو لینے کا معاملہ تھا نہ جانے کس سہارے س نے کچھ سوچ سمجھ کر کہا۔ "پانچ ہزار سے کام بن سکتا تو کسی کے آگے دامن پسار دوں۔"

"داروغہ جی سے بات کر کے دیکھ لیتا ہوں شاید جائیں۔ دیکھو لو مکٹ بڑی مچھلی کا شکار کرنے والے ٹی مچھلی کا کانٹے میں پرو دیتے ہیں۔" سپاہی نے مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

اس وقت لہجے میں سختی لاتے ہوئے جاگن بولا۔

"جانوروں کی طرح ڈھونگ پوری لینے والے داروغہ جی کو ایک پیسہ بھی نہیں دینا ہے چاہے زیور ملے یا نہیں ملے۔"

"پولس سے بگاڑ کر خاندے میں نہیں رہو گے جاگن۔" سپاہی نے تن کر کہا۔

"یہ وقت بتائے گا کہ خاندے میں کون رہتا ہے۔"

جاگن کی بات سن کر سپاہی جھلا کر چلا گیا۔ ماں باپ بھی اس کے اس طرح کئے گئے پولس کے ساتھ برتاؤ پر بھلی بری کہنے لگے مگر جاگن خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ جب ماں باپ چپ ہو گئے تو جاگن نے دھیرے سے کہا۔ "میں نے ماں کے سارے گہنے بیچ کر گلٹ کے گہنے خرید لئے تھے۔ اور چاندی کا پانی کرا کے صراف کی دکان سے نئے ڈبے لے کر انہیں سجا کر بیاہ میں دے دئیے تھے۔ اس وقت کون اتنی نرکھ پرکھ کرتا ہے کچھ روپیہ شادی میں کام آ گیا کچھ میرے پاس اب بھی رکھا ہوا ہے۔ میری شادی میں کسی کا کوئی پیسہ قرض نہیں ہے۔ بیوی بچوں سے بڑھ کر کوئی گہنا نہیں ہوتا ہے۔ جب میری نوکری لگ جائے گی تب خوب سارے گہنے گڑھا دوں گا۔ کسی سے کہنا مت۔

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے دو جلد کتابوں کا آنا لازمی)

کتاب :۔ شعاع نو
...یت :۔ مجموعۂ کلام ۔ فن کار :۔ وفا براہی
...امت :۔ ۲۵۶ صفحات ۔ قیمت :۔ ۷۵ روپے
...تہ :۔ سید شاہ منصور عالم، فلیٹ ۱۴؍۲، سکنڈ فلور
بلاک ایف ۔ فی ایچ ڈی فلیٹس، سکٹر بی ۱۴؍۱
شادمان ٹاؤن ۲ ۔ نارتھ کراچی (پاکستان)

وفا براہی کا تعلق اگر ہماری روایتی اور کلاسیکی ...ری سے ہے تو اس میں نہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ افتخار ...ازکی اور نہ اس میں کوئی محرومی ہے ظاہر ہے کہ وہ ہمارے ...رگ شاعروں میں ہیں ۔ عمر کے لحاظ سے آٹھویں دہائی ...ار رہے ہیں اور ابتدائے عمر سے شعر و سخن سے وابستہ رہے ہیں ...یں اگر انہوں نے اپنے عہد کے شعری رویئے کا ساتھ ...ئو یہ عین فطری بات ہے ۔ روایات سے وابستگی کے بغیر تو ...ابھی اچھی شاعری نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا ...غلط ہوگا ۔ محض روایات پر انحصار کرکے اچھی شاعری ...سکتی ہے ۔

بہرحال! جناب وفا نے روایات سے اپنا سفر ...کیا ہے لیکن سفر کا مفہوم ہی یہی ہے کہ انسان آگے بڑھتا رہے ۔ اگر کوئی اپنا سفر جس نقطے سے شروع کرے اسی پر ختم بھی کرے تو پھر اسے سفر سے زیادہ قیام کہنا چاہئے ۔ حرکت سے زیادہ جمود بتانا چاہئے ۔ جناب وفا براہی کی شاعری گواہ ہے کہ انہوں نے ہئیتی، تکنیکی، احساساتی اور اظہاری سطح پر کہنے کہ اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے ۔

لیکن ان کے ساتھ یہ دشواری بھی رہی ہے کہ وہ مشاعروں کے بہت پاپولر شاعر رہے ہیں ۔ مشاعرہ شاعروں کو بگاڑنے اور شہرت کے حصول کا موثر نسخہ ہے ۔ وفا براہی نے اس فضا سے لڑنے کی کوشش ضرور کی ہے مگر ہر شخص میں لڑنے کی صلاحیت بھی الگ الگ ہوتی ہے ۔ ایک لمبے سفر میں سمجھوتے کی منزلیں بھی آتی ہیں اور یہ بات وفا صاحب کے ساتھ بھی ہوئی ہے ۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے سلسلے کی شعری قدریں بھی عزیز رہی ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ حضرت نوح ناروی کے تلمیذ خاص رہے ہیں اور نوح نے داغ سے شعری روایات کے جو اجالے حاصل کئے تھے وہ سلسلہ در سلسلہ آج بھی برصغیر ہند و پاک میں نئی روشنیوں سے لڑ رہے ہیں ۔

مشق و مہارت کے طویل لمحوں، مشاعروں کے ماحول، اساتذہ کرام کی صحبتوں اور فطری صلاحیتوں کی وجہ سے جناب وفا براہی کے کلام میں قابل رشک برجستگی اور صفائی پیدا ہوگئی ہے ۔ قدرت کلام کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ شاعر ہر طرح کے موضوع کو احاطۂ سخن میں لے آئے اور دوسرا یہ کہ ان کی ادائیگی میں ایک منفرد اور شگفتہ لہجہ بھی پیدا کرے جناب وفا نے یہ دولت حاصل کرلی ہے ۔ اور عمر بھر کی محنت کے بعد کسی غزل گو شاعر کو ایک امتیاز بھی حاصل ہو جائے تو اسے مطمئن ہونا چاہئے ۔ ان کی شاعری ایک بڑے اسکول

کی نمائندگی کرتی ہے۔

علیم اللہ حالی

نام کتاب :۔ **شہر خوباں**
نوعیت :۔ مجموعہ کلام ● فنکار :۔ عاصی فائقی
ضخامت کتاب :۔ ۱۲۸ صفحات ● قیمت :۔ ۴۰ روپے
پتے :۔ حریم نور، قاضی پورہ، کھنڈوہ ۔ ۴۵۰۰۰۱ (ایم۔پی)

جناب عاصی فائقی کے کلام میں اول تو ہمیں شعری روایات کی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے دوم یہ کہ ان کے کلام میں موضوعات کا غیر معمولی تنوع ہے۔ روایت کا اتباع بسا اوقات شاعر کو ایک مخصوص محدود حصار میں مقید کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو شاعری سامنے آتی ہے وہ متعفن ہو جاتی ہے اس لئے کہا گیا ہے کہ رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی کو۔ لیکن روایت سے محبت کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ مثبت اور تخلیقی پہلو ہے یعنی یہ کہ فن کار اپنے موضوع سے ذہنی وابستگی محسوس کرے۔ جو کچھ وہ محسوس بھی کرے۔ وہ ماضی کی اخلاقی اقدار کا ستائش گر ہو۔ وہ شعر و ادب کو صحت مند معاشرہ کی تشکیل کا ایک آلۂ کار سمجھتا ہو، اس کا مطالعہ وسیع ہو زبان و بیان کے جملہ نشیب و فراز سے بھی واقف ہو اور اس سلسلے میں آگہی کی اس منزل پر پہنچ جائے جہاں لسانی اجتہاد کا حق بھی رکھتا ہو اور عملاً اسے اپنے کلام میں بھی برتتا ہو۔ روایت کے انہیں تعمیری، تخلیقی اور مثبت نقوش سے جناب عاصی فائقی کی قربت ہے۔

انہوں نے زندگی کو ایک کل کی طرح دیکھا اور اپنایا ہے اس لئے ان کے کلام میں مختلف رنگ ملتے ہیں، حمد، تصوف، اخلاق، فطرت نوازی، سیاست، معاشرت یہ تمام رنگ جناب عاصی کے یہاں الگ الگ بھی ہیں اور کہیں کہیں ایک رنگ میں دوسرا تیسرا بھی مل جاتا ہے لیکن یہ عمل ان کے کلام میں کہیں بھی پیچیدگی پیدا نہیں کرتا۔ ایک خوش گوار، مزاح و طنز کا عنصر ان کے انداز بیان میں جاذبیت پیدا کرتا ہے۔ ان کے تازہ مجموعہ کلام "شہر خوباں" کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر اس مجموعہ کا مکمل مطالعہ کر لیجئے۔

مسکراتے ہوئے پھولوں سے یہ پوچھے کوئی
تم نے اپنا بھی کبھی چاک گریباں دیکھا

کلنے تر و تازہ ہیں، فسردہ گل لالہ
یہ کیسی ہوا اب کے بہاروں میں چلی ہے

یہ پروانوں کا پیراہن، یہ سوز عشق کی گرمی
کرم فرما! یہ کس کا نور ہے معلوم ہے تم کو

دنیا کی وسعتیں مرے دامن میں ہیں نہاں
یہ کس نے کہہ دیا تری ٹھوکریں کچھ نہیں

علیم اللہ حالی

نام کتاب :۔ **اسد اللہ خان غالب مرد اور ۔ ۔ ۔**
نوعیت :۔ تحقیق ● مصنف :۔ کالی داس گپتا رضا
ضخامت کتاب :۔ ۱۸۸ صفحات ● قیمت :۔ ۸۰ روپے
پتے :۔ ساکار پبلشرز لمیٹیڈ، ۱۰۷ جولی بھون نمبر ۱
۱۰ ہومیرین لائنز، بمبئی ۔۔۔ ۴۰۰۰۲۰

جناب کالی داس گپتا کے علمی، شعری و ادبی، تخلیقی اور تحقیقی کاموں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے کہ حیرت ہوتی ہے انہوں نے متعدد اور بسا اوقات متخالف میدانوں میں ایسے معیاری کام کئے ہیں کہ پوری اردو دنیا ان کاموں سے متاثر ہے کثرت مطالعہ، انداز استدلال اور حوالہ جات نے ان کی تحریر میں اعتماد پیدا کر دیا ہے۔ اس کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ ایسے دور میں جب غالبیات سے متعلق تحقیقات کا انبار لگ چکا ہے۔ جناب رضاؔ نے غالب اور غالبیات سے تعلق رکھنے والے بہت سے مضامین کو کمال تحقیق کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پیش نظر کتاب "اسد اللہ خاں غالبؔ مرد اور سلسلۂ غالبیات کے دوسرے مضامین" بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں جناب رضاؔ کے دس مقالات ہیں۔ انہیں غالبیات سے متعلق عشرۂ کاملہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان مقالات کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند عنوانات یوں ہیں۔ اسد اللہ خاں غالبؔ مرد / بیدل اور غالب / والئی لوہارو اور ۱۸۵۷ء / تصانیف شیفتہ / فسانۂ غالبؔ / ادبیات مالک رام / حیات غالب / غالبؔ کو نام اور پتے کی شہرت کا خیال / وغیرہ وغیرہ

عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب رضاؔ کو حیات غالبؔ، کلام غالبؔ، عہد غالبؔ اور معاصرین غالب نیز ان پر کی گئی تحقیقات کی کسوٹی زبردست آگہی ہے۔ وہ اپنے موضوعات پر اسی وقت قلم اٹھاتے ہیں جب انہیں مکمل اطلاعات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں کوئی امر مبہم نہیں رہتا۔ پہلے مقالے میں انہوں نے غالب کی علالت اور ان کی وفات کی مدلل تحقیق پیش کی ہے۔ بیدلؔ اور غالبؔ میں بیدل کے بارے میں تفصیلات ہیں اور یہ بھی کہ غالبؔ کس عہد میں بیدلؔ سے متاثر تھے اور کب انہوں نے بیدلؔ کا تتبع ترک کر دیا۔ "غالبؔ کو نام اور پتے کی شہرت کا خیال" میں بتایا گیا ہے کہ غالبؔ کی خودشناسی اور خود آگہی اس بات پر اکثر و بیشتر مصر رہی کہ انہیں صرف ان کے نام اور شہر کے نام سے خطوط لکھے جائیں۔ پتے میں معرفت / مکان نمبر / کوچہ اور گلی کے نام وغیرہ کا اندراج وہ اپنی شہرت عامہ کے پیش نظر غیر ضروری سمجھتے تھے۔ یہ نکتہ بھی تفہیم غالب کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ جناب کالی داس گپتا رضا نے یہ تمام تحقیقات غالب کی تحریروں کے حوالے سے کی ہے اور اکثر و بیشتر ان کے مکاتیب سے استفادہ کیا ہے بعض مقالات میں مالک رام کی تحقیقات بہ سلسلہ غالب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور بعض مختلف فیہ مسائل میں ان کی ہم نوائی کی گئی ہے۔ ایک تحقیقی مقالے کا عنوان "حیات غالب" ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس عنوان کے تحت اب تک کن اہل قلم کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

غرض جناب رضاؔ مشکل سے مشکل موضوع پر بھی سیر حاصل مواد فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب اظہار سادہ مگر دل خوش کن ہے۔ تحقیقی نزاعی مسائل میں ان کا متوازن اور مہذب لب و لہجہ ان کی علمی گہرائی اور کرداری بلندی کا پتہ دیتا ہے۔

▲ علیم اللہ حالی

نام کتاب :- غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں
نوعیت :- تحقیق — مصنف :- کالی داس گپتا رضاؔ
ضخامت کتاب :- ۱۸۳ صفحات — قیمت :- ۸۰ روپے
پتہ :- ساکار پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹیڈ
۱۰۴ اجول بھون ۱ - نیو میرن لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰

مشہور اہل قلم اور محقق جناب کالی داس گپتا رضاؔ
کی زیر تبصرہ کتاب مشتمل ہے ان تحقیقی مقالات پر جو غالب
کی بعض تصانیف کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ گویا یہ مجموعہ بھی رضاؔ
صاحب کے ذخیرۂ غالبیات کا ایک حصہ ہے اور بلاشبہ
اہم حصہ ہے۔

کم و بیش گیارہ مقالات میں کہیں غالب کی زندگی
میں ان کی تصانیف کی اشاعت کا ذکر ہے۔ کہیں یہ تحقیق
ہے کہ دیوان غالب کے کتنے نسخے یا کتنی اشاعتیں خود غالب
کی زندگی میں سامنے آچکی تھیں۔ غالب کی ایک رباعی سے

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل، رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا، سوگند ہو گیا ہے غالب

کے مصرعہ ثانی پر بحث ہوتی رہی ہے۔ جناب رضا نے اپنے
ایک مقالے میں ان تمام مباحث کا احاطہ کیا ہے مگر کسی
قول فیصل کے بغیر غالب کی عروض دانی کی بحث چھیڑ دی
ہے۔ ایک جگہ پنج آہنگ کے ان نسخوں کا تعارف کرایا
گیا ہے جو خود رضا صاحب کی معتدد لائبریری میں موجود
تھے۔

غرض یہ کتاب غالبیات پر تحقیق کرنے والوں کے لئے
ایک تحفۂ بے بہا ہے۔ کثرت مطالعہ اور مواد و حوالہ جات
کی وافر فراہمی کی وجہ سے جناب رضا کے مقدمات میں اعتبار و
قطعیت کی خصوصیت موجود ہے۔ غالبیات سے متعلق
ان کی کم و بیش گیارہ تصنیفات موجود ہیں اور یہ سب اہل
تحقیق کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہیں

علیم اللہ حالی

نام کتاب :۔ جوش ملسیانی سے انتخاب کلام
نوعیت :۔ تنقید و تحقیق ٭ مصنف :۔ کالی داس گپتا رضاؔ
ضخامت کتاب :۔ ۱۷۵ صفحات ٭ قیمت :۔ ۹۵ روپے
پتہ :۔ ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
۱۳ جیل بھون نمبر ۱ ۔ ۱۰ نیو میرین لائنز ۔ بمبئی

حضرت جوش ملسیانی جناب کالی داس گپتا رضاؔ کے
استاد تھے۔ رضا صاحب نے استاد کا حق اس طرح ادا کیا
حضرت جوش کی منثورات، مکتوبات، اور ان کے کلام
کو یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ زیر تبصرہ پیش کش اسی سلسلے کی
کڑی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضرت جوش ملسیانی
بزرگ استاد شاعروں میں اپنی توانائی اظہار، اپنے فکر
اور صحت اظہار کی وجہ سے منفرد تھے۔ ہمیں ان کی شعری
لسانی اقدار کو تلاش کرنے اور ان کی تاریخ مرتب کرنے میں
جوش جیسی شخصیت کے کارناموں کی ہمیشہ ضرورت پڑے
جناب رضا کی استاد سے یہ محبت اردو شعر و ادب کے لئے
نعمت ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی دستاویزی حیثیت ر
کہ حضرت جوش ملسیانی کے سلسلے میں متعدد تحقیقی مواد
ساتھ اس میں خود ان کی تحریریں تخلیق کے کچھ حصے
کئے گئے ہیں۔ حضرت جوش کی یہ نثری تحریریں جو کتاب
شامل ہیں اپنے اندر خود تحقیقی مواد رکھتی ہیں۔ اور ا
ادب کے ایک مخصوص دور کی ادبی و لسانی صورت حا
آئینہ بردار ہیں۔

جناب رضاؔ نے حضرت جوش کا ایک مختصر انتخاب کلا
پیش کیا ہے اور یہ کلام غیر مطبوعہ ہے۔ غرض جوش ملسیانی پر تحقیق
کرنے والوں کے لئے بلکہ ایک عہد کے ادبی و لسانی مدوجزر کا تجزیہ
جناب کالی داس گپتا رضا کی یہ کتاب ایک ایسے خام مواد کا کام

بانی:۔ حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنسہاروی ♣ بیادگار:۔ زین العابدین احمر واد رئیس سنسہاروی

سہیل گیا

ماہنامہ

مجلس مشاورت

چیف ایڈیٹر:۔ مسعود منظر
ایڈیٹر:۔ جمیل منظر
معاونین:۔ شکیل احمد حجازی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
• خوش نویس:۔ سید عبدالاحد گیاوی •

• فہرست •

★

شمارہ ۵ جلد نمبر ۵

بدل اشتراک

فی شمارہ .... ۵/- روپے
زر سالانہ .... ۵۰/- روپے
لائف ممبری .... ۱۰۰۰/- روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
• فون نمبر ۲۱۵۷۳ •

آپسی میل، ایکتا اور ہم آہنگی
قوم کی اصل طاقت ہے
زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر
ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے، نہ کسی خاص مذہب کا، یہ سبھی فرقوں، زبانوں، مذہبوں اور تہذیب و تمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ کوندر، ربندر اور قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت گائے ہیں۔ ملک کے گاؤں گھر میں گائے جاتے ہیں، کثرت میں وحدت ہماری خصوصیات ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے۔

- **آئیے، ہم سب مل کر قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں**

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

- **جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار**

P.R. 38-D (INF.24) 92-93

شعور

اخلاقی زوال

ابھی حال میں ہندوستانی سفارت خانے کے عملے کے ساتھ پاکستانی حکومت نے جو نازیبا سلوک ہے اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ سفارت خانے کے عملے حکومت کے مہمان ہوتے ہیں۔ پاکستان ہندوستانی مہمان کو زدوکوب کرکے اجتماعی اخلاقی کھوکھلے پن کا بدترین مظاہرہ کیا ہے یہ حادثہ نہ حکومتی روابط، پڑوسی ملکوں کے ساتھ خیرسگالی کے مراسم اور عالمی ضابطے کے خلاف ایک گھناؤ ناقدم بلکہ خود اسلامی نقطۂ نظر سے قابل نفریں ہے۔

اگر یہ بات صحیح بھی ہے کہ سفارت خانے کا وہ عملہ حکومت پاکستان کی خفیہ اطلاعات حاصل میں سرگرم تھا تو بھی پاکستانی حکومت کا ردعمل نامناسب ہے۔ جمہوری اور عام اخلاقی طریقہ کار ایسے عملوں کو زیادہ سے زیادہ "PERSONA NON GRATA" قرار دے کر اس کے انخلا جاری کیا جاسکتا ہے۔ مگر پاکستانی انتظامیہ کے دیوانے پن نے عالمی قانون اور اخلاقی قدروں کی پامالی دنیا میں اپنے زوال کی ایک مثال قائم کردی ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب دنیا کی ایک بڑی طاقت ہمارے ملکوں پر کسی طرح سے پابندیاں عاید چاہتی ہے اور مکمل آزادی سلب کرکے انہیں بے دام کا غلام بنانا چاہتی ہے، ضرورت اس بات کی کہ ہندوستان اور اس کے اردگرد کے دوسرے ممالک باہمی اختلافات ختم کرتے ہوئے آپس میں متحد ہو اور اپنی اجتماعی طاقت قائم کرکے آنے والے خطرات کے مقابلے کے لئے تیار ہوجائیں ـــــ ایسے نازک وقت اختلاف کی نئی جہتیں پیدا کرکے پاکستان اپنی بنیادیں خود کمزور کر رہا ہے۔ لگتا ہے پاکستان میں عالمی مت کو سمجھنے کی دانشوری مفقود ہوچکی ہے۔ اگر اس کا یہی انداز رہا تو پھر وہ دن دور نہیں جب بڑے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے اس کے آس پاس کے ممالک بھی تعاون کے لئے تیار نہیں ہیں گے۔ کاش! حکومتِ پاکستان حالات کی نزاکت کو سمجھ سکے اور اپنے عمل اور ردعمل میں بھی محتاط ہوجائے۔

مسعود منظر

اصغر علی انجینئر

پریم چند - حیات اور فن

اُسی زمانے میں پریم چند نے ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ ان کا ناول "جلوہ ایثار" ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد میں چھپا۔ پریم چند ناول نگاری کے فنی نظریات پر بھی غور کر رہے تھے۔ ناول نگاری پر ان کے خیالات کا اندازہ ہمیں ان کے ایک مضمون "اردو زبان اور ناول" سے ہوتا ہے۔ جو "ادیب" کے اگست ۱۹۱۰ء کے شمارے میں "د۔ ر" کے نام سے چھپا تھا۔ ناول سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صرف امیر لوگ ہی تاریخ، سیاست، فلسفہ، حساب کا مطالعہ کر سکتے ہیں مگر آبادی کا بہت بڑا حصہ وہی ہے جسے ۲۴ گھنٹوں میں سے ۱۲ گھنٹے فکر معاش کی نذر کرنا پڑتے ہیں۔ یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ بھی نہیں پڑھ سکتے... ناول نویسوں کو بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اردو ناول کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے۔ انہیں استادانِ فن کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کا فرض ہے کہ طبع انسانی کا نظر غائر سے مشاہدہ کریں اور سچے جذبات کے نمونے پیش کریں۔ پبلک کا ادبی معیار روز بروز اونچا ہوتا جا رہا ہے اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان میں بھی وہی خوبیاں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں جن کی ان کی نگاہ عادی ہو رہی ہے.... ناول لکھنا آسان کام نہیں۔ شاید کسی صنف ادب میں اس قدر جدتِ خیال اس قدر دماغی انہماک، اور اس قدر تخئیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں راتیں خیال میں ڈوب کر کاٹنی ہوں گی۔ انہیں صبح و شام تنہا پر فضا مقامات کی سیر کرنی ہوگی انہیں اساتذہ کے کلام کی خوشہ چینی کرنی ہوگی تب کہیں ان کے قلم سے پر زور ناول نکلے گا۔"

اس اقتباس سے ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ پریم چند شروع سے ہی ناول نگاری کی دقتوں اور فنی مسائل سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ وہ نہ صرف ناول لکھنے کی

ں توجہ دے رہے تھے۔ بلکہ ناول نگاری کے فنی نظریات بھی اچھی خاصی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک باشعور فنکار کے لئے بہت ہی ضروری بات ہے۔ پریم چند۔ جیسا کہ ہم اوپر ذکر چکے ہیں، ایک طرف ادب میں سماجی ذمے داری اور کمٹ منٹ کے قائل تھے تو دوسری طرف، جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس ظاہر ہے۔ ادب میں فنی اور جمالیاتی تقاضوں سے بھی کسی ح غافل رہنا نہیں چاہتے تھے۔ سماجی کمٹ منٹ اور فنی اور لیاتی تقاضوں کا یہ توازن قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے اور ایسا توازن ہمیں یبوں اور فنکاروں کے یہاں کم ملتا ہے۔ اگر اس معیار پر پرکھا ئے تو پریم چند کا ناول "جلوہ ایثار" ہمیں مایوس کرے کیوں کہ اس میں وہ تمام فنی خوبیاں نہیں ہیں جن کا ذکر یم چند نے ناول پر اپنے مضمون میں کیا ہے تاہم سنہ ۱۹۱۲ء میں "جلوہ ایثار" خاصے کی چیز تھی۔

اب ہم ادھر ایک نظر منشی جی کی گھریلو زندگی پر ں ڈالتے چلیں۔ دھنپت رائے کی پہلی بیوی سیرت اور صورت لوں لحاظ سے ان کے لئے قابل اطمینان نہ تھی۔ آئے دن ے جھگڑوں سے وہ خود تنگ آ چکے تھے۔ آخر وہ کسی بات ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔ پریم چند خود اس رشتے سے نالاں تھے۔ وہ بھی اسے لینے نہ گئے شیورانی دیوی (ان کی دوسری بیوی) سے اس کا انھوں نے یوں تذکرہ کیا تھا۔

"چھٹیوں کے دن تھے۔ میں گھر آیا۔ انھیں دنوں مجھ میں اور میری بیوی میں جھگڑا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چاچی نے بھی ان کی کافی شکایت کی۔ غصے میں آکر میں نے ان کو ڈانٹا۔ وہ بھی مجھ پر جھلائی میں نے کہا اس سے بہتر ہوگا تم اپنے گھر جاؤ۔ میں نے وجہ بسادر سے کہا ان کو پہنچا آؤ۔ میرا کہنا تھا کہ وہ انہیں پہنچا آئے"

اس طرح کچھ عرصہ بیت گیا اور پھر چاچی دوسری شادی کے لئے اسرار کرتی رہی۔ پہلے تو پریم چند اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید پہلی بیوی لوٹ آئے۔ آخر کچھ سالوں کے انتظار کے بعد دوبارہ شادی کا ارادہ کرلیا۔ منشی جی آریہ سماج کی اصلاحی تحریک سے تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ دوسری شادی کسی کم عمر کنواری لڑکی سے کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کسی ودھوا (بیوہ) سے ہی شادی کریں گے اور اس طرح اپنے اپدیشوں پر عمل کرکے بھی دکھا دیں گے۔ گھر والے ظاہر ہے ان کی ان باتوں کے خلاف تھے لیکن منشی جی بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔

سلیم پور ضلع فتح پور کے منشی دیوی پرشاد کی لڑکی شیورانی گیارہ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ شیورانی کے والد بھی چاہتے تھے کہ ان کی لڑکی کی دوسری شادی ہو جائے۔ انہوں نے رشتے کے لئے پنڈتوں سے بھی کہا اور اخبار میں بھی اشتہار نکلوایا۔ جواب میں کئی خطوط آئے ان میں ایک خط دھنپت رائے کا بھی تھا۔ اور انہیں سے بات پکی ہو گئی۔ پریم چند نے گھر والوں کو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس کی خبر نہ ہونے دی۔ دھنپت رائے کی دوسری بیوی سے بھی ان کی سوتیلی ماں کا برتاؤ اچھا نہ تھا۔ ایک عرصے تک وہ اپنے میکے ہی میں رہتی تھیں۔ پریم چند کی دوسری شادی سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں کسی بیوہ سے شادی کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

پریم چند کی سرکاری نوکری میں سنہ ۱۹۰۹ء میں ترقی ہوئی اور انہیں ڈسٹرکٹ بورڈ ہمیر پور کے تحت سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز مقرر کیا گیا۔ ۲۴ جون سنہ ۱۹۰۹ء کو مہوبا میں انہوں نے اپنا نیا عہدہ سنبھالا۔ اب انہیں

اکثر گورنمنٹ باہر اسکول کے دوروں پر جانا پڑتا اور وہ بہادر گھر کی دیکھ بھال کرتے رہتے۔ مہوبا میں وہ کائستھوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہاں یہ بھی رواج تھا کہ سرکاری افسر لوگوں سے دودھ گھی وغیرہ مفت منگا لینے اور بیگار بھی لینے میں نہ جھجکتے۔ منشی کو یہ سب باتیں بالکل پسند نہ تھیں۔ چند لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی کہ اگر آپ نہ لیں گے تو پھر یہ رسم ہی ختم ہو جائے گی۔ بہت دباؤ ڈالنے پر منشی جی نے اپنے نوکروں کو یہ نذرانہ لینے کی اجازت دیدی اسی طرح مقامی رواج کے مطابق جب تلک لگا کر روپیہ پیش کیا جاتا تو وہ دہی چاول اور پان کا بیڑہ تو لے لیتے مگر روپیہ لینے پر راضی نہ ہوتے۔

وہ معائنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے اور اپنے گھوڑے کو بڑے دلار سے رکھتے۔ سردیوں میں گھوڑوں کو دوشالہ اڑھاتے۔ بیل گاڑی خریدنے پر سرکار الگ سے بھتہ دیتی تھی لیکن خریدنے کے لئے روپیوں کا انتظام نہ تھا۔ آخر شیورانی دیوی نے اپنی بچت سے ایک سو پچاس روپے دیئے تو بیل گاڑی خریدی گئی۔ پریم چند کا اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی برتاؤ بہت اچھا ہوتا۔ ان کی ترقی کرانے کی فکر میں رہتے۔ شیورانی دیوی اس کے متعلق لکھتی ہیں۔ "آپ کو اپنے افسروں کی ہمدردی تو ملی نہیں۔ ماتحتوں کے ساتھ آپ نے بھائی چارہ ہمیشہ رکھا۔ کیونکہ افسری کرنا آپ کو پسند نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ افسر بن کر انسان انسان نہیں رہتا۔ ایشور مجھے اس سے دور ہی رکھے۔"

انہوں نے کئی بار سرکاری ملازمت ترک کر دینے کا بھی ارادہ کیا مگر ان دنوں وہ یہ فیصلہ کن قدم اٹھا نہ سکے تذبذب میں رہے۔ کبھی کبھی صحافت کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی اور اخبار سے وابستہ ہو جانے کا ارادہ کیا لیکن فیصلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ نگم نے پریم چند کو اودھ اخبار کے اسٹاف میں شامل ہونے کے متعلق لکھا تو جواب دیا۔

اودھ اخبار والے معاملے میں کیا جواب دوں۔ مالی پہلو یہ ہے کہ یہاں کل آمدنی ۸۰ روپے سے کسی طرح زائد نہیں ہے۔ دورے کا خرچ اور ملازموں کی تنخواہ اس میں شامل نہیں ہے۔ قریب قریب یہی حالت وہاں بھی ہوگی اور مصارف بدستور۔ مگر کام میں بڑا فرق ہے۔ یہاں بہت آزادی ہے۔ باوجود غلامی کے چونکہ کوئی افسر سر پر سوار نہیں رہتا اور نہ کوئی جواب دہی ہے۔ اس لئے آزادی سی معلوم ہوتی ہے۔ دس بجے سے پانچ بجے تک کی حاضری، دماغی کام، روزانہ اخبار، جی کانپ جاتا ہے۔ ہمت نہیں پڑتی۔ یہاں لٹریری کا کام بمنزلہ تفریح ہے۔ وہاں یہ معاش ہو جائے گا۔

ویسے وہ اپنے دوست نگم کی اخبار و رسائل نکالنے میں ہر طرح مدد کرنے کے لئے تیار تھے۔ دیانرائن نگم نے ۱۹۱۲ء میں ایک اردو ہفتہ وار اخبار نکالنے کا ارادہ کیا تو پریم چند نے انہیں یوں رائے دی۔ "آپ کا ہفتہ وار 'کامریڈ' کے نمونے کا ہونا چاہئے مگر پالیسی ہندو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا اور اس کی کوشش فضول ہے۔" پریم چند کے اس خط سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور اس کا سہارا لے کر بعض دوستوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام بھی لگایا ہے۔ لیکن یہ الزام انصاف پر مبنی نہیں۔ ... ہم آگے چل کر اس سوال پر تفصیل سے بحث کریں گے۔ منشی دیانرائن نے اپنا "ہفتہ وار"

رفتار زمانہ" کے نام سے نکالنا طے کیا۔ پریم چند نے
ں کام میں ان کی مدد کرنے کا یقین دلاتے ہوئے لکھا۔
"آپ تنہا ایک اسسٹنٹ کی مدد سے ہفتہ وار اخبار
ں حالت میں چلا سکیں گے جب قلم کو زیادہ رواں بنائیں۔
ں ہفتہ وار ایک دو صفحے بلا ناغہ آپ کی خدمت میں بھیج
کروں گا۔ کچھ نوٹ ہوگئے بن پڑا تو کوئی ایڈیٹوریل کبھی کسی
نوں کا ترجمہ کبھی کچھ..... مجھ سے جو مدد ہوسکے گی کرتا رہوں گا۔
کسی اخبار سے باقاعدہ وابستہ نہ ہونے کی وجہ ایک
ی بھی کہ وہ براہ راست کسی کی ماتحتی میں کام کرنا اپنے مزاج
خلاف پاتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں۔
یں جو عاجز ہوں وہ ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں
ں میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضہ نہ ہو۔ جی میں آئے
رات دن کام کرتا رہوں اور جی چاہے تو فوراً بند کردوں۔ مگر
رف مالکانہ حیثیت سے ہوسکتا ہے۔ بجز کاروبار کے
، روپے پیسوں کی ضرورت تھی اور روپیہ پریم چند کے پاس
ا نہیں۔ چنانچہ اپنے دوست کو لکھتے ہیں۔
"میرے لئے تو اب یہی مناسب ہے کہ کسی پرائیویٹ
اسکول کی ماسٹری کرلوں جہاں سے پچاس روپے
ہوار ملے۔ اسی کے ساتھ ساتھ 'زمانہ' اور 'آزاد' کی خدمت
ں۔ اس طرح مجھے ساٹھ ستر روپے ماہوار کا اوسط پڑتا جائے
ا سے زیادہ کی خواہش نہیں اور نہ اس سے زیادہ پا سکتا
ں۔ خواہ مخواہ تقدیر سے کیوں لڑوں؟" اور زیادہ سے
یادہ یہ خواہش رکھتے تھے کہ :-
"کچھ کتابیں لکھوں گا، کچھ اپنی کتابیں چھپواؤں گا۔
ے چھ سو روپے میری کمائی ہے اسے انہیں کاموں میں صرف
ں گا اور بالآخر جب لٹریری شہرت حاصل کرلوں گا تو کوئی
ہوار ... نکال کر گذر کروں گا اور ... پیدا ... ت

نے جواب دیدیا تو پھر رام نام ستیہ ہے؟
جب پریم چند کا قیام بستی میں تھا تو انہیں پیچش کی شکایت بڑھ گئی۔ چھ مہینے کی رخصت لی تاکہ باقاعدہ علاج کراسکیں۔ لکھنؤ میڈیکل کالج کے علاج سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ کاشی میں ایک حکیم سے رجوع کیا۔ تین چار مہینے کے علاج سے افاقہ تو ہوا لیکن بیماری کی جڑ نہیں گئی۔ ایسی حالت میں پریم چند ایسی ملازمت سے وابستہ نہیں رہنا چاہتے تھے جس میں بار بار مختلف علاقوں کے دوروں پر جانا پڑے۔ وہ ٹیچر شپ کے لئے کوشش کرنے لگے اور آخر ۱۹۱۶ء میں بستی میں ہی انہیں پچاس روپے ماہوار پر سکنڈ ماسٹر کی نوکری مل گئی۔ ان کے بستی کے قیام کے دوران ہی پریم پچیسی کا پہلا حصہ شائع ہوا جس میں کل ملاکر بارہ کہانیاں تھیں۔ اسی زمانے میں پریم چند ہندی کے بعض ادیبوں سے قریب آئے اور ہندی میں لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ "سرسوتی" کو ان کی پہلی کہانی بستی ہی سے بھیجی گئی تھی۔

(جاری ہے)

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط ۵

اس کے جانے سے یہ دل میں آ گئے ہے وہ رہ کے ہائے
سب جہاں بستا ہے اک اپنا ہی گھر ویران ہوا
(جرأت)

جرأت کے کچھ اشعار میں نے پیش کئے۔ مگر دل کی کسک اور شدت احساس کے علاوہ لب و لہجہ جو مصحفی کے اشعار (مندرجہ ذیل) میں ہے جرأت کافی پیچھے نظر آتے ہیں۔

اور سب کچھ ملے ہے دنیا میں
لیکن اک آشنا نہیں ملتا

جی سے مجھے چاہ ہے کسی کی
کیا جانے کوئی کسی کے جی کی

رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو
یہ کون سی بات ہے ہنسی کی

شاہد ہو تو اے شب ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

آخری دو اشعار کا تغزل کی اعلیٰ ترین مثال میں شمار ہو سکتا ہے۔

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
(مصحفی)

آہ نکلی تو دل سے ہے لیکن
"آہ" کیا جی جلا کے نکلی ہے (مصحفی)

دوسرے مصرع میں "آہ" قیامت خیز ہے

ہائے کعبہ سے پھرا اب تک نہ ہرگز مصحفی
اس کو واں کیا جانے کس بت سے محبت ہو گئی

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
دل میں تیرے تو بڑا کام رفو کا نکلا

انشا نے غزل کیسی ہونی چاہئے تعریف بھی لکھی مگر ان کے بیشتر اشعار اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ شدت کی کمی ہونے کی وجہ سے مثلاً

گر نازنیں کے کہنے سے مانا برا ہو کچھ
میری طرف بھی دیکھئے میں نازنیں سہی (انشا)

اگر ایسے اشعار کو غزل کے اشعار سمجھا جائے گا تو
غ سے اچھا کوئی شاعر (غزل گو) ہو ہی نہیں سکتا۔ داغ
متعلق آگے لکھوں گا۔

انشا کی ایک مشہور غزل پیش کرتا ہوں ۔۔۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پہ ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہ رواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کس کو، آہ ننگ و نام ہے کیا شے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشا کی ایک غزل کا ایک شعر عرض ہے

سیر گلشن کی نہ تکلیف ہمیں دے انشاؔ
کنج عزلت ہی میں ہم اپنے بھلے بیٹھے ہیں

نظیر اکبرآبادی جو انشا سے بڑے تھے مگر ہم عصر بھی تھے۔ انہوں نے بھی اس مضمون کو ایک قطعہ (دو اشعار میں پیش کیا ہے)
(انشا نے بھی "نہ چھیڑ اے نکہت بہاری ......
میں اپنے دل رنجور کی وجہ سے سیر گلشن یا تفریح سے باز رہنا چاہا ہے۔

نظیر نے کس خوبصورتی سے وہ کہا ہے" وہی بات جو وہ نہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی:

تکلیف نہ دو ہجر میں تم سیر چمن کی
آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت
رہنے دو ہمیں کنج قفس میں کہ ہماری
قسمت میں یہی گوشۂ تنہائی ہے کم بخت

ایک تو ردیف "کم بخت" کا نبھانا آسان کام نہیں تھا مگر نظیر جیسے قادر الکلام کے لئے بچوں کا کھیل۔ اور پھر شدت احساس کا جواب نہیں۔ پھر بھی نظیر غزل گو کی حیثیت سے غالب سے بہت پیچھے تھے اسی لئے جو بات نظیر دو اشعار میں قاری کو کہہ سکے غالب نے ایک شعر میں اس سے زیادہ چابک دستی سے اور زیادہ بہتر شعر کہہ دیا۔ غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو۔ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا غزل کی یہی خوبی ہے اور کامیاب شعر وہی ہے کہ دوسرا کہنا چاہے تو ایک شعر میں ادا کرنے سے عاجز رہ جائے۔ یہ صناعی نہیں بلکہ معجزہ ہے۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ غزل سے مشکل کوئی صنف ہو ہی نہیں سکتی بشرطیکہ صحیح طور پر غزل کہنے پر شاعر قادر ہو۔ نظیر اکبرآبادی کو لیجئے ویسے تو وہ نظم گو شاعر تھے مگر انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور خوب کہی ہیں۔ سہل نگاری میں جواب نہیں ۔۔۔ الفاظ جتنے نظیر نے استعمال کئے ہیں شعرا کو چھوڑیئے نثر نگار کے یہاں بھی آسانی سے اتنے الفاظ نہیں ملیں گے۔ حالانکہ عام طور سے لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ انیس اور جوش کے یہاں الفاظ کی بہتات ہے۔ مگر نظیر بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری ۔۔ نظیر کے یہاں تغزل بھی ہے۔ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

فرصت تو سانس کی بھی نہیں آہ کیا کروں
کیا بے بسی ہے اے مرے اللہ کیا کروں

جدا کسی سے کسی کا کبھی حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے جو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں

قیامت آتی جو سلا کر چمن میں جاتا وہ سیر کرنے
تڑپتی بلبل سسکتی قمری گلوں پہ ہنسنا حرام کرتا
نظیر میری اشارتوں سے یہ باتیں بلبلوں کی سُن رہا ہے
وگرنہ کس میں تھی تاب و طاقت جو مجھ سے آ کر کلام کرتا

قرار کر کے نہ آیا وہ سنگ دل کافر
پڑیں قرار پہ پتھر یہ کچھ قرار ہوا

مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے
کہاں گل اور کہاں وہ۔ منہ تو دیکھ لے باغباں اپنا
ذوق نے اسی مضمون کو کیا خوب باندھا ہے
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

میں دست و گریباں ہجر و غم ہاز پسیں سے
ہمدم اسے لانا ہو تو لا جلد کہیں سے (نظیر)
منتظر آہ سرد و لب خشک و چشم تر
سچی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہے (نظیر)
ہم اشک غم میں آ کے کھتم رہے رہے نہ رہے
خرہ پہ ان کے تنک جسم رہے رہے نہ رہے
رہیں وہ شخص جو بزم جہاں کی رونق میں
ہماری کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے
سو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیا
مثال قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے
کہ کل یہ دیدۂ پُر نم رہے رہے نہ رہے
تمہارے غم میں غرض ہم تو دے چکے ہیں جاں
بلا سے تم کو بھی اب غم رہے رہے نہ رہے
نظیر آج ہی چل کر بتوں سے مل لیجے
پھر اشتیاق کا عالم رہے رہے نہ رہے
اب لگے ہاتھوں دوسرے شعرا کا کلام بھی پیش ہے
وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں (نا
اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا (ز
پہلا شعر تو قیامت خیز ہے۔ ثانی مصرعہ میں "ہائے" با
ویسے ہی ہے جیسے پہلے مصحفی کے شعر میں لفظ "آہ"
یہ درمیاں سے اٹھا دے حجاب کا پردہ
بلا سے تیری اگر ہم رہے رہے نہ رہے
اک عالم اب تو ہے پھر آ کے دیکھئے لے دل
خدا ہی جانے یہ عالم رہے رہے نہ رہے (ش
اس کے گھر لے چلا دیکھو
دل خانہ خراب کی باتیں
تجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل
تیری یہ اضطراب کی باتیں (ذوق
کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے میں محبت والے
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے
(اسی غزل میں ایک ایسا شعر ہے کہ پڑھ کر نفرت
جائے۔ صنف غزل کی بدنامی کی ایک وجہ ایسے اشعار ہ

ہائے رہ حسرت دیدار مری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں چھائے دوچشمی سے کتابت والے)

واں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں (ذوق)

اتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ان کے دل میں غبار ہے دیکھیں
کس طرح سے صفائی ہوتی ہے
اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن
ہائے تجھ سے جدائی ہوتی ہے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ تھا سو ہوتا، تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا (ظفر)

داغ کی شاعری غزل کی معیاری شاعری ہو جاتی مگر شدت احساس کی کمی اور دکھتے ہوئے دل کی چونکہ آواز نہیں بلکہ روز مرہ یا محاورہ، فصیح اور سلیس کلام جس میں دل کی چبھن، احساس میں جلن، محبت کے لطیف لمحوں

اور تجربات کا دل کی گہرائی سے بیان کرنے کی کیفیت نہیں آسکی۔ اگر داغ کے یہاں گہرائی بھی ہوتی اور لب و لہجہ بھی تو داغ میں جو بے ساختگی اور بیدنشی میں جو روانی ہے پھر داغ سے بڑا شاعر کوئی بھی نہ ہوتا۔ تو میرا خیال ہے۔ اگر مرتے نہیں تو گھر کیوں ہوتے۔ والی بات ہو سکتی ہے۔ آیئے داغ کا کلام ملاحظہ کریں

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
داغ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ترے کرم کے سہارے میں حشر میں یارب
گناہ لایا ہوں اور بے حساب لایا ہوں

مقطع اور پھر شعر مفرد میں جو احساس کی شدت ہے کاش ان کے دیوان میں بھی ہوتی۔ ورنہ عام رنگ تو یہ ہے۔ اس میں بلا کی برجستگی اور شوخی اور واقفیت ضرور ہے۔

نگاہیں نیچی کئے سر جھکائے بیٹھے ہیں
یہی تو ہیں جو مرا دل چرائے بیٹھے ہیں

گئے ہوتے الجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہیں گھبرائے کہاں سے

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

معلوم ہوتا ہے سامنے کسی سے مخاطب ہے۔ تقریباً تمام یہی حال ہے

ناروا کہئے ناسزا کہئے
کہئے کہئے مجھے برا کہئے

ہوش جاتے رہے رقیبوں کے
داغ کو اور بے وفا کہئے

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا
صبر و شکیب تاب و تواں جا چکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

پھر مقطع میں بات پیدا ہو گئی

غیر کو منہ لگا کے دیکھ لیا
جھوٹ سچ آزما کے دیکھ لیا
جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا
بارہا آزما کے دیکھ لیا
تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار
اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا
وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا
ذرا ڈال دے اپنی زلفوں کا سایہ
مقدر بہت نارسا ہے کسی کا
بظاہر نہ جانے نہ جانے کہ جانے
تجھے داغ دل جانتا ہے کسی کا

یہ زلفوں کا سایہ ڈالنے پر دو شعر یاد آ گئے دیکھئے

اے کاش اس کا ہلکا سا سایہ ہی ہو نصیب
گیسو تو بے پناہ سہاروں کا نام ہے (عدم)
مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے
(فراق)

آپ خود دیکھ لیں۔ داغ کے یہاں زبان کی خوبی، بن
چستی، روانی اور سلاست، برجستگی ہے مگر عدم کے
جو احساس کا لطیف پردہ ہے۔ وہ داغ کے شعر
اور فراق کا شعر تو غزل کے بہترین اشعار میں سے۔
داغ کا اور مطالعہ فرمائیے۔

بت کو بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں
ہم بھی دیکھیں تو اسے دیکھ کے کیا کہتے ہیں
پہلے تو داغ کی تعریف ہوا کرتی تھی
اب خدا جانے وہ کیوں اس کو برا کہتے ہیں

میرے قابو میں نہ پہروں دل ناشاد آیا
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
دی مؤذن نے اذاں وصل کی شب پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

اسی ردیف اور قافیہ میں جوش کی غزل قبل لکھ
اگرچہ داغ کی غزل بھی کوئی مثالی چیز نہیں۔ پھر بھی
نسبتاً غزل کے مزاج سے ناواقف ضرور دکھائی دے
یہ بات دونوں غزلیں ملا کر دیکھ لیں۔
دیکھئے داغ نے کس خوبصورتی سے ابہام پیدا
ڈالی ہے۔ ابہام بھی صنعت اور معہود ذہنی بھی۔

بات اک مرے جی میں آ گئی ہے
تم سے کہہ دوں تو پھر لڑائی ہے

بات واضح طور پر شاعر نہیں کہتا ہے مگر قاری سمجھ
نہایت آسانی سے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔
بات بھونڈے طور پر کھل کر بھی کہی جا
مگر حسن یہی ہے کہ شاعر نہ کہہ کر بھی قاری کو سمجھنے
دقت نہیں پیش کرتا ہے۔ شاعر جو کہنا چاہتا ہے

کی سمجھ میں اگر نہ آئے تو کہنے کا فائدہ۔ ایسا ہی ایک شعر اور سنئے۔

انہیں جس بات سے تھی سخت نفرت
وہی بے ساختہ نکلی زباں سے

دیکھا حسن کلام۔

داغ کا سارا کلام روانی، برجستگی۔ محاورہ کی بندش، صداقت سے بھرا پڑا ہے۔ مگر افسوس ایک شے کے نہ ہونے سے سارا کلام جو بہترین ہو سکتا تھا اس سعادت سے محروم رہ گیا۔

جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی
وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
نازوالے نیاز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے مے کشوں سے لطف شراب
یہ مزہ پاک باز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

میں جو کہتا ہوں کہ داغ کے اشعار میں ایک ہی چیز کی کمی ہے وہ ہے "دل سے نکلی ہوئی بات۔" اس کی ایک مثال دے دوں۔ شاید اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہو سکوں۔ داغ کہتے ہیں۔

جو ملنے پہ آؤ بہانے بہت ہیں
جگہ سینکڑوں ہیں ٹھکانے بہت ہیں

مگر مومن اس کو دل کی گہرائی سے کہتے ہیں اور یہی بات داغ کو نصیب نہیں۔ دیکھئے

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

یہ بات داغ کو نصیب نہیں۔ ہاں طبیعت اتنی بلا کی ہے کہ بعض شعر پر شدت احساس کا دھوکا بھی ہوتا ہے۔

زرا سی بات پر اے داغ تم ان سے بگڑ بیٹھے
اسی کا نام الفت ہے محبت ایسی ہوتی ہے

(جاری)

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

قسط ۱۱

چھک اٹھی لفظوں کی چھاگل ۔ کلیات وزیر آغا ۔ پیش کش ۔ مکتبہ فکر و خیال ، لاہور ، ضخامت ۱۰۶۰ صفحات ۔ انتساب بنام مشفق خواجہ ۔ ابتدائی ۲۰۲ صفحات میں غزلیں ہیں ۔ اس کے بعد مختلف مجموعوں کی نظمیں ہیں ۔ یہ مجموعہ یوں ہیں ۔

شام اور سائے / دن کا زرد پہاڑ / نرد بان / آدھی صدی کے بعد / گھاس میں تتلیاں اور ایک کتھا انوکھی

پہلے مجموعہ کلام "شام اور سائے" کا ابتدائیہ مجید امجد نے لکھا ہے ۔ اس میں وزیر آغا کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے کئی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ لکھا ہے کہ ۔

"ہر آواز ایک مدھم گھلاوٹ میں بدل کر شاعر کے دل کی ایک ایسی دنیا کا پتہ دیتی ہے جہاں کالے سرد پہاڑوں اور رنگین کومل پنکھڑیوں نیلے مواج سمندروں اور لرزاں بے بس آنسوؤں کی حقیقتیں احساس کے ایک ہی نرم رو دھارے پر پھسلتی بہتی چلی گئی ہیں ۔"

دوسرے مجموعے "دن کا زرد پہاڑ" کا ابتدائیہ خود وزیر آغا نے لکھا ہے ۔ تیسرے مجموعے "نرد بان" کا دیباچہ بھی خود وزیر آغا نے لکھا ہے ۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں ۔

"میرا موقف یہ ہے کہ پس منظر سے آگاہی نظم سے لطف اندوز ہونے کے عمل کو مہمیز لگاتی ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری تجریدی فضا میں بالا بالا اڑ جانے کے بجائے اپنی جملہ حسیات کی مدد سے اس ارضی ماحول کو محسوس کرتا ہے جو نظم کا عقبی دیار بھی ہے اور اس کا منبع و مخرج بھی ۔"

چوتھا مجموعہ چند طویل نظموں پر مشتمل ہے ۔ ان طویل نظموں کے عنوانات یوں ہیں ۔ "جھرنے" ، "ندی" ، "دریا" اور "سمندر" ان موضوعات اور عنوانات سے وزیر آغا کی تخلیقی شخصیت کے محرکات کا اندازہ ہوتا ہے ان کے یہاں بالعموم متحرک جمالیات

پھیل گیا

ارنامہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں جامد اشیاء سے تحرک کیا گیا ہے۔ وہاں اس سکوت اور جمود سے بھی وزیر سفیانہ سطح پر فعال نقوش حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ہ "پہاڑ" سے بھی متاثر ہوتے ہیں تو وہاں وہ کوہ پیما آتے ہیں چنانچہ "آدھی صدی کے بعد" کے ابتدائیہ میں تے ہیں:۔

"میری حالت بھی کسی کوہ پیما سے مختلف نہیں
یں بھی ایک عرصے عمر کے پہاڑ کی چوٹی
کو چھو لینے کے بعد اس کی دوسری جانب
چٹانوں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
پر سے مسلسل لڑھک رہا ہوں اور چاہتا
ہوں کہ کہیں چند لمحوں کے لئے رک کر بیتے
ہوئے لمحات کی باز آفرینی کروں اور ان
تمام مسافتوں کو تخیل کی آنکھ سے دیکھوں
جنہیں میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں"

"گھاس میں تتلیاں" وزیر آغا کا پانچواں مجموعہ ہے اس کے پیش لفظ میں انہوں نے شعری تخلیقی عمل کا تجزیہ کیا ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ تخلیقی عمل فن کار کے لئے خارجی نہیں ہوتا، یہ اس کی ذات کا اظہار ہے۔ اس کا لہجہ، اس الفاظ و اشارات اور اظہار کے دوسرے تمام عناصر اس داخلی شخصیت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ گویا فن پارہ فن کار ایک مکمل اکائی اور ناگزیر ربط کا نام ہے تخلیقی عمل کے حوالے سے ان کی یہ بات یاد رکھی جائے گی کہ :۔

"سو شعر کہنا موم بتی کی طرح دھیرے دھیرے
سلگنے کا عمل ہے مگر موم بتی کی روشنی سورج
کی شعاع کی طرح خط مستقیم پر سفر نہیں کرتی بلکہ
ایک شمع کی نوک سے چھلانگ لگا کر دوسری
اور پھر تیسری تک پہنچتی ہے اور تب یہ جلتی
ہوئی شمعیں دائرہ در دائرہ پھیلتی ہی چلی
جاتی ہیں۔ سورج طلوع ہوتا ہے پھر غروب
ہو جاتا ہے۔ چاند ابھرتا ہے پھر ڈوب جاتا
ہے۔ مگر یہ ننھی منی سی شمعیں سدا سلگتی رہتی
ہیں۔ شاعری کا حلقۂ اثر اس لئے زیادہ ہے
کہ شاعری نور کے دائرے تخلیق کرتی ہے اور
پھر ان دائروں کے اندر قیامت تک سلگنے
کا اہتمام کرتی ہے"

"ایک کتھا انوکھی" وزیر آغا کا چھٹا مجموعہ کلام ہے۔ یہ اب تک کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ وہ طویل نظم ہے جس میں شاعر نے تخلیقی عمل کے کرب اور داخلی کشمکش کو DRAMATISE کیا ہے۔ اس نظم نیز مجموعے میں شامل دوسری منظومات میں فکری اعتبار سے وزیر آغا کے یہاں وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے داخل کا سفر عمیق تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سفر راست نہیں بلکہ پیچ در پیچ دائرے بناتا ہے۔ وزیر آغا کی منظومات میں قدیم اساطیری لہجہ، ڈرامائی حرکت و عمل اور فکر و نظر کے پھیلاؤ اور ابعاد کی خصوصیات نے انہیں ایک روایت ساز شاعر کی طرح ابھارا ہے۔

میں نے پاکستان کے اس سفرنامے کا عنوان "ہم مسافر جہاں جہاں گزرے" وزیر آغا کی غزل کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔ میں نے ان کے مصرعے میں تھوڑی سی ترمیم کی ہے۔ ان کا شعر یوں ہے۔

تشنگی کی سبیل جاری تھی
ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے

میں اپنے سفرنامے کے عنوان کے لئے وزیر آغا کا ممنون ہوں اور ہلکی سی ترمیم کے لئے معذرت خواہ بھی۔

۲۔ تطہیر — مجموعہ کلام حضرت اطہر ضیائی۔ مطبوعہ ادارہ ادب و ثقافت۔ جی پی او بکس نمبر ۱۳۹۱، اسلام آباد

اس سے پہلے کہ میں حضرت ضیائی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مجموعے تطہیر میں شریک چند مشاہیر کی آراء اختصار کے ساتھ پیش کردوں۔

احمد ندیم قاسمی کی رائے مجموعہ کے اختتامیہ میں یوں ہے۔

"اطہر ضیائی کا رنگ سخن ان اساتذہ غزل کے بہت قریب ہے جنہیں اپنے دور میں اردو غزل کے عناصر اربعہ کہا جاتا تھا۔ ان عناصر میں فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، اور اصغر گونڈوی شامل تھے۔ اس دور میں یگانہ بھی غزل کہہ رہے تھے۔ اور فراق گورکھپوری بھی مگر ان دو حضرات کا اسلوب اظہار بلکہ موضوع فن بھی اپنے ان چاروں معاصرین سے مختلف تھا کہ وہ جدید غزل کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ مجھے اطہر ضیائی بیشتر جگر مراد آبادی کے لہجے سے فیض یاب محسوس ہوئے۔ وہی سلاست، وہی وارفتگی وہی تغزل، البتہ اطہر نے اپنی غزل کو جدید طرز احساس اور گردوپیش کی تہذیبی و معاشرتی صورت حال کے تاثرات سے بھی سجایا ہے اور یوں سونے پر سہاگے کا کام ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر آذر نے "اظہار خاطر"، شان الحق حقی نے تطہیر کے عنوان سے ڈاکٹر سحر انصاری نے "اقدار حیات" کی شاعری، پروفیسر آفاق صدیقی نے بھائی اطہر ضیائی، ڈاکٹر خورشید خاور نے اس کے نام سے جو کچھ ہے، اس کے سوا کوئی نہیں کے سرنامے سے، ساقی جاوید نے اطہر ضیائی اور تطہیر کے عنوان سے اور تسلیم الہی زلفی نے شجر سایہ دار کے عنوان سے کتاب اور صاحب کتاب کے سلسلے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شروع کتاب میں خود شاعر نے حرف آخر کے عنوان سے اپنی باتیں بیان کی ہیں۔ حرف آخر میں شاعر نے احباب و معاونین کا شکریہ بھی پیش کیا ہے اور اپنا فنی نقطۂ نظر بھی واضح کیا ہے۔ اس تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جناب اطہر ضیائی شاعری کو ایک اضطراری عمل نہیں سمجھتے بلکہ اسے شعوری کوشش تصور کرتے ہیں۔ وہ فن کے مقصدیت کے قائل ہیں۔ ان کے پیش نظر شعر و سخن محض جذبے کے اظہار کا وسیلہ نہیں ہیں بلکہ ان سے حیات اجتماعی کے مسائل بھی حل کئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح وہ اعلیٰ قدروں کے امین اور داعی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"شاعری پوری زندگی کی تہذیب و ترتیب کرتی ہے۔ حتیٰ کہ شاعر کو حصار ذات سے نکال کر آفاق کی فضائے بسیط میں مائل پرواز کردیتی ہے۔ پھر اس کا غم، غم زمانہ اس کا طرب کائنات کا طرب اور اس کے افکار آئینہ فطرت کا روپ اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے ہر حرف میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہوتا ہے اور ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں وہ پورے انسانی معاشرے کا ترجمان بن جاتا ہے"

مجھے حضرت اطہر ضیائی کے مندرجہ ذیل اشعار نے خاص طور پر متاثر کیا ہے ؎

روشنی، خوشبو، تبسم، زندگی، تابندگی
صرف صحن و بام و در کافی نہیں گھر کے لئے

اک عمر تک جلے ہیں کڑی دھوپ میں مگر
ہیں مطمئن کہ ہم شجر سایہ دار ہیں

جلے چراغ، کھلے گل، ابل پڑے نغمے
جہاں جہاں ترے دھوکے میں ہم پکار چلے

مخالفوں نے خبر جب کوئی اڑادی ہے
تو دوستوں نے اسے اور بھی ہوا دی ہے

جیسے اب آ سکوں گا نہ پھر لوٹ کر کبھی
حسرت سے دیکھتا ہے ہر اک نقش پا مجھے

نہ جانے کس لئے گھر سے نکلتے ڈرتا ہوں
اگرچہ شہر میں کوئی میرا عدو بھی نہیں

میں بھی خود کو فریب دیتا ہوں
دوستوں پر ہی کس لئے الزام

سجدے تو کر رہا ہوں مگر یہ خبر نہیں
میری جبیں کہاں ہے ترا آستاں کہاں

ب اطہر ضیائی کی غزل گوئی کا سلسلہ ہمارے قدیم اقدار
ن سے ملتا ہے۔ جہاں مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ
قی اقدار کی پاسداری کی گئی ہے۔ ان کی شاعری سے
کے مشق سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔ جذبے کی شدت اور
الی بھی ہے مگر پوری شاعری کا رخ اصلاح ذات و
نات کی طرف ہے۔ غزل کی مضبوط روایت میں بہت
رے SHADES ہیں۔ جناب اطہر ضیائی کے یہاں
فا کی شرکت و رفعت و تراکیب کی ندرت کے ساتھ باتوں
فصاحت و سلاست کے ساتھ بیان کرنے کی خصوصیت
تی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے اشعار عام قارئین کے
و لنظر کو قبول ہو جاتے ہیں۔ غزل کی شاعری کا ایک لہجہ
بی ہوتا ہے جہاں نیم گفتنی کا انداز اختیار کیا جاتا
، جہاں بادی النظر میں کسی ایک شعر میں ایک ہی
نوع کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر بعد میں پھر
یہ پتہ چلتا ہے کہ مفہوم کی بہت سی شاخیں اور احساس
کی متعدد جہتیں قاری کو مختلف سطحوں پر متاثر کر رہی ہیں
یہ اور بات ہے کہ اس فنی رویے میں ہلکا سا ابہام پیدا
ہو جاتا ہے لیکن چشم بینا ابہام کے حریری پردوں
سے جلوۂ صد رنگ کا نظارہ کر لیتی ہے۔ جناب اطہر ضیا
کی ترتیب سخن جس شعری فضا میں ہوئی ہے اس میں کثرت
نظارہ سے زیادہ وحدت احساس کا پیدا ہونا ایک فطری
عمل ہے۔ ان کے سرمایۂ فکر میں کہیں کہیں نئے موضوعات و
مسائل بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان کی ذہنی وسعت ان گتھیوں
کو سلجھانے کی طرف راغب ہیں جنہیں ہمارے بزرگ شعرا
نامکمل چھوڑ گئے ہیں، لیکن تکمیل کا معاملہ بھی عجیب ہے۔
جناب اطہر ضیائی نے بزرگ شعرا کی روایات میں جو نئی
جہتیں پیدا کی ہیں پھر وہ دوسری جہتوں کی دعوت دیتی
ہیں گویا روایت کے سلسلے سے روایتوں کی توسیع کی روایت
بنتی ہے۔ دراصل غزل ہماری قدیم اقدار سے اس
طرح جڑی ہوئی ہے کہ یہاں چراغ سے چراغ جلانے کا سلسلہ
ہے۔ مکمل انحراف اور رخصت کی جو کوششیں ہوئی ہیں
وہ انفرادی رویے کے طور پر تو ہماری شاعری میں روشن
مثالیں ضرور ہیں مگر غزل گوئی کے عام مزاج کے لئے ہنوز
قابل قبول نہیں بن سکی ہے۔ جناب اطہر ضیائی فنی رویے
کے لحاظ سے MAIN STREAM میں اس لئے ان
کے رو کے جانے کا کوئی مسئلہ تو نہیں اٹھتا مگر یہ ضرور
ہے کہ بھیڑ یا ہجوم میں چلتے ہوئے اپنی الگ شخصیت بنانے
اور منوانے کا مرحلہ بھی بہت سخت ہوتا ہے۔ ان کی شاعری
کا تیور ہمارے سابقہ اساتذہ سخن سے اس قدر
قریب ہے کہ ہر شعر پر سابقین کی یاد تازہ ہو جاتی
ہے۔ روایات کو زندہ رکھنا بھی ایک سعادت ہے۔
اس میں اپنی مقبولیت خطرے میں ضرور پڑ جاتی ہے مگر

قدروں کی حفاظت کے لئے ایثار کی بھی اہمیت ہے۔

(۲) مسعود عظیم آبادی کی تین کتابیں (۱) پیامِ سحر (شعری مجموعہ)۔ (۲) سورہ یٰسین کا منظوم مفہوم یٰسین والقرآن الحکیم اور (۳) منظوم حکمت کی باتیں ۔ کلام ربانی کی روشنی میں۔

مسعود عظیم آبادی کی شاعری میں روحانیت، عرفان اور مذہبی جذبے کی فراوانی انہیں اختصاص بخشتی ہے۔ شاعری کا نظریہ حیات سے کیا تعلق، مخصوص مذہبی عقاید کی بنیاد پر شاعری کی آفاقی اور عالمگیر قدریں کہاں تک قائم رہ سکتی ہیں، الٰہیات اور ماورائیت شاعری میں کسی نوع کا ترفع پیدا کر سکتی ہے۔ یہ سوالات تو خیر بڑی تفصیل کے متقاضی ہیں لیکن اتنی بات پر آسانی سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ شاعری فن کار کے لطیف ترین جذبوں سے بلند ہوتی ہے اور لطافت اپنے ارتقائی سفر میں مادی تعلقات سے دور ہوتی جاتی ہے۔ روحانی انکشافات بڑھتے جاتے ہیں۔ مسعود عظیم آبادی کے فنی مزاج میں یہ قدریں رچی بسی ہیں، ان سے بھی بڑا کام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ مسئلہ ہر حال سامنے آتا ہے کہ ان کے مقاصد کی تکمیل غزل کے اشعار میں کسی بندھے ٹکے فلسفہ حیات یا طرز زندگی کو اشارات میں تو بیان کیا جا سکتا ہے مگر چونکہ یہ مزاج تفصیلی اظہار کا متقاضی ہوتا ہے اس لئے نظم اس کے بیان کے لئے بہترین پیمانہ ہے۔ مسعود عظیم آبادی کے شعری مجموعہ "پیام سحر" پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے افسر ماہ پوری نے بھی یہ لکھا ہے کہ:-

> ظاہر ہے کہ غزل میں سارے جذبات و
> محسوسات کو فصاحت کے ساتھ بیان
> کرنا ممکن نہیں۔ غزل گوئی حقیقی معنوں
> میں مینا کاری کا فن ہے اسی لئے
> مسعود عظیم آبادی نے ان مضامین کو جو
> اطناب کے متقاضی تھے اپنی نظموں میں
> بیان کیا ہے۔"

اس وجہ سے ان کے موضوعات اور ذہن و فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے خیال میں ان کی فنی شخصیت غزلوں کی بجائے نظموں میں اجاگر ہوتی ہے۔ مسعود عظیم آبادی کو طویل نظم نگاری کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس صنف میں بڑے امکانات ہیں اور تفصیلا بیان کے لئے اس ہیئت کو اب تک اردو کے شعرا نے خاطر خواہ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس نوع کی نظموں پر مسعود عظیم آبادی اختصاص قائم کر سکتے ہیں۔

اخلاق مذہب اور سماجی اصلاح سے متعلق متعدد موضوعات مسعود عظیم آبادی کے سرمایۂ سخن میں اپنی امکانی وسعتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ (؟) جس انداز کی شاعری کر رہے ہیں اس میں انہیں ایک بڑا میدان ہاتھ آتا ہے۔ سورہ یٰسین کا سلیس رواں دواں منظوم ترجمہ ان کی منفرد صلاحیت کی روشن دلیل ہے۔ پند و وعظ، نصیحت اور مذہب کی باتوں کو دلنشیں اور پر دلآویز بنانے میں شاعری کی مدد لے کر ایک طرف جناب مسعود عوام و خواص کی اصلاح کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں اور دوسری طرف شاعری کی افادیت اور مقصدیت کے ایسے پہلوؤں کو پیش کر رہے ہیں جن کی فی زمانہ ہمیں اشد ضرورت ہے۔ اردو شاعری کے اسلوبیاتی تنوع میں جناب عظیم آبادی کا انداز سخن انہیں انفرادیت عطا کرتا ہے۔

جناب مسعود نے سورہ رحمٰن کا منظوم مفہوم بھی پیش کیا ہے۔ یہاں منظوم ترجمہ کرتے ہوئے اور مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۂ کریمہ کے TONE سے پیدا ہونے والا تاثر بھی اردو میں منتقل

(بقیہ صفحہ ــ

حسین الحق

ادب کے کچھ بنیادی مسائل

گذشتہ چار دہائیوں سے ادیبوں کو جو مسائل بار بار پریشان کرتے رہے ہیں۔ وہ میرے خیال میں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ترسیلی مسئلہ
(۲) تخلیقی مسئلہ
(۳) تنقیدی مسئلہ
(۴) تحریکی مسئلہ

جہاں تک ترسیل کا سوال ہے تو پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ترسیل ہے کیا؟ راقم الحروف کے خیال میں یہ کمیونیکیشن (   ) کا ہم معنی ہے، اسے آپ ابلاغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں (۱) کوڈنگ (۲) ڈی کوڈنگ

ہر لفظ اپنی جگہ پر ایک کوڈ ہے اور کوڈ جب لسانی سطح پر استعمال کیا جاتا ہے یعنی لفظ بنتا ہے تو اس کی کامیابی اس میں پنہاں ہے کہ وہ ڈی کوڈ ہو کر تفاعل (ACTION) میں تبدیل ہو۔ سوال یہ ہے کہ ہر کوڈ، ڈی کوڈ کیوں نہیں ہو پاتا اس مسئلے کی تین سطحیں ہیں۔ (۱) لسانی سطح (۲) ذہنی اور علمی سطح (۳) ماحولیاتی سطح۔

معاصر ادب کے ترسیلی مسئلے کی لسانی سطح کا سب سے اہم پہلو، میرے خیال میں یہ ہے کہ اردو زبان کی فعالیت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے، اس تلخ حقیقت کو ہمیں قبول کرنا چاہئے اور اس کے تدارک کی صورتیں تلاش کرنی چاہئے کہ اب اردو صرف ہماری ادبی ضرورت پورا کرنے یا خاندانی اور گھریلو طور پر ترسیل کا ذریعہ بننے والی زبان بن گئی ہے، یعنی معاشی سائنسی، سماجی، تاریخی، طبیعاتی، کیمیائی، جغرافیائی، اصطلاحی قانونی، تیکنکی، ٹکنولوجی، اور اسپیس کرافٹ وغیرہ جیسی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام ہے لہٰذا ایک ڈاکٹر، انجینئر یا کا طالب علم ہے تو اس کے لئے اردو کی اہمیت صرف اس لئے ہے کہ اس زبان میں وہ اپنے والدین، محبوب یا رشتہ داروں کو خط لکھ سکتا ہے۔ مذہبی کتابیں پڑھ سکتا ہے یا اگر وہ ادب

کا شائق ہے تو افسانہ اور شاعری کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے ایسی صورت حال میں اردو تعلیمی ہمہ گیریت میں معاون ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مارکیٹ ویلو دن بدن کم ہوتا جاتا ہے اور DEMAND CREATION کا مسئلہ سامنے آتا ہے، یہ مسئلہ پہلے اتنا اہم اور سنگین نہیں تھا۔

ذہنی اور علمی سطح کا معاملہ یہ ہے کہ جیسے جیسے ہم کائنات کے اسرار پر غالب آتے جا رہے ہیں Knowledge Explosion۔ کا علاقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے نتیجتاً ہمارا زاویہ نگاہ بتدریج تجزیاتی اور توضیحی ہوتا جا رہا ہے جسے بہ الفاظ دگر عقلی رویہ یا SCIENTIFIC APPROACH بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اشیا کی سالمیت اور ان کے مجموعی تاثر کے بجائے تجزیاتی یا جزویاتی نتائج تک پہنچنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں، پس تاثر کی وہ جامعیت (جو وجدان کی دین ہوتی تھی اور) جو تاثر کی شدت کا سبب بنتی تھی مجروح ہوتی جا رہی ہے، جو پہلے نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ زندگی اور کائنات کے بارے میں ہمارا رویہ علمی سے زیادہ پیشہ ورانہ ہو گیا ہے، صارفی سماج میں علم وفن زیادہ تر یا تو شکم پروری کے کام آتے ہیں یا تفریحِ ذہنی کے، یہ بھی ہمارا نیا منظر نامہ ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور خاص بات قابلِ غور ہے کہ معیار اور معلومات میں گیپ بڑھ گیا ہے، پہلے ہمیں کم معلوم رہتا تھا، مگر جو معلوم رہتا تھا ہم اس کا جامع علم رکھتے تھے جب کہ آج ہمیں یہ معلوم ہے کہ آدمی چاند پر چلا گیا مگر کیسے گیا، یہ ہم نہیں جانتے، نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن معیار گرتا جا رہا ہے اور ادیب کے معیار پر دنیا کی شاید دس فیصد آبادی بھی نہ پہنچ پا رہی ہو۔

اور ماحولیاتی سطح کا معاملہ یہ ہے کہ ہم فن پارے میں ترسیل کی ناکامی کے المیے پر روتے ہیں اور فنکار کو مجرم گردانتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر لکھنے کے لئے ماحول سے واقفیت ضروری ہے تو کسی خاص ماحول یا پس منظر میں لکھے فن پارے سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے بھی اس ماحول کی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ قبائلی زندگی پر لکھی تحریر کو وہی شخص بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے اور اس کے حسن و قبح پر گفتگو کر سکتا ہے جسے خود بھی قبائلی زندگی کا تجربہ ہو۔

معاصر ادب اور ادیب کے مسائل کا دوسرا رخ تخلیق ہے، اس سلسلے میں سب سے افسوسناک، بھیانک اور نیا مسئلہ یہ ہے کہ ہم غلط آہنگ کو سروش سمجھنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں، جس معاشرے میں حساب کے سوالات حل کرنے کے لئے کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے وہاں دماغ کی کیا اہمیت رہے گی؟ اور جہاں کار، فرج اور پنکھے میں ترجیحی نکات تلاش کئے جائیں وہاں دل کی کیا اہمیت رہے گی؟ یہ نہایت دردناک صورت حال ہے کہ ہم اب دل و دماغ سے زیادہ آنکھ سے کام لینے لگے ہیں یعنی مشاہدہ بغیر فکر، اور مشاہدہ بغیر جذبہ، اس مجرد مشاہدے نے کمپوزیشن[1]، سچویشن[2] اور صورت حال[3] جیسے مفروضے گڑھے۔

تخلیقی مسائل کا دوسرا پہلو ترک و انتخاب کا ہے، جس پر آج سنجیدگی سے غور نہیں کیا جا رہا ہے۔ جب سوویت نظام قائم تھا تو سنا تھا کہ سوویت روس میں چوری، ڈکیتی اور قتل کی خبریں خبر کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس زمانے میں ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے بہت عجیب سا لگتا تھا اور جدید افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے کمیونسٹوں کی اس بے ایمانی پر بہت غصہ آیا تھا مگر اب جبکہ امریکی

---

۱ طراح میں راز ۲ شوکت حیات ۳ حسین الحق

ایجنٹ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو چکے اور روس میں لیونزم پر فاتحہ پڑھا جا چکا، اب سوچتا ہوں تو طرح طرح کے خیال پریشان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دن خیال آیا کہ کوئی ہے؟ جو راتوں کو اپنے والدین کے کمروں میں جھانک سکے۔ اور صبح سویرے رات کی بات محلہ والوں کو بتا سکے! اور اگر بفرضِ محال کوئی صاحب ایسا کر بھی لیتے ہیں تو انہیں کیا سمجھا جائے گا؟ معلوم ہوا کہ ترک و انتخاب کی ضرورت تو زندگی کے ہر موڑ پر ہے۔

مگر کچھ ادبا و شعراء ہر جذبہ قلمبند کرتے ہیں، ایسا کیوں؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

مسائل کی تخلیقی سطح کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہم علامت کے ابہام کو رد کرنے کے چکر میں بیانیہ کی جس سپاٹ سطح کو دوبارہ گلے لگانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی ناکامی کا تماشہ تو ہم خوب خوب دیکھ چکے، علامت نہ سہی استعارہ تو فن کا حسن ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ملک تیزی سے مذہبی جنون، فرقہ واریت اور ذات کی بنیاد پر تفریق کے موڑ تک پہنچ چکا ہے۔ چاروں طرف صف بندیاں ہو رہی ہیں، اقتدار کبھی تو قتل عام کرنے والوں کو صرف پارٹی اور ذات کی بنیاد پر معاف کر دیتا ہے یا سزا دیتا ہے کبھی ایسے لوگوں کو ملک کے اعلیٰ اعزازات سے نوازتا ہے جو کھلم کھلا فرقہ پرور اور سیکولر ذہن کے دشمن ہیں، اور کبھی سب کو خوش کرنے کے چکر میں بے معنی مذہبی اور اساطیری اشتہار بازی میں معروف ہو جاتا ہے۔ غدار ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں۔ اور ہم ابھی تک فنا کے خوف کا غوغا بلند کر کے جان کو نقطۂ نظر پر ترجیح دے رہے ہیں!!"

نقطۂ نظر ترجیحی درجہ حاصل کر لیتا ہے وہاں وہ جارحیت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کنیا کماری سے کشمیر تک، نیل کے ساحل سے تا بخاکِ کاشغر ایک ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ مگر معاصر ادیب نہ تو برصغیر اشیا میں احتجاج کی آواز بلند کر رہا ہے اور نہ ہی ساری دنیا کے پس منظر میں کوئی ایسی موثر طاقت بن پا رہا ہے جو لیبیا پر مغربی ممالک کی ممکنہ جارحیت کے جواب میں دوسری U.N.O بنا سکے، کیا طرفہ تماشا ہے کہ عوام کی حمایت سے عراق کی سربراہی کرنے والے صدام کو مٹی چٹانے کے لئے امریکہ علی الاعلان اپنا بجٹ بناتا ہے، اور دنیا کچھ نہیں کہتی۔ الجزائر میں جمہوری انداز میں سامنے آنے والے سالویشن فرنٹ (خواہ وہ بنیاد پسند ہوں یا کوئی بھی) کو وہاں کا فوجی ٹولہ بے اثر کر رہا ہے، قتل کر رہا ہے اور مار رہا ہے اور عالمی میڈیا خبریں نشر کر رہا ہے۔ .... Fundamentalists V/S Rulers

اسی صورت حال کے آس پاس ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بدلتے ہوئے صارفی سماج میں آج کے ادیب و شاعر کا منصب اور تفاعل کیا ہے، وہ ہیرو کہاں سو گیا جو مصر کو سر کرتا تھا، آج کا ادیب ہیرو کے بجائے اینٹی ہیرو کیوں پیدا کر رہا ہے؟ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ رستم و سہراب اور لیلیٰ مجنوں حقیقتیں تھیں، وہ بھی فسانے تھے مگر قصہ گو اپنے ذہن میں اتنا بلندی اور اپنی محبت میں اتنا شدید تھا کہ اس کے کردار رستم و سہراب اور لیلیٰ مجنوں بن جاتے تھے اور اس ذہنی بلندی اور شدید محبت کے واقعات کا اثر معاشرے پر پڑتا تھا اور عشق معاشرے کا ایک اسلوب فکر، طرزِ زندگی اور سلسلۂ عمل بن جاتا تھا۔

[illegible] معاشرے میں آدمی بونا ہوا ہو

ہاتھ ہوا ہو، ادیب محدود ہوگیا ہے ... صرف بونا ہی
نہیں بزدل بھی ہوگیا ہے اور مفاد پرست بھی۔ اس حادثے
کے رونما ہونے کی کچھ خاص وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو اردو ہی
کے پس منظر میں بیان کی جا سکتی ہے کہ ہم ہندوستان میں جس
خوف کا شکار ہیں وہ خوف ہمیں سماجی ذمہ داریوں سے بے
نیاز کر کے جہانِ داخل کی سیر پر مجبور کرتا ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں
کہ ہم اردو والوں کی باتوں کا انتظامیہ پر کوئی اثر پڑنے والا
نہیں ہے، نتیجتاً یہ خوف زدگی (fear complex)
ایک کچلی اور پس ماندہ نسل" — (suppressed
generation) سامنے لا رہی ہے اور دوسری طرف کچھ
دنوں پہلے تک "حاکم نسل" موجود تھی اور اب "حاکم حلقہ"
ہمارے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہا ہے۔

"راجہ اور رعایا کے درمیان "لُکا چھپی" یا آنکھ مچولی
کا یہ کھیل وحشت ناک بھی ہے اور اردو کے ساتھ
ہندوستانی نظامِ حکومت کے پس منظر اردو والوں کی یہ
ایک نئی مصیبت اور مسئلہ ہے۔ تخلیقی مسئلہ کے شانہ
بشانہ تنقیدی مسئلہ بھی لگا کھڑا ہے ..... ایک نظر
اس پر بھی۔

صورتِ حال یہ ہے کہ کچھ لوگ جو اپنے آپ میں دراصل
کمتر درجے کے فنکار ہیں، وہ گروپ بازی اور رشوت
کے زور پر اسٹیبلشمنٹ ہو جاتے ہیں اور بقیہ جینوئن فنکار
پیچھے پڑ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اردو ادب
کی تجارتی اہمیت تو بہت کم ہے ایسے میں جب جینوئن ادیب
پچھڑتا ہے اور میڈیوکرس آگے آتے ہیں تو خالص فنکار رہا ہیں
ہو کر الگ ہو جاتا ہے اور معاشرے کے تخلیقی منظر نامے
پر جعلی فنکار (Fake ghost writers) چھانے لگتے
ہیں۔ یہ جعلی فنکار دوسروں سے کہانیاں لکھوا کر اپنے نام شائع
کراتے ہیں اور اپنے آپ پر اپنے خود ہی سے مضمون لکھ کر دا
کے نام سے شائع کراتے ہیں .... ایسے لوگ ترقی پسند
کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور غیر ترقی پسندوں کو بھی اور افسو
کی بات یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ آہستہ آہستہ اہم ہو جا
ہیں کہ دربار میں پوچھ ہونے لگتی ہے۔ اور اس طرح یہ جعل
فنکار اسٹیبلشمنٹ کو خوشامد کا میٹیریل (raw material)
سپلائی کرتے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ بدلے میں انہیں پدویا
اعزازات اور انعامات دیتا ہے۔ طرح طرح کی سہولتیں مہ
کرتا ہے اور ان کا منہ بھرتا رہتا ہے .... اور خالص او
جینوئن ادیب یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے اور کڑھتا رہتا
ہے اور کوئی اختر الایمان بہت ہمت کرتا ہے تو بس ا
کہہ کر چپ ہو جاتا ہے

ع خسروی دی لیموں کو اور مجھے نکہت

یہ مسئلہ نیا نہیں ہے مگر ابھی تک "قصہ پارینہ" نہ
بن سکا..... ہیہات!

اب آیئے تحریکی سطح پر.... تحریک کو میں تحرک
تحریک دونوں معنوں میں استعمال کرنے کی اجازت چاہ
گا..... ہماری تحریر کیا تحریک پیدا کر رہی ہے ... دو
پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ع بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے

..... سنا ہے کہ اس چھوٹے سے منظوم بیان پر عورت
نے اپنے ہاتھوں کے کنگن اور کانوں کی بالیاں تک اتار
دی تھیں مگر ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۰ء تک جو کچھ لکھا گیا ا
میں کتنی تحریروں میں یہ طاقت موجود ہے؟ آج تک اس
ایمانداری سے کوئی تنقیدی سروے نہیں کیا گیا۔ ضرورت
ہے کہ ایسی تحریروں کو پہچانا جائے اور پہچنوایا جائے
جو تحرک پیدا کرنے والی ہیں۔

یہل گیا

اگر تحریر تحرک نہ پیدا کر سکے تو ایسی تحریر کے شہود پر آنے کا جواز؟

ادر اگر تحریر ایسی کوئی تحریک نہ پیدا کر سکے تو اس کے زندہ رہنے کا جواز؟

زوال روس کے بعد ہندوستان کی انجمن ترقی پسند ین کے حوالے یہ بحث ایک عصری ادبی ضرورت ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات، کاسٹ رائٹ، طبقاتی جدو نجاب آسام کشمیر، شیعہ سنی فساد، سیاسی قتل، امان کی بگڑتی ہوئی ہندوستان گیر صورت حال...." حسیت" کا علم بلند کرنے والوں کے نزدیک انسانی مایہ زیاں پہلا مسئلہ کیوں نہیں بنا؟ جدیدیوں یک مقبول ہونے والی یہ معصوم جگہ کیوں نہیں؟ آج تک کوئی ایسا جلوس اردو ادیبوں کی اسے کیوں نہیں نکلا جو ذاتی، علاقائی، لسانی اور ارانہ خلیج کے خلاف آواز بلند کرتا۔

معاصر ادیبوں نے منہ میں گھونگنیاں کیوں ڈال یں؟ اس مسئلے پر اب نہ سوچا گیا تو کب سوچا جائے

آخری مسئلہ:۔ لکھنے والوں کے دلوں میں جھل نے گھر کر لیا ہے، شاید ہم سب کی تخلیقی اور تنقیدی ں کا اصل مقصد یہ ہے کہ کسی بھی طرح ہمیں اعزازات نے ملیں...... اور کسی بھی طرح دنیا میں ہمارا نام رہے میں یہ نہیں کہتا کہ پہلے یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر پہلے بزدل اور بہادر، مفاد پرست ملص، خوشامدی اور صاف گو، نام و نمود کا لالچی اور بر مصر الگ الگ بیٹھتے تھے، سب کی صفیں الگ تھیں، ن چہروں کی پہچان آسان تھی مگر اب ہر چہرہ دوسرے میں خلط ملط ہو گیا ہے، بلکہ ایک چہرے میں کئی چہرے

شامل ہو گئے ہیں..... ویلن ہیرو میں ضم ہو گیا ہے۔

راقم الحروف کی نگاہ میں معاصر ادب کا سب سے بڑا مسئلہ ویلن اور ہیرو کو الگ الگ کر دینا ہے، اور اس کی ابتدا جینوئن فنکار کو اپنے آپ سے کرنی ہوگی، شعور اور تحت الشعور ہی نہیں لاشعور کو ٹٹولنا ہوگا..... ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر کسی کے اندر ویلن چھپا ہے تو وہ ہیرو کی صف سے ہٹ جائے۔ اور جو دراصل ویلن ہے تو وہ تو ہیرو کی صف سے ہٹنے والا نہیں ورنہ پھر وہ ویلن کہاں رہ پائے گا؟ اس لئے جس کے یہاں ہیرو موجود ہے اسے چاہئے کہ وہ خود اپنی صف الگ بنائے، ویلن کی شناخت کے لئے یہ بہت ضروری ہے، اور پھر بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے اندر ہیرو اور ویلن دونوں موجود ہیں..... دونوں میں سے ایک کو کمزور کرنا بہت ضروری ہے یہ جبلّت سے شخصیت کی طرف پیش قدمی کا پہلا قدم ہے۔ تزکیہ کا عمل ہے جو انسانی شرف کا ضامن ہے اور جس کے بغیر ادب اور ادیب وہ رول ادا نہیں کر سکتا، جس کی ادائیگی کے لئے وہ مبعوث کیا گیا ہے ـــــ!!

▲▲

(بقیہ:۔ شہر خیال)

کے عظیم ستون ہیں۔ ان حضرات کے فن پارے تحقیق و تمیز کے بہترین پیکر اور اردو ادب کے پر وقار لباس ہوتے ہیں۔ جو شدید مصروفیت میں بھی اپنے مطالعے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس کاروان شوق و شعور ہی کے سائے میں سہیل کا قد بڑھا ہے اور انشاء اللہ بڑھتا ہی رہے گا۔

▲ فیروز نظامی، (لکھنؤ)

ساجدہ زیدی

وہ آرزو نہ سہی قرضِ بندگی ہی سہی
رہِ حیات میں سجدوں کی روشنی ہی سہی
میں اپنی آگ میں یوں جل بجھوں تو کیا حاصل
اس التہاب میں اسباب زندگی ہی سہی
نباہنا ہے کشاکش سے تا دمِ آخر
ہوا کی زد پہ لرزتی دیئے کی لَو ہی سہی
چلو ملا تو کچھ اس کارزارِ ہستی سے
نشاط و عزم نہ سہی، اُن کی آگہی ہی سہی
مرے وجود کی تنہائیاں مسلّم ہیں
میں آپ کی ہی سہی، ہاں میں آپ کی ہی سہی
یہ شاعری، یہ نگاہ ولولۂ صوت و خیال
یہ کاروبارِ زیاں شغلِ زندگی ہی سہی
کسی گناہ سے دامن کو کرتے آلودہ
حیاتِ تیرہ میں داغوں کی روشنی ہی سہی

غزلیں

بلراج حیرت

غل یہ مچا ہے بستی بستی
میرا گماں ہے تیری ہستی
تشنہ لبو! اس شہرِ طلب میں
جرم ہے پینا بادہ مستی
آج بالآخر دیکھ لی ہم نے
شعلۂ گل سے روحِ تجلّی

کیا ہے یہی دستورِ مشیت
جسم ہیں مہنگے جانیں سستی
ہم نے کچھ ایسے خواب تو دیکھے
رہ گئی دنیا جن کو ترستی

اپنا اپنا ظرفِ نظر ہے
کیسی بلندی کیسی پستی
گردشِ دوراں بھی فانی ہے
جیسے تیری میری ہستی
پیاس بجھی ہے اپنے لہو سے
کام نہ آئی جامِ بدمستی
نام اسے کچھ بھی دو حیرتؔ
مسلکِ دل ہے کفر پرستی

شہباز اختر شباب

میں ہنس رہا تھا

سڑک ویران تھی
اور
میں تلاش کر رہا تھا بیٹر
کہاں ملتا مجھے ؟
پھر میں نے دیکھا
لوگ رو رہے تھے
لوگ دہاڑ رہے تھے
کسی کا خون ہوگیا تھا
ویران سڑک
پھر چہل پہل ہوگئی تھی
لوگ رو رہے تھے
میں ہنس رہا تھا
میں ہنس رہا تھا

یاد

کسی کی یاد
آئی ہے
اور وہ
بھی رات میں

جسم کی تلاش

رات ہوئی تو
جسم کا خیال آیا
میں کہاں گم ہوں
کہ مجھ کو میرا جسم بھی
میرا نہیں لگتا
میں کہاں ہوں ؟
کیا میں تنہا ہوں ؟
یا میرا جسم تنہا ہے
تنہا ہے بھی
تو پھر کہاں ہے ؟

کیا ہوا ہے ؟

میرے جسم سے کیسی خوشبو نہیں اٹھ رہی ہے
بونداس اٹھ رہی ہے
مہک اٹھ رہی ہے
آدمی کے جسم کی مہک
آدمی کے مردہ جسم کی مہک
کیوں اٹھ رہی ہے یہ مہک
کیا قتل ہوا ہے کہیں
یا میں خود ہی مر گیا ہوں

تیزاب کی بارش

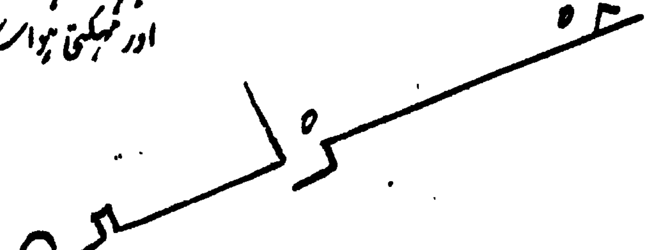
جب سے میں نے
پتھروں کو ٹکرایا ہے
آگ جلایا ہے
تب سے
تیزاب کی بارش ہونے لگی

رشید افروز

گرفت سخت ہے گزرے ہوئے زمانے کی
مگر وہ شخص جسے ضد ہو بھول جانے کی
نہ جانے کب سے میں ناکامیوں کی زد میں ہوں
نہ جانے کب سے ہے کوشش تجھے بھلانے کی
یہ اور بات کہ محسوس کر نہیں سکتے
ہر اک کے ساتھ ہیں مجبوریاں زمانے کی
اسی خیال نے بخشی نئی توانائی
مٹا نہ دیں کہیں یہ تلخیاں زمانے کی
کئی چراغ بجھائے ہیں ایک جھونکے سے
یہ بات کس لئے فانوس سے ہوا نے کی
کسی کے سامنے دست طلب دراز نہ کر
خدا کے پاس ہے کنجی ہر اک خزانے کی

عبدالشکور شکور

گرمیوں میں ہوا ساتھ دیتی رہی
ایک کالی گھٹا ساتھ دیتی رہی
میں سفر میں تو تنہا ہی تھا مگر
میری ماں کی دعا ساتھ دیتی رہی
میں تو ذرہ ہوں میری حقیقت ہی کیا
بس رضائے خدا ساتھ دیتی رہی
شب کی پر خوف و گھنگھور ظلمات میں
اک دیا کی ضیا ساتھ دیتی رہی
کامرانی کا سہرا بندھا میرے سر
رب کل کی عطا ساتھ دیتی رہی
مسکراتے رہے پھول گلزار میں
اور باد صبا ساتھ دیتی رہی
لہلہاتا رہا سُرخ آنچل شکور!
اور مہکتی ہوا ساتھ دیتی رہی



رفیق جعفر

ہم جنسِ رائگاں ہی بتایا گیا ہمیں
میلے میں اس خیال سے لایا گیا ہمیں
جیسے کسی فقیر کو مل جائے اک پناہ
اپنے ہی گھر میں ایسے بسایا گیا ہمیں
کانٹے کی طرح چبھتے رہیں گے تمام عمر
ایسا سمجھ کے یارو ستایا گیا ہمیں
موقع ملے تو چھا کے رہیں گے جہان پر
شاید اسی کے ڈر سے مٹایا گیا ہمیں
دن سر پہ آگیا ہے مگر کھل سکی نہ آنکھ
ایسا تھپک تھپک کے سلایا گیا ہمیں
کیسا سلوک اور یہ کیسی پناہ ہے
جھوٹی تسلیوں سے منایا گیا ہمیں
کیا بات ہے رفیق ذرا چل کے دیکھ لیں
پھر میکدے میں آج بلایا گیا ہمیں

جاوید نقیب

ہمیشہ قیدِ غمِ رائگاں میں رہنے دے
اسے تو حلقۂ سود و زیاں میں رہنے دے
نقیبِ فن ہوں صفِ نکتہ داں میں رہنے دے
مجھے تو صحبتِ اہلِ زباں میں رہنے دے
وہ اپنی ذات کے زنداں میں قید ہے لیکن
ہے آرزو کہ مکمل جہاں میں رہنے دے
خدا کی شان اسے کھینچ لے گی ساحل تک
شکستہ ناؤ کو موجِ رواں میں رہنے دے
ہر ایک حرف میں پوشیدہ گنجِ معنی ہے
ہر ایک لفظ کو حسنِ بیاں میں رہنے دے
حیات بخش تلاطم اسے بچا لے گا
حبابِ زیست کو آبِ رواں میں رہنے دے

غزلیں

سیّد معراج جامی

پتہ تو چلے کچھ کہ منزل کہاں ہے
تعین نہ ہو تو سفر رائگاں ہے

نہ میں بدگماں ہوں نہ دل بدگماں ہے
مگر اک حجاب نظر درمیاں ہے

بہاروں کی دُنیا سمیٹے ہوئے ہوں
مرے دل کے زخموں کا موسم جواں ہے

فضاؤں پہ کیوں چھا رہی ہے اداسی
ابھی تو بھی تک مری داستاں ہے

اندھیرے مقدر میں کچھ اور ہیں کیا
یقینِ سحر سے نظر بدگماں ہے

تجھے یاد کرنا، تیرا نام لینا
میرا ہر نفس حاصلِ امتحاں ہے

ابھی سے کہاں اختتام فسانہ
ابھی میں جواں ہوں ابھی دل جواں ہے

سمجھ کر کوئی رائے قائم کرو تم
یقیں پھر یقیں ہے گماں پھر گماں ہے

زمانے کی نظروں کا محور ہوں جامی
کبھی خود کو دیکھوں یہ فرصت کہاں ہے

محسن رضا رضوی

عجیب کیف کا عالم مری نظر میں رہا
تمام عمر میں یادوں کی رہ گزر میں رہا

وہ تیرا جلوہ تھا یا تھا حجاب چہرۂ حسن
جو رنگ بن کے مری چشم معتبر میں رہا

مسافروں کو عطا کر گیا سرِ منزل
وہ گمرہی کا تقاضہ جو راہبر میں رہا

نہ عکسِ رُخ، نہ کوئی آئینہ، نہ کوئی نگاہ
نہ جانے کون سا منظر مری نظر میں رہا

یہ جانتا تھا کہ پرسش خدا کے گھر ہوگی
مگر میں خوف کے عالم میں اپنے گھر میں رہا

نہ جانے کون سی منزل کی تھی تلاش اُسے
تمام عمر پریشان وہ سفر میں رہا

یہ ہر کسی کو شکایت ہے صرف رضوی سے
وہ اجنبی تھا مگر ہر کسی کے گھر میں رہا

اِدھر پاس ذرا تم تو کچھ قرار رہے
نگاہِ لطف کا مجھ کو بھی اعتبار رہے
بہار لے کے سحر آگئی ہے گلشن میں
خدا گواہ کہ ہم پھر بھی سوگوار رہے
میں راہ دیکھتا رہتا ہوں ہر گھڑی جس کی
اسے بھی کاش کبھی میرا انتظار رہے
لبوں پہ پھول کھلیں، زندگی ہو نغمہ بہ لب
خدا کرے نہ کوئی آنکھ اشکبار رہے
لگے نظر نہ کسی کی، یہی تمنا ہے
نسیم اپنا گلستاں سدا بہار رہے

نسیم عزیزی

فاصلے پھیلتے سمٹتے ہیں
رہگزر راستے بدلتے ہیں
اس قدر تپ گئے ہیں یاں رشتے
در، دریچے، صحن سلگتے ہیں
کیا گزرتا ہے سادہ دل جانے
سانحے دل سے جب گزرتے ہیں
امتحاں ہی جہانِ آدم ہے
لیکے تختی یہاں سسکتے ہیں
خلدِ آدم کی اک کڑی ہیں ہم
ہر قدم ہم یہاں بچھڑتے ہیں

م - ح - اشرف

تنہا وہ راہ گیر تھا شامل کوئی نہ تھا
اس زندگی کا اصل میں حاصل کوئی نہ تھا
مجمع ستم زدوں کا عدالت میں تھا لگا
خالی تھیں کرسیاں وہاں عادل کوئی نہ تھا
چھائے رہے شکوک کے بادل نگاہ میں
چھپتا بھی کیا یقین کے قابل کوئی نہ تھا
مارا گیا تھا خون کے چھینٹے کہیں نہ تھے
حیران تمام لوگ تھے قاتل کوئی نہ تھا
نقطے سے بن گیا تھا وہ لفظوں کا سلسلہ
اک لفظ خود نہ پڑھ سکا جاہل کوئی نہ تھا

مشرف عالم ذوقی

ترجمہ:۔ تبسم فاطمہ

مسلمان*

قسط ۵

گوہر بائی کو اچانک احساس ہوا۔ نواب صاحب سے نہوں نے یہ کیا کہہ دیا۔ دنگوں کے ذمہ دار بھی آپ ہیں۔ نہ نہیں نواب صاحب نے کیا محسوس کیا ہو... لیکن ۔ اس کی غلطی بھی کیا تھی۔ جو سنا وہی تو کہا۔ کوٹھے پر کیسے کیسے لوگ آیا کرتے ہیں۔ وہ بھی تو دوسرے گاہکوں کی طرح ہی ایک گاہک تھا ۔ جس سے انہوں نے عجیب عجیب باتیں کی تھیں ۔ کتنی باتیں ۔ کیسی کیسی باتیں...

اسے کبھی کبھی لگتا..... وہ صرف ایک طوائف ہے...... شاید اسے یہ سب نہیں سوچنا چاہئے ۔ یہ باتیں ملک کے سیاستدانوں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ آخر، اب کچھ نیا کیا رہ گیا ہے ۔ کل چوری ہوتی تھی، ڈاکے پڑتے تھے، قتل ہوتے تھے تو کچھ دیر کے لئے کلیجہ بھی بھر آتا تھا۔ لیکن اب ...، کیسے کیسے قصے سنتی ہے وہ۔ اور اس کے یہاں آنے والے ڈراؤنے خواب کی طرح۔ کیسے کیسے بھیانک واقعات لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

توبہ... توبہ.... گوہر جان نے ذہن ہٹانے کی کوشش کی تو پھر آنکھوں کے سامنے وہی گاہک دوڑ گیا جو قصوں کی پٹاری لے کر بیٹھ جایا کرتے ۔ کچھ لوگ تو بس آنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ۔ ادھر کی ادھر کی... کچھ گھر کی ۔ کچھ تو بے حد اذیت پسند ہوتے۔ کچھ میٹھی میٹھی باتیں کر کے لطف حاصل کرتے ۔ اور کچھ اپنی محبت کی کہانیوں کو لے کر شروع ہو جایا کرتے۔

ادھر آنے والوں میں، جب سے ملک نے سیاست کا زہر یلا دھواں پینا شروع کیا، کچھ نیتا جیسے لوگ بھی آتے تھے، جن کی زنبیل میں سیاسی مہرے ہوتے تھے اور جنہیں ملک کی فکر کھائے جاتی تھی۔

تقسیم کے بعد تیزی سے بدلتی حکومتیں اور سیاسی حکمرانوں نے مذہب کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ گوہر بائی کے پاس مولوی، پنڈت جیسے لوگ بھی آیا کرتے، جو اپنا اپنا راگ الاپا کرتے۔ کچھ پرانی کہانیاں دہراتے۔ کچھ نئی باتیں کرتے ۔ جیسے گوہر بائی کو شہناز بائی سے اماں کی بدنصیبی کی کہانی تو معلوم ہوئی لیکن پاکستان

نے کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر کیا کیا افتاد پڑی،
س کا ذکر تو وہ یہاں آنے والے زیادہ تر لوگوں سے
سنتی رہی۔ مکان و مال کا کیا نقصان ہوا۔ وہ تو یہاں
نے والے دردمندوں سے ہی معلوم ہوا۔۔۔۔ کہ جو مال
ار تھے پاکستان جا کر کنگال ہو گئے۔ جو کنگال تھے
لامال ہو گئے۔ بس، مکان کا تالہ توڑنا تھا۔ اپنا قبضہ
جمانا تھا۔ اسلام تو وہاں نام کا ہے گوہر بائی فیشن
یہ تو پاکستان نے ہندوستان کی بھی چھٹی کر رکھی ہے۔
کوٹھے پر آئے ہوئے ایک ملّا نما شخص نے بتایا
تھا۔ مسلمان یہاں محفوظ کہاں ہیں گوہر بائی؟ اللہ
عذاب ہے۔ پہلے شہنشاہیت چھینی۔ پھر دوسروں
محتاج بنا دیا۔ کافروں کو حاکم بنا دیا۔ مسلمانوں
ماتحت۔۔۔

گوہر بائی کو سب کچھ یاد ہے۔ وہ اس کی کوئی بھی بات
نہیں بھولیں۔ وہ آنکھوں میں سرمہ لگائے تھا۔ گندمی
ین نقش۔ لیکن آواز میں عجب سا جادو تھا۔ پتہ نہیں
س رات وہ کیا کیا بولتا رہا۔ لیکن وہ آوازیں جیسے اب بھی
نوں میں گونج رہی ہیں۔

سب کو عیاشیاں لے ڈوبیں گوہر بائی۔ تاج و تخت
چھن گئے۔ مال و متاع سے محروم کر دیئے گئے ہم۔ برق گرتی ہے
و بیچارے مسلمانوں پر۔۔۔ آج ساری دنیا میں ذلیل و خوار
ہو رہے ہیں۔ اور یہاں۔۔۔ اپنے ملک میں۔ جہاں ہمارے
مکان ہیں۔ اپنی تجارت ہے۔ یہاں بھی ہماری تجارتیں چھیننے
کے حربے آزمائے جا رہے ہیں۔ آگ لگائی جا رہی ہے۔
مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدے اور محکمے نہیں دیئے جاتے۔
فساد اور دنگے کرا کر ان کی آبادی کم کی جا رہی ہے۔ کہیں
ری بھی مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے۔ سب اوپر سے کچھ کہتے

ہیں، اندر سے کچھ ہیں۔۔۔ اور وہ قائد اعظم۔۔۔ مولوی
کے گلے سے زہر کی لپٹیں نکلی تھیں۔ پاکستان بنا کر اچھا
نہیں کیا جناح نے۔۔۔ کیڑے پڑیں اس کی قبر میں۔
اور گوہر بائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مولوی کو تکتی
رہی۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔ کیسا زہر ہے۔۔۔ اسے تو بچپن
سے ناچنے اور گانے کی تعلیم ملی تھی۔ ان باتوں کو بھلا وہ کیا
سمجھ پاتی۔

اور بھی کتنے چہرے تھے۔۔۔
کیسے عجیب عجیب چہرے۔۔۔

ایک چہرہ اس دبلے پتلے مریل سے شخص کا تھا۔
پاؤں سے بھی کمزور تھا جبنا۔ چہرے پر چیچک کا داغ۔ ماتھے
پر بڑا سا ٹیکہ۔۔۔ وہ شاید کسی مذہبی پارٹی کا لیڈر تھا
وہ اپنے دبلے پتلے ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں کو۔ ماسٹر جی کی بید
کی طرح غصے میں ہلاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

تم تو مسلمان ہو گوہر بائی۔ دھت۔۔۔ وہ مسکرا
تم مسلمان کہاں ہو۔۔۔ تم لوگوں کا بھی دین ایمان ہوتے ہیں
تو پھر ہمارے جیسے لوگ جائیں گے کہاں۔۔۔ لیکن ایک
بات ہے گوہر بائی۔۔۔ ذرا سوچو۔۔۔ دل پر ہاتھ رکھ کر
خود ہی فیصلہ کرو۔۔۔ مسلمانوں نے جب لڑ جھگڑ کر اپنا
الگ پاکستان لے لیا تو۔۔۔۔؟ یہاں رہنے سے فائدہ
کیوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں نہ میں۔۔۔؟ رہنا ہے تو ڈھنگ
سے رہیں۔۔۔ ورنہ اٹھائیں سامان اور جائیں پاکستان
غصہ مت ہو گوہر بائی۔ ذرا سوچو۔۔۔ مسلمانوں کے
ملک تو انیک ہیں۔ ہندوؤں کے ملک ہی کتنے ہیں آپ
آپ نے تو ہندوستان میں سے بھی ایک [illegible]
اور پاکستان کے ماتھے پر اسلام لکھ دیا۔ اب ہندوستان
کے ماتھے پر ہندو راجیہ لکھا جائے گا تو کون سی آفت آ جائے

گی — کہیے ... کہا میں نے گوہر بائی۔ اب سچ سچ بتانا۔ سارا قصور ... مسلمانوں کا ہے۔ دیکھا جن کے ذمہ دار بھی وہی — یہاں ہونے والے دنگوں کے بھی — غدار کہیں کے — میرا بس چلے تو ..... لیکن تم کیوں لال پیلی ہو رہی ہو گوہر بائی ؟

اور —

گوہر بائی اچانک مجرے سنانے میں آگئیں —
اس حقیقت سے تو کبھی ان کا تعارف ہی نہیں ہوا تھا۔
یہ کیسی داستان ہے ؟
وہ ... یہ کیسا زہر بھر گیا ہے ..
یہ مولوی اور یہ پنڈت ...

یہ تو اپنی اماں عزیز النسا کی دردبھری داستان معلوم تھی، جو پاکستان جانے والے قافلے سے بچھڑ کر ایک بدمعاش ہندو ویرا کے ہاتھوں پڑ گئی تھی۔ جو انہیں اٹھا کر کوٹھے پر لے آیا تھا۔ بس اتنا ہی جانتی تھیں وہ۔ انہیں نفرت تھی ہندوؤں سے۔ لیکن یہ مرچی جیبا دکھنے والا شخص کیا ہذیان بک رہا ہے۔

تاریخ کے کتنے چہرے ہوتے ہیں ... ؟
سچ کے کتنے پہلو ہوتے ہیں .... ؟
فساد — سیاست — کوٹھا .....

اس نے پھر ٹھمکا لگایا۔ مجرے کے بول گنگنائے۔ سازندوں کے ساز پر رقص کیا اور الطاف حسین کو کھری کھری سنادیا کہ تم ....
دنگوں کے اصل ذمہ دار تو تم ہو ....
تم ہو ....

برسوں سے اندر دبی آگ کا استعمال وہ اور کہاں کرتی۔

یہ اس کے قوم والے .... اسے نفرت ہے۔ سب سے نفرت ہے .... سب کے سب گندے ہو گئے ہیں۔ ... کے جنے ... عیاش ....

اور یہ الطاف حسین — وہ تو دنیا کی ساری گندی گالیوں کا اکیلا مستحق ہے۔ جنا، صرف نسلی ... بول دیئے جا رہا ہے — بدمعاش —

اُسے لگا، اس کی تسکین ہوگئی ہے۔ آخر نواب صاحب کی اپنی بھی تو اولاد ہیں۔ افروز کے سر پر ایک ... بھی تو شفقت سے ہاتھ نہیں پھیرا۔

دوسروں کی طرح وہ بھی تو .... صرف ایک گاہک ہی — بس —

دھند چھٹی — اور گوہر بائی اس دھند سے باہر نکل آئیں۔

افروز کمرے میں آئی تو اس نے پوچھا۔
"آج ٹیچر نہیں آئے ؟"
"ان کی طبیعت خراب ہے۔ آج وہ نہیں آئیں گے۔"
افروز جانے کو ہوئی تو اس نے ٹوکا — کیا بات ہے افروز ... نہ تم ہنستی ہو .... نہ کبھی خوش ہوتی ہو .. یہ ہر وقت مرجھایا ہوا چہرہ .. میری بچی، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

بائی اماں — ماسٹر جی شاید ابھی ایک دو روز اور نہیں آئیں — ان کا مکان فساد زدہ علاقے میں پڑتا ہے۔

افروز نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔
بائی اماں کی، جیسے کسی نے دکھتی رگ پکڑلی ہو .. ہائے اللہ ... یہ بچی تو اپنی ماں کو دیکھ کر مسکراتی بھی نہیں ... اب .... کتنی بڑی ہو گئی ہے ... اور ... وہ
گوہر بائی نے جیسے خود پر نظر ڈالی — پھر مطمئن

ہوگئیں... نہیں... ابھی ان کے ڈھلنے میں کافی دن باقی ہیں...

وہ بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

افروز کمرے میں ایک قطار سے رکھے ہوئے ساز دیکھ رہی تھی۔ جو ابھی خاموش تھے، سازندوں کی انگلیوں اور گاہکوں کے انتظار میں تھے۔

ایک نامعلوم خطرے کا احساس کرتی ہوئی گوہر بائی، افروز جان کو بغور دیکھے جا رہی تھی۔

تب، ملک کی سیاست میں ایک نئے خونی باب کو جوڑنے کی تیاری چل رہی تھی۔

اِدھر گوہر بائی کا شباب ڈھلنے پر آیا، اُدھر نومینس لینڈ NOMAN'S LAND پر منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی لاش پڑی تھی۔

ملک کے حاشئے پر اس وقت سب سے بڑا ہیرو مذہب تھا۔ اور یہ نازک سا کھلونا بطور ہتھیار سب کے پاس تھا۔ ہر شخص اس سے کھیلتا تھا۔ یا کھیل سکتا تھا، خواہ وہ سیاست داں ہو یا نہیں ۔ وقت بدلا تھا۔ ملک کی تہذیب بدلی تھی۔ زمانے کا چلن بدلا تھا۔ مذہب کے رنگ بدلے تھے۔ جنوں کے انداز بدلے تھے۔ فکر کا تیور بدلا تھا۔

اور ——

برسوں سے چلی آرہی محبت بدلی تھی۔

افروز اب ننھی بچی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی، وقت کو، انسانوں کو، اپنے یہاں آنے والوں کو.... وہ دیکھ رہی تھی، سمجھ رہی تھی... اور سوچ رہی تھی... جذبات اور احساسات سے یہ لوگ اس قدر کٹتے کیوں جا رہے ہیں.. انسان مشین کیوں بنتا جا رہا ہے۔ سڑکوں پر پھیلے لہو کو دیکھ کر بھی کوئی چنگاری اندر پیدا کیوں نہیں ہوتی ——

بائی اماں اب موقع نکال کر نماز فاتحہ بھی کرنے لگی تھیں۔ محفل مولود کے لئے بڑی ماما چند مولویوں کو پکڑ لاتی۔ اماں وعظ بھی سنتیں، بریانی بھی کھلاتیں۔ اور پیچھے تجھیا کبھی کبھی قرآن پاک کی تلاوت بھی کر لیتیں۔ وقت ملتا تو نماز دو گانہ بھی پڑھ لیتیں۔ .. بائی اماں کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ جیسے، ان کی بیٹی سماج... زمانے میں عزت پاتی — وہ اچھا لڑکا دیکھ کر ہاتھ پیلے کر دیتیں۔ جو خوشی ان کے نصیب میں نہیں آئی، وہ افروز جان کے آتی... پھر ایک خوبصورت سی پھلواری ہوتی... اور وہ پرانے بد رنگ دلوں کو ایکدم سے بھول جاتیں۔

لیکن خوابوں کا کیا۔

اندر دھنشی رنگوں کا کیا ؟

بائی اماں.... جیسے آسمان دیکھتے دیکھتے کوئی ٹوٹا تارا ان کی آنکھوں میں چبھ جاتا....

سب سے خطرناک ہوتا ہے ہمارے سپنوں کا مر جانا۔ کتنی مشکل سے پڑھ پائی ہے افروز.... کتنی دقتیں جھیلی ہیں... نواب صاحب کی کتنی منتیں کی ہیں.... یہ سب وہی جانتی ہیں۔

لیکن افروز کا مستقبل کیا ہوگا ؟

کیسا ہوگا ؟

اس سوال کے جواب میں وہ درخت سے ٹوٹے پتے کی طرح کانپ جاتیں... لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اسے کوٹھا سے دور رکھنے کی تدبیر نہ کر سکیں۔ (جاری) ٭٭٭

ایس اشرف

بکھرے سپنے

دیکھتے ہی قدرت بھی کبھی کبھی سوتیلا سا برتاؤ کرتی ہے بشنکر پور کی سنگلاخ اور چٹیل زمین کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے۔ پرانے زمینداروں کے منہدم مکانات ماضی کی یاد دلاتے ہیں جہاں غریب کسانوں کی چند جھونپڑیاں ہی رہ گئیں ہیں جو اس ویرانے کو گاؤں کا نام دینے پر مجبور کرتی ہیں۔ سبزہ کوسوں دور ہے۔ کچھ غریب لوگ دس بیس تیس میل کے فاصلے پر کسی ... فیکٹری میں کام کر کے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ گویا اب کسان صرف نام کو رہ گئے ہیں۔ انہیں اپنی روزی روٹی کے لئے مل میں مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ اس گاؤں کا ایک غریب کسان رامو بھی ہے جو مل میں مشقت کر کے اپنے پریوار کی زندگی کی نیا کھے رہا ہے۔ اس کے دو لڑکے اجے اور وجے گاؤں سے میلوں دور ہائی اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ رامو بھی تعلیم کی اہمیت خوب سمجھتا ہے اس نے اپنے ان بیٹوں کے لئے ایک سپنا سجا رکھا ہے وہ انہیں اعلیٰ تعلیم دلوا کر اپنے خاندان کی بدحالی کو خوشحالی میں بدل دینا چاہتا ہے۔ اس کی گہری اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایسے سپنے ہر لمحہ ابھرتے ڈوبتے نظر آتے ہیں۔

اجے اور وجے نویں اور دسویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ دونوں ذہین بھی ہیں۔ اجے بڑا ہے، وہ کچھ زیادہ سوچ سکتا ہے۔ اسے اپنے باپو کی ہر لمحہ فکر رہتی ہے۔ اس نے اپنے باپو کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ اجے کو وہ ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔ کارن یہ کہ دو تین سال پہلے جب اس کی دادی بغیر دوا کے کھانستے کھانستے مر گئی اور کوئی ڈاکٹر اس کے بلانے پر گاؤں نہ آسکا تو انہوں نے اجے کو ڈاکٹر بنانے کی پرتگیاں (प्रतिज्ञा) کر لی اور اسے ڈاکٹر بنانے کی تمنا پال لی۔ وہ اجے کو باتوں باتوں میں اپدیش بھی دیتے رہتے۔ اجے نے بھی اب سپنا ساکار کرنے کو سوچ لیا ہے۔ اس نے بھی یہ نشچے کر لیا ہے کہ وہ ڈاکٹر بن کر ہی رہے گا اور باپو کے اپدیش کے مطابق اپنے گاؤں میں ہی رہ کر غریبوں کی سیوا کرے گا۔

آج اتوار ہے۔ اسکول میں چھٹی ہے۔ اجے اور وجے گھر پر ہی موجود ہیں اور رامو مل میں مزدوری کرنے

جا چکا ہے۔ اجے کو رہ رہ کر اپنے بابو کا ہی خیال آ رہا ہے کیوں کہ فیکٹری میں چھٹی ہوئے دو تین گھنٹے ہو چکے ہیں اور اس کا بابو ابھی تک لوٹ نہ سکا ہے۔ اجے چونکہ اب وہ زیادہ سوچ سکتا ہے اس لئے اس کے دل میں غلط خیال اٹھ رہے ہیں کہ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

"کون ہے ؟"

"میں ہوں... فیکٹری کا دربان،.... چودھری۔"

"کیا بات ہے چودھری چاچا ؟"

تم رامو کے بیٹے ہو نا : اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ شہر کے اسپتال میں ہے۔

اجے بے اختیار دھاڑیں مارتا ہے۔ نہیں بابو نہیں......

چودھری اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تھپتھپاتا ہوا کہتا ہے۔

بچو! دھیرج رکھو، مل مالک بڑے سرکار نے تمہیں بلایا ہے۔

اجے پاگل کی طرح روتا سسکتا چودھری کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ میلوں چلنے کے بعد اسے شہر کا وہ ہسپتال نظر آتا ہے جہاں اس کا بابو اپاہج جسم لئے بیڈ پر پڑا کراہ رہا ہے۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ اجے، بابو۔ بابو کہہ کر اس کے گلے سے لپٹ جاتا ہے۔

بابو! یہ کیا ہو گیا ؟ کیسے چلے گی ہم لوگوں کی زندگی کی یہ گاڑی ؟؟

کیا بھگوان اتنا کٹھور ہو گیا ہے ؟؟؟

رامو بول اٹھتا ہے۔ نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ بھگوان جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اب رونا دھونا بند کرو... بڑے سرکار سے میں نے بات کیا ہے۔ اب تو میری جگہ فیکٹری میں کام کرے گا۔ میں ہفتہ دو ہفتہ میں گاؤں واپس لوٹ جاؤں گا۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ فیکٹری والوں نے مل کر میرے لئے لکڑی کے دو پیر منگوائے ہیں۔ بہت جلد وہ دونوں پیر میرے ساتھ جوڑ دیئے جائیں گے اور میں چلنے پھرنے لگوں گا۔ فیکٹری میں کام نہیں کر سکتا تو کیا ہوا۔ تو میرا بڑا بیٹا ہے نا تجھے مل میں نوکری مل جائے گی۔ تو کل سے کام پر چلے جانا۔ بڑے سرکار اس کے لئے راضی ہو گئے ہیں۔

وقت گھاؤ پر گھاؤ لگاتا رہا اور خود اسے بھرتا بھی رہا۔ رامو کی نوکری اب اس کے بیٹے اجے کو مل گئی ہے۔ وہ دن رات کڑی محنت کر کے اپنے چھوٹے بھائی وجے کو شہر میں پڑھا رہا ہے۔ اس کا سپنا ڈاکٹر بننے کا اب بھی اس کے دل میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ اجے کی جگہ وجے اب ڈاکٹر بننے والا ہے۔ اب تو رامو اپاہج زندگی گزارتے گزارتے تھک چکا ہے اور اپنی موت کی بھگوان سے پرارتھنا کرتا رہتا ہے۔

اجے نے سوچا، اب ماضی کتنا پیچھے چھوٹ چکا ہے۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اس کے اپنے ساتھ بیتے ہوئے کل، ایک کہانی کی طرح لگتے ہیں۔ پھر بھی اس کا سپنا اس کے سامنے ہے اور وہ سپنا اب ساکار ہوتا نظر آتا ہے۔ وجے کی ڈاکٹری کی تعلیم اب مکمل ہو چکی ہے۔ اب وہ اندرا گاندھی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ہاؤس سرجن کی ٹریننگ لے رہا ہے۔ اجے کو ہر لمحہ اب بھی یہی خیال رہتا ہے کہ وہ اپنے بابو کو دیا وچن بہت جلد پورا کر سکے گا۔

اس کے پڑوس میں رہنے والی گیتا دادی جو دن رات کھانستی رہتی ہے کا علاج کرا سکے گا۔ لکھو دادا جو خون تھوکتا رہتا ہے اس کا بھی علاج اپنے عزیز ترین بھائی

یے کر دا کر ہی دم لے گا۔ اسے اپنے اس گاؤں سے بہت پریم ہے۔ یہاں کے غریب لوگوں سے کتنا اسے پیار ہے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا۔ وہ ہر لمحہ ان کی فکر میں دبا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہاں کے لوگوں سے بڑے گھمنڈ سے یہ کہتا ہے۔ گھبراؤ نہیں لکھو دادا۔ اب یہاں کوئی دوائی بنا، ڈاکٹر بنا مر نہیں سکتا۔ اب تو بہت جلد میرا وجے آنے والا ہے۔ وہ تم لوگوں کی دن رات سیوا کر کے بتیا سے چھٹکارا دلائے گا۔ ٹی۔بی تو اب کوئی روگ نہیں رہا ہے دادا — میں نے اخباروں میں پڑھا ہے۔ اس کی دوائیاں آچکی ہیں اور ہمارے ہی دیش میں کافی لوگ اس بیماری سے مکت ہو چکے ہیں۔

یہ سب کہتا ہوا اجے فخر سے سر اٹھائے اپنے گھر کی اور چلا۔ گھر پہونچتے ہی اسے روپ منی جو اس کی بیوی تھی کے کھانسنے کی آواز سنائی پڑی۔ اس نے پوچھا، کیا ہوا روپ منی؟ کیوں کھانس رہی ہو؟

اجے نے دیکھا کھانستے کھانستے روپ منی نے کتنا سارا خون اگل دیا تھا۔ وہ لال خون اس کے دماغ میں چند خیالات ابھارنے لگا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے وہ فیکٹری میں دن رات محنت کر کے جو بھی کماتا وہ وجے کو شہر میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں بھیج دیتا تھا۔ روپ منی گاؤں سے دو تین میل کی دوری پر بن رہے ڈیم پر کام کرتی تھی اس سے جو کچھ بھی حاصل ہوتا ان دو پرانیوں کے لئے کافی تھا۔ ایسے بھی روپ منی نے کبھی ایسا سخت کام نہ کیا تھا جس کی بنا پر اس نے یہ بیماری پال لی۔ اجے یہ سمجھ چکا تھا کہ روپ منی اس کے بھائی کی ڈاکٹری کی تعلیم کے واسطے اگنی پریکشا میں ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے اجے کو آواز دی۔ اجے جب اس سے ملا تو اس نے بتایا کہ وجے بابو شہر میں ایک ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں بلایا ہے۔

چند لمحہ کے لئے اجے روپ منی کا دکھ درد بھول چکا تھا۔ اس نے روپ منی سے وعدہ لیا کہ وہ اس وقت تک اس کا انتظار کرے گی جب وہ اپنے بھائی ڈاکٹر وجے کو لے کر لوٹ آئے گا

دھوپ شدید تھی لیکن اس کا احساس اجے کو بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم سے شہر کی اور چلا اس کا ذہن بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ وجے اب ڈاکٹر بن چکا ہے۔ یہ سپنا باپو کا سپنا تھا۔ اجے کا سپنا تھا۔ لوگ سپنے تو دیکھ سکتے ہیں۔ ساکار نہیں کر سکتے۔ آج اس نے اپنا سپنا ساکار کر لیا ہے۔

میلوں پیدل چلنے کے بعد وہ شہر کے اس ڈاک بنگلو کے احاطے میں پہنچا جہاں اس کا ڈاکٹر بھائی لان میں رولنگ کرسی پر بیٹھا اپنے دوستوں سے محو گفتگو تھا۔ اجے پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بھیا کہہ کر اسے اپنے کمرے کی طرف لے گیا۔ اب ایک کرسی پر اجے اور دوسری کرسی پر ڈاکٹر وجے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

خاموشی کے سلسلے کو توڑتے ہوئے اجے نے کہا۔

دیکھو وجے! اب تم ڈاکٹر بن چکے ہو۔ میرا اور باپو جی کا سپنا ساکار ہوا۔ اب تمہیں گاؤں چلنا چاہئے وہاں کے لکھو دادا، گیتا دادی اور بہت سارے غریب بھائی بندھو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی آشا تم سے بندھی ہوئی ہے۔ ان کے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ اپنی بیماریوں اور دکھوں کا علاج شہر پہنچ کر کرا سکیں

بے چارے سمے کاٹ رہے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو دلاسا دیا ہے اور کہا ہے کہ گھبراؤ نہیں میرا وجے بہت جلد آنے والا ہے۔ وہ تم لوگوں کے دکھ درد سے خوب واقف ہے۔ وہ تم لوگوں کے لئے بیاکل ہو جائے گا۔ شہر کے ڈاکٹروں سے کوئی بیر یوارک سبیندھ کہاں ہے کہ ہم سبھوں کا دکھ درد بانٹ سکے گا۔

اور ہاں! یہ تو بھول ہی گیا کہ تمہاری بھابی بھی خون اُگل رہی ہے۔ اسے بھی ٹی۔بی ہو گئی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ اب ٹی بی کوئی روگ نہیں رہ گیا ہے۔ وجے آئے گا تو تمہارا مرض کافور ہو جائے گا اور تم پھر سے پہلے سے زیادہ اچھی ہو جاؤ گی۔

تو چلو گے نا؟.... کب چلو گے ___؟ کل صبح صبح تو اچھا ہوتا۔

نہیں بھیا! میں نہیں جا سکوں گا۔ بحرین سے میرا اپائنٹمنٹ اور ویزا آچکا ہے۔ میرا ہوائی جہاز پرسوں تین بجے بھور میں اڑان بھرے گا۔ کل دلی کے لئے میں روانہ ہو جاؤں گا۔

وجے! ایسا نہ کرو۔ گاؤں چلو۔ چل کر لوگوں کو دیکھ تو لو۔

نہیں بھیّا! میرے پاس سمے نہیں ہے۔ میرے بھوشیہ کی بات ہے۔ میں اپنے بھوشیہ کے لئے بحرین جا رہا ہوں۔ مجھے گاؤں سے کیا لینا دینا ہے۔

تو کیا بھابی کے لئے بھی نہیں جاؤ گے؟

نہیں۔ میں کسی کے لئے بھی نہیں جا سکتا

▲▲

براہ کرم تخلیقات صاف اور خوشخط
اور مراسلہ اختصار روانہ فرمائیں

چنانچہ اصل متن کے لحاظ سے مختلف کڑیوں میں اشعار کی کمی بیشی اور ایک شعر

پھر اے انس و جاں دیکھو رب کی عطا
تو کس کس عنایت کو جھٹلائے گا

کی تکرار بنیادی تاثر سے قریب کرتی جاتی ہے۔

جناب مسعود عظیم آبادی اپنے لہجے اور موضوعات کی وجہ سے ہماری بساط سخن پر ممتاز ہیں۔ کراچی کی چند ادبی و شعری نشستوں میں ان سے ملنے کا بھی موقع مل چکا ہے اور ان کی شخصیت اور فن کی ہم آہنگی کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔ پاکستان میں مضبوط ہوتی ہوئی مذہبیانہ شاعری کی روایت اردو شاعری کو جن خطوط پہ لے جا رہی ہے اس کے بارے میں ابھی تو قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن آگے چل کر یہ جائزہ لینا پڑے گا کہ ایسی شاعری کے ATTITUDE میں عقیدت اور پیغام کا کتنا حصہ ہے اور شاعری کا کتنا حصہ۔

▲▲

شہرِ خیال

○ شمارہ ۵۱/۵۲ بہت پسند آیا۔ اداریہ بہت خوب ہے۔ انسانیت فی الواقع گورستان میں جگہ بنا رہی ہے۔ اصغر علی انجینیر، سید علی مظفر، علیم اللہ حالی کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ نئی کتابوں کا تعارف بھی خوب ہے۔ غرض کہ سہیل خوب سے خوب تر کی جانب تیز قدمی سے گامزن ہے۔

مطالعہ ریاض و ریاضت کا ثمرہ ہوتا، مضمرات و ملوثات ذہنی و باطنی صحیح انداز فکر و نظر پیدا نہیں کر سکتے۔ ابن رشد مشہور و معروف مفکر قرطبہ کا قاضی تھا مگر آزادیٔ فکر و نظر نے اسے جلا وطن کروا دیا۔ ابن رشد کا موقف تھا کہ فلسفہ کا مقام الٰہیات سے بالاتر ہے مگر اقبال موخر کو فلسفہ سمجھ بیٹھے۔ اقبال کے فکر و نظر سے متعلق میری تصنیف

IQBAL IN FINAL COUNTDOWN

جس کے ناشر دہلی کے ہیں اور تقسیم کار ہیں

Western Book Depot, Pan Bazar - GUWAHATI - 781001

اس میں پیش کردہ میرا موقف ایک کھلے چیلنج سے کم نہیں ہے۔ شاعر بمبئی کا اقبال نمبر اقبالیات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے مگر کتنے اقبالیے ہیں جو اس سے رجوع کئے ہوں۔ اردو والے بالعموم کم مطالعہ ہوتے ہیں لہٰذا اوٹ پٹانگ مراسلے لکھتے رہتے ہیں اور بس۔

▲ تاباں محمد، بنگلور

○ سہیل، باقاعدگی سے آپ کی محنتوں اور لگن کی کہانیاں سناتا آجاتا ہے۔ قسط وار تخلیقات ہیں تو اچھی لیکن سلسلہ ٹوٹ جانے سے بھول جاتی ہیں۔ خاص طور پر حالی صاحب کا سفرنامہ اور ذوقی صاحب کا ناول شعوری حصہ زوردار ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ ویریندر پٹواری کی کہانی قومی تشخص بیدار کرنے کی کوشش تو کرتی ہے لیکن علامتوں کے جنگل میں بھٹکی سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ موضوع زیادہ وضاحت سے بات کرنے کی مانگ کرتا ہے۔ علامت کو کہانی کے حسن میں اضافہ کرنا چاہئے۔ اس کی رفتار میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔ ہر علامت کو موضوع میں رچے بسے ہونا چاہئے۔ کہانی اچھی کہی جا سکتی ہے۔

اگر رستوگی صاحب علامہ اقبال پر اعتراضات کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں تو ان کے اعتراضات کا مدلل جواب ملنا چاہئے صرف شکایت کرکے یا علامہ سے عقیدت کے اظہار سے تو بات نہیں بنتی۔

▲ سرون کمار ورما۔ امرتسر

○ "ایک شام ساجدہ زیدی کے نام" کے تمام مندرجات بہت ہی دلچسپی، شوق اور لگن کے ساتھ پڑھے اور ایک ایک مضمون کا غائر مطالعہ کیا۔ آپ نے بہت اچھی تخلیقات کا انتخاب کیا ہے جس سے ساجدہ زیدی کی شخصیت اور فن کے متنوع پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ صدیوں سے عورت سماجی ناانصافی، ظلم و تشدد کی چکی میں پستی رہی ہے اور کبھی اسے کھل کر اپنے جذبات، احساسات اور مسائل کے اظہار کا موقع نہیں دیا گیا۔ لیکن جوں جوں تاریکیاں مٹتی گئیں، زمانے نے نئے انداز نے، پیرہن اختیار کئے۔ تاریک اور فرسودہ

ایات سے انحراف کرکے نئی روائتیں بنائیں۔ نئے اقدار
لیل دیئے تو عورتوں کے مسائل پر لوگوں نے توجہ دینی
روع کردی۔ قاسم امین جیسا عورتوں کا مسیحا مشرق میں
پیدا ہوا اور "عورتوں کی آزادی" نامی کتاب لکھ کر خواتین اور
نسوانی طبقے کو نئی آگہی اور نیا شعور بخشا۔ نذر سجاد حیدر اور
اب امتیاز علی نے عورتوں کے حقوق کے لئے جدو جہد کی۔
رد انبساط کی آزادی نے عورتوں کو حوصلہ دیا۔ تو عورتوں
ساتھ سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کو جب عورتوں
دیکھا تو باغیانہ جذبے کے ساتھ سماج کے فرسودہ قدریں
رد کیں۔ جنس زدہ ماحول، ناانصافی، ظلم اور سماجی تشدد
قیر نسواں اور ان جیسی کیفیات سے عورتیں نہ گذرتیں
امرتا پریتم، کرشنا سوبتی، ششی بھاڈی، عصمت چغتائی،
ہمیدہ ریاض نہ پیدا ہوتیں۔ اور پھر یہ خواتین فن کار اپنی
انفرادیت اور حق خود ارادیت کے لئے آواز اٹھانے پر
مجبور نہ ہوتیں۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ساجدہ
زیدی بھی ہیں۔ جن کی شاعری کو Feminist - Per-
spectives - ہی میں دیکھنا چاہئے۔ اور آپ نے ان کے
نام ایک خصوصی شمارہ معنون کرکے گویا استحصال نسواں کے
خلاف ایک آواز اٹھائی ہے اور جدو جہد کرنے والی خواتین
فن کاروں کی حمایت کی ہے۔

مجلد میں شامل مضمون "پروفیسر ساجدہ زیدی۔
تعارف" (تارا چرن رستوگی) بہت وقیع ہے گو کہ ان کی ایک
بری عادت یہ ہے کہ بات مجروح سلطان پوری کی ہو، ذکر
فضا ابن فیضی کا ہو، سلسلہ گفتگو خلیق انجم سے متعلق ہو
بات اقبال کی شاعری تک جا پہنچتی ہے۔ اس مضمون میں
ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ ذکر اقبال سے ان کا شاید ہی کوئی
مضمون خالی ہو۔ اقبال بقید حیات ہوتے تو ان کے ممنون
ہوتے کہ کسی نہ کسی بہانے ان کا ذکر تو محفل میں ہے۔

منصور سبزواری کا مضمون (آتش سیال۔ ایک جائزہ)
بھی داد طلب ہے۔ انہوں نے آتش سیال کا عمدہ تجزیہ کیا ہے
اور ساجدہ زیدی کے باغیانہ افکار و احتجاجی لب و لہجہ کے
تعلق سے بہت ہی وقیع باتیں لکھی ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے
ہوئے بہت ہی خوبصورت جملوں نے جہاں لطف دیا وہیں
معانی کے در بھی کھول دیئے۔

علیم اللہ حالی صاحب ان کے دو شعری مجموعے "آتش
سیال" اور "سیل وجود" کی روشنی میں ساجدہ زیدی کی شاعری
میں تانیثی تحریک کے پہلو کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔
حالی صاحب کی اس رائے سے مجھے اختلاف ہے کہ "اچھی شاعری
عام قارئین کے لئے نہیں ہوتی۔ اس لئے ساجدہ زیدی کے
مخاطب بھی مخصوص ہیں۔" یہ انداز فکر پوری ادبی روایت کی
توہین ہے اور شاعرانہ حقائق سے اغماض برتنے کی ایک کوشش
اچھی شاعری تمام لوگوں کے لئے ہے بلکہ اچھی شاعری تو کہی ہی جاتی
ہے اس لئے کہ اس سے سبھی لوگ روشنی حاصل کریں۔ اس
کے لئے مخصوص سانچے میں ڈھلے ہوئے لوگ نہیں ہوتے ہیں۔

سید احمد قادری نے اپنے مضمون (ساجدہ زیدی کی
نظم نگاری) میں بالکل یہ بات لکھی ہے کہ ساجدہ
زیدی نے "اردو نظم نگاری کو اپنے گہرے مطالعے، عمیق مشاہدے
اور شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ نئی سمت، نیا لب و لہجہ، زندگی
کا فلسفہ اور اس کی حقیقت کو اپنے پر وقار انداز میں پیش
کیا ہے۔"

ساجدہ زیدی سے ایک ملاقات (فیاض نعمانی) میں اس
بات سے متفق نہیں کہ مارکسی نظریہ سے وابستگی یا انسلاک
اور اعلیٰ تعلیم کا حصول مشرقی تہذیب کی راہ میں رکاوٹ ہے
دراصل یہ ہماری خام خیالی ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے الگ
الگ طور طریقے بنائے ہوئے ہے۔ بہت سی کم پڑھی لکھی
بھی مغربی تہذیب کو اپنانے میں سب سے آگے رہتی ہیں۔

ساجدہ زیدی کی تینوں غزلیں بے حد پسند آئیں اور ان کا مضمون "تخلیق شعر کی نفسیاتی تعبیر" بھی شعراء اور نفسیات کے طالب علموں کے لئے بھی انتہائی مفید ہے۔ بہتر ہوتا کیلون کی کتاب "شخصیت کے نظریات" سے بھی ایک دو تراجم سہیل میں شامل کرتے۔

مجموعی طور پر آپ نے بہت اچھا شمارہ نکالا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

▲ حقانی القاسمی (علی گڑھ)

◯ سہیل (شمارہ ۳ جلد ۲ ۵) ملا۔ شکریہ

نمود کے تحت آپ کا اداریہ مختصر مگر اہم مسئلہ اٹھائے ہوئے ہے۔ بہار کی موجودہ حکومت کو چاہئے کہ اگر وہ واقعی اردو کے لئے کچھ کرنے کے لئے سنجیدہ ہے تو وہ بہار کے تعلیمی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر نظر کرے اور اس کے حل کی جانب عملاً پیش رفت کرے۔

سید علی مظفر صاحب کے "پراگندہ طبع لوگ" کا سلسلہ پسند آیا۔ امید ہے یہ سلسلہ باقی رہے گا۔

"ہم مسافر جہاں جہاں گزرے" کے تحت حالی صاحب کے سفرنامہ پاکستان کا نواں پڑاؤ حالی صاحب سے لئے گئے انٹرویو کی شکل میں ہے۔ اس انٹرویو کو خود رعنا اقبال کے ذریعہ شائع کرانا چاہئے تھا۔ اور غالباً پاکستان میں شائع بھی ہو چکا ہوگا۔

قیصر عثمانی نمبر، ساجدہ زیدی نمبر کے بعد اب رضا اشک نمبر کا اعلان نظر سے گزرا۔ ظاہر ہے یہ نمبر بھی ہر نمبر کی طرح صرف "خوبیاں ہی خوبیاں" لئے ہوگا۔ کیوں کہ اردو ادباء و شعراء کے یہاں تو کمزوریاں ہوتی ہی نہیں (کم از کم نمبر یا گوشہ نکالنے والے کی نظر میں) رضا اشک کی شاعری خیال و مزاج کے اعتبار سے عمدہ شاعری کا نمونہ ہے۔ اگر رضا اشک صاحب اظہار فن کے پہلو پر بھی سنجیدگی سے محنت کریں تو ان کا نام اچھے ہی نہیں بہت ہی اچھے شعراء میں ہوگا۔ اور سرفہرست۔ ڈاکٹر اختر بستوی کی چار نظمیں اور دو غزلیں پڑھیں۔ اختر بستوی صاحب نے پابند نظم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے جس طرح اختصار کا جامہ پہنایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ موجودہ دور میں پابند نظموں کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ غزل کی طرح خوبصورت لگے، ایک بہت مشکل کام ہے۔ اختر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ یہ مشکل کام کر رہے ہیں۔

بقیہ غزلیں بھی اچھی ہیں۔ لیکن خوب سے خوب تر کا تقاضہ کرتی ہیں۔

مشرف عالم ذوقی صاحب کے ناول "مسلمان" کی تیسری قسط پڑھی۔ ایک فکر انگیز موضوع پر ذوقی نے فنکارانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ پتہ نہیں اگلی قسطوں میں وہ کیا کیا رنگ دکھاتے ہیں۔ لیکن امید ہے کہ یہ رنگ دیرپا اور خوشنما ہوگا۔ میں عام طور پر قسط وار افسانے یا ناول نہیں پڑھتا۔ "مسلمان" کی ہر قسط کم از کم چھ صفحات پر مشتمل کیجئے تاکہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے کا موقع ملے۔

▲ عطا عابدی

◯ سہیل ملتا رہتا ہے۔ تمہارے اداریئے آپ اپنی پہچان ہوتے ہیں۔ کم الفاظ میں بڑے سے بڑے معنوی پھیلاؤ کو سمیٹ لینا اور اختصاریئے کو کلمہ بنا دینا اپنی جگہ ایک عظیم فنکارانہ مشاقی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، اصغر علی انجینیئر، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، جناب قیوم خضر، ڈاکٹر محمد مثنیٰ اور جناب سید احمد قادری کو اکثر میں نے پڑھا ہے اور اب سہیل میں بھی پڑھتا ہوں، یہ حضرات سہیل کی ضمانت اور تعمیر اردو

(بقیہ صفحہ ۲۱۴ پر)

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ★ بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
▲ کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ▲

فہرست

شمارہ ۶ جلد ۵۲

بدل اشتراک

فی شمارہ .... ۵/= روپے
زر سالانہ .... ۵۰/= روپے
لائف ممبری .... ۵۵۱/= روپے

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل
ریورسائیڈ روڈ گیا

فون نمبر ۲۱۵۷۳

انکم ٹیکس سے چھٹکارا پانے کے آسان طریقے

نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ / اٹھویں برگم

- مولیئے ورگ :- سبھی ڈاک گھروں میں 100 ، 500 ، 1000 ، 5000 اور 10,000 روپے کی دستیابی
- سود کی شرح :- بارہ فی صد سالانہ در سے چکرورددھی سود ہر چھ ماہی کے حساب سے پری پکوتا پر دیتا ہے
- ٹیکس راحت :- ان میں لگائی گئی رقم پر انکم ٹیکس قانون کے دفعہ 88 کے تحت چھوٹ۔ سالانہ جمع سود جو کہ پوری نیویشت سمجھا جاتا ہے یہ بھی انکم ٹیکس قانون کے دفعہ 88 میں چھوٹ کے قابل ہے۔

نیشنل سیونگ اسکیم - 1987

- نیویش :- سبھی اہم اور چنے ڈاک گھروں میں کم از کم 100 روپے سے کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔ ایک مالی سال میں زیادہ سے زیادہ 40,000 روپے نیویش کر سکتے ہیں
- سود :- گیارہ فی صد ہر سال دستیاب ہے۔ ● نکاسی :- تین مالی سال کے بعد نکاسی کر سکتے ہیں۔

پندرہ سالہ بھوشیہ نیدھی کھاتہ

- نیویش :- کم از کم 100 روپے سے کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔ ایک مالی سال میں زیادہ سے زیادہ 60,000 ہزار روپے نیویش کر سکتے ہیں
- سود :- بارہ فی صد ہر سال کمپاؤنڈ
- ٹیکس راحت :- انکم ٹیکس قانون کی دفعہ 88 کے تحت چھوٹ دستیاب ہے۔ کورٹ اٹیچمنٹ سے بری
- نکاسی :- چھ سالوں کے بعد نکاسی کر سکتے ہیں۔ تین سال کے بعد قرض لینے کی سہولت

دستخط :- ارون جھا ، ڈائرکٹر

نیشنل سیونگس ، فینانس ڈیپارٹمنٹ ، بہار ، (پٹنہ)

PRD - 67 ہ/ (ہ - 37) 92-93

نوٹ

عاشور کاظمی کا پیغام

ارباب فکر کے نام

کچھ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ سوویت یونین کے انتشار سے اشتراکیت کی موت ہو چکی ہے۔ اور ایسے بھولے بھالے لوگ بھی ہیں جو تخلیقی تحرک کے لئے کسی دوسرے فلسفہ حیات کی دعوت دیتے ہیں۔ انہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ اشتراکیت ایک نقطۂ نظر اور طریقۂ فکر کا نام ہے اور دنیا میں یہ ہنوز جاری وساری نہیں بلکہ دور رس نتائج پیدا کر رہی ہے۔ حکومتوں کے زوال وقیام سے اس کا لازمی تعلق نہیں ہے۔

اس فکری دو جملے میں صاحبانِ فکر کے پاس ایک واضح وشفاف نقطۂ نظر کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ تخلیقی عمل کا اس سے براہ راست تعلق ہے۔ ترقی پسندی کا وسیع تر خطہ ایک طرف اگر اشتراکیت سے ملتا ہے تو دوسری طرف اس میں ناپیدا کنار وسعت بھی ہے۔ ہمیں اس وسعت کا اندازہ لگانا چاہئے اور حالیہ صورتحال میں "تازہ کار" تازہ دم اور مطلق ہو کر نظریات کی افادیت اور ان کے اثرات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

لندن سے جناب عاشور کاظمی نے متعدد ارباب نظر کے پاس ایک گشتی مراسلہ روانہ کیا ہے اور موجودہ حالات و آثار کے تحت شعر وادب کے فکری منظر نامے کو مرتب کرنے کے لئے رائیں طلب کی ہیں۔ ہم ان کا یہ مکتوب (جو ہمارے ادارے کے رکن پروفیسر علیم اللہ حالی کے نام آیا ہے) من وعن شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین سہیل اپنی قیمتی آرا سے ہمیں نوازیں ——— ہم ان کے تمام مباحث کو جناب عاشور کاظمی کے پاس روانہ کر دیں گے تاکہ وہ آئندہ منعقد ہونے والے کانفرنس میں مزید غور وخوض کے لئے انہیں مندوبین کے سامنے پیش کر سکیں۔

——— مسعود منظر

Institute of Third World Art & Literature
16 Winderermere Road London W3 4TD

قابلِ احترام پروفیسر علیم اللہ حالی صاحب ۔ تسلیم و تعظیم

ادب میں ارتقا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بھی سچا (GENUINE) ادیب شعوری طور پر اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اس طرح ہر دور میں سچے اور کھرے قلم کاروں کا تخلیق کردہ ادب اس دور کی پہچان ہوتا ہے ...... اپنے عہد میں ہم اگرچہ اس بات پر دست و گریبان بھی رہے ہیں کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیئے یا ادب برائے زندگی .... مگر حقیقت یہ ہے کہ بوجوہ ادب برائے زندگی کی تحریک سے اختلاف کرنے والوں میں بھی جو صحیح معنوں میں قلم کار تھے انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کا ادراک کیا اور اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار کیا۔۔

ہماری اس چھوٹی سی دنیا میں پچھلے دنوں تک دو واضح طاقتیں تھیں جو پوری دنیا کو اپنے زیر نگیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ جس سے ہر ذی فہم پر اس کے دو اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ایک تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ ہر وقت ایک بھیانک جنگ کا خطرہ منڈلاتا رہتا تھا اور ہر صاحب فہم ایک اعصاب شکن تناؤ کا شکار رہتا تھا۔ اور اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ دنیا میں ایک CHECK & BALANCE کا نظام خودبخود قائم ہو گیا تھا .... لیکن حال ہی میں جب " اک گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے " تو خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ اس جشن میں وہ بھی شریک تھے جن کو کامرانی نصیب ہوئی تھی اور وہ بھی جن کے گھروں کی طرف شعلے بڑھ رہے تھے۔ اور پھر چند ہی ماہ میں اس بات کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے کہ یہ تبدیلی دنیا میں طاقت کے کسی ایک عفریت کو جنم دے سکتی ہے۔

اب یہ بحث بیکار ہے کہ کون حق پر تھا اور کون نہیں۔ اب تو یہ سوچنا ہے کہ دنیا کے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ آنیوالی کل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاید وقت لنگڑے پاؤں چل پڑا ہے اور وہاں لے جا رہا ہے جہاں بڑے بڑے طالع آزما دنیا کی حکمرانی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ لہٰذا اب ادیبوں کی ذمہ داری ہے کہ اس نازک وقت میں اپنا دانشورانہ کردار ادا کریں اور انسان کو خبردار کریں کہ نیا عالمی نظام کسی ہلاکو یا چنگیز خان کو جنم دے سکتا ہے۔

آج کا عام انسان خوش ہے کہ سرد جنگ ختم ہو گئی۔ اسلحہ کی دوڑ ختم ہو گئی، نو آبادیاتی نظام ختم ہو گیا۔ مگر اب یہ دانشوروں کو سوچنا ہے اور اور دنیا کو سمجھانا ہے کہ کیا واقعی اسلحہ کی دوڑ ختم ہو گئی ہے، کیا ان ملکوں میں اسلحہ سازی بند ہو گئی ہے جن کی معیشت کا دار و مدار اسلحہ سازی پر ہے اور اسلحہ کی فروخت میں مفروضہ کمی کے خوف سے "ترقی یافتہ" ملکوں میں جو RECESSION آگیا ہے کہیں اس کا یہ حل تو تلاش نہیں کیا جائے گا کہ تیسری دنیا کے ممالک یکے بعد دیگرے اسلحہ خرچ کرنے کے لئے منتخب کئے جاتے رہیں۔ کہیں نو آبادیاتی نظام اس لئے تو غیر ضروری نہیں ہو گیا کہ اب اس نظام کو برقرار رکھنے کے لئے کسی ملک پر براہ راست قبضہ ضروری نہیں بلکہ پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں وہیں کے باشندوں میں ظالم و مظلوم اور حاکم و محکوم پیدا کر کے عوام کو مقامی حاکموں کا دست نگر اور ان حاکموں کو اپنا محتاج بنا لینا کافی ہے۔ پس اب اہل قلم کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ بے حسی کے سمندروں میں اتر جانا پسند کریں گے یا ایسی دنیا ترتیب دینے کے لئے اپنا کردار ادا کریں گے۔ جہاں کوئی کسی کا حاکم مطلق نہ بننے پائے..... بظاہر یہ بات چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مترادف ہے مگر اہل قلم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ قلم اور حرف ایٹمی طاقت سے زیادہ طاقتور اور انقلاب انگیز ثابت ہو سکتے ہیں..... آیئے اس نازک موقعے پر اپنے سب اختلافات بھلا کر کچھ سوچیں اور کچھ کریں۔

ہمارا خیال ہے کہ اس سوچ بچار اور لائحہ عمل بنانے کے لئے لندن میں ایک بین الاقوامی اجتماع کیا جائے..... اس کی آسان صورت یہ تھی کہ ہم (دستور کے مطابق) یہ بھی طے کرتے کہ ایجنڈا کیا ہوگا۔ کون کون سے اہل قلم اس میں شرکت کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ... مگر ہم اس اجتماع کو وسیع تناظر میں اور وسیع تر کینوس پر دیکھ رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر ادیب یہ محسوس کرے کہ وہ اس اجتماع کا میزبان ہے اور اس میں پوری طرح شریک ہے۔ ہم سب کے اعتماد کے سہارے آگے بڑھنا چاہتے ہیں.... چنانچہ سوچا گیا ہے کہ آپ ایسے صاحب الرائے اور صاحب ادراک لکھنے والوں سے درخواست کی جائے کہ سب سے پہلے آپ اپنے علاقے میں سب ادیبوں کو جمع کریں۔ درپیش عالمی مسائل پر بحث کریں اور متفقہ طور پر کچھ ایسے سوالات ترتیب دیں جن پر آپ حضرات کی رائے کے مطابق" لندن کے اجتماع میں" بحث ضروری ہو۔

لندن کا یہ اجتماع ایک طرح سے نئے بین الاقوامی سیاق و سباق میں ایک تحریک کی صورت اختیار کرے گا... لہٰذا ہم اس کی ابتدا سے لے کر آخر تک کی تمام کارروائیاں کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس آپ جو اجتماع کریں اس کی مکمل کارروائی یعنی صرف قرار دادیں یا مقامی فیصلے ہی نہیں بلکہ مثبت و منفی بحث کی ساری تفصیلات، شرکاء کے اسمائے گرامی معہ تصاویر ہمیں جلد از جلد ارسال فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ کانفرنس کے ریکارڈ پر آسکے۔

اس قسم کا ریکارڈ اردو دنیا کے مختلف علاقوں سے موصول ہوتے ہی لندن کے اجتماع کی تاریخوں کا اعلان کر دیا جائے گا۔ فی الحال اس بات کی کوشش کی جا رہی کہ یہ اجتماع نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں منعقد ہو سکے لیکن اس بات کا انحصار اہل قلم یعنی آپ کے تعاون پر ہے۔ یہ بات ابھی سے واضح کرنی ضروری ہے کہ لندن کے اجتماع کے خیال سے

پس منظر میں کسی ملک یا مالی ادارے کی سرپرستی نہیں ہے اور نہ چندے کی کوئی مہم پیش نظر ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اس اجتماع کے میزبان آپ سب اہل قلم ہیں۔ اس لئے یوں سوچا گیا ہے کہ جو اہل قلم اس اجتماع میں شریک نہیں ہو سکیں گے ان کے خیالات، قیمتی مشورے اور ان کے جذبات، حمایت و یکجہتی، مقامی اجتماعات کی کارروائیوں کی شکل میں شائع بھی ہوں اور لندن کے اجتماع کی کارروائی کا حصہ بھی بنیں ....

لہٰذا آپ سے ایک بار پھر التماس ہے کہ بدلتی عالمی قدروں کے حوالے سے ایک جدوجہد کی ابتدا میں ہماری سرپرستی کریں اور جلد از جلد نہ صرف یہ کہ مذکورہ بالا مواد ہمیں فراہم کریں بلکہ اپنی ذاتی تجاویز سے بھی نوازیں۔

آپ اگر کسی سبب کسی مقامی محفل میں نہ بھی شریک ہو سکیں تو ایسی صورت میں آپ کی ذاتی رائے، تجاویز، تائید اور حمایت بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہوگی۔

نیک تمناؤں اور بھرپور عزائم کے ساتھ

آپ کی توجہ اور تعاون کا طالب

سید عاشور کاظمی

کل ہند افسانوی انعامی مقابلہ

ڈیڑھ ہزار کا پہلا انعام

قارئین کے مسلسل اصرار اور گزارش کے بعد مجاہد اسلام کمیٹی، برہم پورہ، مظفرپور، نے کل ہند افسانوی انعامی مقابلے کی (آخ)ری تاریخ میں توسیع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اب افسانہ داخلہ فیس کے ساتھ ۱۲ر مئی ۹۲ء کے بجائے ۹ر اکتوبر ۹۲ء (تک) وصول کئے جائیں گے۔

اس انعامی مقابلے میں ڈیڑھ ہزار روپے، بارہ سو روپے اور ایک ہزار روپے کے علاوہ دس دوسرے منتخب افسانوں پر ایک سو روپے کے خصوصی انعامات اور سرٹیفیکٹ بھی دیئے جائیں گے۔ انعامات کا فیصلہ ملک کے معروف ادیبوں پر مشتمل ایک پینل کرے گا۔ اور تمام منتخب افسانوں کو علاحدہ سے کتابی شکل میں ادارہ شائع کرے گا۔

مقابلے میں شرکت کے لئے فی افسانہ پچیس روپے داخلہ فیس ہے، جسے 'شاہد جمال' سکریٹری مجاہد اسلام کمیٹی (قا)دری منزل، برہم پورہ، مظفرپور (بہار) کے نام منی آرڈر سے ارسال کیا جانا چاہئے۔

افسانے کاغذ کے ایک جانب تحریر ہوں اور غیر مطبوعہ ہوں۔ رسید یا جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ (ا)رسال کریں۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے آخری ہفتے میں ایک بڑے ادبی جلسے میں انعامات تقسیم کے جائیں گے۔

شاہد جمال ـــــ سکریٹری، مجاہد اسلام کمیٹی

قادری منزل، برہم پورہ، مظفرپور (بہار)

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

تقابلی ادبیات پر گوپی چند نارنگ کی تصنیف
ایک مطالعہ

تقابلی ادبیات (COMPARATIVE - LITERATO. کی اصطلاح اردو میں مروج تو ہے مگر تقابلی ادبیات کیا ہے اور جواب بحیثیت پروان چڑھ چکی ہے۔ اس موضوع پر ہنوز کوئی روشنی الی گئی ہے۔ تقابلی ادبیات بہ طور ایک مخصوص متعدد یونیورسٹیوں میں قائم ہو چکا ہے۔ مثال کے آگرہ میں کنہیا لال منشی ودیاپیٹھ میں بھی یہ شعبہ ہاں ہندی، بنگالی، گجراتی، مہاراشٹرین، تامل، وغیرہ کے ادبیات کا محققانہ مطالعہ کیا جاتا ہندی کا کسی ہندوستانی زبان کے ساتھ تقابلی ہ آسان کام نہیں ہے۔ کیوں کہ ایسے اساتذہ اور و ہندی کے ساتھ کسی اور زبان پر پوری دسترس ہوں بہت کم ہی ہو سکتے ہیں لہذا انگریزی میں ان ں پر لکھی گئی کتابوں کا سہارا لینا ناگزیر ہوتا آج کل ہندی زبان و ادب پر بے شمار انگریزی تصانیف دستیاب ہیں جو دوسری زبانوں میں کام کرنے والوں کو ضروری مواد و مواخذ فراہم کر رہی ہیں۔ بنگال کی یونیورسٹیوں بالخصوص کلکتہ یونیورسٹی و شوبھارتی وغیرہ میں تقابلی ادبیات کا شعبہ خصوصی اہمیت کا حامل ہو چکا ہے۔ مگر اردو ادبیات کی انگریزی تصانیف میں پیشکش ابھی تک بھرپور انداز سے نہیں ہو سکی ہے۔ لے دے کے درج ذیل کتب Ram Babu Saxena :- A HISTORY OF URDU LITERATURE

M. M. Sidiq :- A HISTORY OF URDU LITERATURE. ہمارے سامنے ہیں۔ مزید برآں ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ نے اردو ادبیات پر متعدد مطبوعات پیش کی ہیں۔ بایں ہمہ، جو ہونا چاہئے یا ہو جانا چاہئے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ اس ضرورت کو گوپی چند نارنگ نے محسوس کیا اور اسی لئے وہ وقتاً فوقتاً اردو موضوعات پر انگریزی میں بھی مضامین پیش

کرتے رہے۔

موصوف جو وسکونسن اور میڈیسن یونیورسٹیوں میں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر دو بار کام کر چکے ہیں اور متعدد بار لندن، پریگ، ٹورنٹو، کیلیفورنیا، شکاگو، کارنیل، کولمبیا، اریزونا اور فلاڈلفیا یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کئے گئے۔ نارنگ صاحب مشکلات سے آشنا ہیں جو غیر اردو داں حلقوں کو پیش آتی ہیں۔ لہٰذا ان کو خطاب کرنے کے لئے ان کی ضرورت کو پیش نظر رکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ نارنگ صاحب نے اردو زبان و ادب میں جو خطابات پیش کئے گئے ہیں ان ہی پر مشتمل ایک کتاب شائع کرانے کا جو تصور کیا ہے وہ فی الواقع بہت مستحسن ہے یہ کتاب موسوم بہ

URDU LANGUAGE AND LITERATURE
CRITICAL PERSPECTIVES

یعنی "اردو زبان و ادب — تجزیاتی تناظرات" بہت افادیت و اہمیت کا حامل ہے۔ چار حصوں میں منقسم اس کتاب میں درج ذیل ۱۵ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(۱) غالب اور ۱۸۵۷ء کا غدر
(۲) اردو شاعری پر تصوف کا اثر
(۳) کلیات سودا کا پرنسٹن (PRINCETON) مسودہ
(۴) اردو مثنویوں کے سماجی و ثقافتی پہلو
(۵) ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو شاعری
(۶) شعر اقبال کا صوتی تنظیم
(۷) فراق کی شاعری، روایت و اختراع
(۸) فیض احمد فیض، روایت و اختراع
(۹) دور حاضرہ کی اردو شاعری، ہندوستانی منظر میں
(۱۰) اردو افسانہ نگاری۔ خاص رجحانات
(۱۱) راجندر سنگھ بیدی کی فنکاری میں استعاراتی نیز اساطیری سرچشمے
(۱۲) نیا اردو افسانہ، علامتی اور تمثیلی اختراعات
(۱۳) کرشن چندر، ایک تاثر
(۱۴) سہ لسانی فارمولا اور اردو
(۱۵) رسم الخط، متعدد ثقافتی اعتبار سے، عربی، فارسی رسم الخط اردو کے اعتبار سے

درج فوق موضوعات پر فی الواقع انگریزی اور دوسری زبانوں میں کتابیں ہنوز اشاعت پذیر نہیں ہوئی ہیں — بنگالی، ہندی، تامل وغیرہ زبانوں پر انگریزی میں بے شمار کتابیں دستیاب ہیں مگر اردو حلقوں نے ہنوز اس جانب توجہ ہی نہیں دی ہے۔ خلیل جبران عربی کے شاعر و ادیب تھے مگر ان کی تصانیف دنیا بھر کی زبانوں کے ترجموں میں ملتی ہیں۔ غالب پر انگریزی میں متعدد تصانیف ملتی ہیں اور ہندوستانی زبانوں میں بھی غالب پر کتابیں دستیاب ہیں۔ ذکر غالب کو اگر ۱۸۵۷ء کے غدر کے تناظر میں پیش نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہتی ہے اور اس ضرورت کا احساس نارنگ صاحب جو تقابلی ادبیات کے خدوخال سمجھتے ہیں ہونا ہی تھا۔ اقبال کی شاعری پر انگریزی میں بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف ہی ابھی تک دو تصانیف پیش کر چکا ہے۔

WESTERN INFLUENCE IN IQBAL

IQBAL IN FINAL COUNTDOWN

مگر یہ حقیقت ہے کہ شعر اقبال کا صوتی تجزیہ نہیں ہوا تھا اور اس کمی کو پورا کرنے کا سہرا نارنگ ہی کے سر ہے۔

اصغر علی انجینئر

پریم چند کی سیاسی زندگی

قسط ۶

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہندوستان
لئے بڑا ہنگامی دور تھا۔ انگریزی سامراج کے لئے اب نئے
نج پیدا ہو رہے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی
تک انگریزی حکومت سے درخواستوں کے ذریعہ ہندوستانی
یا کے لئے سہولتیں حاصل کرنے کی رہی تھی۔ لیکن اب نئی
ی محض چند سہولتوں سے مطمئن ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔
ں پیڑھی میں قومی حمیت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور قومی
دی کے لئے تڑپ بھی ـــ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے
لے دہے میں ہی بنگال اور کچھ دوسرے علاقوں میں چند
ہوانوں نے خفیہ دہشت پسند گروہ بنا لئے تھے جن کا
مانہ انگریز حکمراں طبقے کے اراکین ہوتے تھے۔ خود انڈین
شنل کانگریس کے افق پر بھی اب زیادہ گرمجوشی اور
لجو پالیسی پر زور دینے والے رہنما پیدا ہو رہے تھے
ن کی نمائندگی تلک کر رہے تھے۔ کانگریس میں لیڈر
پ کا یہ گروہ نرم اور محض درخواست کرنے والی پالیسی
ختی سے مخالفت کر رہا تھا۔ مزدور اور محنت کش طبقوں
میں بھی بے چینی کی لہر پیدا ہو چلی تھی اور ظاہر ہے ان نچلے
طبقوں کی نمائندگی وہی کر سکتا تھا جو انگریز حکمرانوں سے
لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تلک اس دور
میں ہندوستان کے سیاسی افق پر آندھی کی طرح چھا گئے۔
تلک پر انگریز حکومت نے بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا
اور پہلے انہیں ڈیڑھ سال کی قید با مشقت کی سزا ہوئی
(لیکن کچھ لوگوں کی درخواست پر انہیں ایک سال کے بعد
رہا کر دیا گیا) اور بعد میں ۱۹۰۸ء میں انہیں جلا وطن کر کے
مانڈلے بھیج گیا۔ قوم پرست تلک کے خلاف انگریزوں کے
اس ظالمانہ رویئے نے سارے ہندوستان میں جیسے آگ
لگا دی۔ مزدوروں نے بھی احتجاجاً ہڑتال کر کے اپنی سیاسی
بیداری کا ثبوت دیا۔

تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات نے کانگریس میں
دو گروہ پیدا کر دیئے۔ ایک گروہ جس کی رہنمائی گوپال کرشن
گوکھلے کر رہے تھے نرم دل کہلاتا تھا اور دوسرا گروہ جس
کی رہنمائی تلک کر رہے تھے گرم دل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

لک کے اکثر نوجوانوں کی ہمدردی ظاہر ہے۔ موخرالذکر گروہ
کے ساتھ تھی۔ کیونکہ یہی گروہ ان کے سیاسی جذبات
کی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ بھلا ایسے حالات میں پریم چند کیسے
لک کی سیاست سے الگ رہ سکتے تھے۔ ان کے د ل میں
بھی وطن عزیز کی آزادی کے جذبات موجزن تھے۔ یہ صحیح
ہے کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور اپنے جذبات کے اظہار
میں وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ پھر بھی اپنے
قلم کے زور سے اور تخلیقی ادب کے ذریعہ انہوں نے صدق
دل سے اپنے حب وطن کا ثبوت دیا اور نتیجے میں جیسا کہ
ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، ان کی کہانیوں کا مجموعہ "سوز وطن"
انگریز سرکار نے ضبط کر لیا اور نوجوان قلم کار کو آئندہ
ایسی کہانیاں نہ لکھنے کی سخت تنبیہ کی گئی۔ لیکن منشی جی
ڈرے نہیں اور نام بدل کر اپنا زور قلم دکھاتے رہے۔ اور
اپنے جذبات کی عکاسی کرتے رہے۔

پریم چند کا جھکاؤ بھی نرم دل کے مقابلے گرم دل
کی طرف تھا اور وہ تلک کا بڑا احترام کرتے تھے۔ نگم صاحب،
جو ان کے بڑے عزیز دوست تھے، نے خود اس کی گواہی دی
ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "پریم چند نابرابر کی لڑائی میں سمجھوتے
کے خیال کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی
جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوگا اور وہ اس کے لئے عوام
کو جلد سے جلد تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ
حکومت سے سخت ٹکر لئے بغیر کام نہ چلے گا۔۔۔۔" امرت
رائے بھی لکھتے ہیں کہ کانگریس کے اندر تلک کا اندولن روز
بروز منشی جی کے من کو باغی بناتا جا رہا تھا۔ اور جب ۱۱ر
اگست ۱۹۰۸ء کو خودی رام کو پھانسی ہو گئی تو ان کے دل
سے سمجھوتے کی بات، کسی طرح کے سمجھوتے کی بات، ہمیشہ کے لئے
رخصت ہو گئی۔ اس دن کے بعد سے ان کے اور سرکار کے بیچ
خودی رام کی لاش تھی۔" چنانچہ اس دور کی کہانیوں میں ہمیں

اکثر بہادری، قوم پرستی اور ایثار کے جذبات ملتے ہیں۔
جب اپنی کہانیوں کو ترتیب دینا چاہتے ہیں تو انہیں عنو
بھی ایسے ہی سوجھتے ہیں۔ چنانچہ مہوبا سے اپنے ایک
میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔ "ترتیب کیوں کر دوں
ابواب کی صورت میں نہیں آتے ورنہ میں نے چاہا تھا کہ شہ
خودداری، ایثار وغیرہ کے عنوان سے ترتیب دوں"

وطن کی آزادی پریم چند کے لئے اپنی زندگی کا اعلیٰ
مقصد تھا۔ انہوں نے اپنا قلم اسی مقصد کے لئے وقف
کر دیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں پنڈت بنارسی داس چترویدی
کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "میری تمنائیں کچھ نہیں ہیں۔ اس وق
سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ ہم آزادی کی لڑائی میں فتحیاب
ہوں۔ دولت یا کامیابی کی آرزو مجھے نہیں رہی۔ کھانے
کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں
ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھوں
لیکن ان کا مقصد بھی سوراجیہ کا جیت ہو۔۔۔ میں مٹ ن
سے بیٹھنا بھی نہیں چاہتا، ادب اور سودیش کے لئے کچھ نہ
کرتے رہنا چاہتا ہوں۔" اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند
نے اپنی فکر اور اپنی تحریروں کو وطن عزیز کی آزادی کے
وقف کر دینا ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا
تھا۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے درمیانی عرصے تک
وہ ایک ادیب اور کہانی کار کی حیثیت سے خاصی شہرت
حاصل کر چکے تھے اور وہ چاہتے تو بڑے آرام سے ا
باقاعدہ زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن اس کے لئے انہیں ایسے
لوگوں سے سمجھوتہ کرنا پڑتا جو انگریز سرکار کے وفادار تھے
اور ملک کی آزادی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب
مہاراجہ الور کی طرف سے انہیں یہ پیش کش کی گئی کہ اگر وہ ا
کی ملازمت قبول کر لیں تو انہیں چار سو روپے مشاہرہ ملے گا
رہنے کو بنگلہ اور موٹر اور معقول آمدنی تاکہ اطمینان سے و

رسکے اپنی تخلیق اور تحریر کا پریم چند بھی یہ راستہ اختیار
سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنے اصولوں کا خون کر کے اپنے
ں گزارنا نہیں چاہتے تھے۔ راجے مہاراجے آخر انگریزوں
وفادار تھے۔ ان کی حکومت کے ستون تھے۔ وہ ایسے ہی
ستون کا سہارا لے کر کیسے جینا گوارا کر سکتے تھے؟

آزادی کی تحریک میں دل و جان سے کون شریک ہیں
لوں نہیں اس کے متعلق پریم چند کا ذہن بالکل صاف
۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ان کے طبقاتی مفاد
اچھی طرح واقف تھے۔ رائے بہادر، خان بہادر، نواب
راجے اپنے طبقاتی مفاد کی حفاظت کی خاطر انگریزوں
امی تھے۔ ان کی ہمدردی تحریک آزادی سے کس طرح
متی تھی۔ وہ اپنے طبقاتی مفادات کو عوام کی امنگوں پر
بھینٹ چڑھا سکتے تھے۔ پریم چند لکھتے ہیں: "ہاں ہم
انے کو تیار نہیں کہ ہمارے خان بہادران صاحبان،
لی تعداد ایشور کی دیا سے، انگریزوں کے لامحدود،
دی کے باوجود بہت زیادہ نہیں، بیشک ہمارے ساتھ
ہیں۔ خان صاحب نہیں ہیں تو رائے صاحب بھی تو نہیں
۔ یوں کہئے کہ یہ ان لوگوں کی تحریک ہے (تحریک
دی کی طرف اشارہ ہے) جو اپنی تمام تکلیفوں کا حل
ث دیش کی آزادی کو ہی سمجھتے ہیں۔ جو غریب ہیں،
رے ہیں، دلت ہیں یا جو غیرت سے بھرا ہوا، فخر وطن
چمکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر جن کا خون
لنے لگتا ہے کہ کوئی دوسرا ہم پر حکومت کرے۔
ہیں نہ ہندو کی قید ہے نہ مسلمان کی۔" جو شخص ایسے
یزہ جذبات رکھتا ہو، جس کے دل میں وطن کی آزادی
جذبہ اس شان سے موجزن ہو، جو غریب اور کچلے ہوئے
رام سے اس قدر ہمدردی رکھتا ہو۔ بھلا وہ کیوں کر
ابراہیم الور کی پیشکش کو قبول کر سکتا ہے؟ اپنے عیش و
عشرت کے لئے منشی جی ہرگز وطن کی آزادی کا سودا نہیں
کر سکتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب نمک پر ٹیکس لگائے جانے کے خلاف
احتجاج کرنے کے لئے گاندھی جی نے ڈانڈی جاکر نمک بنانے
کی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے "ہنس وانی" میں لکھا۔

"پہلے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مہاتما جی کیا کرنے جا
رہے ہیں۔ مذاق بھی اڑایا گیا۔ ایک گورنر نے اپنے خوشامدی
ٹٹوؤں کو جمع کر کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے اس
سنگرام کو المناک حادثہ بتایا۔ گورنر صاحب کو یہ کیا معلوم
تھا کہ یہ المناک حادثہ دو ہفتے میں ہی آزادی کی ایک زبردست
لہر ثابت ہوگی۔ جسے نوکر شاہی کی ساری منظم قوت بھی
نہ رد کر سکے گی۔ وہ سب کیا گیا جو ایسی حالت میں
ایک خود مختار حکومت کیا کرتی ہے۔ ہمارے لیڈر چن
چن کر جیل بھیج دیئے گئے.... لیکن سوراجیہ کی فوج
کے قدم آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ کہیں نہتی جنتا پر ڈنڈوں
اور گولیوں کی بوچھار ہو رہی ہے، کہیں جنتا میں پھوٹ
ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ فلموں پر روک لگائی جا
رہی ہے، تار کی خبروں کا سنسر ہو رہا ہے..... نہ کوئی
قانون ہے نہ کوئی قاعدہ، نہ نیتی نہ دھرم۔ مگر ہم ان باتوں
کی شکایت نہیں کرتے۔ انہیں بے انصافیوں سے تو ہماری
فتح ہے.... ہم تو مہاتما گاندھی کی سوجھ بوجھ کے قائل ہیں۔
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ نہ جانے کہاں سے نمک
قانون کھوج نکالا کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے دیش میں
آگ لگا دی..... انگریزی حکومت سے پہلے یہ کر کبھی نہ
لگایا گیا تھا۔ آج بھی دنیا بھر میں بھارت ہی ایک ایسا
دیش ہے، جہاں نمک کر لگایا جاتا ہے.. مسلم علماء نے تو
نمک، ہوا اور پانی پر کر لگانا حرام قرار دیا ہے، پر ہم ۱۵۰
برس سے یہ کر دیتے آئے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ جس چیز پہ

دو آنے من لاگت آتی ہے اس پر ۲۰ آنے من کر لیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کر کو اجتماعی شکل میں نہایت آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔ ایسا کوئی زمین کا حصہ نہیں جہاں لونی مٹی نہیں۔ اور شہر اور گاؤں دونوں ہی جگہوں سے آدمی بڑی تعداد میں جمع ہو کر اسے توڑ سکتے ہیں اور سرکاری نمک کو بازار سے نکال باہر کر سکتے ہیں۔"

در اصل نمک ستیہ گرہ کے پیچھے ہندوستانی عوام کا جذبہ آزادی ہی کام کر رہا تھا۔ اگر سینے میں یہ آزادی کی تڑپ نہ ہوتی تو لاکھوں کی تعداد میں اس طرح لوگ اس میں شریک نہ ہوتے۔ پریم چند کے سینے میں بھی یہی تڑپ ہے جو ان کے قلم کو جنبش دیتی ہے اور مہاتما گاندھی کے لئے ان کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ خلافت تحریک اور ترک موالات کی تحریک کا بھی پریم چند نے پورے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ امتیاز علی تاج کو ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں انہوں نے ایک خط میں لکھا: میں بھی ترک موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی آجکل وہی مسائل گونجا کرتے ہیں۔ عدم تعاون اور خلافت تحریک کو ہر طرح سے طاقت ور بنانا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ مضامین لکھے، قصے کہانیاں لکھیں، ناول لکھے۔ جس طرح بھی وہ آزادی کی اپنی تڑپ کو لوگوں تک پہنچا سکتے تھے، پہنچاتے رہے۔ ان کے "میدان عمل" میں جو اگست ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا آزادی کا یہ جذبہ ہمیں پورے شباب پر نظر آتا ہے —— پرکاش چندر گپت لکھتے ہیں "کرم بھومی" (میدان عمل) اپنے انقلابی جوش کی بنا پر اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔ ہر طرف لوگ حرکت میں ہیں، جنہیں ٹوکنے یا روکنے والی طاقت مفقود ہے۔ شہر اور دیہات میں۔ پہاڑوں اور وادیوں میں ایک زلزلہ سا آگیا ہے۔ کوئی جبر و تشدد انہیں نہیں دبا سکتا۔ یہ بغاوت پر آمادہ ہندوستان کی تصویر ہے۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد جیسے ہیرو میدان میں اتر آئے تھے۔ جواہر لال نہرو نے لاہور کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔ میں ریپبلکن اور سوشلسٹ ہوں، "کرم بھومی" میں اس ہلا دینے والے وقت کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے۔ گورکی کی تصنیف "ماں" کی طرح یہ ناول بھی بتاتا ہے کہ انقلاب کس طرح آتا ہے۔"

جب تحریک آزادی زوروں پر تھی تو پریم چند سرکاری نوکری میں گھٹن محسوس کرنے لگے اور ملازمت کی غلامی سے مستعفی ہونے کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ ان کی بیوی شیورانی دیوی بھی اس کے حق میں تھیں۔ عدم تعاون کی تحریک کے درمیان جب استاد اور طالب علم اسکول اور کالج چھوڑ رہے تھے۔ وکیل کچہریوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔ اور سرکاری نوکر اپنے عہدوں سے الگ ہو رہے تھے تو بھلا پریم چند جیسا حساس ادیب کیسے سرکاری نوکری پر قائم رہ سکتا تھا۔ پھر بھی کوئی اور اسرا نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ کچھ دنوں تک شش و پنج کی حالت میں رہے، اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ انہی دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ خود پریم چند نے اس دورے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ کیا شہر کیا دیہات، عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی۔ ایسا مجمع میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما گاندھی جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔" استعفیٰ دینے سے پہلے جب انہوں نے اپنی بیوی سے مشورہ طلب کیا تو فوراً وہ کوئی جواب نہ دے سکیں۔ اس

بدب کا حال خود شیورانی دیوی نے بیان کیا ہے۔

جو الجھن ان کو تھی وہی دو تین دن مجھے بھی ہوئی۔ بھی بار بار یہی خیال ہوتا کہ آخر بی۔ اے کی خواہش ں ہوئی۔ یہی نہ کہ آگے ترقی کو آشا۔ پہلے تو یہ خیال ماکہ یہ کبھی پروفیسر ہو جائیں گے اور جیون کے دن آرام ے کٹیں گے۔ کیونکہ صحت اچھی نہ تھی اور کہاں یہ تجویز جو کچھ ملتا ہے اس کو بھی چھوڑ کر محض ہوا میں اڑا جائے۔ س وقت ان کو کل ملاکر ایک سو پچیس کے قریب ملتا تھا۔ سکول کی نوکری ہونے کی وجہ سے گھر پر بھی کام کرنے کا وقت ں جاتا تھا۔ مجھے بھی اس بات کی الجھن تھی کہ آخر نوکری چھوڑ کریں گے کیا؟ ایک لڑکی اور ایک لڑکا سامنے تھا۔ اور ی بچے ہونے کی امید تھی.... ادھر میری خواہش یہ بھی تی کہ کسی کے پیر کی بیڑی بن کر رہوں..... یہ نہیں کہ پیوں کی قیمت میری آنکھوں میں کم تھی۔ ایک تو اپنی رورت کو دیکھتے ہوئے، خود بھی بہت دنوں سے بیمار، گھر نہ دوار۔ ان سب باتوں کو سوچ کر یہی دل میں آتا اکہ ان کو نوکری چھوڑنے سے روک دوں۔ دو روز کا نت لیا تھا لیکن چار یا پانچ دن میں بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ چار پانچ دن کے بعد انہوں نے پھر پوچھا کہ بتاؤ تم کیا فیصلہ کیا — میں بولی — ایک دن کا وقت اور — دن میں نے یہ سوچا کہ آخر جب یہ اتنے بیمار تھے اور کہیں کوئی آشا نہ تھی، ایک طرح سے شاید انہوں نے مجھے اب ہی دیدیا تھا، یہ کہہ کر کہ یہ تین ہزار روپے ہیں اور نکم۔ ایشور کچھ اچھا ہی کرنے والا ہوگا تبھی تو یہ اچھے گئے ہیں۔

دوسرے دن میں نے ان سے کہا۔ چھوڑ دیجئے نوکری کو سرکاری غیبتی اب قوت برداشت سے باہر ہے۔ اب آپ انفطری منسی ہنس کر بولے۔ دوسروں کا خاتمہ کرنے سے پہلے خود اپنا انجام سوچ لو۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ جب تم اچھے ہو گئے ہو تو میں سوچتی ہوں کہ اب آگے بھی جنگل میں منگل کر سکوں گی اور میرا خیال ہے کہ ایشور کچھ اچھا ہی کرنے والا ہے۔ سوچ لو، پھر نہ کہنا کہ چھوڑ کر خود بھی تکلیف اٹھائی اور مجھے بھی تکلیف دی کیوں کہ سر پر تکلیفیں آگے بہت آنے والی ہیں۔ ممکن ہے کھانے کو بھی نہ ملے، میں اس کے لئے سوچ چکی ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ سر پر جب بلا آتی ہے تب ہر کوئی بھگت لیتا ہے۔ پھر بھگتے تو ہیں بڑے بڑے لوگ۔ اپنی تو بساط ہی کیا ہے؟

بیوی کے یہ تیور دیکھ کر پریم چند نے سرکاری ملازمت ترک کر دینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر شری بچن لال پریم چند کے قدر دانوں میں سے تھے۔ جب پریم چند نے ان کو اپنا ارادہ بتایا تو انہیں یقین نہ آیا کہ ایک آدمی جو اتنی لمبی بیماری سے ابھی ابھی اٹھا ہے۔ اپنی سرکاری ملازمت ترک کر دینا چاہتا ہے۔ انہوں نے پریم چند کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی اور کہا کہ میں آپ کا استعفیٰ ابھی آگے نہیں بھیجوں گا۔ آپ ایک بار اور سوچ لیجئے۔ پریم چند اپنے ارادے پر قائم رہے۔ اور بولے میں کل سے کام پر نہیں آؤں گا" میری آتما نہیں چاہ رہی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں؟ مدن گوپال اپنی کتاب "قلم مزدور" میں لکھتے ہیں۔ اسکول کے کاغذوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ پریم چند نے نان کوآپریشن تحریک کی وجہ سے استعفیٰ دیا اور ان کی نوکری ۱۶ فروری ۱۹۲۱ء کو ختم ہوئی۔ ان کے استعفیٰ کی تحریری کاغذات موجود نہیں؟ انہوں نے استعفیٰ میں کیا لکھا ہوگا اس کا اندازہ ہمیں ان کی جولائی ۱۹۲۱ء کی لکھی ہوئی ایک کہانی" لال فیتہ" کے ہیرو ہری بلاس کے استعفیٰ کے الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ ہری بلاس بھی ترک موالات کی تحریک سے متاثر ہو کر

سرکاری نوکری سے استعفیٰ دیتا ہے۔ ہری بابو اپنے استعفیٰ میں لکھتا ہے: "جناب من، میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے اور اس کے قوانین بھی رحم، حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا ... میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا ... میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمت ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا۔ لیکن مراسلہ نمبر .... مورخہ ..... میں جو احکام نافذ کئے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہیں۔ اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تعمیل کے لئے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔ ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنا ہے دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا حق بھی حاصل ہے اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر کے اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔"

(جاری)

(بقیہ: مسلمان)

"کپڑے دھو لئے؟"

"ہاں.... !"

"جاؤ اب آرام کرو۔"

اماں نے اشارہ کیا۔ بڈی تھوڑا سا گھوڑے کی طرح ہنہنایا، پھر آگے بڑھ گیا۔

(جاری)

(بقیہ: سید فضل احمد کریم فضلی)

معاون ہوں تو وہ قدرے خفگی کے لہجے میں بولے۔ "آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسی طرح اپنا یہ مضمون "اداکار" کو بھیج دیجئے۔ اداکار دیکلی لاہور سے جناب سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی ادارت میں نکلتا تھا اور سارے ملک میں فلم والوں کے لئے اچھا خاصا ہوّا بنا ہوا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ فضلی برادران لیمٹیڈ کے پبلسٹی آفیسر دراصل واثق طارق تھے جو بدقسمتی سے تپ دق کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کی جگہ فلمی دنیا کے منجھے ہوئے اداکار خواجہ صابر صاحب وقتی طور پر نشر و اشاعت کا کام کر رہے تھے لیکن یہ خبر ہرگز نہ تھی کہ ایک دن "یادگار مشاہدہ" سے متعلق میرا لکھا ہوا جوابی مضمون کیا گل کھلانے والا ہے۔ چنانچہ کچھ ہی دن بعد جب میری تحریر "اداکار" میں نمایاں طریقے سے شائع ہو گئی تو بالکل غیر متوقع طور پر کلکتہ کے اس پروقار فلمی ادارے میں پبلسٹی آفیسر کا گرانقدر عہدہ باضابطہ میرے سپرد کر دیا گیا۔

اس حقیقت کے باوجود
کہ فضلی برادران کے دفتر میں
عالی جناب سید فضل احمد کریم فضلی مرحوم سے میری
اتفاقیہ ملاقات کا "پراسرار منظر"
نصف صدی پہلے کی بات ہے
میری یادوں کے پردے پر
اس کی مکمل تصویر
آج بھی پوری تابناکی کے ساتھ
رقصاں نظر آتی ہے۔

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط ۷

آج غیروں کے شکوے ہوتے ہیں
اب ایسوں کو منہ لگائیں کیوں
آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

خدا شاہد خدا شاہد ہے کیوں کہتے ہو وعدوں پر
خدا کو کیا غرض میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو
یہ مصرع لکھ دیا ظالم نے میری لوح تربت پر
جو ہو فرقت کی بے تابی تو یہ خواب گراں کیوں ہو

...جیسا عظیم شاعر بھی داغ سے متاثر ہوا۔ داغ کی ...ہی کی یہ مثال ہے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب ممبر پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

محبت میں ایک جگہ سخت مقام باندھا ہے اقبال ...بل مقام باندھا۔

رہ رو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں (داغ)

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہ رو کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا
(اقبال)

تاثر نہ ملایئے۔ اقبال کے یہاں جو تاثیر ہے وہ داغ کے یہاں کہاں۔

اب خدانخواستہ ان دو اشعار پیش کرنے پر حقانہ ہوں کہ ایک لفظ یا ایک فقرہ ویسا ہی استعمال کرنے سے داغ کا اثر نہیں ثابت ہوتا تو اقبال کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا

تری آنکھ مستی میں ہوشیار کیا تھی
تعامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

غرض داغ کا تتبع اظہر من الشمس ہے مگر داغ کی بات میسر نہیں۔ اصلی اور کاغذی پھول کا فرق ہے۔

اب داغ کی ایک غزل پیش کرتا ہوں۔ اور اسی ردیف قافیہ میں ساحر لدھیانوی کی غزل دیکھئے۔ داغ کے یہاں شدت احساس مفقود ساحر کے اشعار میں کم از کم احساس کی جھلک تو ہے ہی

ناچار دل سے تم ہو تو مجبور جی سے ہم
رکھتے ہو تم کسی سے محبت کسی سے ہم
غیروں کے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا
کیا بات بھی کبھی نہ کریں اب کسی سے ہم
دل کچھ اداس سا ہے ترے طور دیکھ کر
وہ بات کر کے پیار کریں تجھ کو جی سے ہم
(داغ)

اب ساحر کی سنئے۔

اتنے قریب ہو کے بھی کیا جانے کس لئے
کچھ اجنبی سے آپ ہیں کچھ اجنبی سے ہم
وہ ایک بات جو تھی فقط آپ کے لئے
وہ ایک بات کہہ نہ سکے آپ ہی سے ہم
تم دور ہو تو موت بھی آئے نہ ہم کو راس
تم پاس ہو تو جان بھی دے دیں خوشی سے ہم

داغ کے اشعار میں یہ فرق مبین ہے

غزل کے خلاف جو مورچہ باندھا گیا وہ بھی کسی حد تک جائز اور صحت مند تھا۔ غزل کے نام پر جو ابتذال داخل ہوا تھا اس پر ذی شعور ذہنوں کو تکلیف پہنچی اور سب سے پہلے غالب، حالی نے اس طرف توجہ مبذول کرائی

گنہگار واں بخشے جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

یہ کہنا چونکہ کافی نہیں کہ حالی چونکہ غالب کے شاگرد تھے اس لئے غزل کے اچھے اور برے پہلو سے یہ خوب واقف تھے۔ غالب کے اور بھی شاگرد تھے مگر کوئی قابل ذکر نہیں حتیٰ کہ میر مہدی مجروح بھی داغ سے بے حد متاثر ہو کر اپنی شاعری کو اپنانے لگے مگر داغ کا مرتبہ نہ مل سکا۔

میر مہدی مجروح کو سنئے

تمہارا شکوہ اور میری زباں پر۔ معاذ اللہ کتنے بدگماں ہو
مجھے شکوہ ہے اک بیداد گر سے۔ اب اس میں آپ ہوں یا آسماں ہو

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں
لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں
یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہوگی
کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں

غرض یہ بھی داغ کے تابعین کی طرح ہیں۔ حالی میں پھر بھی غزل کہنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ان کے یہاں غزل کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً

دور ہو اے دل مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزہ تو نے

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت درد جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں
اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی (حالی)

آئیے اب آپ کو آرزو لکھنوی کے اشعار کی کچھ جھلک دکھاؤں ویسے لکھنؤ کا اثر تھا پھر بھی اکثر آپ کے اشعار میں تغزل کی چاشنی ملتی ہے۔ مثلاً

کیفیت میری ان کی چپ میں بھی
کچھ سوال و جواب کی سی ہے

اسی مضمون پر فیض اور مجروح سلطانپوری کے اشعار پیش کرتا ہوں۔

اس طرح میری خامشی گونجی
جیسے ہر سمت سے جواب آئے (فیض)

وہ لبِ عرضِ مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے
(مجروح)

معشوق کی طرف سے تینوں اشعار میں جواب کچھ نہیں ملتا۔ مگر مجروح کے توقع نے "کتنی آوازیں" سنیں اس سے شعر میں جو نفسیاتی باریکی اور محبت کے تجربے کی جو بھرپور عکاسی ملتی ہے یہ ہوا حسنِ تغزل --- خیالات بھی اکثر مل جاتے ہیں اور ایک جیسے خیالات کی دو چار شاعر ترجمانی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلیغ سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

یہ تو جملہ معترضہ تھا اب آئیے آرزو کو سنئے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہاں دل ڈوبا جاتا ہے
نہ موجیں ہیں نہ طوفاں ہے نہ دریا ہے نہ پانی ہے

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

وہ ایسے غافل نہیں کہ سوچیں جو کچھ کہا تھا یہ جا کہ بے جا
ہم ایسے کافر نہیں کہ سمجھیں انہیں ہماری خبر نہیں ہے

نہ اس کو سمجھو سنی سنائی یہ بات ہے اپنی آنکھوں دیکھی
نظر پیامی ہے دردِ دل کی زبان پیغام بر نہیں ہے

عہدِ وفا پہ لے کے قسم ایک خود غرض
ممکن تو ہے کہ ہاں ابھی کہہ دے مگر نہیں
اس دل کی وجہ سے ہے۔ تم اپنا چکے جسے
وہ ایک بے بسی کہ ادھر ہے ادھر نہیں
جب بیٹھنے نہ پائے تو کھانے کو ٹھوکریں
دنیا بڑی ہے ایک تری رہ گزر نہیں

آخری شعر غالب کے شعر کے بعد کہا گیا ہے۔ مگر منہ چڑھانے کی بات نہیں۔ شعر میں بات ہے۔ غالب کا شعر تو یاد ہوگا ہی پھر بھی۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

آرزو کے دو شعر یاد آگئے جو غزل کے شعر نہیں ہیں مگر اچھے ہیں۔ یہ بات گوش گذار کرنا ضروری ہے کہ ہر اچھا شعر لازمی طور پر غزل کا ہی ہے ایسی بات نہیں۔

اس سے کیا اکبر انصاف اتنا بھی سوچے نہ جو
ظلم کرنا جرم ہے یا ظلم سہنا جرم ہے

ہوس اندھا بنا کر قتل کا سامان کرتی ہے
فریب نفس ہے سیتا کہاں آغوش راون میں

صفی لکھنوی کا یہ شعر خالصتاً غزل کا شعر ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
زرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ایسے ہی ثاقب لکھنوی کا یہ شعر

دعائیں دیں گے مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ گلشن سے

اس شعر پر دو شعر اور دیکھئے ایک تو مجروح سلطانپوری کا ہے اور ایک غالب کا۔

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتار رم سوخت
منتے بر قدم راہ روان است مرا

غالب کے بعد ظاہر ہے کہ دونوں نے طبع آزمائی کی۔ دو میں کوئی بھی غالب تک نہ پہنچ سکا۔ مگر کسی پر بھی بے کار شعر کہنے کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔ ثاقب یا مجروح دونوں نے مضمون کو اپنایا اور کماحقہ شعری سانچے میں ڈھال کر غزل کی روح بخشی۔

اب ایک شاعر جو غزل گو تو ہیں مگر میں نے صف غزل گویاں میں ان کو شامل نہیں کیا ان کے اشعار جن میں غزل کی جھلک یا غزل کی روح (یعنی دو طرح کے اشعار) ہے پیش کرتا ہوں اور شاعر ہیں عزیز لکھنوی۔

لپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

انگڑائی پر نظام رامپوری کا شعر یاد آگیا یہ شعر بہت ہی مشہور ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

مشاہدہ اور واقفیت ضرور ہے۔ مگر وہی داغ کا اثر ہے جس میں محسوس کر کے دل کی گہرائی سے شعر کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اسی غزل کا مقطع جاندار ہے۔ یہ بھی

دنیا وہ اس کا ساغر مئے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

خیر تو عزیز لکھنوی کے اور چند اشعار پیش ہیں۔

ہے ناشکیبی دلِ مضطر کا کیا علاج
مانا وہ میرے حال سے غافل نہیں رہا

یہ سعی بے خودی پے تسکینِ شوق تھی
واقف ہوں میں کہ آپ کا ملنا محال تھا

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے
نہ بن پڑتی ہے ہنسنے اور نہ روتے
شب فرقت اسی حسرت میں گذری
ہمیں بھی نیند آتی ہم بھی سوتے
عزیز اب ضبط سے بھی کام لے کچھ
ارے مر جائے گا کیا روتے روتے

دیوان گان عشق پہ کر لو ستم کی مشق
اتنا کسے دماغ کہ شکوہ کرے کوئی

اٹھنے کو تیرے در سے اٹھا تو مگر نہ پوچھ
جو کچھ گزر گئی دل بے اختیار پر

میر نے اسی مضمون کو عزیز سے پہلے اور فیض نے کہا ہے۔ میر اور فیض دونوں ہی نے بہتر شعر کہے

اگر فیض کے بعد عزیز نے یہ شعر کہا ہوتا تو بھی یہ نہ کہا جا سکتا تھا کہ بے کار شعر کہا ہے۔ فیض کا شعر بہتر ضرور ہے مگر عزیز نے بھی اچھا ہی کہا ولیسا نہ سہی مگر میر کے بعد تو شعر پھیکا معلوم ہوتا ہے۔

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں
(فیض)

یوں اُٹھے تیرے آستاں سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے (میر)

حالانکہ عزیز اور فیض دونوں نے لطیف اشارہ سے کام لیا ہے " مگر نہ پوچھ۔ جو کچھ گزر گئی دلِ بے اختیار پر" یا " کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں " اور اشارہ میں کہی گئی بات عموماً کھل کے کہنے سے زیادہ با اثر ہوتی ہے۔ کیونکہ بقول اصغر گونڈوی " جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود "

پھر بھی میر کے شعر میں جو واردات قلبی کی عکاسی ہے وہ دونوں ہی سے زیادہ گہری اور موثر ہے۔

ایسے ہی ایک شعر اور عزیز کا یاد آگیا جس کے ساتھ ساتھ بے اختیار طور پر حسرت موہانی — غالب اور میر کے اشعار بھی یاد آ گئے۔ عاشق معشوق کے سامنے بہت کچھ کہنا چاہتا تو ہے مگر الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ بہت سارے شعرا نے اس تجربے کی عکاسی کی ہے مگر کامیاب عکاسی کم ہی کے حصے میں ہے۔ اور پھر کامیاب عکاسی کرنے والوں کے بھی مدارج ہیں کہ کون کس سے بہتر اظہار پر قدرت رکھتا ہے۔ تو لیجئے چونکہ عزیز کا ذکر ہے پہلے ان کا شعر دیکھئے۔

نہ لے چلو مجھے اس تک نہ جانے کیا میں کہوں
ہوا اختیار۔ یہ بات اب دل و زباں میں نہیں

حسرت کہتے ہیں۔

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

دونوں اشعار اچھے ہیں اور خالص غزل کے شعر ہیں مگر دیکھا غالب کے شعر کو دو میں سے کوئی نہیں پہنچتا۔

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

یہ "پریشانی خاطر" اور یہ بے بسی جو ثانی مصرع میں ہے روح تغزل کی اعلیٰ مثالوں میں سے ایک ہے۔

غالب نے ظاہر ہے میر کے بعد ہی کہا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ میر کے بعد کیوں کہا۔ اس لئے کہ غالب نے غزل کی لاج رکھی اس مضمون میں بھی۔ حالانکہ مجھے ذاتی طور پر میر کا شعر غالب سے کچھ بیس ہی معلوم ہوتا ہے۔

کہتے تو ہو یوں کہتے۔ یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

یہاں میں موازنہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ بر سبیل تذکرہ ایک ہی مضمون کے کئی چند اشعار یاد آ گئے اس لئے پیش کر دیا۔

اب عزیز لکھنوی کا ایک آخری شعر پیش کرتا ہوں

حفاظت کرنے والے خرمنوں کے مطمئن بیٹھیں
تجلی برق کی محدود میرے آشیاں تک ہے

پھر لیجئے اسی مضمون پر فانی کا شعر یاد آگیا۔ کیا شعر کہا ہے سبحان اللہ

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا

تکرار لفظی سے کیا حسن پیدا کیا ہے دونوں مصرعوں

ں" ہر شاخ ہر شجر" ۔ یہ مشاقی کی دلیل بھی ہے اور
ے حزن ہے وہ عزیز کے شعر میں نہیں ہے ۔ اس کا مطلب
یہ نہیں کہ عزیز کا شعر صنف غزل سے باہر کی چیز ہے ۔ اسی
سم کی ایک غزل اور یاد آگئی ۔ غالباً احمد فراز کی ہے ۔
پہلے مصرع اور دوسرے مصرع کی ابتدا ایک جیسی ہے یہ
ت پوری غزل میں ہے اس لئے شاعر نے سوچ
سمجھ کر یہ صفت رکھی ہے اور خوب نبھایا ہے ۔

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقف اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

آخری شعر تو حاصل غزل ہے ۔

▲▲

بقیہ :- تقابلی ادبیات پر

افسانوی ادبیات پر انتقادیاتی نظر ڈالنے والوں میں نارنگ کا مخصوص مقام ہے ۔ انگریزی میں اشاعت پذیر کتاب میں اس صنف پر چار موضوعات کے مماصلات پر سیر حاصل بحث وضاحت کی گئی ہے ۔ اردو والوں کو تو یہ سب مواد اردو کتب سے حاصل ہو سکتا ہے مگر غیر اردو دانوں کے لئے اردو کتب کام نہیں آسکتیں ۔ تقابلی ادبیات کے شائقین اور تحقیق کرنے والے سکالرز کے لئے انگریزی مطبوعات ہی کار آمد ہو سکتی ہیں ۔

ابتدائیہ میں نارنگ صاحب نے بہ شمول دیگر امور پر بھی سچے کی بات کہی ہے کہ زبانوں کو فرقہ وارانہ سیاست سے دور رکھنا بہت ضروری ہے ۔ ہندوستان جمہوری اور سیکولرز حکومت ہے جس میں اردو کو ہندی کے ساتھ رکھتے ہوئے امتزاجی رول ادا کرنا ہی وقت کا تقاضا ہے ۔

پایان سخن ، درحقیقت اردو اور ہندی بہ لحاظ زبان ایک ہیں مگر ان کے ادبیات کی شگفت علیحدہ ہو گئی ہے ۔ یہ خیال جناب امرت رائے A HOUSE DIVIDED (O.U.P) میں پیش کر چکے ہیں ۔ باہری ممالک میں ہندی اور انگریزی بالعموم ایک شعبے کے تحت پڑھائی جاتی ہیں ۔ ضرورت ہے کہ اردو موضوعات پر دوسری زبانوں میں بھی کتابیں لکھی جائیں ۔ انگریزی بین الاقوامی سطح پر بھی رابطہ کی زبان ہے لہذا اس نقطۂ نظر سے انگریزی کو کام میں لاتے ہوئے استفادہ کرنے کے دائرے کو وسیع کیا جائے ۔ نارنگ صاحب نے مستحسن کام کیا ہے ۔

▲▲

قیصر عثمانی

یادوں کے پردے پر

سیّد فضل احمد کریم فضلی (آئی۔سی۔ایس)

سنہ ۱۹۰۶ء ــــ سنہ ۱۹۸۱ء

یہ اس زمانے کی بات ہے جب نیو تھیٹرز
تہ کی فلموں کی ہر طرف دھوم مچ رہی تھی اور سہگل، جمنا،
روا، پرتھوی راج، پہاڑی سانیال، جگدیش سیٹھی،
یلا دیسائی اور کانن بالا جیسے فلمی ستاروں کی چمک
مل سے ہندوستان کی فلمی دنیا جگمگا رہی تھی۔ دیوداس،
ندگی، مکتی، ادھیکار، لگن، کپال کنڈلا، دشمن،
یاپتی، اور اسٹریٹ سنگر وغیرہ نیو تھیٹرز کی وہ رومانی
میں تھیں جنہوں نے ملک بھر میں اپنی کامیابی کے جھنڈے
اڑ رکھے تھے۔ ان کے علاوہ کلکتہ ہی کے ایک دوسرے فلمی
ارہ فلم کارپوریشن کے تحت ایک اور فلم بنی تھی "قیدی"
جسے ایس۔ الیف۔ حسنین نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ اور جس کی
ہانی اور مکالمے ان کے برادر خورد سبطین فضلی کی کاوشوں
نتیجہ تھے۔ "قیدی" ہندوستان کی پہلی فلم تھی جس میں بڑی
میابی کے ساتھ مسلم معاشرت کے صحیح خدوخال کو اجاگر
ا گیا تھا۔ شعریت میں ڈوبی ہوئی اتنی خوبصورت فلم تھی

کہ ملک کے گوشے گوشے میں اس نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ میں
نے اس فلم کو ایک بار نہیں مسلسل آٹھ بار دیکھا تھا۔ پھر بھی
یہ واقعہ ہے کہ میرے ذوق و شوق کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔
رمولا کی شوخ و شنگ اداکاری کے علاوہ نانڈریکر کا کام خاص
طور پر دیکھنے کے قابل تھا۔ واسطی نے اس یادگار فلم میں پولس
انسپکٹر کا کردار انجام دیا تھا۔

"قیدی" میں نے پٹنہ میں دیکھی تھی جب میں کالج کا متعلم
تھا۔ وہ غالباً سنہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب گیا
سے شائع ہونے والے خالص ادبی ماہنامہ "سہیل" کے ادارتی
فرائض انجام دینے میں دو سال (۴۱-۴۲) گذار دیئے تو میں
اپنے عزیز ترین دوست شیدا کیوروی کے ساتھ جنوری
سنہ ۱۹۴۳ء میں سینے میں آرزوؤں کی ایک دنیا بسائے ہوئے
اپنے خوابوں کے شہر کلکتہ پہنچ گیا جہاں مجھے تقریباً ایک
ماہ بہت ہی کڑی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا ــــ کام
کی تلاش میں دن بھر کلکتے کی سڑکوں پر خاک چھانتا پھرتا تھا

لیکن بدقسمتی سے مجھے کہیں بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھے ہر روز ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کلکتے کی ہر بلند و بالا عمارت میری آرزوؤں کا مقبرہ ہو ۔۔۔ شیدا جو "پردہ نشین" کا ہیرو بن چکا تھا میری پریشان حالی کو دیکھ کر ملول تو ہوتا تھا لیکن اپنی امید افزا باتوں سے ہر شام وہ میری ہمت بھی بندھایا کرتا تھا۔

بیکاری کے اس دور میں ایک دن بگّو نام کے ایک نئے دوست نے یہ اطلاع دی کہ بنٹنک اسٹریٹ پر دلّی کے فیاض صاحب کی ایک جوتوں کی دکان ہے اور انہیں اپنے لڑکے کے لئے ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے تو میں دن کے تقریباً ڈیڑھ دو بجے راجہ بازار سے سیدھا وہاں پہنچ گیا۔

فیاض صاحب نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا پھر میرے چہرے کی پژمردگی، کو بھانپتے ہوئے بڑے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"سنا ہے آپ کو ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔" میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ضرورت تو تھی لیکن رفع ہو گئی۔" فیاض صاحب نے جواب میں کہا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سر پر سینکڑوں جوتوں کی بارش ہو گئی ۔۔۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میرا دل ٹوٹ کر رہ گیا۔

فیاض صاحب کی دکان سے نکل کر نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں بالکل غیر ارادی طور پر، اپنی قسمت کو کوستا ہوا، سیدھا راستہ چھوڑ کر دائیں طرف کو جانے والی سڑک مشن رو اکسٹینشن پر آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک عظیم الشان عمارت کی سب سے اونچی منزل پر ایک بہت بڑا سائن بورڈ نظر آیا جس پر اردو میں لکھا تھا۔

فضلی برادران لمیٹڈ

میرے قدم یکایک رک گئے اور سوچنے لگا کہ کیوں نہ "قیدا" کے شہرت یافتہ ہدایت کار ایس۔ ایف حسنین (فضلی) او[ر] کہانی کار و مکالمہ نگار سبطین فضلی کے اس فلمی ادارے کی چل کر زیارت کر لوں ۔۔۔ چنانچہ جب کینٹ ہاؤس نام کی عمارت کی لفٹ کے پاس پہنچا تو لفٹ مین نے مجھے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس بلڈنگ کے کسی دفتر سے میرا کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجبوراً بدھنوں سیڑھیاں چڑھتا ہوا میں پانچویں منزل پر ہانپتا کانپتا پہنچ گیا۔ فضلی برادران کے دفتر کے باہر ایک کوٹھری میں بیٹھے ہوئے دربان کو میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ دینا چاہا تو اس نے کہا "آج سنیچر ہے اور دفتر بند ہو چکا ہے۔ صرف خواجہ صابر صاحب کچھ کام کر رہے ہیں۔ کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اندر جائیے۔ میری پیٹھ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔"

میں جب دفتر کے بیرونی کمرے میں داخل ہوا تو وہاں مجھے تین میزیں نظر آئیں۔ دو میزیں خالی پڑی تھیں۔ تیسری میز پر ایک صاحب اردو ٹائپ رائٹر پر کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھے۔ یعنی وہ وہی خواجہ صابر صاحب تھے جن کا ذکر دربان نے لیٹے لیٹے کیا تھا۔ میں نے سلام عرض کیا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"آپ کی تعریف؟"

"جی مجھے قیصر عثمانی کہتے ہیں۔ میں گیا سے آیا ہوں اور کلکتے میں کام ڈھونڈ رہا ہوں۔" میں نے انہیں مطلع کیا۔

"آپ نے گیا چھوڑ کر بڑی غلطی کی ہے۔ کلکتہ بڑا ظالم شہر ہے۔ یہاں کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے جوتے گھس جاتے ہیں لیکن کام نہیں ملتا۔ آپ فوراً گیا واپس چلے جائیے۔ اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔" خواجہ صاحب نے مشورہ دیا۔ اگر

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک صاحب کالی شیروانی اور چست پاجامے میں ملبوس بڑی تیزی کے ساتھ میرے پاس سے گذرتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے وہ کمرہ شاید کمپنی کے صدر یا ڈائرکٹر کا ہوگا۔ پھر پانچ سات منٹ بعد ہی وہی صاحب واپس میرے قریب سے گذرے تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ یکایک رک گئے۔ ان کا رکنا تھا کہ میں سہم گیا۔ اور اسی طرح اپنی کرسی پر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون صاحب ہیں؟"
انھوں نے مجھ سے رعب دار آواز میں سوال کیا۔

"جی میرا نام قیصر عثمانی ہے اور کلکتہ کام کی تلاش میں آیا ہوں"

"پہلے کہاں تھے؟"

"گیا میں"

"کیا کرتے تھے؟"

"سہیل نام کے ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر تھا" میں نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"کھڑے ہو جائیے" انہوں نے حکم صادر کیا۔
اور میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس وقت اپنی خبط الحواسی پر ندامت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"تو آپ نے وہ کام چھوڑ کیوں دیا؟ کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

"جی نہیں۔ بس کلکتے میں کچھ کرنے کا ارادہ تھا"

"سہیل سے آپ کو کیا تنخواہ ملتی تھی؟"

"چالیس روپے"

"میں آپ کو پچاس روپے دوں گا۔ کہ مزدور خوش دلی کشند کار بیش"

"لیکن کام ....."

"بس بیٹھ جائیے۔ میز پر پڑے ہوئے اردو اور انگریزی کے فلمی رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا" اور دیکھئے کل آپ اپنا رسالہ ضرور لائیے گا۔ میں دیکھوں گا"

اس کے بعد وہ اپنی سیمابی کیفیت کے ساتھ دفتر کے باہر چلے گئے۔ میں ہکا بکا خواجہ صابر صاحب کا منہ تک رہا تھا کہ انہوں نے پھر بولنا شروع کیا۔ لیکن اس مرتبہ ان کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔

"ارے آپ تو بڑے خوش نصیب انسان ہیں۔ آپ جانتے ہیں یہ کون ہیں۔ ان کا نام نامی ہے سید فضل احمد کریم فضلی (آئی سی ایس) ڈائرکٹر حسینین کے بڑے بھائی۔ تعجب ہے کہ وہ آپ کو دیکھتے ہی ڈیڈیا سناپ ہو گئے۔ کچھ پوچھ تاچھ کی اور جھٹ سے انہوں نے آپ کو اپنی کمپنی میں کام بھی دے دیا۔"

"یہ شاید آپ کے پاس بیٹھنے کی برکت کا نتیجہ ہے" میں نے از روئے اخلاق جواب دیا۔ اور جلدی ہی دفتر سے نکل کر میں نے خوشی خوشی اپنی رہائش گاہ کی راہ لی۔

دوسرے دن جب دفتر پہنچا تو محترم کریم فضلی صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہاں ایک کونے میں حضرت جگر مراد آبادی کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ وہ نہ جانے کس خیال میں محو تھے کہ رسالہ "سہیل" کے تین خاص نمبروں کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کریم صاحب نے سوال کیا

"کیا آپ صف اول کے غزل گو شعراء کے نام بتا سکتے ہیں"

"حضرت جگر مراد آبادی، حضرت اصغر گونڈوی، حضرت فانی بدایونی، حضرت حسرت موہانی، اور علامہ آرزو لکھنوی"

میں نے دانستہ طور پر جگر مراد آبادی کا نام پہلے لیا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے سنا ہی نہیں۔ جگر صاحب کی از خود رفتگی کا یہ عالم میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ محترم کریم صاحب نے مجھ سے انٹرویو کے طور پر اور بھی کئی سوالات کئے تھے اور وہ میرے جوابات سن کر مسرور و مطمئن نظر آ رہے تھے۔

ابھی مجھے کمپنی میں کام کرتے ہوئے کچھ ہی دن گذرے

تھے کہ جناب سید فضل احمد کریم فضلی کی کہانی پر مبنی جناب ایس۔ ایف حسنین (فضلی) کی ہدایت کردہ مسلم سوشل فلم "معصوم" کی کلکتہ میں نمائش شروع ہو گئی تھی۔ اور میں پریمیئر شو میں کمپنی کے دیگر افراد کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔

"معصوم" میں آہو چشم مہتاب کے مقابل حیدرآباد کے ایک خوبرو نوجوان امجد نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ گانے علامہ آرزو لکھنوی کے تحریر کردہ تھے۔ شو جب ختم ہوا تو ہال کے برابر کریم صاحب کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ تیزی کے ساتھ بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے پاس آ گئے اور فلم سے متعلق میرے تاثرات جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ایک ایسا قابل ستائش جذبہ تھا جس سے ان کی عالی ظرفی اور فطری سادگی کا پتہ چلتا تھا۔

کریم صاحب کلکتے میں نہ صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بلند عہدے پر فائز تھے بلکہ شعر و سخن کی دنیا میں بھی ان کا ایک وقار تھا۔ انہیں دنوں ان کے کلام کا ایک دیدہ زیب مجموعہ "نغمۂ زندگی" ٹائپ کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک دن فون کے ذریعہ انہوں نے اپنے چیمبر میں بلایا اور حکم دیا کہ میں ہندوستان بھر کے مختلف شہروں میں رہنے والی ان مقتدر شخصیتوں کی فہرست تیار کروں جنہیں ان کا شعری مجموعہ تحفتاً ارسال کیا جا سکے چنانچہ میں نے جلد ہی فہرست مع پتہ مرتب کر لی۔ میری اس فہرست میں جواہر لعل نہرو، سر تیج بہادر سپرو اور سچدانند سنہا سے لے کر اختر شیرانی، احسان دانش اور عندلیب شادانی تک موجود تھے۔ میری اس فہرست کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئے اور مجھے انعام و اکرام سے بھی سرفراز کیا۔

یہ یقیناً میری خوش نصیبی تھی کہ میں ایک ایسے ادارے سے وابستہ تھا جس کے ارباب حل و عقد عالی نسب، عالی ظرف اور عالی مرتبت تو تھے ہی شعر و ادب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ جس زمانے میں فضلی برادران لمیٹڈ کی یہ فلم "معصوم" پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی تھی۔ محترم کریم صاحب کی تحریر کردہ فلم "یادگار مشاعرہ" کی شوٹنگ بھی ہو رہی تھی۔ چنانچہ حسنین صاحب کی ہدایت میں بنے اس خالص ادبی پیش کش کے سلسلے میں مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، ساغر نظامی، معین احسن جذبی بسمل الہ آبادی اور کئی دیگر مشاہیر اردو کلکتہ میں ایک ساتھ موجود تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس فلم میں مولانا حالی کا رول مولوی عبدالحق صاحب ادا کر رہے تھے۔ یہ مشاعرہ بہادر شاہ ظفر کے زیر صدارت عالم ارواح میں منعقد ہوتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا کردار وہی خواجہ صاحب ادا کر رہے تھے جن سے فضلی برادران کے دفتر میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے وجہ تو معلوم نہیں لیکن اس خالص ادبی کارنامے کے لئے حضرت سیماب اکبرآبادی کو دعوت شرکت نہیں دی گئی تھی۔ اس لئے ان کے بیٹے منظر اکبرآبادی کے ہفت روزہ "ایشیا" میں اس کی مخالفت ہو رہی تھی۔ جس کی خبر مجھے اس دن ہوئی جب کریم صاحب نے مجھے رائٹرس بلڈنگ میں بلا کر وہ سارے اخبارات میرے حوالے کئے اور ان سب کا زوردار جواب دینے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دن بعد محترم کریم صاحب کے ارشاد کے مطابق میں اپنا مضمون لکھ کر دوبارہ رائٹرس بلڈنگ گیا اور اسے موصوف کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔ کریم صاحب نے اسی وقت میرا مضمون شروع سے آخر تک بڑے غور کے ساتھ پڑھ لیا اور خوش ہو کر روشنائی سے اس پر میرے نام کے ساتھ پبلسٹی آفیسر فضلی برادران لمیٹڈ۔ کلکتہ تحریر کر دیا۔ جب میں نے عرض کیا کہ پبلسٹی آفیسر تو خواجہ صابر صاحب ہیں اور میں ان کا صرف

(بقیہ صفحہ ۲۴۱ پر)

صغیر ریاض

’دوہے‘

بنا گوند جو باندھ لے چڑیوں کو ہے وہ عیار
دریا جو نیکی میں ڈالے وہی تو کھیون ہار
ایسی کلجگ رن بھومی کا کون حساب کرے
تو پیادے بن بیٹھے غازی سو سردار مرے
دادی کی باتیں سچی اللہ کی رحمت سچی
اپنا چہرہ پڑھنے والے تری تلاوت سچی
تو ہی بول نجومی راجا یہ کیسا سنجوگ
شاسن کو سہیوگ ملا تو بک جائیں گے لوگ
سب کا جوٹھا کھانے والا حاتم مانا جائے
کھاٹ بھی جس کے پاس نہیں ہے وہ سمراٹ کہلائے
کب تک آخر جنتا جھیلے یہ سرکاری کھیل
لے مولا پانی کے بدلے دے مٹی کا تیل

آج ریاض اخباروں نے کیسی افواہ اڑا دی
چوروں نے اک کوتوال کی پھر سرکار گرا دی

دریندر پٹواری

لمبی لمبی برگد کی شاخیں
زمین کو چھو کر
اپنی جڑیں پکڑتی ہیں
یہ شاخیں ڈراؤنی نہیں
بلکہ شیو جی کی جٹائیں ہیں۔۔۔!
یہ دادی ماں نے بتلایا ہے ــــــــ

دور دور تک پھیلے
جڑوں کے نیچے
ناگوں نے بل بنائے ہیں
یہ ماسٹر جی نے بتلایا ہے ـــ

صدیوں پرانے
برگد کے نیچے
ناگوں نے ناگ منی چھپائی ہے
یہ رشی منیوں نے بتلایا ہے ــــ

برگد کے اندر
بندوق چھپا ہے
یہ کسی نے بھی نہیں
بتلایا ہے ـــــــ!!

نشتر اکبر آبادی

گھر مانگ رہی ہے نہ پتہ مانگ رہی ہے
اب میری غزل اس سے صبا مانگ رہی ہے
نغموں کی ڈبلیا چوک میں کیا مانگ رہی ہے
خاموش شیشوں سے صدا مانگ رہی ہے
بیٹی کی ہتھیلی مجھے تڑپائے گی کب تک
شہزادی مری رنگ حنا مانگ رہی ہے
کون اپنے چراغوں کو بجھانے کی طرف ہے
کوفہ کی زمیں سرخ فضا مانگ رہی ہے
اب پار بھی جاؤں تو مجھے غم نہیں کوئی
ہر آنکھ مرے حق میں دعا مانگ رہی ہے
دن رات کی تنہائی سے جی اوب گیا ہے
کمرہ کی گھٹن تازہ ہوا مانگ رہی ہے

بستی کی اداسی کا سبب جان ر
بگڑی ہوئی تصویر کو پہچان ر
دن بھر کی ملاقاتوں کو پیشکوں میں
اللہ مرے چادر شب تان رہے
تم گھات میں سورج کی لگے رہتے ہو دن
اک ہم کہ اندھیروں سے ضیا چھان رہے
وہ کبھی گھر رہا شہر میں آوارہ و بدنام
غالب کی طرح ہم بھی پریشان رہے
اب مجھ سے شکایت۔ نہ گلہ میری غزل سے
جو ماننے والے نہ تھے وہ مان رہے ہیں
ہر گھر سے یہاں آج شناسائی ہے میری
اک عمر اسی شہر میں انجان رہے ہیں
اس شخص کے ہمراہ بھی جینے کے زمانے
دشوار رہے ہیں کبھی آسان رہے ہیں

زہر کی شیشی اٹھائی اور پی کر سو گئی
کتنی خاموشی سے لڑکی گھر سے رخصت ہو گئی
دے رکھی تھی آج تک جس نے ترے ملنے کی آس
وہ تمنا بھی۔ جانے کس گلی میں کھو گئی
عقل تکتی رہ گئی۔ تہذیب کی دیوار کو!
وقت سے پہلے چھتوں پر اب کے بارش ہو گئی

کس نے انساں کے دکھوں سے مجھ کو واقف کر دیا
کس کی چاہت زندگی میں بیج غم کے بو گئی

سیّد معراج جامیؔ ۔ کراچی

بے سبب دنیا سے اتنی برہمی اچھی نہیں
یہ جنونِ آگاہ رسمِ آگہی اچھی نہیں
موسمِ گل ہے بکھر جائے نہ دیوانہ کہیں
چھیڑنا اچھا نہیں ہے دل لگی اچھی نہیں
کچھ نکھرنے دو ذرا رنگِ شباب بے خودی
ایسے عالم میں خرد سے دوستی اچھی نہیں
فطرتِ آئینہ ہے، آئینہ رکھے سامنے
آئینے کے کیوں ہو دشمن، دشمنی اچھی نہیں
لے ہی آئی منزلِ مقصود تک دیوانگی
لوگ یہ کہتے رہے دیوانگی اچھی نہیں
ہو سکے تو حلقۂ احباب رکھو مختصر
اپنے ہی ہاتھوں جہاں میں خودکشی اچھی نہیں
زرد موسم میں نہ تم گھر سے نکلنا دوستو
زرد موسم میں ہوا کی برہمی اچھی نہیں
رہروانِ وقت کے پیروں تلے آجاؤ گے
ہوش میں آجاؤ جامیؔ خودسری اچھی نہیں

عاصیؔ فائقی

شعلہ شبنم نہیں، گلاب ہوا
یہ تغیر بھی، لاجواب ہوا
چشمِ جاناں میں انتخاب ہوا
دل ہمارا بڑا عذاب ہوا
نور تو مل رہا ہے چھن چھن کر
کیا ہوا رخ پہ گر نقاب ہوا
تن بدن میں سما گئی گرمی
جب نمودار آفتاب ہوا
تم بھی خانہ خراب کہتے تھے
دل بھی ناداں تھا خراب ہوا
زندگانی کی دھوپ چھاؤں میں
زن ہوئی زر ہوا شباب ہوا
جلوتوں میں نہ کھل سکا تجھ سے
حسن خلوت میں بے نقاب ہوا
قتل و غارت گری کا عالم ہے
اب تو جینا بھی اک عذاب ہوا
رات دیکھا تھا خواب میں ان کو
صبح ہوتے ہی خواب، خواب ہوا
لوگ حیرت زدہ ہیں عاصیؔ بھی
اپنے مقصد میں کامیاب ہوا

غزلیں

غزلیں

عبرت مچھلی شہری

وہ بازہ ہے کہ مرا گھر ضرور ٹوٹے گا
یہ آسماں مرے سر پر ضرور ٹوٹے گا

ان آندھیوں کی مخالف دشاؤں میں ڈالو
جو بچ گئے تو یہ پر ضرور ٹوٹے گا

سسکتے خواب سجائے رہو یوں آنکھوں میں
کہیں تسلسلِ منظر ضرور ٹوٹے گا

ٹکا ہوا ہے جو شہتیر کی بغاوت پہ
ہماری چھت کا وہ پتھر ضرور ٹوٹے گا

جہاں بناتے ہوں سب ڈیڑھ اینٹ کی مسجد
یہ بات صاف ہے وہ گھر ضرور ٹوٹے گا

یہاں بھی جو بند رہیں گے گھروں کے دروازے
فصیلِ شہر کا پتھر ضرور ٹوٹے گا

کہاں چھپاتا میں بونوں میں سر بلندی کو
میں جانتا تھا مرا سر ضرور ٹوٹے گا

مرے ہی دوست تو شامل ہیں اسکے دستوں میں
مرے غنیم کا لشکر ضرور ٹوٹے گا

حقیقتیں تو چٹانوں سے کم نہیں عبرت
خیال و خواب کا پیکر ضرور ٹوٹے گا

کسے خبر تھی مرے بعد وہ بھی روئے گا
جو آنسوؤں میں مجھے عمر بھر ڈبوئے گا

خیال آیا ہے پھر مجھ کو خود شناسی کا
پھر آئینہ مری بے چہرگی پہ روئے گا

تو میرا سر تو یقیناً اتار لے گا مگر
ترے ضمیر کا یہ بوجھ کون ڈھوئے گا

جو آنکھ بیچ کے سپنے خرید لایا ہو
عجیب بات ہے وہ شخص کیسے سوئیگا

اگر لباس پہ ہوتا تو لوگ دھو دیتے
یہ داغ دامنِ کردار کون دھوئے گا

راشد ندیم

گئی رُتوں کا مکمل حساب رکھ دیں گے
ہم اس کے سامنے دل کی کتاب رکھ دیں گے

نہ جانے کس کے تعاقب میں ہیں یہ برسوں سے
بھٹکتی آنکھوں میں ہم اب کے خواب رکھ دیں گے

جو کہہ گئے ہیں بہت کچھ وہ بے زباں آنسو
بدل کے کیفیتِ اضطراب رکھ دیں گے

یہ اپنی آبلہ پائی اور اس پہ عزمِ سفر
ہر اک سوال کا لیکن جواب رکھ دیں گے

فضائے عیش و طرب کس کو راس آئی ہے
ہم اپنے ہاتھ سے چنگ و رباب رکھ دیں گے

اگر وہ پوچھنے آئے گا حالِ دل راشدؔ
تو اس کے سامنے سوکھا گلاب رکھ دیں

غزلیں

رؤف جاوید

ہر گلی کوچے میں بکھرے ہوئے پتھر دیکھو
رات دن شہر میں چلتے ہوئے خنجر دیکھو

آپ کا درد وہی ہے جو مرے دل میں ہے
آٹھ دس روز مرے ساتھ کبھی رہ کر دیکھو

یہ بڑے پیار سے ہوتے ہیں مخاطب مجھ سے
واہ کیا خوب ہیں، الفاظ کے نشتر دیکھو

کون ہے ادنیٰ یہاں میرے سوا لوگوں میں!
ایک سے ایک مرے شہر میں برتر دیکھو

کس کو معلوم نہیں، وقت نے مارا ہے اُسے
پھر بھی جاویدؔ کو ہنستا ہوا اکثر دیکھو

حمید خاں حمیدؔ

شعلوں کی لپلپاتی زباں دیکھتے رہے
جلتے ہوئے وہ میرا مکاں دیکھتے رہے

ہنگاموں سے نپٹتے مری عمر کٹ گئی
کاغذ پہ صرف امن و اماں دیکھتے رہے

مہکی ہوئی ہوائیں تھیں بہکی ہوئی فضا
ہم بیٹھے ان کا حسن جواں دیکھتے رہے

وہ پتھروں کا شہر تھا حیرت کی بات ہے
پھولوں سے تھی سجی وہ دکاں دیکھتے رہے

احساس کی شگفتگی سے تا عمر ہی حمیدؔ
اٹھتے ہوئے دلوں سے دھواں دیکھتے رہے

نعیم ذوہرہ

میری نظر کو وسعتِ منظر کشائی دے
میں جس طرف بھی دیکھوں تو ہی تو دکھائی دے

جس روشنائی سے تری تعریف لکھ سکوں
مالک مرے قلم کو تو وہ روشنائی دے

بے کیف زندگی کی حصاروں میں قید ہوں
اس کیفیت سے میرے خدا اب رہائی دے

اس دورِ انتشار میں انصاف ہی کہاں
حق بات جو کہے مجھے اس تک رسائی دے

دل کی صدا وہ کیسے نہ سن پائے گا نعیمؔ
چونٹی کے پاؤں کی جسے آہٹ سنائی دے

شرون کمار ورما

بوگی

پلیٹ فارم اپنی بھیڑ اور شور سمیت پیچھے رہ گیا تھا۔ گاڑی آوٹر سگنل سے آگے نکل آئی تھی۔

"لوگ کچھ زیادہ ہی موبائیل ہو گئے ہیں؟" ایک مسافر نے بھیڑ کو دیکھ کر کہا۔

"جی، صنعتی تبدیلیوں سے لوگوں کا انداز فکر، سوچ ہی بدل رہی ہے۔" عینک والے مسافر نے، جو کھڑکی کے ساتھ الگ تھلگ سا بیٹھا تھا۔ مدبرانہ انداز سے کہا۔

دوسری طرف کھڑکی کے قریب بیٹھے نوجوان نے ایک باتصویر فلمی جریدے سے نظریں ہٹا کر سنجیدگی سے کہا۔

"جی ہاں، انگریزی میں سفر کرنے لگے ہیں۔"

کرسی نما سیٹ پر بیٹھے خاموش طبع، سنجیدہ صورت ادھیڑ عمر کے شخص نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے نوجوان کو بغور دیکھا۔ اپنے گنجے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑھتی ہوئی آبادی، مہنگائی، صنعتی تبدیلیوں اور ترقیاتی منصوبوں کی ناکامی پر اظہار رائے کرنے لگا۔

اسے جلدی ہی محسوس ہو گیا کہ مسافر اپنے اپنے لئے مناسب جگہ کی فکر میں تھے۔ کوئی بھی دلچسپی سے اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ اسے دکھ ہوا۔ وہ تو انہیں سب کی بھلائی اور بہتری کے لئے سر کھپا رہا تھا۔

وہ نوجوان پھر اپنی من پسند فلمی اداکاراؤں کی رنگین دنیا اور سہانے سپنوں میں لوٹ گیا تھا۔

عینک والے مسافر نے باہر دیکھنا بہتر سمجھا۔ آبادی والے علاقے کے بعد اب کھیت شروع ہو گئے تھے۔ گیہوں کی بالیاں مستی میں جھوم رہی تھیں۔ سنجیدہ صورت، مدبر مسافر نے سفری تھیلے سے موٹی سی کتاب نکال لی تھی۔ 'پاورٹی آف فلاسفی'۔ بیچ میں بیٹھے کچھ مسافروں نے گھٹنوں پر بریف کیس رکھ کر تاش شروع کر دی تھی۔ کتاب والے مسافر کے چہرے پر کرب اور ناگواری کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اس نے سوچا۔ نئی نسل سنجیدہ مسائل سے کتنی کترانے لگی ہے۔ Escapists حکومت نے اپنا دامن چھڑانے کے لئے پوری قوم کو کرپٹ کر دیا ہے۔ غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ فراریت پسند اور خود غرض بنا دیا ہے۔ لوگ اس سچائی کو سمجھتے کیوں نہیں۔

ٹی۔ٹی۔ای بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آ گیا تھا—

ں نے اپنے اپنے ٹکٹ نکال لئے تھے۔ عینک
سافر نے اپنا کمپیوٹر ٹکٹ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔
" لائن میں گھنٹہ بھر کھڑے ہو کر سیٹ ریزرو
تیس روپے زیادہ دینے اور جھل خواری کا تجھے کیا
ا۔ نہ کسی بوگی پر نمبر پلیٹ ہے، نہ ریزرویشن چارٹ
یٹ ___ لگتا ہے یہ سب صرف اونچے درجوں کے
یا جاتا ہے۔ ریلوے ایڈمنسٹریشن، ریلوے اسٹیبلشمنٹ
در اونچے طبقہ کے لوگوں کو خوش کرنے، انہیں آرام
نے میں لگ گئی ہے۔"
ٹی ٹی ای نے اس کی باتوں کو بے معنی سمجھ کر نظر انداز
تھا۔ وہ ایک ایسے مسافر سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ
تھا جو بنا ٹکٹ سفر کر رہا تھا اور ٹی ٹی ای کو شیشے
رنا چاہتا تھا۔
عینک والے نے باہر دیکھنا ہی مناسب سمجھا، جہاں
۔ گیہوں کے کھیت کسانوں کی درانتیوں کا انتظار
ہے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھے نیلی پگڑی اور کھلی
ں والے سکھ مسافر نے فخر سے لہلہاتے کھیتوں کو
اور جیسے لوگوں کو خبردار کیا۔
" پنجاب اگر اناج نہ دے تو ہندوستان بھوکا مر
ے۔"
" باہر سے لوہا، سیمنٹ، کھاد وغیرہ نہ آئے
اب میں دھول اڑتی نظر آئے۔ تاش کھیلنے والوں
ے ایک نے کہا۔
" یہ پنجاب اور ہندوستان میں کہاں جی۔" نوجوان
کہا۔
سکھ مسافر کا ہاتھ غیر شعوری طور پر گاتر سے لٹکی
ی کرپان تک گیا۔ اس نے تمام مسافروں کو حقارت
رت سے دیکھا اور تلخی سے بولا۔

" اوئے اللہ، یہ سب اس وقت پتہ چلے گا جب
خالصتان بنے گا۔"
" تُسی کتھے جا رہے ہو۔؟" ایک مسافر نے پوچھا۔
سکھ مسافر نے اس سوال کا جواب دینا شاید خلاف
شان سمجھا۔ سیٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ داڑھی پر ہاتھ
پھیرا اور پیارے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔
بہت سے مسافر ادھر ادھر ٹک ٹکا گئے تھے لیکن
بہت سے ابھی تک کھڑے تھے۔ لائٹس ٹوٹی ہوئی تھی،
دیواروں پر چاقو اور بلیڈ سے نقاشی کی گئی تھی۔ لگتا تھا
'کھجراہو' کے مندروں کو سجانے والے فنکار کی روح اس
بوگی میں سفر کرنے لگی ہے۔ ٹائلیٹ میں با تصویر کوک
شاستر بنا دام میسر تھا۔ سفر کے دوران شاید کبھی کسی
نے چین کھینچ کر ٹرین روکنے کی کوشش میں چین کا ہینڈل
ہی توڑ دیا تھا۔
ٹرین رفتار پکڑ رہی تھی۔ تاش کے کھلاڑی کسی بات
پر الجھ رہے تھے۔ نوجوان فلمی جریدے میں تصویریں دیکھ دیکھ
کر اکتا گیا تھا اور شاید "تصویر تیری دل مرا بہلا نہ
سکے گی" کے اصول کو اپنا کر زندہ، متحرک چہروں میں دلچسپی
لینے لگا تھا۔ سامنے بیٹھی عورت کو جو گود کے بچے کو چپ
کرانے کی کوشش میں اپنی قمیص اٹھانے والی تھی۔ نوجوان
کی بھوکی نظریں ببول کے کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس
ہوئیں۔ اس نے زاویہ بدلنا چاہا۔ لیکن بھیڑ میں ایسی
پھنسی تھی کہ ہلنا ناممکن ہو رہا تھا۔ اس نے لاچاری سے
خاوند کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجبوری
کا احساس دلایا۔ عورت نے بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔
نوجوان کو کسی حد تک مایوسی ہوئی لیکن وہ اپنی جسارت
سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ نوجوان کے ساتھی کو شاید سگریٹ
کی طلب محسوس ہوئی تھی اس نے جیب سے ڈبیہ نکال کر

مسافر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ عینک والے شخص نے نرمی اور سمجھانے کے ڈھنگ سے کہا۔

"ہم سب کو سب کے جذبات اور اعتقادات کی قدر کرنا چاہیئے۔ اگر ہماری کسی بات سے کسی کو دکھ پہنچتا ہو تو وہ نہیں کرنی چاہیئے۔

نوجوان کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ اسے یہ بات ناگوار گذری ہے۔ لیکن موقع کی نزاکت کے مدنظر وہ اٹھ کر دروازے تک چلا گیا۔ دوسرے نے اپنی بیوی کی نگاہوں کو چارہ نہ ملنے پر نشانے سے ہٹا لیا اور تاش کے پتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ تاش کھیلنے والے شاید ایک دم اکتا گئے تھے۔ وہ کاروبار کی باتیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے جو شاید پہلی مرتبہ بزنس ٹور پر نکلا تھا۔ خوف کا اظہار کیا کہ بنا بل کا مال لے کر وہ محصول چونگی اور سیلز ٹیکس کے عملہ سے کیسے بچے گا۔ اس کے پرانے ساتھی اس پر یوں ہنسے جیسے وہ بے وقوفی کی باتیں کر رہا ہو۔ اسے سمجھایا یار، یہ رشوت کا یگ ہے۔ یہ تو تھوڑا سا مال اٹیچی میں رکھ کر لائے گا۔ یہاں تو دن دہاڑے ہاتھی نکال لے جاؤ۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ بس، ان کا حصہ انہیں دے دو۔ اوپر والی برتھ پر لیٹے لڑکے نے نیچے بیٹھی ماں سے وہ کامکس لے لئے جو اس نے اسٹیشن سے خریدے تھے۔ نوجوان کی آنکھوں کے سامنے ہی جب چاروں ہتھیلیاں ڈبیہ میں بند کر دی گئیں تو اس نے کتاب نکال لی۔

دلڑکی جوان، پڑوسی پریشان "— پاورٹی آف فلاسفی والے مسافر نے دکھ اور مایوسی سے کتاب کی طرف دیکھا۔ ٹائٹل کور پر ایک عورت کی بھدی سی تصویر تھی جس میں کوئی تناسب یا آرٹ نہیں تھا۔ بس عورت کی چھاتیاں نیم عریاں حالت میں پورے سرورق پر پھیلی دکھائی گئی تھیں پس منظر میں ایک پستول آگ اگل رہا تھا۔ جب اوپر کی برتھ والا لڑکا کامکس کی جھوٹی دنیا سے نکلے گا تو ایسی واہیات کتابوں میں ڈوب جائے گا۔ پوری قوم کو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت تباہ کیا جا رہا ہے پاورٹی آف فلسفی والے نے دکھ سے سوچا۔

عورت کا خاوند چاہتا تھا کہ وہ نوجوان کتا نہ پڑھے۔ کم از کم ان سب کے سامنے، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اس لئے اس نے آنکھیں موند لیں۔ سکھ مسا کا گھٹنا، جانے انجانے میں، بار بار عورت کی کمر کو ٹھو دے رہا تھا۔ عورت نے اس کی کھلی داڑھی کی طرف دی وہ آنکھیں موندے جاپ کر رہا تھا۔ عورت نے اسے ا کی اس دھارمک اوستھا سے نکالنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور قدرے اور سمٹ گئی۔ لیکن وہ گھٹنا بدستو اسے تکلیف دے رہا تھا۔ عورت نے بے بسی سے شو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ ا نے اٹھ کر اپنی جگہ بیوی کو دے دی اور خود اس جگہ پر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ گھٹنا کچھ اور بے تکلف ہو رہا تھا۔ اس دبلے پتلے کمزور مسافر نے سکھ کی نیلی پگڑی، کھلی داڑھی اور نو انچ کی کرپان دیکھا۔ مدد کے لئے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھ لیکن سب آنکھیں موندے ہوئے۔

ایک اندھی بھکارن۔ بہت پرانا فلمی گیت گاتی — بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے، دل کا سف — ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی تھی۔ ایک اپا بچہ۔ کھجور کی جھاڑو سے فرش بہارتا، گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ مسافر ترس کھا کر اسے پیسے دے رہے تھے۔

"بھیک مانگنے کے نئے طریقے۔" نوجوان نے طنزاً کہا۔

" نہیں برخوردار، ایسا نہیں ہے۔ سنجیدہ صور مدبر شخص نے گمبھیرتا سے کہا۔ صفائی کر کے ہماری خودک

ین کرتے، ٹھیکے پران اپاہج بچوں کو جھاڑو تھما
تے ہیں۔ تنخواہ کے علاوہ اوپر سے آمدنی ہو جاتی ہے
" ریلوے اتھارٹیز ادھر دھیان کیوں نہیں دیتی"
" صاحبزادے، ہم بے دھیانی کے دور سے گذر
ہے ہیں؟

نوجوان نے سوچا، اس مدبر شخص سے باتوں
ں الجھ کر وہ نوجوان لڑکی اور پریشان ٹروسن
گرما گرم کارناموں سے محروم ہو رہا ہے۔ اس لیے پارٹی
ے فلاسفی کو نظر انداز کیا اور جوانی اور پریشانی
سنگم میں ڈوب گیا۔ عورت کی گود میں پڑا بچہ پھر
بخنے چلانے لگا تھا۔ عورت اسے زبردستی سلانے
کوشش کر رہی تھی۔ اور بچہ غضب مخالفت کی
رح ضد پر اڑا ہوا تھا۔

" بچے کو چپ کراؤ بھئی۔ نوجوان نے کتاب رکھ
ناراضگی سے کہا۔

اوپر کی برتھ پر کامکس پڑھتے بچے نے ایک چیکو
س عورت کی طرف بڑھا دیا۔ عورت جھجکتی رہی۔ آخر
ں کی ماں کے اصرار پر اس نے چیکو لے لیا۔ چھیل
بچے کے منہ سے لگایا تو وہ چپ ہو گیا۔
" بچے کی بھاشا بچہ ہی سمجھ سکتا ہے" مدبر صورت
سافر نے کہا۔
" ایک آپ کو دوں انکل" کامکس والے بچے نے
معصومیت سے کہا۔

مسافر مہنگائی اور کرپشن کا سلسلہ حکومت
غلط اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں سے جوڑ رہے
۔ سکھ مسافر کا گھٹنا دبلے پتلے آدمی کی کمر میں گھسا
ا رہا تھا۔
" گیانی جی ٹھیک سے بیٹھو"

اوئے لالہ۔ ٹھیک سے تو بیٹھا، زیادہ تکلیف
ہے تو اتر جا گاڑی سے۔"
" چلتی گاڑی سے" نوجوان نے پوچھا۔
" آہو ـ (ہاں) سکھ مسافر نے غصے میں کہا
اور کچھ اور پھیل کر بیٹھ گیا۔" خالصتان بنے گا تو
تمہیں عقل آئے گی۔"

ٹرین بھاگی جا رہی تھی۔ عورت کی گود کا بچہ پورا
چیکو کھا کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے شوہر نے وہ کتاب
اٹھالی تھی۔ نوجوان نے اس کی طرف دیکھا اور کہا
" ہاتھ جل جائے گا، بڑی گرم کتاب ہے۔"
عورت نے سرزنش کے سے انداز میں شوہر کی طرف
دیکھا۔ مرد نے کتاب رکھ دی۔

انبالہ چھاؤنی اسٹیشن سے کچھ لوگ اس بوگی
میں سوار ہو گئے۔ بولی ٹھولی سے وہ ہریانہ کے جاٹ
لگتے تھے۔ اونچے، لمبے ڈیل ڈول والے مضبوط کڑیل
جوان۔ انہوں نے ادھر ادھر جگہ کی تلاش میں دیکھا۔
پنجاب میں تو یہ گاڑی چار جگہوں پر رکتی ہے
اور ہریانہ میں ایک جگہ۔ ریل وبھاگ کو چیتاونی دینی
پڑے گی۔ زنجیر کھینچ کھینچ کر، تھوڑا سا پتھراؤ، آگ۔
لفظ آگ نے تمام مسافروں کو چوکنا کر دیا
" اے گیانی جی، بندوں کی طرح بیٹھو۔"
" سنبھل کر ہی بیٹھے ہیں ہم۔ سکھ مسافر نے تاؤ کھا
کر کہا۔ آگے جگہ دیکھو۔"
" ہم دیکھیں کہ تجھے دکھائیں" ایک جاٹ نے اس
کی طرف دھمکی آمیز ہاتھ بڑھایا
سکھ مسافر نے ان کے تیور بھانپ کر پاؤں
لٹکا لیے۔ دونوں جاٹ اس طرح پھیل کر بیٹھے کہ گیانی
جی سیٹ پر سے آدھے باہر ہو گئے۔ ایک جاٹ نے بیڑی

سلگائی تو سکھ مسافر نے ٹیڑھی آنکھ سے اُسے دیکھا۔ لیکن ہریانوی جاٹ نے اس کی پرواہ نہیں کی پھر تو تین چار اور مسافروں نے سگریٹ سلگائے۔ مدبر و سنجیدہ صورت مسافر نے سوچا۔ "لاٹھی اور بھینس" کے علاوہ دنیا میں سب جھوٹ ہے۔ دبلے پتلے مرنجاں مرنج سکھ مسافر کو کھسکتے دیکھ کر قدرے خوشی محسوس کی تھی لیکن گرانڈیل جاٹوں نے اسے کچھ اور سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے احتجاجاً کہا

"سرکار لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر رہی۔"

"کر کیوں نہیں رہی کچھ، کرائے بڑھا رہی ہے۔"

نوجوان بولا۔ "روپے کی قیمت کم کر رہی ہے۔"

بھکارن نے اب دوسرا گیت شروع کر دیا تھا

"ہمیں بھی دیدو سہارا کہ ہم بے سہارے ہیں۔" چائے بیچنے والا آگیا تھا۔ پلیٹ فارم کی چائے مہنگی بیچ رہا تھا۔ لوگ پی رہے تھے اور ڈسپوزیبل گلاس مروڑ مروڑ کر اندر باہر پھینک رہے تھے۔ چنے کی دال، مونگ پھلی سنترے۔ موسمی یہ موسمی چیزیں لوگ کھا رہے تھے فرش پر خالی لفافے، کاغذ، دیاسلائی اور سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے بکھرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بچے نے ماں کا کروشیا نے کر دیواروں پر جدید آرٹ کے نادر نمونے بنا دیئے تھے۔ ماں لاڈ سے کہہ رہی تھی کہ بچہ بہت شریر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک صاحب بھکارن سے کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی دوسرا باعزت کام کیوں نہیں کرتی --- اور وہ ایک روپیہ ایک روپیہ کی رٹ لگائے تھی۔

ایک ہریانوی جاٹ نے فلمی جریدہ اٹھا لیا تھا۔ پہلے تو وہ تصویروں کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے کسان پکی فصل کو دیکھتا ہے۔ پھر اس کے چہرے پر تناؤ سا

آگیا۔

"اس میں کیا رکھا ہے چودھری صاحب" نوجوان نے کہا۔

"یار تو بالکل گدھا ہے" نوجوان کے ساتھی نے کہا۔ "تجھے سو مرتبہ سمجھایا کہ جب حکومت چوالیس سال سے ایپیزمنٹ کی پالیسی پر چل سکتی ہے تو، تو یہ تھوڑا سا نفرت۔

"مجھے لگتا ہے تو بوڑھا اور فرسٹریٹ ہو رہا ہے" نوجوان نے کہا --- لے یہ کتاب پڑھ۔" اس نے یاورنی آ فلاسفی" اٹھا کر اسے تھما دی۔

"بھاری ہے۔" دوسرے نے کہا

"تو رکھ دے بیٹا تھک جائے گا۔"

اس سنجیدہ صورت، مدبر شخص کو نوجوان کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی پھر بھی اس نے ان سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ نئی نسل میں برداشت کا مادہ تو نہیں۔ یہ تو ایسے ہی راستے سے بھٹکی ہوئی ہے، پاپ میوزک، بریک ڈانس، اور وائلنس کی پروردہ یہ نسل کتابوں کے وزن سے بھی ڈرتی ہے۔

"دلی کب آئے گا" اوپر والی برتھ سے بچے نے پوچھا۔

"دلی نہیں آئے گا۔ گاڑی وہاں جائے گی۔"

"کافی لمبا سفر ہے" عورت نے کہا

"اچھی اچھی کتابیں پڑھو، پھر پتہ نہیں چلتا کہ راستہ کٹ گیا" مدبر شخص نے کہا "اچھی کتابیں پل ہوتی ہیں جن پر تہذیبیں سفر کرتی ہیں، علم و ہنر کرتے ہیں۔

"وہ آؤٹ --- نوجوان نے معصومیت سے کہا: "میں ایک Recreation Coach ہونی چاہئے"

ری ہو ، ان ڈور گیمز ہوں اور موسیقی ہو۔

" برخوردار، تم انجانے میں بہت بڑی بات کہہ گئے ہو"

" جی انکل، یہ اکثر ایسی باتیں کرتا ہے" نوجوان ماتھی نے کہا۔

" دلی کب آئے گا" وہ بچہ شاید تھک گیا تھا

سبزی منڈی — جھگی جھونپڑی — لائن بدلنے کی

— مسافروں نے اپنا اپنا سامان سنبھالنا شروع کیا تھا — گاڑی دلی کے حدود میں تھی۔ پھر اسٹیشن رود میں داخل ہو گئی اور آخر پلیٹ فارم پر رک گئی۔

باقی بوگیوں کی طرح وہ بوگی بھی خالی ہو گئی۔ رہ فرش پر بکھرے ہوئے خالی لفافے، کاغذ، چھلکے — ے ہوئے گلاس، سگریٹوں۔ بیڑیوں کے ٹوٹے اور اداسی سی خاموشی اور وہ بھکارن۔ بھیک کے پیسے اب گرتی ہوئی جو گا رہی تھی۔

" بچے بھنور میں آن پھنسا ہے —"

▲▲

مشرف عالم ذوقی

ترجمہ : تبسم فاطمہ

مسلمان

قسط ۶

مشتھس کی فضا پھر خراب ہوگئی تھی۔ یوں تو رانی منڈی میں اچھے کہے جانے والے مکان تو کم ہی تھے۔ یہ پورا علاقہ ہی رنڈیوں کا تھا، لیکن یہاں مسلم طوائفوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں زیادہ تر بنگلہ دیش سے بھاگی یا بھگائی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ جنہیں کم داموں کے عوض رانی منڈی میں بیٹھا دیا گیا تھا۔ فساد یا ہنگامے کا اس محلے پر بھی کوئی اثر پڑتا یہ سوچنا ہی فضول تھا۔ آزادی کے بعد دنگے تو جیسے اس ملک کی تقدیر بن گئے تھے۔ بائی اماں کو اپنے اس تاجر گاہک کی بات اب تک یاد تھی۔

دیکھ لینا، یہاں بھی جم کر فساد ہوگا۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی ہے۔ مسلمان خوشحال ہیں۔ تجارت میں بھی آگے ہیں، آر۔ ایس۔ ایس جیسی جماعتوں کی آنکھیں تو بس ایسے ہی شہروں پر ٹکی رہتی ہیں۔ دنگے کروا دو—— مسلمانوں کو غریب اور بے روزگار بنا دو۔ معاشی طور پر انہیں اتنا کمزور کر دو کہ وہ سر ہی نہ اٹھا سکیں۔

بائی اماں کو ہندوؤں سے نفرت محسوس ہوئی۔ کتنے برے ہیں یہ۔ مسلمانوں کے لئے بھائی جیسا لفظ ان کے دھن میں گونجتا تھا۔ تبھی تو اتنی مارکاٹ مچتی ہے۔ چاروں طرف مسلمان مارے جاتے ہیں۔

بائی اماں کو شہر کی فضا کو لے کر مسلمانوں کی طرف سے بہت فکر تھی۔ کئی دنوں سے وہ سن رہی تھیں کہ کوئی مذہبی جلوس نکلنے والا ہے... پتہ نہیں کیا ہوگا ایک دہشت سی اندر بیٹھ گئی تھی۔ جلوس نکلا، تھوڑی بہت افراتفری کے بعد معاملہ دب بھی گیا۔ لیکن شہر کی فضا بجائے ٹھیک ہونے کے اور بھی خراب ہوگئی۔

دو ایک روز سے بدی ماما روز ہی کوئی نہ کوئی بری خبر لے کر حاضر ہو جاتی۔

قصاب ٹولا کے رحمتوا نے ایک ہندو کو چاقو مار دیا۔

پانچ پیر کے مزار کو لے کر دو فرقوں میں ٹھن گئی۔

ہندوؤں کے مذہبی جلوس پر مسلمانوں نے پتھراؤ کیا۔

جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتے مسلمانوں پر کسی ہندو نے گوشت کی ہڈی پھینک دی۔

ابراہیم کی مسجد میں بم بنائے جا رہے ہیں

مسلمانوں نے بھی ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا ہے

کتنی ہی خبریں..... خون اپلاتی دہکتی خبریں...

اس دن اجمیری آئی تھی..... بنگلہ دیش میں اس کا سارا خاندان تباہ ہوگیا۔ اجمیری کی آنکھوں میں بھی دہشتوں کا جنگل تھا۔

گوہر بائی ــــ کیا یہاں بھی .....

یہاں کچھ نہیں ہوگا ــــ

بائی اماں نے اطمینان سے تسلی دی، پر اجمیری کی آنکھوں کی دہشت نہیں ختم کرسکی۔

مجرے میں تو سب آتے ہیں، طرح طرح کے لوگ... پر کسی کی آنکھیں نفرت سے لہولہان نہیں لگتیں۔ پھر اتنے سارے گدھ کہاں سے آجاتے ہیں؟

بائی اماں سوچتی۔ انہیں اپنی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی ــــ بس افروز کی ــــ اس کا اپنا جسم تو کوٹھے کی زینت بن ہی گیا۔ دنگے فساد میں لڑکیوں کی آبرو ریزی بھی تو ہوتی ہے۔ اجمیری بھی تو پہلے ایسی نہیں تھی۔ آبرو لٹنے کے بعد ہی تو اس نے اس پیشے سے سمجھوتہ کیا۔ کبھی جی چاہتا افروز کو لے کر وہ کہیں دور نکل جائیں۔ مگر کہاں؟

کون سی جگہ ــــ؟

جہاں وحشتیں اپنا ڈیرا نہ ڈالے ہوں

جہاں مسلمان محفوظ ہوں .....

ایسی کوئی جگہ بائی اماں کو نظر نہیں آرہی تھی۔

اس مسئلے کو لے کر بائی اماں پڑوس کی لگ بھگ سبھی طوائفوں سے مل آئیں۔ دلشاد بائی، امیر بائی، کوثر جہاں، دلربا بائی.......

اسے حیرت ہوئی ــــ سب نے اس کا مذاق اڑایا۔

یہ کوٹھا ہے... کوٹھا... گوہر جان... یہاں کچھ نہیں ہوگا۔

لیکن.... نیاز... فاتحہ، مقبروں پر جانا، بڑے پیر صاحب، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا نیاز.... خواجہ بابا کا نیاز.... مولود شریف.....

طوائفوں کا عقیدہ تو بہت مضبوط ہوتا ہے۔

پھر اگر مذہب کے نام پر قہر ٹوٹتا ہے تو بجلیاں ان پر بھی تو گر سکتی ہیں۔

گوہر بائی کو اپنی اماں کی یاد آتی ہے۔ جو اسے پیدا کرتے ہی چل بسی تھیں۔ شہناز بائی نے اسے سب کچھ بتایا تھا.... پروردگار.... ساری آزمائشیں مسلمانوں کے لئے.... اماں کو کیسی کیسی تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ مہاجر ہونے کا دکھ اٹھانا پڑا.. اور کیا ملا ــــ ایک کوٹھا.... ایک بدنصیب کوٹھا ــــ جو ہمیشہ کے لئے گوہر جان کا مقدر بن گیا۔

مکمل عورت کا تصور کہیں اندر ہی گم ہوگیا تھا۔ سوگیا یا مردہ ہوگیا.. لیکن وہ یہ قصہ افروز کے ساتھ نہیں ہونے دیں گی۔

اس دن دوپہر کا وقت تھا۔ ایک انسانی ہوئی دوپہر۔ گوہر جان کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ بڑی ماما کو دھونے کے لئے وہ پرانے کپڑے کی گٹھر باندھ رہی تھیں کہ دیکھا دروازے کے دونوں پلے دھڑ سے کھلے۔

چہرے پر وحشتوں کی پوری داستان لئے، رنگین جانگھیا اور بے ڈھنگا سا کرتا پہنے بڑی ماما پریشان سا اندر آگیا۔

وہ چونک پڑی ــــ

کیا بات ہے؟

وہ..... دنگا.....!

ہانپتے ہوئے بڑی ماما دھم سے بستر پر گرے... گھوڑے کی طرح ان کا منہ خوف سے ہنہنایا.... منہ سے بھنچی بھنچی آواز نکلی... وہ خوف سے تھر تھر کانپ

رہے تھے۔

بدّی ـــــ

گوہر جان اتنی تیزی سے چیخیں کہ دوسرے کمرے سے بھاگ کر افروز دوڑی دوڑی آئی۔

پھر اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔

بدّی کا سر اماں کے زانو پر تھا۔ منہ سے جھاگ باہر آ رہی تھی ... گھوڑے کی طرح ان کے پیر ایسے ہل رہے تھے جیسے اسے چابک ماری گئی ہو۔

وہ .... مار .... ڈالیں گے .... مار ڈالیں گے ...

یہ کیا تماشہ ہے .....

وہ مار ... ڈالیں گے .....

گھوڑا مسلسل ہنہنا رہا تھا ـــــ

ہوش میں آؤ بدی ....

بنگلہ دیش .... بنگلہ دیش .....

ہاں، جانتی ہوں بنگلہ دیش میں بھی یہی ہوا تھا ....

... یہاں کچھ نہیں ہوگا۔

وہ چھوڑیں گے نہیں .... مار .... ڈالیں گے ... میری بیٹی .....

افروز اپنی جگہ جیسے تھم سی گئی۔ میری بیٹی ... گھوڑے کے اس آخری جملے نے اس کے اندر بھی تھرتھراہٹ بھر دی ... وہ غور سے آنکھوں میں مجبور جیسے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

بدّی ماما پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہے تھے۔

میری بیٹی ... وہ .... مار ڈالیں گے ـــ ان کی آنکھ آنسوؤں سے تر تھیں۔

میری بیٹی ..... میری زرینہ .... ؟؟؟

بائی اماں نے آنکھوں سے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔

پھر چیخیں ـــــ

افروز مالش کا تیل لے آؤ ـــ

وہ دوڑ کر تیل کی شیشی لے آئی .... اماں ہتھیلیوں کو تیل سے بھر کر ان کا سر دبا رہی تھیں۔ بدّی ماما کے پتلے، سوکھے پیر چارپائی سے باہر زمین پر لٹکے تھے۔ .... وہ سچ مچ کسی مریل گھوڑے جیسے دکھائی دے رہے تھے .... اماں کے ہاتھ تیزی سے ان کے سر پر دوڑ رہے تھے .. وہ حیرت سے دروازے کا سہارا لئے دیکھ رہی تھی۔ اماں بار بار تر ہو جاتی آنکھوں کو پلّو سے پونچھ رہی تھیں۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔

الگنی پر ادھر ادھر کپڑے بکھرے ہیں ...

یہ سب .....؟

افروز کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں تھیں ..

"بائی اماں۔ یہ سب کیا تھا؟

پھر جیسے گہرے کنویں سے بائی اماں کی آواز ابھری۔

بدّی کو ہنگامے سے ہول آتا ہے ... بیچارہ ..... پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں .... بنگلہ دیش میں اچھا خاصا خاندان تھا اس کا .... سبزی منڈی میں سبزیوں کے ٹھیلے لگاتا تھا۔ زرینہ تھی اور ایک بیٹا بھی تھا۔ شیخ مجیب کے وقت میں جب وہاں آندولن چھڑا تو بھاری مار کاٹ مچ گئی ـــ آنکھوں کے سامنے اس نے اپنے گھر خاندان والوں کو تکا بوٹیوں کی طرح کٹتے دیکھا ہے۔ وہاں سے بچ بچا کر جب یہاں آیا تو سب کچھ ہی کھو گیا تھا ـــ پھر کیسے کیسے یہاں رانی منڈی میں پہنچ گیا۔ نہ جیب میں کچھ نہ کھانے کو کچھ ـــ بتّن پان والے نے اسے میرے پاس بھیج دیا ... تب سے میرے یہاں ہے۔

بائی اماں بولتے بولتے ٹھہر گئیں ..... افروز نے بھی چونک کر دیکھا۔ دروازے پر سوچی ہوئی آنکھیں لئے بدّی کھڑا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلد کا آنا لازمی ہے

نام کتاب "اکائی سے پہلے" (مجموعہ کلام)
مصنف ضیاء الانجم، پرتاپ گڑھی
ضخامت :- ۱۱۲ صفحے قیمت :- ۲۰ روپے
ملنے کا پتہ :- ضیاء الانجم ۱۰۶ کینٹ جبل پور

"اکائی سے پہلے" ضیاء الانجم کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس میں غزلوں کے علاوہ کچھ دوہے، رباعیات، قطعات، اور آزاد غزلیں بھی شامل ہیں۔ پورے مجموعہ کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ضیاء الانجم کو اگرچہ اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کے اظہار کے لئے غزل کوئی پسند ہے مگر وہ ہر صنف سخن پر اسی آسانی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں جس طرح غزل میں ان کا رنگ جھلکتا ہے۔ البتہ آزاد غزل پر ان کی گرفت خاصی نظر آتی ہے۔ حالانکہ آزاد غزل ابھی اپنے تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ مگر موصوف نے جس طرح سے اپنے اشعار کو خوبصورتی بخشی ہے وہ قابل تعریف ہے اور یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل کا قاری ایسے خوبصورت اشعار کو آزاد غزل کا سرمایہ سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں مظہر امام نے "آزاد غزل گو شعراء" کی ایک فہرست مرتب کی تھی جس میں انہوں نے ضیاء الانجم کے نام کو چند اہم شعراء میں شمار کیا تھا۔

"ضیاء الانجم" کوئی نو وارد شاعر کا نام نہیں، بلکہ اس پختہ شاعر کا نام ہے جنہوں نے اپنی شاعری میں زندگی کے پچیس سالہ تجربات، داخلی اور خارجی احساسات کو اشعار کے پیکر میں ڈھالنے کا کام کیا ہے۔ بقول سلیم انصاری "ضیاء الانجم، عصری ادب کے ان نمائندہ شعراء میں ہیں جن کے یہاں غم ذات اور غم دوراں کے اظہار کے لئے علامتی پیکر کو اتنی خوبصورتی سے تراشا گیا ہے کہ کہیں بھی ترسیل کے المیہ کا احساس نہیں ہوتا"

چنانچہ نمونے کے لئے حاضر ہے۔

ضبط الم تسلیم ہے لیکن دل کو تمہاری یاد آئے تو
قلب کی روشنی تاریکی میں روح اگر گھبرائے تو

آئینے کی گرد جھاڑو خود نظر آ جائے گا
کس قدر بدلا ہوا ہے کل سے چہرہ آج کا
(ماخوذ غزلیات)

منہ پر ہیں تعریفیں پیچھے پیچھے ہے تکذیب
یہ کیسا اخلاق ہے یارو یہ کیسی تہذیب
(دوہے)

عشق بے پردہ سرِ عام ہوا جاتا ہے
عشق پھر مورد الزام ہوا جاتا ہے
اپنی تخلیق کی خود آپ حفاظت فرمائیں
لفظ "کُن" آپ کا بدنام ہوا جاتا ہے
(قطعہ)

جسم ایک گہری ندی ہے سانس موج مضطرب

کیوں نہ اس میں زور دریا دیکھئے

شہر کو دیکھئے یہ موجودہ سیاست کی ہے دین
اک طرف آبادیاں ہیں اک طرف ہیں بے کفن ویرانیاں
مری گندی عمر لوٹ آئے تو
ماںتا کی گود میں سو جاؤں سنکر لوریاں
(آزاد غزل)

ضیاء الانجم کے کلام میں کہیں بھی الجھاؤ نہیں ہے۔ جوش، جدت اور سادگی انکی شاعری کے اہم اجزاء ہیں وہ کہیں بھی ایسے الفاظ کا استعمال نہیں کرتے جو متروک ہوں۔ روحانیت و رومانیت بھی ان کی جولانی طبع کے مظہر ہیں۔

▲ انتشار بھاگلپوری

نام کتاب :- الہام

مصنف :- ابراہیم اشک • قیمت :- ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ :- سائی نواس، شانتی نگر کرلا بمبئی ۷۰
مکتبہ جامعہ بمبئی، دہلی، علی گڑھ

ابراہیم اشک کا شعری مجموعہ "الہام" خوبصورت چھپا ہے۔ سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہے۔ کلام بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ مطالعہ کے دوران بار بار دل سے آہ اور واہ نکلی۔ اکثر اشعار نے مجھے روک کر بہت کچھ کہا۔ اور میں غور کر کے متاثر ہوا۔ اشک کو شعر کہنے کا نہایت اچھا سلیقہ ہے نہایت سادگی کے ساتھ بہت کچھ سنا جاتے ہیں اور کیفیت پیدا کر جاتے ہیں۔ آپ کے کچھ اشعار مجھے بہت پسند آئے۔

اک محبت ہے کہ ہے جس سے زمانے کا نظام
یہ بھی چھن جائے تو ممکن ہے کہ دنیا نہ رہے
چلے گئے تو پکارے گی ہر صدا ہم کو
نہ جانے کتنی زبانوں سے ہم بیاں ہوں گے

زندگی اپنی مسلسل چاہتوں کا اک سفر
اس سفر میں بارہا مل کر بچھڑ جاتا ہے وہ

یہ بازار جہاں ہے بے غرض کوئی نہیں ملتا
پرکھ کر جب تلک دیکھو نہیں سب کو پرکھیو

چند اشعار ان کے اور بھی سُنئے۔

خوش ہو کے ہر فریب زمانے کا کھا لیا
یہ دل ہی جانتا ہے کہ دل پر نہیں ہے کیا

اجنبی لوگوں سے جب ملنا پڑا
اور بھی ہم تو اکیلے ہو گئے

دور ہی سے جاننے والے ملے ہر موڑ پر
فاصلے سارے مٹانے کو تڑپتا میں ہی تھا

تم جان کے بھی اس کو نہ پہچان سکو گے
انجانے میں وہ اور ہے، جانا تو کوئی اور

اس طرح کے سادہ لیکن دل میں اتر جانے والے اشعار اشک کے یہاں کافی ہیں جن سے میں متاثر ہوا اور میرے دل سے ان کے لئے اچھی اچھی دعائیں نکلیں۔ دعا ہے کہ خدا کرے اشک مستقبل میں اپنی نمایاں پہچان بنانے میں کامیاب ہوں اور ایک دنیا آپ کے اچھے کلام کی معترف بن جائے۔

▲▲

سُہیل

ماہنامہ

مجلسِ مشاورت

فہرست

شمارہ ۔۔ جلد ۵۲

بدلِ اشتراک

فی شمارہ .... ۵/- روپے

زرِ سالانہ .... ۵۰/- روپے

تاحیات .... ۱۰۰۰/- روپے

▲ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سُہیل

دلور ساشید روڈ، گیا

فون نمبر

انکم ٹیکس سے چھٹکارا پانے کے آسان طریقے

نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ / آٹھویں [illegible]

دستیابی :- سبھی ڈاک گھروں میں 500، 1000، اور 10000 روپے کی دستیابی
سود :- بارہ فی صد سالانہ در سے چکرورتی سود ہر چھ ماہی کے حساب سے چھ سال کے بعد بڑھتا ہے
ٹیکس راحت :- ان میں لگائی گئی رقم پر انکم ٹیکس قانون کے دفعہ 88 کے تحت چھوٹ۔ سالانہ
اضافت سود جو کہ پوری نیویشٹ سمجھا جاتا ہے، بھی انکم ٹیکس قانون کے دفعہ [illegible] میں چھوٹ کے قابل ہے

نیشنل سیونگ اسکیم 1987

نیویشن :- سبھی اہم اور چنے ڈاک گھروں میں کم از کم 100 روپے سے کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔ ایک مالی
سال میں زیادہ سے زیادہ 40,000 روپے نیویشن کر سکتے ہیں
سود :- گیارہ فی صد ہر سال دستیاب ہے۔ ●

پندرہ سالہ پبلک پراویڈنٹ فنڈ کھاتہ

نیویشن :- کم از کم 100 روپے سے کھاتا کھولا جا سکتا ہے۔ ایک مالی سال میں زیادہ سے زیادہ 60000
ہزار روپے نیویشن کر سکتے ہیں۔ ● سود :- بارہ فی صد ہر سال کمپاؤنڈ
ٹیکس راحت :- انکم ٹیکس قانون کے دفعہ 88 کے تحت چھوٹ دستیاب ہے۔ کورٹ اٹیچمنٹ سے بری۔
نکاسی :- چھ سالوں کے بعد نکاسی کر سکتے ہیں۔ تین سال کے بعد قرض لینے کی سہولت

دستخط :- [illegible] ڈائرکٹر
نیشنل سیونگس [illegible]

P.RD-8721 ([illegible]) 92-93

ہمارا بھارت ورش بھی عجیب ولیش ہے۔ جب دنیا کے ممالک معاشی ترقی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، ساری قومیں مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعہ بڑے بڑے انسانی مہمات سَر کر رہی ہیں ——— تو ہم مسجد مندر کے تنازعہ میں ہیں۔ اور مرکزی حکومت بھی اس مسئلہ کو اتنا اہم بنا کر پیش کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنی خوشحالی، اپنے مسائل کے حل اور نئے مسائل کے چیلنج کے لئے کچھ اور کرنا ہی نہیں ہے۔ جو قوم قصے کہانیوں کو حقیقت سمجھنے لگتی ہے اس کی حقیقت بھی کہانیوں کی طرح ختم ہو جاتی ہے۔ جو اپنی تاریخ کو نہیں سمجھتی وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ در اصل ہم اہم ترین بنیادی مسائل سے بھاگ رہے ہیں کہ ہمیں ان کو حل کرنے کی طاقت ہی نہیں ———

اس طرح عوام کو کچھ دنوں تک اس فریب میں مبتلا رکھ کر اقتدار کا لطف حاصل کرنا چاہتے ہیں ——— مگر کب تک مندر بن بھی گیا تو کیا ——— مسجد ٹوٹ بھی گئی تو کیا اور بچی تو کیا ——— ہم ہندوستان کے غریب معاشی طور پر بدحال اور سماجی طور پر ٹوٹے ہوئے لوگوں کو بہت دنوں تک بہلا دے سکتے ہیں؟

مسعود منتظر

اصغر علی انجینئر

پریم چند۔ حیات اور فن

قسط ۲

[illegible] ان کی کہانی کے کردار کے ان لفظوں سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ پریم چند نے اپنے استعفے میں کیا لکھا ہوگا۔ بہرحال پریم چند ۱۶ فروری ۱۹۲۱ء کو اپنی سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لئے سبکدوش ہو گئے۔ پریم چند کو اس استعفے سے جذباتی طور پر کتنی راحت محسوس ہوئی اس کا اندازہ ان کے خط سے ہوتا ہے۔ "گاؤں جانے کے ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک ماہ کے اندر پاخانہ کے ساتھ آؤں کا آنا بند ہو گیا۔ (اس طرح) غلامی سے نجات پاتے ہی نو سال کے پرانے مرض سے آزاد ہو گیا۔ اس تجربے نے مجھے تقدیر پرست بنا دیا ہے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند سرکاری ملازمت میں زبردست گھٹن محسوس کر رہے تھے اور اس نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کا علاج محض دواؤں سے ممکن نہ تھا۔ آزادی کی تحریک میں حصہ لے کر ہی ان کے جذبات کی تطہیر ممکن تھی اور ایسا ہوا بھی۔ ملازمت سے الگ ہوتے ہی وہ آزادی کی تحریک میں

حصہ لے کر ہی ان کے جذبات کی تطہیر ممکن تھی۔ اور ایسا ہوا بھی۔ ملازمت سے الگ ہوتے ہی وہ آزادی کی تحریک میں پورے جوش و خروش سے شامل ہو گئے۔ عدم تعاون کا پرچار کرنے لگے۔ مہاویر پرشاد پوت دار نے انہیں اس بات کی تحریک کی اور وہ ان کے ساتھ ان کے گاؤں مانی رام چلے گئے۔ دونوں دوستوں پر اب چرخے کا پرچار کرنے کی دھن سوار تھی۔ چرخے بنوانا اور گورکھپور لا کر انہیں بیچنا ان کا کئی دنوں تک مشغلہ رہا۔ زندگی کے اس دور میں پریم چند نے گویا چرخے کا پرچار اور ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کے نصب العین بنا رکھے تھے۔ وہ اس کام میں اتنے مشغول تھے (خاص طور سے چرخے کا پرچار کرنے میں) کہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۱ء میں ان سے مضمون طلب کیا تو پریم چند نے جواب دیا: "جامع مضمون لکھنے کے لئے بہت تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور میں ترک موالات کا ہیرو ہونے کے باعث فی الحال اس کے لئے کافی وقت نہیں نکال سکتا۔"

اس لیے طلب ہیں کہ پریم چند نے اس زمانے میں
ناول لکھنا ترک کر دیا تھا۔ وہ کہانیاں بھی لکھتے اور
اپنے ناول "گوشۂ عافیت" پر بھی کام کرتے رہے۔
اسی سال (۱۹۲۱ء) انہوں نے ایک کتابچہ سوراجیہ کے
بارے بھی لکھا۔ یہ کتابچہ ہندی میں "اسہیوگ" مالا میں
شائع ہوا۔ اس کے چند اقتباسات پیش کرنا دلچسپی سے
خالی نہیں ہوگا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس سے ان کے سوراجیہ
کے تصور پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے سیاسی خیالات کا
بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اپنے دیس کا پورا پورا انتظام جب پرجا کے
ہاتھوں میں ہو تو اسے سوراجیہ کہتے ہیں۔ جن دیشوں
میں سوراجیہ ہے، وہاں کی پرجا اپنے ہی چنے
ہوئے پنچوں کے ذریعے اپنے اوپر راج کرتی
ہے۔ وہاں یہ نہیں ہو سکتا کہ پرجا لگان اور
کروں سے دبی رہے اور ادھیکاری لوگ
دنوں دن فوج بڑھاتے جائیں۔ پرجا بھوکوں مر
رہی ہو۔ چاروں اور اکال پڑا ہو اور دیش
کا اناج دوسرے دیشوں کو ڈھویا جا رہا ہو۔
مرگی، ہیضہ وغیرہ بیماریاں پھیل رہی ہوں اور
ادھیکاری لوگ اس کو روکنے کا مناسب بندوبست
نہ کرتے ہوئے سیر و تفریح میں مشغول ہوں۔ غریب
مسافروں کو ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ مل
رہی ہو اور ادھیکاریوں کے لیے ایک پوری
گاڑی کھڑی رہتی ہو۔"

سوراجیہ سے متعلق پریم چند کے خیالات بڑے
سلجھے ہوئے ہیں اور وہ بہت ہی آسان لفظوں میں اپنی
بات پڑھنے والوں تک پہنچا دیتے ہیں۔
پریم چند [illegible] سوراجیہ [illegible] اس

کتابچے میں ایسی لکھی ہیں جن سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ
اور سماج رچنا کے پیچیدہ سوالوں پر گہری نظر کا قائل ہونا
پڑتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ جو باتیں انھوں نے اس وقت
انگریز افسروں اور حکمرانوں کے متعلق لکھی تھیں وہ آج
ہمارے افسروں اور حکمرانوں پر بھی لاگو ہوتی ہیں۔ اپنے اس
کتابچے میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"سوراجیہ حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ ان نظاموں
کو ترک کرنا ہے جو ہماری روح کو دباتے ہیں۔
اور اسے مفتوح کرتے ہیں۔ عدالتیں، سرکاری
نوکریاں، سرکاری تعلیم وغیرہ ہمارے روح کو کچلنے
والی، ہمارے من کے مقدس جذبات کو دبانے والی
ہمیں کوڑی کا غلام بنانے والی، ہماری واسناؤں
کو بھڑکانے والی تنظیمیں ہیں۔ ہمارے بچے بچپن
سے ہی سرکاری نوکریوں کی آشا کرنے لگتے ہیں،
اسی وقت سے ان کی آتم رکھشا کی طاقت
ختم ہونے لگتی ہے۔ انہیں پر کٹے پرندے کی
طرح اپنے دربے کے سوا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔
چاپلوسی کرنے کی اور گالیاں سہنے کی عادت پڑ
جاتی ہے۔"

اس دور کی عدالتوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"عدالتوں کا اثر اس سے کم نقصان دہ نہیں۔
وہاں مقدمے بازی کرنے والی جنتا اور ان کا
دھن لوٹنے والے وکیل، مختار دونوں ہی [illegible]
روح کو کچلتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی جھوٹ، چھل
کپٹ اور بے ایمانی کا زبردست ناٹک دیکھنا چاہے
تو اسے ایک بار عدالت میں جانا چاہیے۔ [illegible]
گواہ تیار کیے جاتے ہیں۔ [illegible]
بیان [illegible]

[illegible] [illegible] حاصل کرنے کے [illegible] کوئی ملک اپنے مفاد کے [illegible] سکتی ہیں۔ اور یہ سب تماشا [illegible] کے بھوکا رہتا ہے۔ آزاد ہندوستان کی عدالتیں بھی اس سے بہتر نظر [illegible] نہیں کرتیں۔ یہ تصور ذاتی مفادات، دولت اور اقتدار کے ذریعے انصاف کا کھلم کھلا سودا ہوتا ہے۔ غریب اور محنت کش عوام مشکل ہی سے ان عدالتوں سے انصاف کی امید رکھ سکتے ہیں۔ پریم چند آزاد ہندوستان کا جو تصور رکھتے تھے وہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

"ہم تو صرف اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شلپ اور کلا کی ترقی چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ سستا مال بنا کر کمزور ملکوں پر ٹیکس اور تجارت کے بہانے ان پر اقتدار حاصل کریں۔ اسی تجارتی مقابلے کی وجہ سے یورپ کی قوموں میں ہمیشہ عداوت رہتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ جنگ عظیم (پہلی عالمی جنگ) تھا۔"

منشی پریم چند کا سوراجیہ سے متعلق بڑا ہی صاف ستھرا تصور تھا۔ وہ استحصال اور لوٹ مار کے سخت خلاف تھے۔ چاہے اس کی شکل تجارت ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آزاد بھارت کو پونجی واد کے راستے سے بالکل الگ رکھنا چاہتے تھے تاکہ اس ملک کے عوام اور دوسرے پچھڑے ہوئے ترقی پذیر ملکوں کے عوام ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہیں۔ اور اپنی بنیادی ضرورتیں [illegible] فن کی ترقی [illegible] عوام ملک کی اس ترقی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پریم چند آزاد بھارت میں [illegible] کسانوں اور مزدوروں کو خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے زمانہ کے اکتوبر۔ نومبر ۱۹۲۶ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے

"یہ دھیان میں رکھنا چاہئے کہ مزدور اور کسان ایک ہو کر جو چاہیں کر سکتے ہیں ان کی طاقت اسیم ہے وہ جب تک بکھرے ہوئے ہیں گھاس کے ٹکڑے ہیں۔ ایک ہو کر جہاز کو کھینچنے والی رسی ہو جائیں گے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ سرمایہ دار ۹۵ فیصد منافع بانٹ لیں اور مزدوروں کی زندگی کی ضرورتیں بھی نصیب نہ ہوں، وہ ہوا اور روشنی سے بھی محروم رہیں۔ سرمایہ دار تو پیرس اور سوئٹزرلینڈ کی سیر کریں اور مزدور کو صبح سے شام تک سر اٹھانے کی مہلت نہ ملے۔ زمیندار اور تعلقدار صاحب تو عیش منائیں، شکار کھیلیں، [illegible] کسانوں کو روٹیاں بھی نصیب نہ ہوں۔ اس کی کمائی نذرانے، بیگار، [illegible] خانہ، کھتیانی وغیرہ کی صورتوں میں زمیندار کے عیش کا سامان مہیا کریں۔ بہرحال، ان طبقوں (سرمایہ دار اور زمیندار) سے کانگریس کی مخالفت کی بہت زیادہ ہے۔ اور سوراجیہ کی تحریکوں میں ان سے اشکا ناطے شدہ بات ہے:"

پریم چند کا یہ عقیدہ مشہور تھا جو انہیں گاندھی واد سے آگے لے گیا اور وہ کمیونزم کے سماجی تصور سے قریب تر ہو گئے۔ ان کے اصلی جذبات کا اظہار ان کے ایک مشہور مضمون مہاجنی تہذیب میں ہوا ہے جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنی موت کے تین مہینوں پہلے ہی لکھا تھا۔ اس مضمون کا تفصیلی ذکر

[illegible]

[illegible]

[illegible] ان کے [illegible] کے ساتھ [illegible]

گرم دل کے [illegible] وقت تھی [illegible] تحریک آزادی [illegible]

[illegible] گرم [illegible]

[illegible]

اپنے ایک خط [illegible] آپ نے

مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کس پارٹی کا ہوں؟ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں

اس لئے کہ [illegible] پارٹی کے نرم اور گرم دل کی طرف

اشارہ ہے [illegible] میں تو اس آنے والی پارٹی کا

ہوں جو [illegible] کو اپنا دستور العمل بنائے۔

منشی جی دھیرے دھیرے کانگریس کی [illegible]

بازی کی پالیسی سے بیزار ہونے لگے۔ ان کی ہمدردی صرف

ایسی ہی سیاسی جماعت سے ہو سکتی تھی جو ہر طرح سے غریب

اور کچلے ہوئے عوام کا بغیر کسی تحفظات کے ساتھ دینے کے لئے

تیار ہو۔ اسی عہد میں ہمیں ان کی تخلیقات جیسے کہ ان

کے ناول "رنگ بھومی" یا کہانیوں مثلاً "سوا سیر گیہوں"

"[illegible]" جیسی کہانیوں میں بھی ایسے کردار

نظر آتے ہیں جو ہر طرح سے نادار ہیں اور انقلاب ہی ان کی

زندگی کی آخری امید ہے۔ ان کرداروں کے دکھوں سے

ہمارا دل دہل جاتا ہے اور ہمیں لوٹ کھسوٹ مچانے

والوں سے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۳۲ء

میں لکھے گئے اپنے ایک خط میں نگم کو لکھتے ہیں۔

"ملک اس کا (سرمایہ دار کا) ایمان ہے۔ وہ یا تو

آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لئے قیمت نہ دے گا

دوسروں [illegible] کرنا ہی اپنی شان کے مناسب

سمجھتا ہے یا وہ اسی خیال میں مگن ہے کہ آپ

[illegible] آزادی [illegible] کانگریس کے دور

[illegible] کانگریس کے [illegible]

[illegible]

دیکھنا ہے کہ جو کچھ [illegible] اور جسے [illegible]

سمجھتا ہے وہ دوسروں کے ایثار و قربانی [illegible]

ہے پھر وہ ایثار اور قربانی میں فرق [illegible]

یہی پورا روا رکھتا ہے اور یہی [illegible] فرقے کو دوسرے

فرقے کا دشمن بنا دیتا ہے۔"

اس خط کے چند مہینوں بعد [illegible]

رسالے [illegible] کے [illegible] ۱۹۳۲ء کے [illegible] میں [illegible]

قلمبند کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"دو مینش پارٹی کا نگریس کے ان [illegible]

اشارہ ہے جو [illegible] کے حق [illegible]

دیکھتا [illegible] ہمارے [illegible]

زمیندار ہمارے [illegible]

آتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ [illegible]

سوراجیہ کی دُنیا میں انہیں کچھ [illegible]

گا۔ سوراجیہ میں [illegible]

اتنی کمزور نہ رہے گی [illegible]

کے ڈر سے [illegible]

پڑتا ہے۔ وہ اپنے دل میں سمجھ رہے ہیں کہ [illegible]

کے مفادات کی حفاظت انگریزوں [illegible]

ہو سکتی ہے۔ سوراجیہ کبھی انہیں غریبوں کو

کچلنے اور ان کا خون چوسنے نہ دے گا۔

[illegible] غریبوں کی آواز ہے [illegible]

کاشتکاری پر مرنے جینے والوں کی"

کتنا صاف ذہن تھا ان کا [illegible]

لیکن منشی جی کے تصور کا سوراجیہ [illegible]

آج تک قائم نہیں ہو سکا ہے۔ آج بھی [illegible]

چوسنے والے اور ان کی [illegible]

[illegible] پر حاوی تھا۔ پریم چند اپنی [illegible] کی شدت کو کم کرنے کے لئے کسی اداریے میں آگے [illegible]

[illegible] ہمارا ہے، زمیندار اور سرمایہ دار [illegible] میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ جگہ ہے صرف اپنے لئے۔ لیکن جس آدمی کے دل میں غریبوں کی درد ہے، [illegible] کی بری حالت دیکھ کر شعلہ سا اٹھتا ہے، جوان کا خاموش درد دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا ہے۔ وہ کسی ایسے سوراجیہ کے تصور سے مطمئن نہیں ہو سکتا، جس میں کچھ اونچے درجے کے آدمیوں کا مفاد ہو۔ اور عوام کی حالت جیوں کی تیوں بنی رہے۔ ہماری لڑائی صرف انگریز حکمرانوں سے نہیں، ہندوستانی حکمرانوں سے بھی ہے۔ ہمیں ایسے آثار نظر آرہے ہیں کہ یہ دولت مند حکمران طبقہ اس ادھارمک لڑائی میں آپس میں مل جائیں گے اور عوام کو دبانے کی، اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔"

پریم چند کی دوربین نگاہوں نے سماجی صورت حال کا کتنا صحیح تجزیہ کر لیا تھا۔ وہ تحریک آزادی کے لئے لڑنے والے لوگوں کی طبقاتی کردار سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اس کا بالکل صحیح شعور رکھتے تھے کہ یہ کہاں اور کس موقع پر اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ پریم چند کے تصور کا سوراجیہ [illegible] قائم نہیں کر سکے ہیں۔ آج بھی عوام کی اور [illegible] کی حالت بہت بری ہے اور [illegible] کو حکمران طبقے کچلنے کی کوشش کرتے رہتے [illegible] پریم چند عوام کے مسائل کو لے کر بڑے زور

[illegible] اداریے [illegible] لکھتے رہتے تھے۔ جس میں سے ایک اور اداریے میں لکھتے ہیں:

"کانگریس کے ممبر یا اور لوگ بھی کبھی کبھی انصاف اور اصول کے ناتے بیٹھے ہی کسانوں کی وکالت کریں، لیکن کسانوں کے طرح طرح کے دکھوں اور مصیبتوں کا انہیں وہ احساس نہیں ہو سکتا جو ایک کسان کو ہو سکتا ہے۔ سب چھوٹے بڑے اسی کو نوچتے ہیں، سب اسی کا خون اور گوشت کھا کھا کر موٹے ہوتے ہیں۔ پر کوئی اس کی خبر نہیں لیتا۔۔۔ ان کی (کسانوں کی) طاقت بکھری ہوئی ہے۔ اگر انہیں منظم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو سرکار، زمیندار، سرکاری ملازم اور مہاجن سبھی بھنا اٹھتے ہیں چاروں اور سے ہائے ہائے مچ جاتی ہے — 'بالشوزم' کا ہوا بنا کر اس تحریک کو جڑ سے کھود کر پھینک دیا جاتا ہے۔"

کیا ٹھیک یہی بات ہمارے دیش میں نہیں ہو رہی ہے؟ کیا بے زمین کسانوں کو بڑے بڑے زمیندار اور مہاجن آج بھی لوٹ نہیں رہے ہیں۔ کیا آج بھی ان کسانوں کے اندولن کو کچلنے کی سازشیں نہیں ہو رہی ہے؟ پریم چند نے نہ صرف اپنے اداریوں بلکہ میدان عمل اور گئودان جیسے ناولوں کے ذریعہ بھی کسانوں کی ناقابل رحم حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ "ہنس" میں [illegible] رہے تھے وہ انگریز سرکار کی برداشت سے باہر تھا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں جب "ہنس" کا چوتھا شمارہ شائع ہو چکا تھا اور پانچواں شمارہ پریس میں تھا، سرکار نے پریس سے ایک ہزار روپے کی ضمانت مانگی، تو پریم چند نے اس شمارے کو کسی اور پریس میں چھپانے

ئی لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، ایسے شعلہ
کے پرچار کرنے والے پرچے کو چلانے کے لئے کوئی
دیتا۔ آخر مجبور ہو کر رسالے کو بند کر دینا پڑا۔
لیکن پریم چند کہاں خاموش بیٹھنے والے تھے۔
کے سینے میں آزادی اور انصاف کے لئے جو تڑپ
۔ انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ دلتو دشنکر ویاس
ب پندرہ روزہ جاگرن نکالنا شروع کیا تھا۔
شنکر اسے چلا نہیں سکے اور اس کے خریداروں کا
۲۰۰ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ پریم چند نے اب
ذمہ داری کو سنبھالا اور اب اسے ہفتہ وار کی
میں نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں
جینندر کو لکھا: "تمہارا ارادہ بھی ایک ہفتہ وار رسالہ
نے کا تھا یہ تمہارے لئے ہی سامان ہے۔ میں جب
لے چلاتا ہوں پھر یہ تمہاری چیز ہے۔ پیسے کی کمی ہے۔
میں بھی کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں۔ لیکن ہفتہ
نکالنے کی لالچ کو نہ روک سکا۔" جاگرن کا پریم
ادارت میں پہلا شمارہ، ۲۲ اگست ۱۹۳۲ء میں
شائع ہوا۔ "جاگرن کا نیا روپ" کے عنوان سے
انہوں نے لکھا:

"جاگرن" کے ادبی رسالہ کی شکل میں جنم لیا تھا۔
اپنے بچپن کے بارہ شمارے پورے کر کے اب وہ
ایک وسیع حلقہ میں آگیا ہے، اس کا جنم اچھے
گھرانے میں ہوا۔ اس کی پرورش قابل ہاتھوں
میں ہوئی۔ پرکھنے والے پرکھ گئے کہ یہ بالک
ہونہار ہے پر ادب کے محدود دائرے میں
اس کی ترقی جتنی ہونی چاہئے تھی ویسی نہ ہو سکتی
تھی۔ ہاتھ پاؤں نکالنے والا بالک ہونہار ہے۔

ہاتھ پاؤں والے
والا بالک سنسار میں کب تک رہتا۔ اس لئے
اس کے جنم دینے والوں کو اسے ابھارنے
کی ضرورت پڑی جو ذرا سخت ہاتھوں سے اس
کی گوشمالی کر دیا کریں جو ممتا بھرے ماکھن اور
مصری کی جگہ سوکھے چنے اور روکھی روٹیاں کھلائیں
کیونکہ سنسار میں پہلے چاہے لاڈ پیار میں پلے
بالکوں کو بڑھنے کا موقع ملتا رہا ہو اب تو
وقت ان کے موافق نہیں رہا۔ آج سنسار میں
وہی بالک بازی لے جاتا ہے جس نے بچپن میں کڑیاں
جھیلیں ہوں۔ دھکے کھائے ہوں۔ بھوکے سوئے
ہوں۔ جاڑے میں ٹھٹھرے ہوں۔ گملے کا پودا
دھوپ اور بارش کا سامنا کیا کرے گا وہ میدان
پر اگا ہوا پودا ہی ہے جو جیٹھ کی جلتی لو، ماگھ
کی سخت سردی اور بھادوں کی موسلا دھار بارش
میں ڈٹا کھڑا رہتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔
ہمارے اوپر اس کی نگاہ پڑی۔ ہم کہہ نہیں
سکتے کہ ہم کیوں اس کام کے لئے چنے گئے۔ ہم
اس کام کے بہت عادی نہیں ہیں۔ ابھی تک ایک
چھوٹا بالک ہے اور اسے بھی کتنی بار مشکل میں ڈال
چکے ہیں۔ شکاریوں کے دو نشانے اس پر لگ چکے
ہیں۔"

پریم چند کے لئے "جاگرن" کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں
تھا۔ ان پر کافی مالی بوجھ پڑا۔ دو مہینے بھی نہ بیتے تھے
کہ اپنے دوست نگم کو لکھا:

"جاگرن" ہفتہ وار میں خوب جیت پڑ رہی ہے
پر بہت گھاٹے میں نکلے جاتا ہوں۔ دیکھئے اونٹ
کس کروٹ بیٹھتا ہے۔"

[illegible] داشت

کرنا [illegible] کا کسی

نہ کسی طرح [illegible] جاری رکھ سکیں۔ ہنس کا اکتوبر

[illegible] اس شمارے میں انہوں

نے ایک [illegible] کے عنوان سے لکھا۔ اس

[illegible]

"[illegible] حکومت کے خلاف زبان کھولنا پہلے سے بڑا

جرم [illegible]۔ وہاں امن کے خیالات

[illegible] بہت دن تک امن کی حفاظت

نہیں کی جا سکتی ۔۔۔ مذہبی اداروں نے حکمرانوں

سے اسی طرح اپنے کو ملا رکھا ہے اور جمہوریت

کی اتنی مخالفت کی تھی اور کر رہے ہیں کہ جنتا اب

آزادی کی نئی امنگ میں مذہبی انجمنوں کو مٹانے

پر تلی ہوئی ہے۔ روس اور اسپین دونوں ہی

ملکوں کی یہی حالت ہے۔ ہندوستان میں کچھ

وہی ہوا چلتی نظر آتی ہے۔"

"ہنس میں "انت" نامی کہانی کی اشاعت پر سرکار

سے ایک ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ پریم چند کی

حالت بہت خراب تھی۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں اس کا

ذکر کرتے ہوئے جنتیندر کو لکھا۔

"بہت پریشان ہوں۔ بھاگا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ وہاں

چیف سکریٹری سے مل کر کہانی کا مقصد سمجھایا اور

اپنی لائلٹی کے ثبوت دیئے۔ اب امید ہے کہ

ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔ ذرا سی بات میں

گردن پر چھری چل جاتی ہے"

ان زیادتیوں کے باوجود پریم چند صحافت کے

میدان [illegible] رہے۔ یہ صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً انہیں

[illegible] بھی جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن میدان

[illegible] کی صورت

نکال کر [illegible] عوام میں قومی

آزادی اور [illegible] کے جذبات پیدا کر سکیں

اور [illegible] ہندوستان کی

[illegible] (جاری)

گیان چند

مولانا حالی سے قبل اردو میں تنقیدی افکار

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو تنقید کی پہلی مستقل کتاب مقدمۂ شعر و شاعری ہے جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ دراصل یہ بھی مستقل بالذات کتاب نہ تھی بلکہ دیوان حالی کا مقدمہ تھی۔ یہ مقدمہ اتنا طویل اور [illegible] تھا کہ اسے بعد میں ایک کتاب کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اور اس کو جدید اردو تنقید کی پہلی کتاب مانا گیا۔ عربی فارسی شعریات میں کوئی فن تنقید کے نام سے نہ تھا۔ ادب کے شعبہ بلاغت کے تحت کئی علوم تھے۔ کم و بیش انہیں کلاسیکی تنقیدی افکار کا امین کہا جا سکتا ہے۔ بلاغت کے تحت ذیل کے علوم آتے تھے۔

معانی، بیان، بدیع، عروض، قافیہ

ان میں معانی ایسا علم ہے جو اردو میں سب سے زیادہ مغالطے کا شکار رہا ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے مفہوم سے خبردار نہیں۔ اسے عام طور پر علم بیان کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جدید شعریات کے نباض شمس الرحمٰن فاروقی بھی اسے [illegible] کر گئے۔ [illegible] اردو [illegible] کی کتاب درس بلاغت (۱۹۸۱ء) میں اپنے بنیادی مضمون "بلاغت کیا ہے" میں لکھتے ہیں۔

"علم بدیع کو علم معنی بھی کہتے ہیں ۔۔۔۔ جب ہم معنی و بیان کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس میں بھی معنی سے دراصل بدیع مراد ہوتی ہے۔" ص[illegible]

علم معنی کی تعریف و تفصیل نجم الغنی کی کتاب بحر الفصاحت میں ملتی ہے جہاں اسے بیان اور بدیع سے الگ ایک مکمل علم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی انفرادیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا بیان بڑے سائز کے ۲۲۹ صفحات کو محیط ہے۔

بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ علم معانی ایسے قواعد کا نام ہے جن سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ کلام میں آئی مخصوص لفظ مقتضائے حال کے مطابق ہے کہ نہیں۔ علم معنی کے مفہوم کا احاطہ اس کے حسب ذیل آٹھ موضوعات سے ہو سکتا ہے

۱۔ اسناد خبری ۲۔ مسند الیہ ۳۔ مسند ۴۔ متعلقات فعل ۵۔ قصر ۶۔ انشا ۷۔ وصل و فصل ۸۔ [illegible]

الفاظ و عبارات

ان اصطلاحوں کی تشریح میں جائے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بحث کچھ نحو سے مماثل ہے۔ علم معانی کی افادیت کے تمام دعووں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ یہ محض مجرد اصولوں کا گورکھ دھندا ہے جو شان اطلاق نہیں۔ محض ذہنی ورزش ہیں۔ کلاسکی دور میں بھی ادبی بحثوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کے مقابلے میں علم بیان کا ہمیشہ اطلاق ہوا ہے۔ اس کے چار موضوعات تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ ہیں۔

بدیع، عروض اور قافیہ کا موضوع ان کے نام ہی سے ظاہر ہے۔

ہر عہد اور ہر زبان میں قافیہ شعر کی جان رہا ہے۔ غیر مہذب قبائلی افراد اور بچے تک قافیہ پیمائی کرتے ہیں۔ اس خوشگوار عمل کو مشرقی شعریات کے علم قافیہ نے لایعنی اصولوں میں الجھا کر اس طرح بے رس بنا دیا ہے کہ یہ بھی علم معانی کی طرح محض ذہنی اوجھڑ پن ہو کر رہ گیا ہے۔ علم قافیہ کا مرکز حرف روی ہے۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنے کے باوجود بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ حرف روی کسے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے مجموعہ مضامین "آواز اور آدمی" میں مشمولہ مضمون "قافیہ" میں بہت درست لکھا ہے۔

"قافیہ ایک سادہ صوتی تنظیم ہے لیکن قدما نے غیر ضروری موشگافیوں سے اسے پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے اور ایک مستقل علم کی بنیاد رکھ دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علم قافیہ کی خشت اول ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے۔ یہ علم چند غلط مفروضات پر قائم ہے۔ ان مفروضات کی غلطی واضح کر دی جائے تو سارا علم پادر ہوا ہو جاتا ہے۔"

(آواز اور آدمی۔ حیدر آباد ۱۹۸۳ء ص ۴۵)

علم قافیہ بڑی حد تک غیر ضروری ہے یہ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے دور میں رسالوں میں عروضی بحثیں تو شدومد سے کی جاتی ہیں لیکن علم قافیہ کے احکام کی نہیں۔ پھر بھی اتنا ماننا ہوگا کہ علم قافیہ کا ایک تھوڑا سا جزو ضرور مفید ہے مثلاً عیوب قافیہ میں 'اقوا' یعنی روی کے ماقبل کی حرکت کا مختلف ہونا۔ میر اثر کا شعر ہے۔

یہ درختوں کے پات ہلتے ہیں
یا با افسوس ہاتھ ملتے ہیں

قافیے سے بے نیازی کے موجودہ دور میں بھی ہلتے اور ملتے کے قافیے کو پسندیدہ نہ کہا جائے گا

بلاغت کا ایک اور موضوع ہے جو براہ راست مندرجہ بالا کسی علم میں شامل نہیں لیکن بلاغت کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ہے اقسام نظم و نثر۔ اصناف نظم کی حد تک کوئی دشواری نہیں۔ گتھی پڑتی ہے اصناف نثر میں۔ قدیم نقد میں نثر کی سہ گانہ تقسیم کی جاتی تھی۔ ۱۔ سلیس و دقیق، ۲۔ سادہ و رنگین ۳۔ عاری، مسجع، مرتجز۔ گویا موضوعاً سے ایک قلم صرف نظر کر لیا تھا شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔

"بعض علما نے تاریخ گوئی، معما، توارد، سرقہ کے تعین وغیرہ کو بھی علوم بلاغت میں قرار دیا ہے لیکن اگر بلاغت کی صحیح تعریف ذہن میں رکھی جائے تو یہ معاملات .... بلاغت سے چنداں متعلق نہیں معلوم ہوتے۔"

(درس بلاغت ص ۱۶)

بحر الفصاحت میں نجم الغنی نے تاریخ گوئی اور معما کو صنائع کے تحت لیا ہے اور سرقے کو ضمیمے میں۔ توارد کو بھی سرقے کا ہم صنف ۔۔۔ [illegible]

رشاذ ہے۔ اس طرح تاریکی و سرقہ، بلاغت کے اجزا اور یاد ہوں لیکن یہ روایتی تنقیدی شعور کے عناصر ضرور ہیں۔

تنقیدی روایات سے متعلق دو مزید علوم جو بلاغت کے تحت نہیں آتے لغت اور قواعد ہیں۔ لغت سے لفظوں کے صحیح تلفظ، معنی، اشتقاق اور محاوروں کا پتہ چلتا ہے۔ قواعد سے مشتق الفاظ کی صحیح شکلوں اور کلام کی درست ترتیب کی رہنمائی ہوتی ہے۔ قدیم نقد شعر کے عارف کے لئے لغت اور قواعد پر عبور ضروری تھا۔

عرب میں ایک طبقہ راویوں کا ہوتا تھا جو منجملہ دیگر روایات کے سینکڑوں شعرا کا کلام سنانے پر قادر ہوتا تھا۔ اگلے زمانے میں اردو میں بھی سخن شناسوں کے لئے یہ مستحسن تھا کہ انھوں نے کثرت سے قدما کا کلام پڑھا ہو۔ آب حیات میں آزاد نے ذوق کے لئے لکھا تھا کہ انھوں نے اساتذہ سلف کے ساڑھے تین سو دیوان دیکھے تھے اور ان کا خلاصہ تیار کیا تھا۔ دیوان ذوق کے مقدمے میں یہ تعداد بڑھ کر ۔۔۔ ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ آزاد کا تراشا ہوا افسانہ ہے لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہی ہوتا ہے کہ سخن داں کے لئے بہ کثرت اساتذہ کا کلام پڑھنا ضروری تھا۔ وجہ؟ تاکہ وہ ان کی تقلید سے باہر نکل سکے۔

اس ڈھنگ کی تنقیدی سوچ اور ادبی معیاروں کا اندازہ ذیل کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔
۱۔ منظومات میں شعر کے حسن و قبح سے متعلق اظہار۔ ۲۔ تذکروں میں ادبی تحریکوں، ادبی ماحول کی تبدیلیوں، شاعروں میں اعتراضات اور سند کے ساتھ ان کے جوابات کا بیان۔ ۳۔ تذکرہ میر کے آخر میں ریختے کی اقسام اور مصحفی کے انتخاب دواوین نیز قادر بخش صابر

کے تذکرہ گلستان سخن میں بلاغت سے متعلق مقدمہ ۱۵۔ باقر آگاہ کی مثنوی۔ گلزار عشق کا مقدمہ اور کلیات فائز دہلوی کا طویل فارسی خطبہ۔ بعض متفرق کتابیں مثلاً مرزا جان طپش کی شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان، انشا و قتیل کی دریائے لطافت، رنگین کی مجالس رنگین۔ ۱۶۔ تقریظیں جن میں غالب کی نگارشات سب سے نمایاں ہیں۔

وقت اور جگہ کی تنگی کے سبب میں ان میں سے چند کے بارے میں اشارے کرتا ہوں۔ منظوم تنقید کی قدیم مثال وجہی کی قطب مشتری میں ملتی ہے۔

جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس وغیرہ

ولی کہتے ہیں۔

ولی شعر میرا سراسر ہے درد
خط و خال کی بات ہے خال خال

۱۷۔ ابہام کی ادبی تحریک کے بارے میں کئی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ بعض نے میر درد یا میر کے یہاں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے مشاعروں اور ان کے مباحث شعری کی روداد پیش کی ہے۔ مصحفی نے انتخاب دواوین کے مقدمے میں اصناف شعر کی تفصیل پیش کی۔ صابر کے گلستان سخن میں یہ موضوع اور تفصیل سے ہے جس میں الفاظ فصیح و غیر فصیح، علم عروض و قافیہ نیز اقسام نظم کی شرح کی گئی ہے۔ باقر آگاہ نے گلزار عشق کے مقدمے میں زبان کے بارے میں لکھا تو فائز نے طویل فارسی مقدمے میں تشبیہات کاذب، ایہامات ناخوش، استعارات بعید اور تکلفات، نامطبوع وغیرہ سے پرہیز کا مشورہ دیا۔ طپش کی شمس البیان میں اردو کے محاورے سند اور کہاوتیں پیش کی گئیں۔

اس دور کے مشاعروں میں نہ صرف اشعار پر داد
دی جاتی تھی بلکہ [illegible] پر اعتراض بھی کئے جاتے تھے۔
جن کا فی البدیہہ جواب دینا ہوتا تھا۔ شاگردوں کے
کلام پر اعتراض کا جواب استاد دیتے تھے۔ یہ اعتراضات
زیادہ تر بحر، قافیہ، محاورے اور روزمرہ وغیرہ سے متعلق
ہوتے تھے۔ شاذ مضمون شعر کے کسی پہلو پر بھی اعتراض کیا
جاتا تھا۔ جواب کا مسکت طریقہ قدما کی سند پیش کرنا
تھا۔ قدیم علوم بلاغت اور لغت و قواعد کے پس منظر میں
اعتراض و سند کی ہنگامہ آرائی ہی اس دور کی تنقید کی
کائنات تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ ہوتی
ہے۔ اردو ادب میں اس کا اظہار علی گڑھ تحریک اور انجمن
پنجاب لاہور کے مشاعروں کی شکل میں ہوا۔ حالی کے مقدمے
سے پہلے تین اہل فکر سب سے اہم ہیں۔ غالب، سرسید
اور محمد حسین آزاد قدما آزادیٔ فکر و اجتہاد کے دشمن
اور تقلید کے نام لیوا تھے۔ ان کے علی الرغم غالب نے
کھل کر لکھا۔

• یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق
ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے:

ان کے چند اور اقوال

• بالجملہ سہل ممتنع کمال حسن کلام ہے اور بلاغت
کی نہایت ہے:

• بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں:

• فارسی میں تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور
ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔

اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ کے ہادی سر سید تھے
جن کے نظریات معروف عالم ہیں۔ دوسری طرف لاہور
میں ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائیڈ وغیرہ نے آزاد کو
مغربی نظریات ادب سے آشنا کرایا جس کے زیر اثر
انہوں نے انجمن پنجاب کے ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۴ء کے دو لیکچروں
نیرنگ خیال کے ابتدائیے نیز آب حیات میں جدید خیالات
کی بشارت دی۔ لیکچر میں کہتے ہیں۔

• تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی
ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے
ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں وصل
کا کچھ لطف، بہت سے حسرت و ارمان اور اس سے زیادہ
ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں فلک کی شکایت
اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی خیالی
ہوتے ہیں اور بعض وقت ایسے پیچیدہ اور دور دور کے
استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ
اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں۔

نیرنگ خیال میں لکھتے ہیں۔

• اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک
کہانی، طوطے یا مینا کی زبانی سنا لیں۔ ترقی کریں
تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں۔
دیو بنائیں اور ساری بات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب
کچھ اور وقت ہے۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا
چاہیئے۔ علوم و فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہئیں
جو صاف و شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہمارے بزم
کلام میں سجائیں

اردو کی کلاسیکی تنقید عروض و قافیہ، محاورہ،
روزمرہ، تذکیر و تانیث وغیرہ کے مباحث کے گرد گھومتی
تھی۔ غالب اور آزاد نے اجتہاد کا راستہ دکھایا۔
آزاد بالطبع قدیم ادب کے دلدادہ تھے لیکن زمانے کے جبر
کی وجہ سے جدیدیت کے نقیب بنے۔ حالی اپنے مقدمے میں
آزاد سے بھی کئی قدم آگے [illegible]

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط [illegible]

دو لفظ جدید شاعری کے بارے میں بھی عرض کروں ۔ اس کے خلاف اور موافقت میں تو بہت کچھ لکھا جا رہا ہے ۔ آپ نے ضرور پڑھا ہوگا ۔ شاعر جدید شاعری کرتا ہے یا وہ ترقی پسند ہے یا قدیم اسلوب کو اپناتا ہے ۔ اگر اس میں شعر کہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم ہے تو وہ جہاں کہیں ہوگا عمدہ شعر ہی اختیار اچھا کہنے پر مجبور ہوگا ۔ ایک اور بات جو خلاف میں کہی جاتی ہے وہ ہے "ابہام" کا مسئلہ یعنی قاری کی سمجھ میں بات نہیں آتی ۔ "المعنی فی البطن شاعر" اس مسئلہ سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ ایسا شعر جس کا ترسیل جس کا جو جیسا چاہے کرے تو وہ شعر نہیں Communication کا ریزرویشن ہو گیا ۔ دو مثالیں دے رہا ہوں ۔ یہ سیاسی بحث نہیں [illegible] وہاں سے [illegible] تو وضاحت کر دوں کہ شاید جس ابہام کا [illegible] آئے گا [illegible] Dynamic [illegible] [illegible] [illegible]

جب جینک کو ہوائی جہاز [illegible] کا سوال کیا تو وزیر مالیہ نے فرمایا کہ اس کا [illegible] (Control) ہوگا ۔ [illegible] سمجھا دی ۔ غیر ضروری ۔ جدید اشعار جن میں روح غزل ہے جو غزل کی نمائندگی کریں گے ۔

۱۔ یہ کیا طلسم ہے جو رات بھر سسکتا ہوں
یہ کون ہے جو دیوں میں جلا رہا ہے مجھے

(ساقی فاروقی)

۲۔ خوشبو کا جسم سائے کا پیکر نظر آئے
دل بھی کبھی ڈھونڈتا پھرے [illegible]

(شہریار)

۳۔ اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم
روز پیغام [illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible] بہرحال [illegible]

اب ایک آخری بات بھی عرض کرتا چلوں۔ حالاں کہ آخری
بات [illegible] اہم اتنی ہی ہے جتنی پہلی بات اور وہ یہ
[illegible] غزل گو شعرا کی فہرست پیش کی ہے
ایسی بات [illegible] کہ ان بارہ شعرا جو کچھ کہا سب پر غزل کا
اطلاق ہو۔ ایسا بھی نہیں۔ اس لئے کچھ نمونہ کے لئے اشعار
پیش کر دوں۔

چھپے ہرگز نہ مشکل ہو وہ پردوں کے چھپانے سے
مزہ پڑتا ہے جس گل پیرہن کو بے حجابی کا

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حور بہشت
پر کہاں یہ شوخیاں یہ طور یہ محبوبیاں
(درد)

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
کرتا ٹوپی خرقہ جبہ مستی میں انعام کیا

کیسے ہیں زر ہو تو چپنا جو یاں
تم سے کتنے ہماری جیب میں ہیں (میر)

ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے
(مومن)

[illegible]
دھوکے دیے جا رہے احرام [illegible]

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں
(غالب)

گلوں پھولے صبا افسوس کیا غربت برستا ہے
کسی دن تو گریباں ان غریبوں کے لئے پھرتے

کشیدہ رکھو گے مجھ سے کب تک تم اپنے ابروے جاں ستاں کو
شکار کرنا تھا کر چکے بس اتار بھی دو کڑی کماں کو
(مشاکو)

یہاں لب و لہجہ موجود ہے مگر مضمون محض رسمی ہے۔

۱ مستی کے پھر آ گئے زمانے
آباد ہوئے خرابات خانے
۲ ہر پھول چمن میں زر بکف ہے
بانٹے ہیں بہار نے خزانے
۳ سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے
چھیڑا جو لطف اک صبا نے
۴ سرسبز ہوا نہال غم بھی
پیدا وہ اثر کیا ہوا نے
۵ رندوں نے پھاڑ کر بہا دی
واعظ کے نہ چل سکے بہانے
۶ کر دوں گا میں بہروں کو مے خوار
توفیق جو دی مجھے خدا نے
۷ ہم نے تو شکار کر دیا دل
اب جانے وہ تیر یا نشانے

۸ بھلا دے کیا تجھ کو
ساقی کی نگاہ آشنا نے
۹ مسکن ہے قفس میں بلبلوں کا
ویران پڑے ہیں آشیانے
۱۰ اب دل سے نہ عاشقی کے چرچے
سب خواب وہ ہو گئے سہانے
۱۱ اب کام ہے کو وہ آئیں گے حسرت
آغاز جنوں کے پھر زمانے

(حسرت موہانی)

یہ غزل خاص طور پر پوری پیش کر دی۔ ۱ سے ۶ تک تو کسی بھی شعر پر غزل کے شعر کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ کلیم الدین نے خاص طور پر ۲ اور ۳ کی تعریف کی ہے۔ اچھا شعر ہو سکتا ہے

ایک بار پھر گزارش کر رہا ہوں کہ ہر اچھا شعر ضروری نہیں کہ غزل کا ہی ہو اور ہر اچھے شعر پر یہ تہمت ان گزرتی ہے۔ اگر اس میں تغزل کی بو باس نہ ہو۔

ہر پھول چمن میں زر بہ کف ہے
بانٹے ہیں بہار نے خزانے
سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے
چھیڑا جو لطیف اک صبا نے

بہت عمدہ بیان ہے۔ قدرت کلام ظاہر، منظر کشی بھی ہو سکتی ہے۔ غرض جو تعریف جی چاہے بیان کیجئے۔ میں واللہ ناصحت نہیں کروں گا مگر آپ انہیں غزل کے اشعار رہ جائیں گے تو میں عرض کروں گا کہ آپ نظر ثانی کریں آپ مطمئن ہو سکتے تو سوائے منظر کشی کے دوسرا جواب نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ غزل کے اشعار ہیں تو یہ بھی غزل کے اشعار ہیں

طے کر چکا ہے منزل شب کاروان صبح
ہونے لگے افق سے ہویدا نشان صبح
تاروں سے گوپ کرنے لگے اختران صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

دیکھیے کیا منظر کشی ہے۔ سبحان اللہ اور "ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح" پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور یہ ہرگز غزل کے اشعار نہیں۔

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا
دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے
دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گزر جا
اس بحر بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا ڈوب اور پار کر جا
گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانی
لے نور عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

(فانی بدایونی)

بھلا بتائیے کیسے بھی اس مشق شاعری پر غزل کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔

انوار کی ریزش ہو اسرار کی بارش ہو
ساغر کو جو ٹکرا دوں اس گنبد مینا سے

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خون عاشقاں
کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا

ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

(اصغر گونڈوی)

مخصوص کس کے واسطے ہے رحمت تمام
پوچھیں گے ایک دن یہ کسی پارسا سے ہم

پروفیسر علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

آخری قسط

ممکن ہے پاکستان کی کچھ یادیں اب دھندلی ہو چکی ہوں اور کچھ مناظر کہیں گم ہو رہے ہوں مگر ریک پہ رکھی ہوئی کتابیں اور رسائل کی جلدیں تو ایسا سرمایہ ہیں جنہیں بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا سکتا۔ یوں سرسری نظر ڈالتا ہوں تو کندن، طلوع افکار، ماہ نو، اوراق، اقدار، ادب لطیف، تشکیل، افکار، رعنائیاں، اکیسویں صدی، صریر اور دریافت کے متعدد شمارے اپنے مطالعے اور تذکرے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ایک کام تو کر چکا ہوں۔ یعنی ان کا مطالعہ ـــــ اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے تفصیلی تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پاکستان کی ثقافتی اور لسانی جاں داری کی ایک اچھی علامت تو اس طرح دیکھی جا سکتی ہے کہ یہاں سے شائع ہونے والے رسائل کی تعداد خاصی زیادہ ہے لیکن اس امر کا اعتراف کرنا ہوگا کہ مشمولات کا معیار ترتیب و تزئین کے معیار کے مقابلے میں پست ہے۔ اتنے سارے رسائل کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ شعری تخلیقات (خصوصاً غزلیں) تو خوب خوب شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس ہجوم میں نیم پختہ اور خام تخلیقات کی بھیڑ ہے۔ اچھی شاعری جس طرح ہندوستان میں کم ہو رہی ہیں اسی طرح پاکستان میں بھی بلکہ پاکستان اس جہت سے کچھ آگے ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقی سرگرمی اور فعالیت ایک فال نیک ہے۔ اسی CREATIVE MULT-ITUDE سے بڑی شاعری کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ پست اور اوسط درجے کی کوشش بہرحال ادبی تخلیق کے لئے ایک فضا بناتی ہیں۔ پاکستانی رسائل میں معیار کے اعتبار سے کمتر درجے کی تخلیقات سے بدمزہ ہونے کی بجائے ہمیں اس VITALITY کو سمجھنا چاہئے جس کی بنیاد پر معیار بلند اور بلند تر ہو سکتا ہے۔ اس خون صد ہزار انجم کو گوارا کیا جا سکتا ہے جس کے عوض ایک روشن سحر پیدا ہوتی ہے۔

ان پاکستانی رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں میں معیاری تخلیقات موجود ہیں۔ پاکستان میں تنقید یا تو خاصی

پست ہے یا غالب بلند۔ رسالوں کے عام شمارے بسا اوقات تنقیدی مقالات سے عاری ہیں لیکن مستند اور مشاہیر تنقید نگاروں کی تحریریں جو گاہے گاہے رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں قابلِ داد اور قابلِ فخر ہیں۔ ظاہر ہے کہ چند معیاری تنقید نگاروں سے اس امر کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کے مقالے ان بہت سارے رسائل کے پیٹ بھر سکیں۔ جو ملک کے کونے کونے سے شائع ہوتے ہیں۔ معیار سے قطع نظر رسالوں کی کثرت اس امر کی علامت ہے کہ پاکستان میں اوسط درجے کے ادب کے قارئین کی تعداد اطمینان بخش ہے۔

بک شیلف پر رکھی ہوئی دوسری کتابیں مثلاً اظہار عقیدت (از صدیق فتح پوری، حمد، نعت اور منقبت کا مجموعہ) راغب شکیب کا سفرنامہ، سفر ہم سفر، شہزاد منظر کے ایک ناولٹ اور تیرہ افسانوں کا مجموعہ "ندیاں کہاں ہیں تیرا دیس" علامہ جمیل مظہری کی مثنوی آب و سراب مرتبہ ڈاکٹر ہلال نقوی۔ علی حیدر ملک کے مقالات کا مجموعہ "اردو ٹائپ اور ٹائپ کاری"، اسیر فیض آبادی کے مراثی "خالی کوزے" مرتبہ ملک شن قمر، تصویر فاطمہ کی کتاب بصیرت، رفیع الدین راز کا مجموعہ کلام دیدۂ خوش خواب، خواجہ منظر حسن منظر کا مجموعہ کلام "ضرب گل" شہزاد منظر کی کتاب "غلام عباس۔ ایک مطالعہ" ـــــ اور دوسری متعدد کتابیں پاکستان کے علمی و ادبی، ثقافتی و تہذیبی اور ملی و اقتصادی سچائیوں کی آئینہ دار ہیں۔

پاکستان میں اپنے پرانے رفیقوں اور نئے دوستوں کی ادبی سرگرمی دیکھ کر رشک آتا ہے۔ علی حیدر ملک، صبا اکرام، شہزاد منظر، محمد رضا کاظمی، نور الہدیٰ سید، افتخار اجمل شاہین، احمد ہمیش، رفیع الدین راز، سید معراج جامی، شفیق احمد شفیق، فاطمہ حسن، رعنا اقبال، محمود واجد، ریحانہ روحی، معین دانش، یٰسین افضال، پاشا مان ـــــ اور بہت سے دوسرے احباب مجھے صرف اس لئے یاد ہیں کہ ان سبھوں نے اپنی تخلیقیت اور ادبی فعالیت کی وجہ سے وہاں ایک زندہ و تابندہ فضا بنالی ہے۔ جو ایک صحت مند معاشرے کی پہچان ہے، ان کے دلوں میں شعر و ادب اور زبان و ثقافت کے لئے درد ہے۔ انہوں نے میرے دوران قیام ادبی جلسے، مذاکرے، مباحثے اور مشاعرے منعقد کر کے میرے سفر کی معنویت بڑھا دی ہے

در محبت عشق بازاں می کنند امداد ہم
سنگِ طفلاں بہرِ مجنوں می تراشد کوہکن

کراچی میں شعر و ادب کی صنعت کاٹیج انڈسٹری کی طرح گھر گھر پھیلی ہوئی ہے، چھوٹے بڑے صنعت گران نئے تجربات کی پیش کش پر زور دے رہے ہیں۔ پاکستان میں لاہور کو چھوڑ کر باقی تمام خطوں میں ادب و ثقافت کی سطح پر پاکستانیوں کو اپنی الگ روایت بنانے کی فکر ہے۔ وہ اسے اپنی امتیازی شخصیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تخلیقی نثر اور شاعری، تنقید اور تحقیق کی ایک طویل و عریض روایت غیر منقسم ہندوستان کی دین ہے۔ پاکستان کے بعض حصوں میں تو ایسا احساس ہوتا ہے کہ جس طرح مہاجرین یہاں سے اٹھ کر وہاں جا بسے ہیں اسی طرح اردو زبان اور اس کے شعر و ادب نے بھی ہجرت اختیار کی ہے۔ وہاں کے لسانی تصادم تنازع للبقا اور معیار سے بے نیاز ہو کر بے پناہ تخلیقی سرگرمی جو ہجرت زدگی کے مثبت نقوش ہیں ـــــ یہ پاکستان کے بعض علاقوں میں آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

پاکستان کو اپنے قومی ادب کی تشکیل کی فکر ہے۔ فکر تو ہونی ہی چاہئے مگر بعض پاکستانی اہلِ قلم جس جلد بازی میں یہ کام کرنا چاہتے ہیں اس سے ایک مضحکہ خیز صورت بن جاتی ہے۔ کلاسکس کے بغیر قومی ادب کی تشکیل

نہیں ہوسکتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض غار یا منظر کا بیان کرنا اور مقامی کرداروں کے بیان یا وطن دوستی کے اظہارات سے اس فریضہ کی تکمیل ہوسکتی ہے وہ قومی ادب کی بنیادی سے ناواقف ہیں۔ قومی ثقافت وطن اور اہل وطن کی عکاسی کرنے سے نہیں بنتی اس کے لئے عظیم تر تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے ـــ اور یہ کام پاکستان میں نہیں ہوا ہے۔ ایک نئی قوم کے فن کاروں کو ان اسالیب پر بھی طبع آزمائی کرنی ہے جو وہ باہر سے لے کے آئے ہیں یا جو عالمی سطح پر مروج ہیں ـــ اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ایک نئے جہان تخلیق کی جدوجہد بھی کرنی ہے۔ غزل سے عام دلچسپی ادب کی طرف عمومی توجہ کا ثبوت ضرور ہے مگر یہ کافی نہیں محض عظیم فن پاروں کی تخلیق کے لئے اہل پاکستان کو مزید تخلیقی انہماک کی ضرورت ہے

پاکستان میں قیادت کا فقدان بعض خطرناک نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اجتماعی قومی مسائل سے ہٹ کر انتخابات میں ووٹوں کا کاروبار بنیادی اجتماعی مسائل سے منحرف کر دیتا ہے۔ پاکستانی قومی کردار کی بجائے ریجنل اور ریجنل دلچسپیوں میں مبتلا کر کے عوام کو الگ الگ خانوں میں منقسم کرنے کے تلخ تر انجام کچھ تو پاکستان دیکھ چکا ہے اور کچھ تلخ ترین نتائج سے خدا اسے بچائے رکھے۔ پاکستان میں THE PATRIOTS کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی ہے۔ اس تنظیم کے ارباب نے ماضی کی خامیوں اور حال کے انتشار پر سوچنا شروع کیا ہے۔ اور پاکستان کو مزید تخریب کاریوں سے بچنے بچانے کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے منشور سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صحیح قیادت کا فقدان وہاں کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی فضا بگاڑنے کے درپے ہے۔ اس تنظیم کے منشور کے مندرجہ ذیل نکات سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے صاحبان نظر کیا چاہتے ہیں اور وہاں اندر اندر کیا ہو رہا ہے۔ منشور کہتا ہے۔

> پاکستان کے اہل فکر و دانش کی یہ تنظیم اعلان کرتی ہے کہ اس سرزمین پاک کے محب وطن صحافی، ادیب، شاعر، محقق اور قلم کی حرمت سے واسطہ رکھنے والے تمام لوگ ہر ایسی تحریک کی خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گے جس کا مقصد پاکستان کی نظریاتی، جغرافیائی اور تاریخی اساس کو نقصان پہنچانا یا اس کے شہیدوں کے لہو کی توہین کرنا اور ان کی یادگاروں اور ان کی امانتوں کی تضحیک کرنا ہے۔
>
> ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ہر ایسے اقدام کی بھی مزاحمت کریں گے جو ملک میں علاقائیت یا فسطائیت کی بنیاد پر لوگوں میں تفرقہ پھیلانے یا لسانی اور نسلی بنیادوں پر ان میں پھوٹ ڈالنے کا موجب ہوگا۔
>
> ہم اہل اقتدار اور صاحبان اقلیم سیاست کے ان اقدامات کو بھی حب الوطنی کے تقاضوں کے منافی سمجھنے پر اصرار کریں گے جن کا مقصد ملک میں امن و امان کی فضا کو نقصان پہنچانا، جمہوریت اور مکمل جمہوریت کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرنا۔ مملکت کے مستند اور معتبر اداروں کو پارٹی کے مفاد میں استعمال کرنا، قومی خزانے کو علامت صدر کے لئے سونے کے کلر

انا، رعونت ستائی، انتظامی غفلت، بدعنوانیوں اور بیجا دوانیوں کو تحفظ فراہم کرنا، نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر امتیازات برتنا، ایک خاص طبقہ یا مختلف طبقوں کی حق تلفی کرنا —— اور قومی مفادات کو پس پشت ڈالتا ہو"

ان نکات پر اس لئے اتنا اصرار کیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں کہیں نہ کہیں سے یہ باتیں موجود ہیں۔ یہ تاثرات اور خدشات تو خیر ایک پاکستانی کے ہیں جو حالات اور مسائل سے نبرد آزما بھی ہے اور جسے اپنے ملک و وطن کی آبرو بھی عزیز ہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ وہاں پہنچ کر ایک مہمان یا مسافر کیا محسوس کرتا ہے۔ مطالعات اور مشاہدات میں خارجی حقیقت کے ساتھ ساتھ داخلی تاثر خیزی کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ایک فرد کے تاثرات کو حتمی اور حقیقی بھی نہیں کہا جا سکتا —— مگر اسے سرے سے ناقابل اعتنا بھی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے ایک شاعر ظفر حمیدی نے ۱۹۷۷ء میں کراچی سے واپس آکر اپنے تاثرات یوں بیان کئے تھے۔

یہ شہر کب ہوا آباد بسایا کس نے
یہ تو تاریخ کی ہے بات مورخ جانے
میں تو آیا ہوں یہاں ایک مسافر بن کر
شوق دیدار و ملاقات کا ارماں لے کر
اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں کی زیارت کیلئے
اور اظہار عقیدت کی جسارت کے لئے
ایک نئے ڈھنگ کا مینار نظر آیا مجھے
لوگ کہتے ہیں جسے قائداعظم کا مزار
فن تعمیر کا اک اچھا نمونہ کہتے
جس کے دامن میں ہیں ہم لوگ پڑے تھے
میں نے جب غور سے دیکھا تو یہ محسوس ہوا
ان کی رحمت میں ہے ضم سینکڑوں انسانوں کا
کتنے محاذوں کا لہو کتنے لیاقت کا لہو
جو ہوئے قتل فسادات میں تقسیم کے وقت
میں نے پھیلا ہوا بازار بھی دیکھا ہر سو
مسجدیں دیکھیں، کلب دیکھے، جوا خانے بھی
اور کلفٹن میں سمندر کے تموج کا نکھار
جو کہ صبح مجھے دہلی میں نظر آیا تھا
اس کا ہی دوسرا رخ آج یہاں تھا دو شی
یہ کراچی ہے بڑا شہر سمندر بہ کنار
یہ ہے بنیوں کا نگر، شہر تجارت کہئے
ہر طرف بکھرے ہوئے لوگ مشینوں کی طرح
میں ترستا ہی رہا کوئی تو ایسا بھی ملے
جو کہ اسلام کے معیار پہ پورا اترے
(نظم کراچی)

یہ تاثر تو ظفر حمیدی کا ہے۔ انہوں نے کیا ڈھونڈا اور کیا ملا، کیا نہیں، یہ معاملہ سراسر ذاتی ہے۔ میں نے جو کراچی میں ڈھونڈا وہ مل گیا —— بلکہ بسا اوقات بے ڈھونڈے اور بن مانگے مل گیا۔ میں نے یہ چاہا تھا کہ پرانے رفیقوں میں گرمی محبت پہلی جیسی رہے، سو ملی۔ میں نے شعر و ادب اور تخلیق و تصنیف کی ہما ہمی چاہی سو موجود۔ میں نے نئی ملاقاتوں میں رنگ دوام مانگا سو مجھے ملا۔ میں نے اعزہ کی خوشحالی طلب کی اور وہ وہاں موجود اخلاص و ایثار اور وفا و مروت کے اس حسین زنداں سے ایک ماہ کے بعد واپس آیا تو مصحفی کا یہ شعر گنگناتا رہتا ہوں۔

کتنی گرفتاری میں بھی اک لذت آسودگی
کیا کہیں ہم کتنے پچھتائے نکل کر دام سے

★

فضا ابن فیضی

رد کروگے جس قدر، مقبول بنتا جائے گا
اس ہوا میں، وہ کلی سے پھول بنتا جائے گا

اور کیا دے گا مجھے، آشوبِ معنی پروری
حرف کا شعلہ، جبیں کی دھول بنتا جائیگا

وقت کے ہر اک رویے کو نظر میں رکھ کے چل
اس طرح کچھ اور تو معقول بنتا جائے گا

کرتے رہ جاؤ گے تم، اس کے سوالوں پر گرفت
اور کج رائی سے، وہ مسئول بنتا جائے گا

کیا خبر تھی، آتے آتے، ارتقا کے موڑ تک
آدمی، مجہول در مجہول بنتا جائے گا

اپنے ہونے پر، ترا ایقان، پہلی شرط ہے
تو، خود اپنی ذات کا مدلول بنتا جائے گا

ایسا عالم لفظ، معنی سے نکل کر دردِ فضا
اپنے ہی جذبوں کا تو معمول بنتا جائے گا

کرشن موہن

ہے ہر ایک بزمِ سخن میں کہانیاں میری
ہیں امتحان مرا، مدح خوانیاں میری

جفائیں اس کی بہت یاد آگئیں جب اس نے
کہا کہ بھول نہ جانا مہربانیاں میری

نہ التفاتِ زمانہ سے بہرہ مند ہوں میں
بزعمِ خویش یہ رنگیں بیانیاں میری

یہ مجھ سے پوچھتے ہیں اہلِ انتقاد اکثر
غلط طراز ہیں کیوں گلفشانیاں میری

نکات ان میں ہیں ایسے، کہ از پئے اردو
ہیں وجہ ناز یہ سچ مچ بیانیاں میری

کبھی تو میری شکستوں کو بھی شمار کریں
کھٹک رہی ہیں جنھیں کامرانیاں میری

عجب تھی کیفیتِ حادثاتِ عمر کہ جو
فریب دیتی رہیں خوش گمانیاں میری

وہ میرا ثانی خوش دل ہے کرشن موہن کو
سنائے آتے کہاں بدگمانیاں میری

شفیع اللہ خاں راز امراوی

خوبصورت موم کے پیکر رہے
لو اگلتے خاک کے بستر رہے
زندگی انمول ہیرا ہے مگر
آدمی خطرات سے بچ کر رہے
آئینہ خانوں پہ تھا لکھا ہوا
وقت کی تحویل میں پتھر رہے
شہر میں برپا ہیں ہنگامے جناب
بند کب تک دیکھئے دفتر رہے
قاتلوں میں مشورے ہونے لگے
کون سے نیزے پہ کس کا سر رہے
تیری ہستی کا بھرم کھل جائے گا
پاؤں چادر سے اگر باہر رہے
کوئی بھی اس کو لٹا سکتا نہیں
آپ کی چشم کرم جس پر رہے
وقت کے ہاتھوں میں پتھر تھے مگر
ہم ہمیشہ آئینہ بن کر رہے
شہر کی گلیوں میں ہنگامے تھے آج
خیریت گذری کہ ہم اپنے گھر رہے

مدہوش بلگرامی

اب تک سمجھ سکا نہ مرے یار تو مجھے
جاں سے عزیز رہتا ہے میرا عدو مجھے
بے چین کرتی رہتی ہے یہ آرزو مجھے
تو بھی دکھائی دینے لگے چار سو مجھے
پاکیزگی حسن کا عالم عجیب تھا
چھونا پڑا ہے اس کو مگر باوضو مجھے
تو جو نہیں تھا ساتھ تو اے جان گلستاں
باد نسیم بھی ہوئی محسوس لُو مجھے
اے کاش اس کی آنکھوں میں آئیں کبھی نہ اشک
اک عمر جو رلاتا رہا ہے لہو مجھے
میں زخم خوردہ گوشۂ امن و اماں میں تھا
قاتل کے پاس لے گیا میرا لہو مجھے
مدہوش تیرے آنے سے بدلا نظام مے
حسرت سے تک رہے ہیں یہ جام و سبو مجھے

اشفاق قلق

حسین پھولوں کے پیکر بولتے ہیں
مری آنکھوں کے منظر بولتے ہیں

ہواؤں پر لگے ہیں چپ کے پہرے
مگر چڑیوں کے شہپر بولتے ہیں

بظاہر چپ سے ہیں الفاظ لیکن
مرے شعروں کے اندر بولتے ہیں

ہوا ہے حادثہ نزدیک کوئی
فضاؤں کے یہ تیور بولتے ہیں

صدائے درد بنکر نشترِ غم
مری رگ رگ میں چبھ کر بولتے ہیں

قلقؔ سے معنی کیا وجہِ شہرت
مری چپ سے سمندر بولتے ہیں

رسول ساقی

انا چاہت کی زد میں آ نہ جائے
یہ سورج چاند سے گہنا نہ جائے
یہ حسرت ہے کہ تم کو چھو کے دیکھوں
یہ خدشہ ہے کہ تو مرجھا نہ جائے
میں اس سے اس لئے ملتا نہیں ہوں
کسی کے ساتھ وہ دیکھا نہ جائے
سنا ہے خشک پتے بولتے ہیں
کہیں پر سے خموشی چھا نہ جائے
مری غزلیں روایت زادیاں ہیں
سرِ محفل انہیں چھیڑا نہ جائے
تری سانسوں میں اکثر دیکھتا ہوں
اک ایسا پھول جو توڑا نہ جائے
یہ سوکھے زرد پتوں کا بیاں ہے
کسی کو ٹوٹ کر چاہا نہ جائے

دیر کب لگتی ہے دنیا کو پتہ ہونے میں
ہم تو مصروف تھے کچھ دن سے جدا ہونے میں
کوئی تو لفظ ہو جو تم سے الگ معنی دے
چاہے مفہوم بدل جائے ادا ہونے میں
ان کی معصوم طبیعت پہ ہنسی آتی ہے
کوئی تو بات ہے بے وجہ خفا ہونے میں
فاصلے قرب کا احساس بڑھا دیتے ہیں
مصلحت یہ ہے کسی بت کے خدا ہونے میں
کاغذی چہرے خیالوں سے حسیں ہوتے ہیں
آبروئے مینا و مے کی ہے نشہ ہونے میں

سرور ساجد

نشہ رکھو مگر ایسا نہ رکھو
خرابی آنکھ سے رشتہ نہ رکھو
تباہی آئے تو اپنوں کے ہاتھوں
کوئی بھی شوق ہو چھوٹا نہ رکھو
کسی کی مسکراہٹ بجا گئی ہے
ہمارے سامنے دنیا نہ رکھو
نکلتی ہے ہر اک تعبیر الٹی
سجا کر آنکھ میں سپنا نہ رکھو
کرایہ دار سب ظالم ہیں ساجد
مکانِ دل میں دروازہ نہ رکھو

قاضی انصار

کسی و بے بسی کی کیفیت طاری کریں
ز کچھ تو کر نہیں سکتے اداکاری کریں

طرف دیتے رہیں ظلم و تشدد کو فروغ
طرف مظلوم لوگوں کی وہ غمخواری کریں

ن اپنا پھر رگوں میں منجمد ہو جائے گا
لئے سرگرمیوں کا سلسلہ جاری کریں

فطرت تو زمانے سے ہے بالکل مختلف
یہ ناممکن غلط افراد سے یاری کریں

ن گو اپنا دفتر مصروفیت میں کٹ گیا
تمام شب کی اب انصار تیاری کریں

دل اکیلا ہے سو بہاروں میں
جیسے تنہا ہو چاند تاروں میں
بے زبانی بھی ان کی کیا کہئے
بات کرتے ہیں وہ اشاروں میں
غم کیسا راز اس لئے چھیڑا
درد پنہاں ہے دل کے تاروں میں
عشق آمادۂ نوا ہے آج
بات پھیلے گی اب ہزاروں میں
گریۂ اشک رو کئے ثاقب
ہم بھی جیتے ہیں غم کے ماروں میں

افضل ثاقب اعظمی

اسلم طارق

کار ہائے الفت وہ رائگاں سمجھتا ہے
سرگذشت کو میری داستاں سمجھتا ہے
منزلِ محبت کو وہ کبھی نہ پائے گا
جو غبارِ جادہ کو کارواں سمجھتا ہے
حادثوں کے موسم کی تیز دھوپ میں بھی دل
زلفِ حسنِ خود بیں کو سائباں سمجھتا ہے
وقت کی اسیری نے ذہن ہی بدل ڈالا
اب تو وہ قفس کو ہی آشیاں سمجھتا ہے
میرے دل کے زخموں سے آشنا نہیں ہے وہ
ظاہری تبسم سے شادماں سمجھتا ہے
میرے عشق کا پیکر کس قدر ہے سادہ لوح
پیار کی وہ باتوں کو رائگاں سمجھتا ہے
جانے کیا ہوا اس کو کچھ دنوں سے طارق
بے چراغ وادی کو گلستاں سمجھتا ہے

پروفیسر ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد

سیپڑ کی مورتوں سے اظہارِ دوستی
اندھے نگر میں ہم ہیں طلبگارِ دوستی

آؤ کسی دوکان پہ رکھ دیں اسے بھی رہن
محسوس ہو رہا ہے بہت بارِ دوستی
دل میں سما کے میرے محبت بکھیریے
پھر دل سے آج کیجئے اقرارِ دوستی
محفل میں ذکرِ یار پہ چپ ہو گئی زباں
خود ہم بھی ہو گئے ہیں گنہگارِ دوستی
اتنے قریب سے کے بھی کہتے ہیں خوب آپ
دیکھیں کب آئے سطح پہ معیارِ دوستی
ساجد حسین چہروں کی دنیا ہے پرفریب
تم سے نہ اٹھ سکے گا بھلا بارِ دوستی

ہر صدا با اثر نہیں ہوتی
ہر نظر منتظر نہیں ہوتی
زندگی حادثوں کا مرکز ہے
ایک سی تو بسر نہیں ہوتی
درد ہی سے نکھار ہے ورنہ
زندگی خوب تر نہیں ہوتی
سانحہ جب سے [illegible]
ہم کو اپنی خبر نہیں ہوتی
یا ترا راستہ نہیں ملتا
یا تری رہگذر نہیں ہوتی
اک مسلسل ہے سوز سینے میں
زندگی مختصر نہیں ہوتی
تیری محفل سے اٹھ چلا ساجد
اور کسی کو خبر نہیں ہوتی

غزلیں

نایاب حسن نایاب گلاؤٹھی

خوشبوؤں کی مانند جواب بکھر نہیں سکتا
دل لبستیوں سے کبھی وہ گذر نہیں سکتا
ہو گئی ہے بے معنی اب تری پشیمانی
زخم بات کا ہے جو وہ تو بھر نہیں سکتا
سبز سبز موسم کا وہ تو اک پرندہ ہے
زرد زرد پیڑوں پر وہ اتر نہیں سکتا
زندگی کے دریا کا دور تک نہیں ساحل
یاد کرنا چاہوں تو یاد کر نہیں سکتا
سنگار کا تیرے وہ گلاب ہوں دل پر
کی ان ہواؤں سے میں بکھر نہیں سکتا
عذاب میں جی کر پل چکا ہوں سینوں میں
ن اور خرابے میں تو مر نہیں سکتا

مشتاق صدف

میرے خیال و خواب میں صورت اسی کی تھی
بے آب سی نظر کو ضرورت اسی کی تھی
سورج تو اپنے ساتھ لئے دھوپ ڈھل گیا
لیکن وہ در سے لپٹی تمازت اسی کی تھی
دنیا کی الجھنوں سے اگر تھا میں بے خبر
شامل مرے گناہ میں وحشت اسی کی تھی
اشکوں کو قید کر کے بھلا کیا غضب کیا
آنکھیں اسی کی اور ضرورت اسی کی تھی
یہ اور بات ہے کہ تھی خاموش زندگی
لیکن ہماری موت سے نسبت اسی کی تھی

کیسی سرزد ہوئی خطا ہم سے
شہر کا شہر ہے خفا ہم سے
ہم پریشاں تھے راستے سے کبھی
اب پریشاں ہے راستہ ہم سے
تو اگر غم گسار تھا اپنا
حال تو آکے پوچھتا ہم سے
رات آنکھوں میں نیند بن کے رہی
صبح کو ہو گئی جدا ہم سے
ہم سمندر نہیں مگر پھر بھی
پیاس بجھتی ہے تو بجھا ہم سے
بات کیا ہے کہ ان دنوں طالب
چھپتا پھرتا ہے آئینہ ہم سے

اعجاز طالب

مسلمان

مشرف عالم ذوقی

ترجمہ: تبسم فاطمہ

قسط ۷

مجرا شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی ..... لوگ آنے لگے تھے۔ وقت گزاری کے لئے سازندوں نے ریہرسل شروع کر دی تھی۔ بتی پان کے طشت سجا رہا تھا اچانک دھڑ دھڑاتے ہوئے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر جاگیرا اندر آ گیا۔

گوہر جان کہاں ہے؟

سازندوں نے اشارہ کیا۔

گوہر جان اس وقت تک لباس تبدیل کر چکی تھیں افروز بڑی ہو رہی تھی اور وہ شباب کی آخری منزل پر تھی۔ آئینے کے سامنے اپنے نقش و نگار کا جائزہ لیا تو سکون ملا۔

..... ابھی دم باقی ہے ..... ابھی ان کی محفلیں سونی نہیں ہوں گی۔ سونی ہونی شروع ہو گئیں تو وہ کوئی اور گوہر جان کو خرید لے گا۔ وہ چاہتی تو دوسری طوائفوں کی طرح دلالوں سے کہہ کر سستی قیمتوں پر لڑکیاں منگوا لیتی۔ مگر فی الحال افروز کا دھندہ اسے منظور نہ تھا۔ یوں کم، اس کا دھندا

ابھی مندا نہیں ہوا تھا۔ رونق باقی تھی۔

تیر کی طرح اچانک گھس آیا جاگیرا۔

گوہر بیگم نے مسکرا کر دیکھا۔ "کیوں اتنے دن کہاں لگا دیئے۔"

وہ پرانی باتوں کو بھول جانا چاہتی تھیں

جاگیرے نے جیب سے ایک ہزار روپے کا بنڈل نکال کر گوہر بیگم کے سامنے پھینک دیا۔

"یہ ..... کسی بینک میں ڈاکہ ڈالا ہے کیا .....؟"

"نہیں۔"

"چوری کی ہے؟"

"نہیں۔"

"دھندے میں کمایا ہے؟"

"ہاں ..... امیر بائی کو ایک سونے کی مرغی بیچی ہے" جاگیرا ہنسا۔

"لیکن [illegible] ..... [illegible] لایا ہے؟"

"بہت

"تیرے لئے یہی کہا گوہر جان۔ یہ افروز جان کی تمہ اتراؤں کی قیمت ہے۔"

گوہر جان کا پورا جسم غصے کے آتش فشاں سے سلگ اٹھا۔ غصے میں ہاتھ اٹھایا تو جاگیرا نے ہاتھ تھام لیا۔

بس بہت ہو چکا گوہر جان — اب مجھے پتہ چلا کہ دوسری طوائفوں کی طرح قیمت دے کر تم لڑکیاں کیوں نہیں منگواتی۔ افروز جان کی پڑھائی کی وجہ کیا ہے؟ اب پتہ چلا گوہر جان۔ تم اسے کلبوں میں بھیجو گی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے جاؤ گی۔ اور افروز جان کسی پوش ایریا میں تمہارے لئے قیمتی رہائش کھڑی کر دیگی۔ جہاں تم عزت دار ہونے کا ڈھونگ کرو گی اور وہ کال گرل بڑے بڑے گھرانوں کے لڑکوں سے پیسے اینٹھتی رہے گی — مجھے سب سمجھ گیا ہے گوہر جان سب معلوم ہو گیا ہے۔

گوہر جان کا پورا چہرہ جیسے بارود بن گیا ہو۔ آگ دہکتا ہوا بھٹی — بے رحمی سے جاگیرا نے گوہر جان کے ہاتھ کو دبایا، پھر چھوڑ دیا — تیز آواز سن کر سازندے دروازے تک آکر ٹھٹھک گئے۔ اندر آنے کی ہمت نہیں ہوئی

"سودا کرتی ہے ہا؟"

"جاگیرا..." پوری قوت سے گوہر جان چیخیں۔

جاگیرا نے ایک ذلیل سا قہقہہ لگایا

"سودا..."

رفیع میاں۔ احمد بھائی... جلدی دوڑیئے۔

گوہر جان نے بے بسی سے سازندوں کو آواز دی۔ اس کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ بھیڑ جمع ہو گئی۔ جاگیرا اٹھا۔ سازندے اُسے کھینچ رہے تھے۔

گوہر جان اپنی بھیگی آنکھوں سے اس دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ جہاں سے سازندے ابھی ابھی جاگیرا کو کھینچ کر لے گئے تھے۔ گوہر جان بستر پر دھم سے ڈھلک کر گر گئیں۔

رانی نندی کے لئے یہ واقعات کچھ نئے نہیں تھے روزانہ یہاں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن افروز کو کون سمجھائے۔ جاگیرا کے لفظ، لفظ نہیں تھے پگھلے شیشے تھے جو اچانک کسی نے اس کے کان میں انڈیل دیا ہو... پورے جسم پر پھپھولے پڑ گئے تھے جیسے کسی نے گلابی جسم پر تیزاب پھینک دیا ہو۔ ایک عجیب سی آگ تھی۔ پورا جسم جل رہا تھا... دماغ بھی... ذہن بھی... وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ پاگلوں کی طرح.....

یہ سب.... یہ سب کیا ہے۔ وہ کوئی تماشہ گاہ ہے۔ یہ ماحول... یہاں آنے والے.... اس کی بائی اماں.... کبھی کبھی ایک اُبکائی سی آتی ہے۔ بائی اماں کی مجبوریاں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن اگر اس سے پیشہ نہیں کرانا تھا تو پھر پڑھایا کیوں؟ پڑھایا تو اس ماحول میں کیوں رکھا؟

دماغ میں بم کے گولے چھوٹ رہے تھے۔ کتابیں اسے جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنا پورا غصہ ان کتابوں پر نکالا..... طیش میں آکر میز کی ساری کتابیں پھینک دیں، کاغذ نوچے۔ کتابوں کے ورق پھاڑے۔

وہ پاگلوں کی طرح کر رہی تھی۔

زمین پر کتابوں کے انبار لگے تھے۔ اچانک وہ جھکی۔ پھٹے کاغذوں کو مٹھی میں اٹھا کر سسکیوں سے رونے لگی۔

لیکن آنسو اس مسئلے کا حل کہاں تھے۔

سازندوں نے پھر ساز اٹھا لئے تھے

مجرا شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی

ایک نئے فیصلے کے بعد افروز بیگم اچانک ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

بائی اماں خراب ہو گئے میک اپ کو درست کرنے میں — اور خود کو ترو تازہ کرنے کی جدو جہد میں ایک بار پھر آئینے کے سامنے تھیں۔

آئینے میں افروز کا عکس نظر آیا تو وہ اچانک پلٹیں۔

"افروز.... تم....؟"

افروز نے روتی آنکھوں سے ہاتھوں میں پکڑا ہوا گھنگھرو بائی اماں کی طرف اچھال دیا۔ پھر بائی اماں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"روز کے ہنگاموں سے تو بہتر ہے بائی اماں کہ آپ یہ گھنگھرو میرے پیروں میں ڈال دیجئے۔" بائی اماں حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"بیٹی افروز.... تمہاری طبیعت تو....."

"آج میں فیصلہ سننے آئی ہوں بائی اماں یا تو آپ مجھے یہ گھنگھرو پہنائیے یا اس ماحول سے دور لے جائیں"

بائی اماں پہلی بار افروز کے چہرے پر ایک نئے انقلاب کے تیور دیکھے۔ وہ بس اتنا ہی سوچ سکیں۔ افروز جوان ہو گئی ہے۔

تبھی سازندے نے آکر خبر دی۔ لوگ آ گئے ہیں۔ انتظار ہو رہا ہے۔

"آج مجرا نہیں ہوگا"

بائی اماں نے سر جھکا لیا اور بالیاں اتارنے لگیں۔

نواب الطاف حسین نے نظریں اٹھائیں اور کمزور آواز میں بولے۔

"یہ عزت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے گوہر — عزت کا خیال نہ ہوتا تو کب کا تمہیں تسلیم کر چکا ہوتا اور تمہیں یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔"

گوہر جان کی آواز تھرتھرائی۔

"افروز کا کیا کریں گے وہ اپنی پڑھائی کا الٹ مانگتی ہے"

نواب صاحب کی آنکھوں میں دھیرے سے ایک بجلی چمکی پھر بجھ گئی۔

"گوہر جان تو خدا کی ستائی ہوئی عورت ہے" حسین صاحب... افروز کی قسمت تو اچھی بنا دیجئے یہ تمہارا فرض بھی ہے"

نواب جیسے ایکدم سے بے سہارا ہو گئے۔ اس کمزور بوڑھے کی طرح جس کی لاٹھی اچانک ٹوٹ گئی اور اس کی دھندلی آنکھیں اندھیرے میں لڑکھڑا ہوئے ٹوٹی لاٹھی کو جوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"میرے بچے... اب ان کی آنکھوں میں شک کے کیڑے پڑ گئے ہیں گوہر جان.... میں اتنی دیر تک کہاں رہتا ہوں۔ کہاں جاتا ہوں.... وہ جان گئے! وہ نئی تہذیب کے ہیں گوہر جان.... وقت بدلا ہے چلن بدلا ہے۔ کوٹھے پر شرفا کے جانے کی روایتیں پرانی کتابوں میں گم ہو چکی ہیں۔ نئے زمانے کے بچوں کے لئے یہ بدتہذیبی کی علامت ہے.... جب دیکھتا ہوں ان کی آنکھوں میں میرے لئے عزت و احترام کا جذبہ نہ رہا، تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ فرشتہ اب بڑی ہو گئی گوہر جان.... میں نے قریب سے اس کی آنکھیں دیکھیں گوہر جان۔ اسے مجھ سے نفرت ہے.... ہاں مجھ سے اپنے باپ سے شدید نفرت ہے گوہر جان....."

گوہر جان اچانک سناٹے میں آ گئیں۔

"لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ تم جان لو، میں لاچار ہوں، مجبور ہوں، اپاہج اور کمزور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

تم کمزور کب نہیں تھے۔ گوہر جان کے جی میں آیا کہ چیخ چیخ کر نواب صاحب کو پھٹکارے، انہیں صلواتیں سنائے.... کہ تم کمزور کب نہیں تھے نواب صاحب.. ہمارے یہاں ہجڑوں کی بھی ایک قوم ہوتی ہے۔ تم تو ان سے بھی بدتر ہو نواب الطاف حسین.... یہ بدذات بانگڑو تو ناچ کر گا کر، لوگوں کا دل بہلا کر دوسروں کے سکون کو ڈھونڈ لیتے ہیں.... اور تم.... گھر کی چھوڑو، اس کوٹھے کی بات سنیے دو الطاف حسین، تمہارے پاس تو اپنا سکھ چین بھی نہیں۔ سب کچھ گنوا چکے ہو تم، مسلم ریاستوں کی طرح، مسلمان بادشاہوں کی طرح... تال میٹو تال... ہے کیا تمہارے پاس ___

اس کا جی چاہا.... اتنی زور سے چیخے کہ سارا محلہ جمع ہو جائے۔ لیکن خود کو کمزور اور اپاہج بتانے والے نامرد سے شکوہ ہی کیا کرنا ___ اس نے گھن سے، نفرت سے نواب صاحب کو دیکھا... جو اس وقت، لوٹتے ہوئے بڈّی سے بھی زیادہ گھناؤنے اور ذلیل لگ رہے ہیں

جاؤ عاقبت سدھارو...

بچی کے لئے گوہر جان کے دل میں دنیا بھر کا پیار انگڑائیاں لے رہا تھا... افروز جان.... اتنا بھی نہیں ہوا کہ بچی کی بلائیاں لے لیں۔ نئے اور پرانے زمانے کا فرق سمجھا رہا ہے ___ بڈھا کھوسٹ.... کیڑے پڑیں۔... تہذیب اور بدتہذیبی کی کتابیں کھول کر بیٹھتا ہے۔

نواب صاحب تو کب کا دروازہ کھول کر چلے گئے مگر گوہر بائی کے جسم میں ہزاروں توپ چھوٹ رہے تھے...

اس کا جی چاہا ابھی تک پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں...

لیکن کیوں....

کس لئے....

اس نواب کے بچے کے لئے.... جسے سچ اور جھوٹ کی پرچھائیوں کا احساس تک نہیں......

کھٹ ___ گوہر جان نے دروازہ نہیں بند کیا بلکہ نواب صاحب تک دل کی کھلنے والی کھڑکی پر سانکل چڑھا دی ___ افروز سے تمہارا رشتہ نہیں ___ تو میرا بھی نہیں۔ دوسرے گاہکوں کی طرح تم بھی ایک گاہک ہو۔

وقت گزر گیا ___ یا ___

وقت گزر جاتا ہے۔ اور ہم سب اپنی بھوگی ہوئی حقیقت کے سنکرے پل پر سوار ہو جاتے ہیں ___ پرانے دنوں میں جب صرف ماہواری کے خون آلودہ کپڑے کی طرح لپلپاتی، رینگتے، بلبلاتے پلّوؤں کی طرح سڑی حقیقتیں ہوتی ہیں۔ تو جیسے سب کچھ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت گوہر جان کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔

مس رومی ملک

آسماں سے آسماں تک

آسمان پر کالے کالے بادل کے آوارہ ٹکڑوں کو ہوا کے دوش پر لہراتے دیکھ کر دل مسرتوں سے جھوم اٹھا کتنی شدت سے مجھے برسات کی پہلی بارش کا انتظار تھا۔ لیکن لمحہ بھر میں میری خوشیاں زائل ہو گئیں۔ آسمان صاف ہو چکا تھا بادل کے کالے کالے ٹکڑے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اور اب بڑی ڈھٹائی سے تابناک سورج میرا منہ چڑھا رہا تھا۔

"یہ لڑکی دھوپ میں کیا کر رہی ہے۔۔" یہ بھائی جان کی آواز تھی۔

"بارش کا انتظار کر رہی ہوں۔" میں نے اوپر سے ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" بھائی جان اوپر آ گئے۔

"ابھی ابھی میں نے آسمان پر کالے بادلوں کو دیکھا تھا۔"

"اب تو نہیں ہیں — پھر دھوپ میں کیوں تپ رہی ہو؟"

"یہ سورج میرا منہ چڑھا رہا ہے۔ بادلوں سے کہہ رہی ہوں آکر اس کے منہ پر کالک مل دے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بادل تمہاری بات سن رہا ہے۔"

"کاش سن لیتا۔"

"سن لے گا تب آجانا۔ اس وقت تو نیچے چلو۔"

"بھائی جان وہ دیکھو... بادل۔۔" بادل کا ایک ٹکڑا لہراتا ہوا نہ جانے کہاں سے سطح افق پر نمودار ہو گیا تھا۔

"پاگل مت بنو نیچے چلو.... ورنہ اماں کی ڈانٹ کھانی پڑے گی۔" بادل نہیں چھائے... پانی نہیں برسا اور میں سورج کو گھورتی ہوئی نیچے آ گئی۔

"اماں چار بج گئے۔ کریمن بوا برتن مانجھنے ابھی تک نہیں آئیں۔"

"بچہ بیمار تھا — ساس کی طبیعت بگڑ گئی۔ نند سے جھگڑا ہو رہا تھا ڈھیر سارے بہانے ہیں کریمن بوا کے پاس —" اماں تنک کر بولیں۔

"اماں الٹا ہی کیوں سوچتی ہو... ہو سکتا ہے

ں کی باتوں میں بہکائی ہو۔
"تو میں جھوٹی ہوں —" اماں بگڑ اٹھیں۔
"توبہ میں نے ایسا کب کہا.... مم"
اس دن کریمن بوا نہیں آئیں۔ گھر کا سارا کام
ہی کرنا پڑا۔ دوسرے دن جب کریمن بوا آئیں تو ان
چہرے پر چھائی پژمردگی اور آنکھوں میں ویرانی لرزاں
یہ کر میں پوچھ بیٹھی۔
"کیوں بوا خیریت تو ہے؟"
"بی بی میرا بیٹا بیمار ہے۔"
"کیا ہوا اُسے؟"
"دو دنوں سے بخار میں تپ رہا ہے۔"
"ڈاکٹر کو دکھایا —؟"
"ہاں لے گئی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ بخار ہے کہ
ترنے کا نام نہیں لیتا۔" وہ سسک اٹھی۔ اپنی ساڑی
ے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ مجھے
س کی حالت پر ترس آگیا۔ میں نے یہ کہہ کر اسے چھٹی
ے دی کہ جب تمہارا بیٹا ٹھیک ہو جائے تب آنا —
یا سارا کام خود کر لوں گی۔ اماں نے سُنا تو بگڑ اٹھیں
"خود مختار بن بیٹھی ہو.... کس کی اجازت سے
نے اسے چھٹی دی...؟"
"اماں بگڑتی کیوں ہو اس کا بیٹا بیمار ہے تمہیں
تکلیف نہیں ہوگی۔ میں سارا کام کر لوں گی۔" میں نے
ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"عجیب سرپھری لڑکی ہے۔ جو دل چاہے کر بیٹھتی ہے۔
بڑوں سے رائے مشورہ لینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں —!
بری شان میں اماں نہ جانے کیا کیا قصیدے پڑھتی
رہیں اور میں خاموشی اختیار کر گئی۔
چار دن ... گزر گئے لیکن کریمن بوا نہیں آئیں،

تو مجھے تشویش ہوئی۔ کہیں ان کا بیٹا زیادہ بیمار تو
نہیں پڑ گیا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ کریمن بوا کے گھر
جاؤں گی — اماں برس پڑیں۔
"پاگل ہو گئی ہو — اس گندی بستی میں جاؤں گی۔
لوگ کیا کہیں گے؟"
"کیوں، اس میں کیا برائی ہے، اس بستی میں
انسان ہی تو رہتے ہیں۔"
"تم وہاں نہیں جاؤگی۔" اماں کا لہجہ حتمی تھا۔
"مگر کیوں —؟" میں نے بضد ہو کر پوچھا۔
"مجھے تمہارا وہاں جانا قطعی پسند نہیں۔"
"اماں میں اسکول جا سکتی ہوں۔ کالج جا سکتی
ہوں، بازار جا سکتی ہوں — پھر وہاں کیوں نہیں جا
سکتی۔ میری اچھی اماں پلیز مجھے مت روکو — مجھے جانے
کی اجازت دے دو نا......"
میں نے اماں کے گلے میں پیچھے سے اپنی باہوں کا ہار
ڈالتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ بالآخر اماں نے میری
بات مان لی۔ اور اس سے پہلے کہ اماں کا ارادہ بدلے میں وہاں
سے چل پڑی... میرا رکشہ کریمن بوا کے گھر تک نہیں جا سکتا
تھا۔ کیونکہ ان کے گھر تک جانے والی گلی کافی تنگ تھی۔
میں رکشہ سے اتر گئی۔ بچپن میں کبھی میں کریمن بوا کے
ساتھ ان کے گھر آئی تھی اس لئے ان کا گھر ڈھونڈنے میں
زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں ان کے گھر کے قریب آگئی تو
گلی میں کھیلتے بچے مجھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے اس
گلی میں کوئی گمان سے باہر ہستی آگئی ہو۔ میں نے کریمن بوا
کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی — حالانکہ دروازہ
کھلا ہوا تھا۔ لیکن بغیر دستک کے داخل ہونے کی ہمت
نہیں ہوئی۔ اندر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔
دروازے پر کریمن بوا مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

"بی [illegible] ب ۔؟"

"تمہارا بیٹا کیسا ہے ۔ بوا ؟"

"آپ یہاں ۔۔۔۔ ؟" میں دروازے پر کھڑی تھی ۔ اور بچے جہاں اب تک مجھے اور میرے قیمتی کپڑوں کو دیکھ رہے تھے وہیں کچھ منچلے اور اوباش قسم کے نوجوانوں کے ہونٹوں پر سیٹیاں اور سستی فلموں کے غیر معیاری گانے مچلنے لگے تھے ۔

"تمہارا بیٹا ٹھیک ہے نا ۔۔" میں نے اندر آکر کہا ۔

"آپ یہاں کیوں آگئیں بی بی جی ۔ ؟" وہ محو حیرت تھی

کمرے میں دو چارپائی پڑی ہوئی تھی ایک پر ایک شخص گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے جانگوں سے سینے کو دبائے ہوئے گہری گہری سانس لے رہا تھا ۔ چارپائی کے نیچے مٹی کے برتن کا ٹوٹا ہوا ایک حصہ رکھا تھا ۔ جس میں چولہے کا راکھ بھرا ہوا تھا ۔ اور اس میں جذب گاڑھے گاڑھے بلغم پر بہت ساری مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ جب کبھی وہ بوڑھا شخص حلق کو صاف کرکے بلغم اس ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن میں گراتا تو کمرے میں اس کی سانسوں کی سائیں سائیں کے ساتھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ گونج اٹھتی ۔ دوسری چارپائی پر دس بارہ برس کا ایک لڑکا لیٹا ہوا تھا ۔ لڑکے کے سرہانے دو جوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ غالباً وہ کریمن بوا کی بیٹیاں تھیں ۔ ان میں سے ایک بار بار اس لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی ۔ ایک چار سالہ لڑکا زمین پر سویا ہوا تھا ۔ اور اس کے ارد گرد بھی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ شاید بوا کی بیوہ نند کا بیٹا تھا ۔ پاس ہی سفید میلی سی ساڑی میں ملبوس اس کی نند بیٹھی تھی ۔ جس کی ساڑی میں جگہ جگہ پیوند چسپاں تھے ۔

"بی بی جی میرے بیٹے کا بخار نہیں اترا ۔ دیکھئے نا ابھی بے سدھ پڑا ہے ۔ میرے بچے کا اوپر بیٹھا خدا نگہبان ہے ۔ میں کافی پریشان ہوں اس لئے نہیں آسکی ۔" گویا اس نے صفائی دی ۔

"میں تمہارے بیٹے کو دیکھنے آئی ہوں بوا ۔"

"کیا ۔۔ ؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی ۔ بوا نے آنچل سے کونے میں رکھی اکلوتی کرسی کو صاف کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو بولی ۔ میں جا کر بیٹھ گئی ۔ لیکن جب میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ کرسی نہیں تھی ۔ اسٹول بھی نہیں تھا ۔ خیر جو بھی تھا بیٹھنے کے لائق تھا ۔ گرمی کی شدت سے میرا برا حال تھا ۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کر رہا تھا ۔ کریمن بوا میرے ایک دو سوالوں کا جواب دے کر چپ ہوگئی تھی ۔ میں نے پرس میں سے کچھ روپئے نکال کر بوا کو دیا کہ اپنے بیٹے کا علاج ٹھیک طرح سے کراسکے ۔ اس کے بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"چلتی ہوں ۔۔"

"میرے تو نصیب جاگ گئے بی بی جی آپ اس غریب کی جھونپڑی میں آئیں ۔ منا کے ابا گھر پر نہیں ہیں ۔ انہیں یقین نہیں ہوگا بی بی جی کہ آپ آئی تھیں ۔"

"تم سب اسی کمرے میں رہتی ہو ۔ ؟" میں نے پہلی بار ایک عجیب سا سوال کیا ۔

"اندر آنگن ہے بی بی جی ۔ بنا چھت کا ایک کمرہ ہے جہاں کھانا بنتا ہے ۔" اچانک بادل کے گرجنے کی آواز آئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا مسلط ہوگیا ۔ ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ برسات کی پہلی بارش شروع ہوگئی ۔۔ اُف میں کہاں آ پھنسی ۔۔۔ جس بارش کا مجھے شدت

انتظار تھا جس کے لئے

یا گھنٹوں چھت پر کھڑی بادلوں کو گھورا کرتی تھی آج اف اس جھونپڑی میں بارش کا لطف کس طرح اٹھاؤں .... میری ساری تمنائیں دم توڑتی محسوس ہوئیں اور میں بے بسی کے عالم میں گھر واپس جانے کے لئے سوچنے لگی۔

بی بی جی ٹھہر جایئے ---- پانی ختم جائے گا تب میں آپ کو چھوڑ آؤں گی۔ بارش کی آواز تیز ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی میں لاچار اسی جگہ پر بیٹھ گئی۔ جہاں کرمین بوا نے مجھے بٹھایا تھا۔ میں جیسے ہی بیٹھی ٹپ سے پانی کی ایک بوند میرے سر پر گری ۔ میں اس ایک ننھی سی بوند کا مقابلہ کرتی رہی اس سے قبل ہی بڑی بڑی کئی بوندیں..... لگاتار مجھ پر گرنے لگیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو دیکھا کہ چھت ایک جگہ سے نہیں بلکہ کئی جگہوں سے ٹپک رہی ہے۔ میرا اٹھنا بیکار تھا۔ میں بیٹھی بیٹھی بھیگتی رہی۔ بوا کا بیمار بیٹا بھی اس ٹپ ٹپ سے نہیں بچ پایا تھا۔ اس کی بہنیں اسے چادر سے ڈھک رہی تھیں۔ بوڑھے نے کھانسنا بلند کر دیا تھا۔ وہ بھی بارش کی بوند سے بچنے کے لئے کروٹ بدل رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کس طرح فرش پر پانی آگیا۔ وہ چار سالہ بچہ اٹھ کر رونے لگا۔ اس کی ماں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اندر سے بھیگتی ہوئی کرمین بوا کی ساس کمرے میں آئیں۔ ایک کونے میں رکھی گٹھری کھول اس میں سے کچھ گندے کپڑے نکالے اور اندر کی جانب مڑ گئیں۔ وہ میری طرف سے بے نیاز تھی۔ بوڑھا بول اٹھا

"کیوں پانی میں بھیگتی ہو۔ کپڑے بعد میں دھل جائیں گے"

"ہاں دھل جائیں گے لیکن برسات کے پانی جیسا صاف نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ وہ اندر چلی گئی۔ پھر زور زور سے کپڑے ٹپکنے کی آوازیں آنے لگیں۔۔۔۔ بارش نے زور پکڑ لیا تھا چھت سے اتنا زیادہ پانی ٹپکنے لگا تھا کہ بچنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہنیں لاکھ کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن اپنے بیمار بھائی کو چھت سے ٹپکنے والے پانی سے محفوظ نہیں رکھ پا رہی تھیں ہم چھت کے نیچے تھے لیکن پانی اس قدر برس رہا تھا کہ کھلی چھت کا گمان ہو رہا تھا۔ شام ڈھلنے لگی تھی قبل از وقت رات کی سیاہی اپنی چادر پھیلا رہی تھی۔ میرے لئے مزید ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن اتنی تیز بارش میں باہر نکلنا بھی دشوار تھا۔ پھر بھی گھر پہنچنے کی جلدی میں ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس تیز بارش میں بوا سے میں نے اجازت مانگی۔ بوا پہلے تو نہ مانی۔ پھر اپنے ساتھ گھر تک چھوڑنے کے لئے رضامند ہو گئیں۔ میں جیسے تیسے گھر پہنچی۔ اماں میری حالت دیکھ کر دہاڑ اٹھیں۔۔۔ بھائی جان نے بھی آج اماں کی طرفداری کی۔ اور میں خاموشی سے سب کی ڈانٹ سنتی رہی۔ وہ رات بڑی کالی اور بھیانک تھی۔ تمام رات مسلسل بارش ہوتی رہی۔ اونچے علاقے کی سڑکیں بھی پوری طرح جل تھل ہو چکی تھیں۔ رہ رہ کر کرمین بوا کے گھر کا منظر میری آنکھوں میں گھوم جاتا اس رات ایک سکنڈ کے لئے بھی نہ سو سکی۔ صبح مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں سویرا ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا سڑک پر پانی کا جماؤ ختم ہو چکا تھا۔ اچانک میرے ذہن کے اسکرین پر کرمین بوا کے گھر کا منظر گھوم گیا خدا جانے یہ طوفانی اور برساتی رات بوا کی جھونپڑی کی خستہ حال بنیادوں پر کیا کیا ستم ڈھائی ہوگی۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔

اس روز میں سارا دن سوتی رہی۔ شام ڈھلے

اماں نے مجھے بتایا تھا .... وہ بھی اس خبر کے ساتھ کہ کریمن بوا کا بیٹا مر گیا۔

"کیا ؟" مجھے گہرا شاک لگا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کا صدمہ وہ بے چاری غریب کس طرح برداشت کر سکی ہوگی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی موت بیماری کی حالت میں شدید طور پر بھیگ جانے کی وجہ سے ہوئی ہے چھت سے ٹپ ٹپ کر رستا ہوا پانی کا قطرہ اسے موت کے سمندر میں ڈبو گیا تھا۔

آسمان پر امنڈتے ہوئے کالے بادل دیکھ کر کبھی میرے دل میں خوشیوں کے دیپ جھلملا اٹھتے تھے۔ گرجتا برستا بادل اور بھیگی ہوئی فضا کس قدر مجھے پسند تھی مگر اب یہ سب مجھے مضمحل اور اداس کر دیتے تھے۔ میرے دل میں یہ خلش گھر کر گئی کہ کاش اس رات میں بوا کے بیٹے کو ساتھ اپنے گھر لے آئی ہوتی۔ ـــــ

بقیہ ــ پراگندہ طبع لوگ

فرصت کہاں کہ چھیڑ کریں آسماں سے ہم
لپٹے پڑے ہیں لذتِ دردِ نہاں سے ہم

دل میں اک رشک حور رہتا ہے
پاس رہتا ہے دور رہتا ہے

(جگر مراد آبادی)

فضائیں لاکھ ہوں لیکن محبت ہی نہیں جن میں
فرشتہ ہو خدا ہو کچھ بھی ہو انسان نہیں ہوتا
ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچۂ خنداں نہیں ہوتا
نگاہِ اہلِ دل سے انقلاب آتے ہیں دنیا میں
یقین رکھ عشق اتنا بے سر و ساماں نہیں ہوتا

لیکن اس طرح کتنی مجبور اور بدقسمت مائیں اور ان کے بیمار بیٹے ـــــ اس دنیا میں موجود ہیں کیا میں سب کو پناہ دے سکتی ہوں۔ یہ زمین جہاں انسان رہتے ہیں اور وہ آسمان جہاں بوا کے مطابق خدا رہتا ہے۔ تو کیا اس زمین اور آسمان کے درمیان کوئی ایسی پناہ گاہ ہے جہاں کریمن بوا جیسے لوگ رہتے ہیں۔ میرا بس چلے تو خدا سے اس کا آسمان چھین کر کریمن بوا کے سر پر اوڑھا دوں تاکہ خدا آسمان سے آسمان تک کا سفر طے کرتا رہے۔

گرد و غبارِ ہستیٔ فانی اڑا دیا
اے کیمیائے عشق مجھے کیا بنا دیا

فسردہ پا کے محبت کو مسکرائے جا
اب آ گیا ہے تو اک آگ سی لگائے جا
اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کی مانند تھرتھرائے جا
(فراق)

ابھی تو اے غم پنہاں جہاں بدلنا ہے
ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا
(فراق)

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کریں
(فیض)

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی)

نام کتاب :- **کسک**
تخلیق :- ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیا عظیم آبادی
نوعیت :- شعری مجموعہ ● سنہ اشاعت :- ۱۹۹۰ء
طباعت :- دی آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ ۶
ملنے کا پتہ :- بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴
(۲) کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴
(۳) دار النشاط دریاپور پٹنہ ۴

"کسک" ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیا عظیم آبادی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں سلام و نعت کے علاوہ ۹۴ غزلیں ۱۲ نظمیں اور ۸۰ قطعات ہیں۔ ضیا اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں اور یہ بات ہے کہ گوشہ گمنامی ان کو دل و جان سے پیارا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے تو ڈاکٹر ضرور ہیں لیکن ادب اور شاعری سے جو ان کا فطری لگاؤ ہے اس کا اندازہ ان کی تخلیق کسک کو پڑھ کر بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ضیا نے کتاب کا آغاز عام روایت سے ہٹ کر "سلام" اور نعت سے کیا ہے۔ اس کے بعد "پھر" میں رو عنہ خیر البشر دیکھ لیتا" کے عنوان سے ایک مناجات نظم ہے۔ شاعری ترتیب، تسلسل، سلاست، تنظیم، ہم آہنگی، ربط باہمی اور آمد کی کیفیت ہے۔

ضیا کی شاعری روایتی انداز و آہنگ کی ہے۔ انکی غزلوں میں درد، کسک، ترنم کی زیریں لہریں، سوز و ساز غم عشق۔ غم جاناں تسلسل، روانی اور روح غزل کی ساری خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی غزلیں مرصع اور مسجع ہیں۔ سہل ممتنع شاعری جو غزلیہ شاعری کا طرۂ امتیاز جانا ہے۔ اس کی مثالیں بھی ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

یوں تو ضیا کی پوری شاعری پیامی اور اصلاحی انداز فکر کی ہے مگر ان کی غزلیہ شاعری میں قوم و معاشرہ کے دکھ درد اور ان کی اصلاح کے لئے کسک اور کرب کا جو نمایاں پہلو ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو خال خال ہی ملتا ہے۔ مگر یہ ان کا انفرادی کمال ہے کہ ہر حال میں رنگ تغزل ہاتھ سے نہیں جاتا۔

ضیا نے اپنے مجموعے میں نظموں کو جگہ دے کر ایک عام کمی کو پورا کیا ہے۔ غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی ترنم، موسیقیت، للکار جھنکار، افکار کی جولانی، زور بیان، شان آمد اور وہ تمام خوبیاں جو پابند نظموں کے لئے ضروری ہیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی شہرت یافتہ نظموں میں "اردو زبان" "ابھی کل کی بات" "منزل" "اہل وطن کے نام" "اپنے نونہالان وطن" اور "دنیا" ہے۔ "سپنے اور پانی" جذباتی نظم ہے۔ "عذرا" اور "رفیقۂ حیات" سے خطاب" پڑھ کر مرحوم جمیل مظہری اور اختر شیرانی بے ساختہ یاد آجاتے ہیں۔

ضیا نے اس مجموعے میں بچوں سے متعلق چند معیاری نظمیں شامل کر کے جہاں ایک بہت بڑے فرض کو نبھایا ہے وہیں مجموعے کو بھی انفرادیت بخشی ہے ان کے قطعات بھی اچھے ہیں۔

ان کی زبان صاف شستہ، سہل عام فہم دل آویز ہے کہیں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اچھا گوتا گوند

خصوصیات کی بنا پر بحیثیت مجموعی یہ کتاب قابل مطالعہ ہے قیمت بھی مناسب ہے۔ کتابت، طباعت میں سرورق، کاغذ اور طباعت خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

▲ ڈاکٹر سید ابو الفیض میدآبادی

نام کتاب:۔ تابوت کی صدا

ہیئت:۔ شعری مجموعہ (اڑیا نظم کا اردو ترجمہ)

شاعر:۔ سرنجن پارشی

مترجم:۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

ناشر:۔ قطب کامران، پبلیکیشنز رحمت علی بلڈنگ دیوان بازار کٹک

قیمت:۔ ۴۰ روپے/ سنہ اشاعت:۔ ۱۹۹۱ء

ملنے کا پتہ:۔ کامران پبلیکیشنز رحمت علی بلڈنگ دیوان بازار کٹک ۷۵۳۰۰۱

نرنجن پارشی اڑیا زبان کے جدید شاعروں میں اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں" تابوت کی صدا" ان کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کے تین مجموعے اردو ہندی سنسکرت اور انگریزی زبانوں میں ترجمے ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اس مجموعے کا موضوع فلسفہ حیات و ممات ہے۔ شاعر نے حیات و ممات کے فلسفے کو نہایت آسان اور عام فہم انداز میں پیش کر کے اپنی فنی گرفت کی کامیاب مثال پیش کی ہے۔ یاس و حسرت اور کرب و درد کے ماحول میں بھی شاعر کے دل میں جینے کی جو آرزو ہے اس کی جھلک ہمیں ان کی شاعری میں ملتی ہے۔

پارشی کی المیہ شاعری کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ موت کا رونا رونے کی بجائے موت کو نئی زندگی کا آغاز سمجھتے ہیں۔ چشمہ موت میں بھی انہیں امواج حیات نظر آتی ہیں۔ جب آنکھ بند ہوتی ہے اور پر کیف و پر بہار زندگی کے سارے رنگین مناظر ختم ہو جاتے ہیں تو جسد خاکی تابوت سے صدائے افسوس بلند کرتا ہے کیونکہ سارے عزیز و اقارب اسے قبر میں تنہا چھوڑ کر اسے خدا حافظ کہہ کر لوٹ جاتے ہیں مگر شاعر کو یہاں بھی امید و نشاط کا پہلو نظر آتا ہے وہ موت کو حیات نو کا خزینہ اور نئی آواز کا جادو کہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسے موت کی زبان پر زندگی کا ذائقہ نظر آتا ہے۔

اس مجموعے کی تقریباً تمام تر نظمیں اپنے اندر ایک فلسفہ اور ایک پیغام رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں سلاست، روانی، زور بیان، زور الفاظ، ربط و تسلسل، موسیقیت اور غنائیت سب کچھ موجود ہیں۔ یہ آزاد نظمیں جہاں ایک طرف پابند نظموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں وہاں دوسری طرف آزاد نظموں کے مخالفین کے لئے دعوت فکر و مطالعہ بھی ہیں۔ یہ آزاد نظمیں ببانگ دہل یہ اعلان بھی ہیں کہ آزاد نظموں کی اپنی جداگانہ فنی اور صنفی حیثیت ہے جو کسی پابند نظم نگاری سے کم نہیں۔ شرط صرف فنکار اور فنکاری کی ہے۔

یہ مجموعہ اپنے مترجم کی شعری اور فنی دسترس اور فن پر ان کے عبور کاملہ کا بہترین مظہر ہے۔ کسی زبان کے اشعار یا شعری مجموعے کا ترجمہ دوسری زبان میں اس کے اصل روح اس کے فنی ہیئت اور صنفی خوبیوں اور دیگر لوازمات کو برتتے ہوئے کرنا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے فن پر عبور کامل اور دسترس کلی حاصل ہو۔ حفیظ اللہ نیولپوری اپنے اس گرانقدر کام کے لئے قابل تحسین ہیں۔

اس مجموعے کی طباعت اچھی ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور قیمت مناسب۔

▲ ڈاکٹر سید ابو الفیض میدآبادی

شہ خیال

سہیل کے تازہ شمارے میں میری دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ پرچہ مل گیا شکریہ ۔

ان غزلوں میں کتابت کی چند غلطیاں در آئی ہیں مثلاً

دلِ افسردہ چہک اٹھا یکایک اے دوست
(غلط)

دلِ افسردہ چمک اٹھا یکایک اے دوست
(صحیح)

گونج ہے دل میں ابھی شوق کی تنہائی کی
(غلط)

گونج ہے دل میں ابھی شوق کی شہنائی کی
(صحیح)

دوسری غزل کے مقطع میں کرشنا موہن درست تھا، جسے کرشن موہن لکھا گیا ہے۔ غزل کی بحر میں کرشنا موہن ہی ٹھیک بیٹھتا ہے۔ یہ نام میں اکثر مقطعوں میں تحریر کرتا ہوں۔ آپ کا پرچہ کافی معیاری ہے۔ چند ایک مقالے دلچسپ اور نظر کش ہیں مثلاً پریم چند۔ حیات اور فن، پراگندہ طبع لوگ۔ اور انشائیہ رحمٰن شاہ۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ اور بھی توجہ چاہتا ہے۔

▲ کرشنا موہن
(دہلی)

حالیہ شمارہ مکمل، ایک ہی روز میں پڑھ لیا۔ اداریہ پہلے سے پرچے کی جان ہے۔ اس کو آپ کی دور بینی کہا جائے یا اتفاق کہ آپ نے جس معاشی اور اقتصادی بدحالی کی پیشین گوئی کی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے غداروں کے ایک گندہ کارنامہ دکھایا ہے۔ ایک ضروری بات یہ کہنا چاہوں گا کہ قسط وار چار چار چیزیں شائع نہ کریں۔ اب جس نے پہلی، سابقہ اسقاط نہیں پڑھی ہیں اس کو کیا لطف آئے گا۔ بس ایک یا بہت سے بہت دو مضامین قسط وار دیں۔ باقی کی جگہ افسانوں کو دیں۔ پھر قسط کا معاملہ یہ ہے کہ ہر آدمی نہیں پڑھتا۔ اب میں اپنے بارے میں بتاؤں کہ کتنی اچھی سی اچھی تخلیق ہو اور قسط وار ہو تو میں اسے بس اتفاقیہ ہی پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ بہرحال سہیل کی حد تک یہ محسوس ہوا کہ جو چیز ہے وہ قسطوں میں ہونے پر بھی کسی حد تک مکمل ہے جیسے پریم چند پر اصغر علی صاحب کا مقالہ یا محترم علیم اللہ حالی صاحب کا سفرنامہ اور فاطمہ حسن کا ہلکا سا تعارف۔ عابدہ زیدی نمبر میرے مطالعہ میں نہیں آیا۔

▲ محمد اطہر مسعود خاں ، (رامپور)

○ سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ افسانوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ جناب اصغر علی انجینیر صاحب کا مقالہ "پریم چند۔ حیات اور فن" پڑھا اور پسند آیا۔ پریم چند بلاشبہ اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے جس نے خواب و خیال کی دنیا کو حقیقی دنیا میں تبدیل کرایا۔ گاؤں میں بسنے والے بھولے بھالے اور استحصال شدہ کسانوں کی تصویر کشی انہوں نے جس انداز فنکارانہ میں کی ہے وہ واقعی سراہنے کی چیز ہے۔ لیکن زمانہ کی بڑھتی ہوئی رفتار کو دیکھتے ہوئے میں تو یہ کہنا چاہوں گا کہ اب پریم چند کو اتنی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے کیونکہ آج انسانی مقصد ان کے فن پر ادوی

طرح غالب ... ہے۔ ایسے میں صرف ایک ہی ادیب ایسا نظر آتا ہے جس کی تخلیق آنے والی کئی صدیوں کو متاثر کرتی رہے گی اور یہ ادیب کوئی دوسرا نہیں راجندر سنگھ بیدی ہے جس نے ہماری زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے گھریلو زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ فن کے قالب میں ڈھالا جو بیدی تک کسی بھی ادیب کی نظر نہیں گئی۔ عورت کا مکمل تعارف ہمیں بیدی کے فن ہی میں ملتا ہے۔ ایک عورت کے اندر پھوٹتی کونپلوں اور پروان چڑھتی امنگوں کو پہلے پہل سمجھتے ہوئے انہیں افسانوی لباس عطا کرنا بیدی جیسے عظیم فنکار کا ہی کمال ہے۔ پریم چند کے فن میں جہاں انقلابی طوفان اور شعلہ پوشیدہ ہے وہیں بیدی کے فن میں دھیمی آنچ سلگتی نظر آتی ہے جو "لاجونتی" "اپنے دکھ مجھے دیدو" اور "ببل" جیسی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ خیر! پریم چند کے متعلق نقادوں کی مختلف رائے ... اتفاق کیا جائے کوئی ضروری نہیں۔ ویسے اصغر علی انجینئر صاحب پریم چند کی شخصیت کے روشن پہلوؤں اور ان کے فنی تقاضوں پر بھرپور روشنی ڈالنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس بار بھی "نمود" نے ذہن پر ایک امٹ چھاپ چھوڑی۔ چند جملوں میں انسان کے زوال پذیر کردار کی آپ نے جس طرح عکاسی کی ہے وہ سچ مچ قابل تعریف ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی "نمود" کے حوالے سے سیاست، پولس، قانون وغیرہ کے بے نقاب چہرہ کی اہم جھلکیاں دکھائی جاتی رہیں گی۔

▲ ولسن۔ ڈی سوزا (دربھنگہ)

عثمانی شمارہ جلد ہی نظر آگیا۔ خرید لیا۔ جی خوش ہوا۔ "نمود" کے تحت اداریہ پسند آیا۔ آزادی کی ۵۰ ویں سالگرہ پر اچھی روشنی ڈالی۔ غالبیات کے سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کے کارہائے نمایاں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مقالہ قابل تحسین ہے۔

سید عارفی کی تخلیق معیاری ہیں البتہ ادارہ کی طرف سے کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ تنہائی کے موضوع پر شوکت صدیقی اپنی نظم کے تعلق سے لائق مبارکباد ہیں۔ ڈاکٹر اختر نظمی، خورشید اور اسلاف جاویدکی غزلیں بہترین ہیں۔ مشرف ذوقی اور حلیم صبا نوید اپنی تحریر میں ایک خاص بات رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر سہیل ایک ادبی رسالہ ہے۔ میری جانب سے مبارکباد قبول کیجئے۔

▲ آفاق فخری، جلال پور

○ دوران سفر ایک جگہ بک اسٹال پر ماہنامہ سہیل کا

بانی ـــــ حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل سنہاروی

بیادگار ـــــ زین العابدین احمر وادریس سنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

سرپرست ـــــــــــــــــ چیف ایڈیٹر مسعود منظر

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، ڈاکٹر قمر رئیس — ایڈیٹر — جمیل منظر

اصغر علی انجینیر، قیصر عثمانی — معاونین — شکیل احمد جمالی

شاہد احمد شعیب، ڈاکٹر محمد مشتیٰ ـــــــ عبدالقیوم ابدالی

ڈاکٹر علیم اللہ حالی، سید احمد قادری ـــــــ فیضان عزیزی

شمارہ ۸ تا ۹ ـــــ جلد ۵۲

بدل اشتراک ـــــــــــــــ

فی شمارہ ـــــــ ۵ روپے

زر سالانہ ـــــــ ۵۰ روپے

لائف ممبری ـــــــ ۵۵۱ روپے

اس شمارہ کی قیمت ـــ بیس روپے

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل ، ریلوے سائڈ روڈ گیا پن کوڈ ۸۲۳۰۰۱

۲۱۹/۳ [illegible]

اس شمارے میں

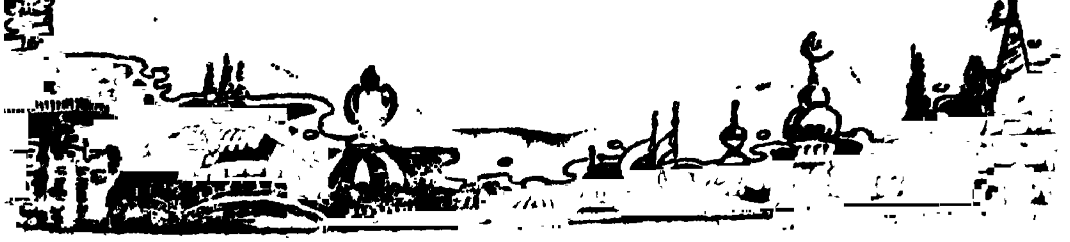
آزادی کے تحفظ کی ڈھال

ہندستانی عوام نے ذات پات اور مذہب وملت سے بلند اور متحد ہوکر آزادی کی جنگ لڑی۔

— جذبہ اتحاد۔ قربانی اور سیکولر نقطہ نظر انکی جدوجہد کا امتیازی نشان رہے ہیں۔

— یہی جذبہ ہیں متحد رکھ سکتا ہے اور ترقی کی راہ پر آگے لیجا سکتا ہے۔

ہماری آزادی کا محافظ — سیکولرازم



نمود

یہ شمارہ

رضا اشک اس مختصر سی مدت میں اردو شاعری کے تخلیقی منظرنامہ پر تسلسل کے ساتھ سامنے آئے ہیں ان کا یہ تخلیقی ابال دیدنی ہے یہ CREATIVE OVERFLOW نہ صرف ان کی فنی شخصیت کے لئے اہم ہے بلکہ شعر وادب کا مطالعہ کرنے والے سنجیدہ قارئین اور ساتھ ساتھ اردو شاعری کی حالیہ تاریخ کے لئے بھی قابل غور وتوجہ ہے ان کے تخلیقی و نمو کے طفیل جو فن پارے ہمیں حاصل ہو رہے ہیں وہ آج کی اردو شاعری کو ایک سمت عطا کر رہے ہیں۔ یہ سمت کیا ہے، آج اس کی معنویت کیا ہے، کل کیا رہے گی۔ یہ سوالات تفصیلی بحث کے متقاضی ہیں۔ رضا اشک کی وہ دست رس جو انہیں اظہار وبیان پر حاصل ہے۔ ان کی بیانیہ شاعری کے مزید امکانات کی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ اظہار وبیان کا یہ سیل بیکراں بہت سے قیمتی جواہر ریزوں کو بھی بہا کر ہماری طرف لیتا آتا ہے۔ بلاشبہ شاعری کے قاری کے لئے یہ ایک دشوار مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ تند رو اظہاری لہروں سے ان جوہروں کو اپنی گرفت میں لے۔ کبھی کبھی سرعت رفتار کے ساتھ ساتھ قاری بھی بہتا ہوا چلا جاتا ہے ——— اور جب وہ لوٹتا ہے تو خالی ہاتھ رہتا ہے۔ اس لئے کہ سرعت وروانی جگہ جگہ اس کے قدم اکھاڑتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس نوع کی شاعری قاری سے استقامت اور زود احتساب طلب کرتی ہے۔

رضا اشک اپنی تلمیحات واشارات کو ازمنۂ قدیم سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ آج تہذیبی تسلسل کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو جوڑنا ایک زبردست مجاہدۂ فن ہے۔ اس ہنر نے رضا اشک کی شاعری میں فکری علو اور تاریخی بسط کے نقوش بھی پیدا کئے ہیں ——— ان عناصر کا SUM TOTAL ان کی شاعری میں کیا اثر ڈالتا ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب قاری کے سامنے ان کی چند تخلیقات بیک وقت موجود ہوں۔ جب یہ دیکھا جائے کہ قاری نے انہیں پڑھ کر کیا محسوس کیا ہے۔ جب یہ معلوم کیا جائے کہ تنقید نگاروں نے ان کے بارے میں کیا تاثرات قائم کئے ہیں۔ رضا اشک کے نام اس خصوصی شمارے کی شان نزول بس یہی ہے کہ ہم عصر شاعری کو سمجھ سکیں۔

مسعود منظر



اس عہد کا ایک عظیم شاہکار
جہاں سب کچھ نیلام ہو رہا تھا
وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے
جو اپنے اسلاف کو بچانے میں لگ گئے

مشرف عالم ذوقی
کا

نیلام گھر

قیمت ۹۰ روپے

ایک ایسا تجربہ جو شہر بھی ہے اور قصبہ بھی
کے بعد
ہندوستان میں اردو ماہیوں کے خالق

ہائے بنارس

دیپک قمر کے مشاہدات اور جذبات کا اظہار

پھیاں پھویاں

ملنے کا پتہ
شان ہندوستان پبلی کیشنز
انصاری مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی

شخص و نظر

ہندوستان میں نئی اردو شاعری	محمد حسن
ایک خط، ایک مقالہ	سلام لعلی
رضا اشک کی شاعری، کچھ تاثرات	اصغر علی انجینیر
سردار رضا اشک	علیم اللہ حالی
رضا اشک ایک فطری شاعر	ساجدہ زیدی
رضا اشک .... تیشہ بدست شاعر	ماجد الباقری
نئے امکانات کا شاعر	سجاد مرزا
فیض کا علم بردار	انیس صدری
	سید احمد قادری
رضا اشک ایک فطری شاعر	رئیس انور
رضا اشک شخصیت اور فن	ابوالفیض سید آبادی
	فیاض حالی

محمد حسن

نئے زاویے

ہندوستان میں نئی اردو شاعری اور نئے افسانے کے نورتن

۱۹۷۰ء میں عصری ادب۔ نکلا تھا تو پچھلے دس سال کی اردو شاعری غزل، نظم، افسانے اور طنز و مزاح کے خزانوں کو کھنگالا گیا تھا۔ یہ اصول پیش نظر رکھا گیا تھا کہ اس مدت میں جن شاعروں اور افسانہ نگاروں کی کتابیں چھپی ہیں انہیں کا ذکر کیا جائے اور نئے میلانات کا تجزیہ کیا جائے اب اس مشق کی پھر ضرورت ہے کہ ۱۹۷۰ء بیتے بیس سال ہونے کو آئے لگ بھگ دو دہائیاں بیت گئیں۔ اگلے سال کے شمارے اس قسم کے تجزیاتی جائزوں کے لئے وقف ہوں گے۔

مدتوں پہلے کرشن چندر نے جو نئے زاویے کے نام سے دو جلدوں میں جدید اردو ادب کا انتخاب اور تبصرہ پیش کیا اس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ ہندی میں اگیے نے جدید شاعروں کا انتخاب اپنے تبصروں کے ساتھ تار سپتک اور اس کے بعد دوسرا سپتک میں پیش کئے۔ اور ان کتابوں کی گونج آج بھی ادبی حلقوں میں ہے۔ غلط یا صحیح نئے لکھنے والوں میں سے کچھ کی شناخت ان ہی کے ذریعے ہوئی۔

اردو میں آج یہ حال ہے کہ معتبر رسالوں کا کال ہے۔ اور اشاعت گھر اکے دکے ہیں۔ اور عام پڑھنے والے تک کتاب یا رسالے کا پہونچنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جاتا ہے۔ مشاعرے میں صرف چلتے ہوئے شاعر داد کی گٹھریاں باندھتے ہیں اور بھلا دیئے جاتے ہیں۔ نقاد ایسے ذمہ دار نہیں کہ تحقیق و تفتیش سے معروف اور غیر معروف لکھنے والوں کی کتابیں تلاش کر کے پڑھیں۔ اور پھر ان پر ہمدردانہ توجہ اور انصاف کے ساتھ رائے دیں۔ وہ صرف معروف ناموں ہی میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔

ان ہی چند خیالات میں الجھے الجھے جی چاہا کہ اپنی پسند کے جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی فہرست سازی تو کی جائے۔ یہ کام جان جوکھم کا تھا۔ مگر اس کوشش کے حدود کو متعین کر لینے سے کچھ آسانی پیدا ہو سکتی تھی۔ اول تو فہرست کو صرف جدید ادیبوں تک محدود رکھا جائے یعنی صرف ان لکھنے والوں تک جن کی تحریروں میں نیاپن ہو، کوئی انوکھی بات ہو جو ان کی شناخت بن گئی ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں جدید کا لفظ [illegible] جدیدیت کے معنی

...نا استعمال نہیں ہوا ہے ۔ دوسری بات یہ ملحوظ رکھی جائے کہ گفتگو صرف ان ادیبوں سے ہو جن کی کتابیں پچھلے دس برسوں ...اچھپی ہیں ۔ اور وہ بقید حیات ہیں ۔

اس حد بندی سے بعض نہایت سرکردہ ادیبوں کے نام چھوٹ جائیں گے ۔ مثلاً اختر الایمان ، سردار جعفری ، کیفی ...ظمی ، مجروح سلطان پوری ، معین احسن جذبی ، وامق جونپوری وغیرہ ، شاعری میں ۔ اور حیات اللہ انصاری ، عصمت ...چغتائی ، قرۃ العین حیدر ، جیلانی بانو ، شکیلہ اختر ، رام لعل ، رتن سنگھ ، عابد سہیل ، اقبال متین وغیرہ افسانہ نگاروں ...ے نام اس فہرست میں نہیں آئیں گے ۔ کیونکہ یہ اب ہماری روایت کا حصہ ہیں ۔ گو ان میں سے اکثر کا قلم اب بھی شاداب ہے ...ر وہ اب بھی عصری تقاضوں پر اثر پذیر بھی ہو رہے ہیں ۔ اور انہیں متاثر بھی کر رہے ہیں ۔ لہٰذا ان کے مقابلے میں ...یادہ جوان یا نوجوان ادیب تو ان میں بھی صرف ایسے چند کا ذکر ہو گا جو کسی نہ کسی طور سے اپنی شناخت بنا چکے ہیں ۔ اور ...ن کا فن کوئی انوکھا پن اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے کہ دراصل اسی انوکھے پن کی نشان دہی مقصود ہے ۔

ان سبھی حد بندیوں کے بعد بھی ایک اور حد بندی ہے نارسائی کی ۔ رسالوں اور کتابوں کی کسادبازاری کے دور ...میں کبھی کبھار محض نارسائی کی بنا پر ادیب گمنام رہ جاتا ہے یا اس کا ذکر جہاں اور جس طرح آنا چاہئے تھا نہیں آتا ۔ بہرحال ...ب ذرا فہرست پر نظر ڈالئے ۔

شاعری :

- عشرت آفریں : جن کی شاعرانہ لہجے کا تذکرہ اردو نظم کے جائزے میں موجود ہے ۔ ان پر سردار جعفری کا لکھا ہوا مقالہ پچھلے کسی شمارے میں شائع ہو چکا ہے ۔
- رفیعہ شبنم : کا تذکرہ ان کا بھی نظم کے جائزے میں موجود ہے ۔
- کشن تدوانی : جن کی نثری نظموں کا مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے "چند سنجیدہ سانسیں" انوکھا پن اس میں یہ ہے کہ شاعری کی مروجہ بیساکھیوں کے بغیر صرف احساس اور جذبے کی فکری اساس پر اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے ۔ اور نثر کی سی روانی اور بے ساختگی قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔
- علی ظہیر : کا مجموعہ " انگلیوں سے خون " شائع ہوا ہے ۔ اس کا انداز رمزیہ ہے ۔ مگر اس کی تہہ داری دور دور تک سطح در سطح پھیلی ہوئی ہے ۔ اور یہی انوکھا پن اسے عصری مجموعوں سے الگ کرتا ہے ۔
- رؤف جاوید : کے مجموعے پر اس شمارے میں تبصرہ شامل ہے ۔ اس کے نئے پن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ نیا پن صرف اتنا ہے کہ ذاتی اور نجی احساس کے دائرے میں عصری مسائل کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے ۔
- رضا اشک : کا ذکر بھی نظم والے مضمون میں موجود ہے ۔ اور اس میں عصری حسیت ایک نئی دردمندی کے ساتھ رونما ہوتی ہے ۔

۷۔ فیروز غضنفر: کا مجموعہ ابھی حال میں چھپا ہے۔ اس مجموعہ پر سلام بن رزاق کا تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے
اس سے اندازہ ہو گا کہ فیروز کے لہجے میں کتنا نیا پن ہے۔ صرف ان چند اشعار کے انتخاب پر نظر ڈالنا
کافی ہو گا جو تبصرہ نگار نے نقل کر دیئے ہیں۔

۸۔ اور شاید نئے لکھنے والے پراتوں میں سب سے اہم نام سید محمد مہدی کا ہے یہ شاعری کے کوچے میں بالکل نو
وارد ہیں۔ ان کی بعض نظمیں اس شمارے میں شائع کی جا رہی ہیں۔ مگر مجموعہ نہیں چھپا ہے۔

۹۔ اسی طرح سہگوان داس اعجاز کا نام قابل توجہ ہے۔ جنھوں نے دوہے اور کنڈلیوں کا راستہ اردو شاعری
کو دکھایا ہے۔ مجموعہ ابھی نہیں چھپا ہے۔

مگر نام گنوا دینے کے بعد بھی یہ ضروری ہے کہ چند ایسے برگزیدہ عکس بھی تذکرے سے محروم نہ رہیں جو نئی شاعری پر
چھپتے رہے ہیں۔ یا جن میں انوکھا پن موجود ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ یہ عکس غزل میں زیادہ اور نظم میں کم نمایاں رہے ہیں۔
نظم میں جو روایت پروان چڑھی ہے وہ اختر الایمان کی روایت ہے۔ ندا فاضلی کی آواز ہے جو چھوٹے چھوٹے لطیف
احساسات سے عصری حسیت اور فنی کیفیت بنتی جاتی ہے۔ نشتر خانقاہی کی "سرائے میں شام" والے مجموعے
کی نظموں کا طرز ہے۔ جس نے "جدیدیت" کی مریضانہ فلسفہ طرازی سے آگے نکل کر اپنے ہی نہیں، دنیا کے غموں کو
دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ پھر وہ ان کی لمبی بحر والی غزلیں اور نظم نما غزلیں ہیں۔ جنھوں نے نظم اور غزل کے
امتیازی سرحدوں پر فتح پائی ہے۔

غزل میں پرانے اور متوسط عمر کے لکھنے والوں نے بھی اپنا نیا پن پیدا کیا ہے۔ حسن نعیم کی غزل اس دور
کی قابل ذکر غزل ہے۔ اسی طرح وہ نئے لہجے اور بھی سامنے آئے ہیں۔ ایک شجاع خاور کا کھرا کھرا سا خنداری
رنگ ہے۔ جو ادب کو عام گفتگو بلکہ سڑک چھاپ لہجے تک پہونچاتا ہے۔ اور اسی لہجے اور امیجری میں اہم باتیں کہہ
گزرتا ہے، اور لطیف کیفیتوں تک پہونچتا ہے۔ اور دوسرا کلاسیکی انداز کے شاعر مغیث الدین فریدی کی غزل
کا لہجہ ہے۔ ان کے نئے مجموعے "کفر تمنا" میں غزل کے کلاسیکی رنگ و آہنگ میں اضافہ ہوا ہے کہ اب امیجری
مینا و جام سے آگے بڑھ کر راستے میں پڑے آئینے تک پہونچتا ہے۔

مگر یہ تو صرف چند اشارے ہیں ان لوز تنوں پر۔ اور پھر ان پر ٹپکنے والے دلِ قامت سالیوں پر۔
تفصیلی گفتگو کی ضرورت جو اگلی اشاعت تک اٹھا رکھتے ہیں۔

نوٹ: اس مضمون سے افسانہ نگاروں کے ذکر والا حصہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ م۔ ا

رام لعل

ایک خط ۔ ایک مقالہ

مکرمی رضا اشک صاحب! تسلیم

پہلے تو مجھے اس بات پر خوشی کا اظہار کرنا ہے کہ آپ محکمۂ ریل سے منسلک ہیں۔ اور تخلیق و تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ تحقیق ان معنوں میں کہ آپ مسائل کو پوری طرح چھان پھٹک کر انہیں اپنے شعری اظہار کا حصہ بناتے ہیں۔ ریلوے کے ماحول میں رہ کر تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس لئے اس ماحول میں بھی وہی ہزاروں انسان مسائل زدہ یا مسائل گزیدہ پائے جاتے ہیں۔ جو دوسری جگہوں پر موجود ہیں۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک اچھے تخلیق کار کے لئے یہاں بہت کچھ موجود ہے۔ اس لئے خود کو اس ماحول میں کبھی UNFIT نہ سمجھئے گا۔ بلکہ محکمۂ ریل کا شکر بجا لائیے کہ وہ آپ سے لیتا کم اور دیتا زیادہ ہے۔ میں نے ریلوے کی اکتالیس سال سروس کی اور کم و بیش چالیس پینتالیس افسانے اسی ماحول کے بارے میں لکھے۔ بدنام بھی ہوا کہ احمد جمال پاشا نے بہت سے لطیفے گڑھ کر لوگوں کے لئے ہنسی کا سامان پیدا کیا۔ ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا ——— کون رام لعل جس کا ہر افسانہ ریل کے پلیٹ فارم سے شروع ہوتا ہے۔

ایک بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے اپنی نئی کہانی تصادم سنائی تو وہ بھڑک اٹھے۔ آپ ہر ایک کہانی ریل کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور صدارت کر رہے تھے۔ راہی معصوم رضا ان دنوں ریسرچ اسکالر تھے۔ دونوں نے میرا دفاع یہ کہہ کر کیا ——— یہ کہانی ریلوے کے بارے میں ضرور ہے لیکن یہ کہانی بٹوارے کے موقع پر لاشیں ڈھونے والے قلیوں کی نفسیات کو پیش کرتی ہیں۔ جو پہلے تو خوفزدہ تھے بعد میں وہ لوگ سرکشی یا کچلی ہوئی لاشوں کے ساتھ مذاق کرنے لگے۔

میں نے بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ جو لوگ زندگی بھر دیہات یا کنبے کے بارے میں لکھتے رہے

ان پر کیوں کبھی اعتراض نہیں کیا گیا۔

جب مجھ پر ریلوے برانڈ کا ٹھپّہ لگا دیا گیا تھا۔ ایک رسالے نے مجھے ریلوے کے سگنل پر بٹھا کر یہ شعر لکھ دیا ہے

ریلوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں ۔ اسٹیشنوں کا سگنل کوئی نشاں ہمارا

شروع شروع میں میں اس طرح کے اعتراض یا اس قسم کی لادی ہوئی شناخت پر کبیدہ خاطر ہو اٹھتا تھا۔ یہ سچ بھی تھا۔ جس شخص نے تین چار سو کہانیاں لکھی ہوں۔ ان میں صرف تین ہی درجن کہانیاں ریلوے کے ماحول کے بارے میں ہوں تو اسے کیوں بدنام کیا جائے؟ پھر رفتہ رفتہ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس میں میری انفرادیت ہے۔ کسی زبان کے کسی مصنف نے اتنی بڑی تعداد میں ریلوے کے بارے میں آج تک نہیں لکھا ہے۔

بات ذرا لمبی ہو گئی ہے۔ آپ کی ایک بھی نظم آپ کے مجموعۂ کلام "پتھروں کی رہگذر" ریل کے بارے میں نہیں ہے لیکن آپ کے خط سے یہ احساس ہوا کہ آپ اس محکمے میں رہ کر خود کو مظلوم سمجھ رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اسی ماحول نے آپ کے ذہن کی پرورش کی ہے اور گھومنے پھرنے کی آسانیاں بھی مہیا کی ہیں۔ جیسے کہ مجھے ملی تھیں۔ میں تو پورا ہندوستان گھوم گھوم کر بہت خوش رہتا تھا۔ اتنی جگہیں، اتنے لوگ، اتنے روپئے، دیکھنے کو اور کہاں مل سکتے تھے آپ اعتراف کریں یا نہ کریں آپ کی سائیکی میں ایک مسلسل حرکت، دھماکہ پیدا کرنے کی خواہش اور ہر دم موضوعاتی سفر کرنے کی عادت یقیناً موجود ہے۔ یہ ریل کے ماحول ہی کا دین ہے۔

میری ایک کہانی "ساحل" کا قصہ سنئے۔ اس میں مال گاڑی کے ایک گارڈ کو گھر لوٹ کر آرام دہ پلنگ پر اس لئے نیند نہیں آ سکی تھی کہ وہ ہچکولے کھاتی ہوئی بریک میں بیٹھے بیٹھے سونے کا عادی ہو چکا تھا۔ جب اس نے اس بات کا ذکر اپنی بیوی سے کیا تو اس نے کہا آپ لیٹ جائیے میں پلنگ کا پایہ ہلاتی رہوں گی۔ جب راجندر سنگھ بیدی نے یہ کہانی پڑھی تو انہوں نے مجھے ایک ملاقات میں اپنی افتادِ طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلنگ کے پائے کو عضوِ تناسل قرار دیا۔

میں نے آپ کی ساری نظمیں پڑھ لی ہیں۔ مبصرین کی آرا بھی دیکھ لی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو آپ کی نظموں کے مقابلے میں غزلیں بہتر معلوم ہوئیں۔ غزلیں پہلے مجموعے "تیشے کا سفر" میں بھی موجود تھیں۔ ظ۔ انصاری (مرحوم) نے آپ کی خصلت یا طبیعت کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا:

"جن ترقی پسند شعراء کی ہوا میں آپ اڑتے ہیں بعض اوقات ان کی ہوا ایک وقت میں بندھی ہوئی تھی، اب آپ بھی زمین پر اتر آئیے"

یہ دونوں نقاد سیاسی نظریات کے معاملے میں ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ لیکن آپ کے نظریۂ شعر کے بارے میں دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے۔ اگرچہ ذرا مختلف انداز سے۔

آپ کی صداقت پرستی، دیانت داری، اور دنیا کو اپنے افکار کی دنیا بنانے کی شدید خواہش پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے شعری یا افسانوی اظہار میں اپنے محسوسات کو اپنے نقطۂ نظر سے ہٹا کر

کا پورا حق رکھتا ہے۔ لیکن موضوع اور طریقۂ اظہار جب ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوتے ہیں تو فن مجروح ہو جاتا ہے۔ نازک احساسات کو زبان اپنے جبڑوں میں لے کر چبا جاتی ہے۔

امرتا پریتم کی مشہور پنجابی نظم "آج آکھاں وارث شاہ نوں" کا آپ نے بہت خوبصورت اردو ترجمہ کیا ہے۔ اتنا خوبصورت کہ ترجمے پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ امرتا پریتم کے وہ سارے تہذیبی استعارے اور محاورے اردو زبان کی اپنی دلکشی کے ساتھ منتقل ہوئے ہیں۔ اس طرح بچوں کے لئے لکھی گئی نظم "دھرتی کی کہانی" بے حد متاثر کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں تاریخی سچائی بھی ہے۔ تخلیقی شان بھی۔ سرداری سنگھ، آج کے دن، کرفیو، پہرا، قفس ہی ہے، تو خاموشی کیسی؟ اور دیہات میں، اچھی نظمیں ہیں۔ آپ کی غزلوں کے یہ اشعار اچھے لگے۔

وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا مصور تھا
یہ اور بات کہ دنیا کو رنگ ریز لگا

مرا وجود ہی کیا وقت کے سمندر میں
بچھا ہوا کسی مچھیرے کا جال لگتا ہے

اصغر علی انجینئیر

رضا اشک کی شاعری ۔ کچھ تاثرات

شاعری کا فن خاصا پیچیدہ ہے۔ اس پر لکھنا آسان نہیں۔ شاعر کئی تجربات سے گذرتا ہے اور اس کے مشاہدات بھی لاشعور کے PRISM سے گذر کر کئی رنگوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور شاعری کے رنگ و نور میں بکھر جاتے ہیں۔ شاعر کی لاشعور کے پیچیدہ عمل کو تجزیے کی گرفت میں لانا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ شاعر جتنا بڑا ہوگا، یہ عمل اتنا ہی پیچیدہ تر ہوگا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ عمل جتنا پیچیدہ ہوگا شاعری بھی اتنی ہی عظیم تر ہوگی۔

ہر فنکار، ہر شاعر زندگی کا ایک نظریہ بھی رکھتا ہے۔ اور وہ زندگی کو اسی نظریئے کے ڈھانچے میں فٹ کرنا چاہتا ہے۔ نظریئے اور فنکارانہ عظمت میں بھی محسوس اور نامحسوس جدو جہد ہوتی ہے۔ نظریہ وضاحت چاہتا ہے اور فنکارانہ عظمت پیچیدگی اور ابہام کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایک طرف زندگی کا تقاضہ ہوتا ہے دوسری طرف نظریئے کا۔ زندگی کسی نظریاتی فریم ورک میں فٹ ہونا نہیں چاہتی اور نظریہ اسے اپنی پکڑ میں سمیٹنا چاہتا ہے

زندگی ہر نظریئے سے بڑی ہے لیکن ہر نظریہ زندگی پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ نظریہ فنکار کے دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ اور زندگی نہ صرف دل کی بات سنتی ہے نہ صرف دماغ کی اور کبھی کبھی دل و دماغ دونوں کو شکست دے کر مسکراتی ہے۔

فنکار انہیں الجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا ساتھ دے یا نظریئے کا؛ زندگی اسے پیاری ہے تو نظریہ بھی اسے عزیز ہے۔ نظریہ کبھی کبھی ۔ بلکہ اکثر فنکار کے جذبات کو مغلوب کر کے فن پر اپنا سکہ جما دیتا ہے۔ اکثر ترقی پسند فنکاروں کے ساتھ یہی ہوا۔ ایسی حالت میں کمٹ منٹ زندگی سے بڑھ کر نظریئے سے ہو جاتا ہے۔ نظریہ اگر محض اقدار کی زمین پر کھڑا ہو تو پھر بھی شاید مضائقہ نہ ہو لیکن نظریہ اگر سیاسی مدو جزر کی سطح پر تیر رہا ہو تو یہ فن کار کے لئے مضحکہ خیز حالات پیدا کر دیتا ہے۔ کوئی سیاست ہمیشہ ٹھوس اقدار کی زمین پر قائم نہیں رہ سکتی، ایسے حالات کے مدو جزر سے گذرنا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نظریہ زندگی کو

سمت عطا کرتا ہے۔ لیکن زندگی اتنی منہ زور بھی بن جاتی ہے کہ وہ نظریے کا رخ موڑ دیتی ہے۔ ایک اچھے فنکار کا کسی نظریے سے کمٹ منٹ تو ہوتا ہے لیکن زندگی کے تمام تر تقاضوں پر بھی اس کی گہری نظر ہوتی ہے اور ایک اچھا فنکار سیاسی نظریے کو جوں کا توں قبول نہیں کر لیتا بلکہ اسے قدروں کے معیار پر بھی پرکھتا ہے۔

پھر فن کے بھی اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ لفظوں کی تراش خراش، تلازمے، تشبیہات، استعارات، کہنے کا انداز، خیال کی ندرت، موضوع کے ساتھ برتاؤ، جدت فکر، وغیرہ وغیرہ۔ اگر مختصراً یہ عرض کروں تو ایک فن کار کو ایک طرف زندگی کے تقاضوں سے نمٹنا پڑتا ہے تو دوسری طرف نظریاتی اور فنی تقاضوں سے۔ اگر شاعری محض زندگی کی حاکمیت قبول کرے تو وہ سماجیاتی حقائق کی نشاندہی تو کر سکے گی لیکن نہ اسے کوئی دشا دے سکے گی نہ اپنے انداز دلربائی سے ہمیں لبھا سکے گی۔ اگر وہ نظریے کی حاکمیت قبول کرے تو نہ صرف وہ بے حقیقت ہوگی بلکہ بہت پھسپھسی بھی۔ اور محض فنکارانہ چابکدستی سے شاعری اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے سے رہی۔

اب سوال یہ ہے کہ رضا اشک کی شاعری کا کیا مقام ہے۔ کیا وہ ان تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے جن کا ذکر سطور بالا میں ہوا ہے میرے سامنے اس وقت ان کے کلام کے دو مجموعے "پتھروں کی رہگذر" اور "تیشے کا سفر" ہیں جن میں نظمیں بھی شامل ہیں اور غزلیں بھی۔ کلام کے دونوں مجموعوں کے نام یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں زندگی کی پتھروں کی رہگذر اپنے نظریے کے تیشے سے تراشنی ہے۔ اور ان کے کلام میں زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کا احساس بھی موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے نظریاتی تیشے سے دودھ اور شہد کی نہریں زندگی کی ان چٹانوں سے کاٹ پاتے ہیں یا نہیں۔ کوئی بھی فنکار خوابوں کے تانے بانے بن سکتا ہے۔ دودھ اور شہد کی نہریں نہیں بہا سکتا۔

ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جا[illegible] ہے کہ رضا اشک ایک درد مند دل رکھتے ہیں جو اچھ[illegible] شاعر کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ان کی کئی نظمیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ غربت، ہلاکت اور تشدد کے واقعات پر ان کا یہ درد مند دل بے قرار ہو اٹھتا ہے "اگنی پریکھشا"، "سال نو"، "ایک سوال" وغیرہ جیسی نظمیں اس کا ثبوت ہیں۔ انہیں اور ایسی ہی دوسری نظموں سے ان کا نظریاتی کمٹ منٹ بھی ظاہر ہے۔ وہ ہر [illegible] کے استحصال سے لڑنا چاہتے ہیں۔ زندگی کو وہ صاف ستھ[illegible] اور نکھری ہوئی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسے غربت، نفرت اور استحصال سے پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں۔

رضا اشک کے یہاں کمٹ منٹ اقدار سے ہے، [illegible] سیاسی نظریات سے نہیں۔ وہ اس خار زار سے اپن[illegible] دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔ اس سے قبل کئی ترقی پسند شاعر اس سے نہیں بچ سکے تھے۔ ان کے یہاں موضوعا[illegible] کا بھی تنوع ہے اور ہیئت کا بھی۔ چھوٹی بحر میں استعما[illegible] کر کے بھی انہوں نے اپنی شاعری میں تاثر پیدا کیا ہے "قصہ ایک شہر کا" "اپنا ہی جناور" "سرد وادی سنگ" جیسی نظمیں اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

رضا اشک کی شاعری سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خارجیت پسند (Entrovert) ہیں داخلیت پسند (Introvert) نہیں۔ ایک [illegible] میں یہ بات ان کی شاعری کے حق میں نہیں جاتی۔ باطن کی گہرائیوں میں اترے بغیر زندگی کے اسرار و رموز [illegible] نہیں آتے۔ یہ صحیح ہے کہ نظم خارجیت کا تقاضہ کرتی ہے لیکن اقبال نے نظموں میں بھی یہ کرشمہ دکھایا ہے

اور زندگی کے اسرار کی لہر تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔
نظم کی خارجیت تو خیر گوارا ہے۔ رضا اشک کی غزلوں
میں بھی خارجیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ ابہام
کے مقابلے میں بیانیہ شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر وہ
شاعر جو زندگی کی پیچیدگیوں پر لفظیاتی کمٹمنٹ کو ترجیح
دیتا ہے اس کے یہاں خارجیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔

جو شاعر کمٹمنٹ کو ترجیح دیتا ہے وہ ابلاغ کو
بھی اسی زمرے میں رکھتا ہے۔ کمٹمنٹ کا جوڑا ابہام
کے ساتھ نہیں بیٹھتا۔ ابہام جہاں زندگی کی پیچیدگیوں کی
نشاندہی کرتے ہوئے شاعری میں دوام کا عنصر پیدا
کرتی ہے وہاں ابلاغ کے معاملے میں کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہر شاعر
کو یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ ابہام کو ترجیح دے یا ابلاغ
کو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رضا اشک ابلاغ کو
ترجیح دیتے ہیں۔

وہ زندگی کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کی آگاہی
بخشنے کے لئے اتنے بے چین نہیں ہے جتنے زندگی کی خرابیوں
اور استحصالی قوتوں کا شعور پیدا کرنے کے لئے۔ وہ زندگی
کی لاشعوری قوتوں کی پہنائیوں اور گہرائیوں میں اتنی
دلچسپی نہیں رکھتے جتنی زندگی کو ہر نجاست سے پاک
کرنے والی قدروں میں۔ دوسرے لفظوں میں جوان کی شاعری
کی قوت ہے وہ کمزوری بھی بن جاتی ہے۔

بہرحال ان کی ترجیحات ہمارے سامنے ہے۔
وہ صداقت، خلوص، مساوات، کمزور اور مظلوم انسانوں
سے ہمدردی جیسی قدروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور ان
جذبات کو فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی شاعری
میں پوری ایمانداری سے پیش کرتے ہیں۔ شاعری کے لئے
یہ اثاثہ کوئی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اور خصوصاً آج کے
سرمایہ دارانہ نفسا نفسی کے دور میں۔

ذکی

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

سردار رضا اشک

میں جب مجبور ہو جاتا ہوں تو کسی پر قلم اٹھاتا ہوں۔ یہ مجبوری دو قسموں کی ہوتی ہے اول تو یہ کہ فن کار کے فن پارے اپنے حسن و جمال، اپنی غیر معمولی تاثیر، شدت جذبات، اظہار کی لغیاتی معیار کی بلندی اور بصر و نظر کی وجہ سے مجھے مجبور کر دیں کہ میں ان کے بارے میں کچھ لکھوں۔ ایک دوسری مجبوری احباب کا اصرار ہے۔ اس سے بھی مفر نہیں کیوں کہ دنیا میں ہوں تو بشمول تنہا دنیا کو کسی نہ کسی حد تک ساتھ لے کر چلنا ہے نقاد جوگی، تیاگی، سنت، صوفی اور فقیر تو ہوتا نہیں کہ جو چاہے روند جائے کسی سے خفا نہیں لیکن اس موخر الذکر مجبوری میں بھی جواز تو بہر حال ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے۔

جواز پر مجھے ایک بات یاد آگئی، آپ نے بھی سنی ہوگی حضرت عیسیٰؑ ایک بار اپنے حواریین کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ بھیڑ نظر آئی، انہوں نے اپنے رفیقوں سے بھیڑ کی وجہ دریافت کی، لوگوں نے بتایا کہ سڑک پر ایک سور مرا پڑا ہے۔ ہر طرف بدبو پھیلی ہوئی ہے لوگ اسے دیکھتے ہیں، ناک بند کر کے اس پر تھوک پھینکتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اپنے حواریین کے ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ انہوں نے مرے ہوئے متعفن سور کے پاس بیٹھ کر لکڑی کے ایک ٹکڑے سے اس کا منہ کھول کر حواریین کو دکھایا اور کہا کہ دیکھو اس کے دانت کتنے حسین کیسے چمکدار اور نوکیلے ہیں اس کے دانتوں کی دیر تک تعریف فرماتے رہے۔

مجھے لگتا ہے کہ سچے تنقید نگار کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح کریہہ المنظر اور متعفن ماحول سے بیزار نہیں ہونا چاہئے اسے قبح میں حسن تلاش کرنا چاہئے ــــ اور اسی طرح وہ ایک ایسا زاویہ نظر پیدا کر سکے گا جو عام لوگوں سے مختلف ہو، جو حقیقت کی خارجی سطحوں سے گزر کر داخلی تہوں تک رسائی کے لئے ایک VISION دے سکے۔

رضا اشک کے مجموعہ کلام "پتھروں کی رہگزر" کا مطالعہ کرتے ہوئے میں کئی دنوں سے ہی خوبصورت چمکدار اور موتیوں کی طرح دمکتے ہوئے دانتوں کو تلاش کرنے میں منہمک رہا۔ ان کی وہ نظمیں بھی پڑھیں جو سماجی اور سیاسی موضوعات پر لکھی گئی ہیں، وہ منظومات بھی جو

خدوخال بے نقاب کرتی ہیں۔ وہ بھی جو مخلف
سے متعلق ہیں۔ جو طنز و مزاح کی ترشی اور خبریت
ہا۔ ظاہر ہے کہ میں نے ان کی تمام غزلیں بھی غایت
اتھ پڑھی ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر اس
خود اپنے اظہارات کا احتساب کس طرح کرتا
رکے ایک ایک شعر اور اس کے ایک ایک لفظ سے
س کے فن کو سمجھنا چاہیے۔ غزل کی صنف میں
شخصیت اور احتساب ذات کے نقوش تلاش
تو مجھے رضا اشک کے درج ذیل شعر نظر آئے۔

ہے لفظ زباں اور حرف حرف دہن
ہر ایک شعر مرا بول چال لگتا ہے

ہم تجھے جاوداں بنائیں گے
تجھ کو بخشیں کے ہم ثبات غزل

یہ میرے فن سے ہے شکوہ جدید ذہنوں کو
کہ میری غزلوں کا لہجہ ہے اشتراکی کا

سفر غزل کا روایت سے شہر جدت تک
ہیا ملی میرے دیوان شاد و حسرت تک

میرا طرز بیاں مرا اسلوب
میری جان نگارشات غزل

یہ صدا گونجے گی پیہم وقت کی محراب میں
زندگی فانی ہے لیکن غیر فانی ہے غزل

صنف غزل کو اہمیت دینے والا خود کیسی غزلیں کہتا
ا روایات سخن سے کتنے نئے گوشے نکلتے ہیں۔ اس
ے کے لئے کیا طرز اپنایا ہے۔ اس کی غزلیں عہد حاضر
، کیا معنویت رکھتی ہیں۔ خصوصاً ایسے زمانے میں
حد لوگوں نے اس صنف میں نئے تیور، نئے لہجے،
یات اور نئے موضوعات کی ایک دنیا بسالی ہے۔

یہ سوالات تفصیل چاہتے ہیں اور اس طرح رضا اشک کی غزلوں کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے واقعی جواز تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ میری ذاتی رائے میں جس صنف کی انہوں نے اتنی طرح سرائی کی ہے جس میں ایک نئے لہجہ کی افزائش کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ جسے ثبات بخش دینے کا عزم ہے جس کے منظر نامے میں روایت سے سفر کر کے جدت تک پہنچنے کا مکمل سروے کیا گیا ہے اور جس صنف کو شاعر نے اپنی نگارشات کی جان بتایا ہے وہ خود اس کی گرفت سے باہر ہے۔ یہاں فنی، عروضی، صوتی اور دیگر خامیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی قاری تہی دست رہتا ہے۔ غزل کے اشعار میں معنی خیزی، تہہ داری، نیم گفتنی، جدت خیال اور احساس و تاثر کی جو شدت چاہئے وہ یہاں موجود نہیں۔ اکہراپن غزل کے شعروں کو بے روح بنا دیتا ہے۔ غزل کا حسن خود بین و خود آرا نہیں ہوتا۔ یہاں جلوۂ بے محابہ کی ضرورت نہیں۔ جلوہ پس چلمن چاہئے، غزل کا اظہار حشو و زوائد کو قبول نہیں کرتا۔ یہ شرطیں کسی نظریۂ حیات کی نفی پر اصرار نہیں کرتیں اگر شاعر اشتراکی ہے تو ہوا کرے اس سے غزل اور اس لہجہ و تاثیر کو کیا لینا دینا، فیض بھی تو اشتراکی تھے، رضا اشک کو کم سے کم اس کی مثال تو سامنے رکھنی ہی چاہئے تھی۔

مگر سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ غزل رضا اشک کو اپنا دوست نہیں سمجھتی۔ انہیں چاہئے کہ جو ان سے بھاگتی ہے اس کی خوشامد بھی نہ کریں۔ جو ہمیں کچھ نہیں دیتا اس پر اتنی توجہ نچھاور کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ غزل شیشے کے سفر زہرہ گداز میں ساتھ نہیں دیتی، یہ پتھروں کی رہگذر پر بھی نہیں چل سکتی اس کے لئے جس لطیف ترین فلاؤ اور ETHERICAL فضا کی ضرورت ہے وہ اگر رضا اشک مہیا نہیں کر سکتے تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی ہنگ

آستاں کیوں ہو۔

رضا اشک کے مجموعہ کلام میں آزاد غزل، قطعات، شجر ممنوعہ کسی مخصوص حادثے یا واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئیں منظومات وغیرہ بھی ہیں۔ یہ سب چیزیں رضا اشک کے تخلیقی سرمائے میں VARAITIES کو بنا دیتی ہیں مگر ان سے اشک کی تخلیقی شخصیت واضح نہیں ہوتی۔ سوائے اس بات کے کہ ان کی قدرت کلام کا اندازہ تمام اہل نظر کو ہے اچھی شاعری صرف قوت اظہار کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ اس سے شاعری کے سرمائے میں BULK تو پیدا ہو سکتا ہے مگر شعری لطافت کے مجروح ہو جانے کا اعلان بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس شاعری کے لئے تو غالب کے الفاظ میں تندیٔ صہبا اور گرمیٔ اندیشہ کی ضرورت ہے جس سے آبگینوں کے پگھل جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور گرمیٔ اندیشہ اور تندیٔ صہبا شاعری کے لئے اتنے اہم اجزائے اعظم ہیں کہ ان کے طفیل شکست آبگینہ کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔

رضا اشک کو صرف ان کی نظموں کی روشنی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے لیکن کسی فنکار کو ایمانداری کے ساتھ سمجھنے اور اس کے سرمایۂ سخن کی تقدیر و تعین کے لئے جو آزاد، پرسکوت اور UNPREJUDICED فضا چاہئے اسے تو خود رضا اشک نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ داد گروں اور دوستداروں کی واہ واہ اور نعرہ آفریں میں کسی آزاد مطالعہ کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ منظر کچھ مشاعروں جیسا ہے۔ شاعر نے ابھی ایک مصرعہ پڑھا، عوام کے لئے پسند خاطر ہوا اور داد کا ایسا ہنگامہ بلند ہوا کہ مصرع ثانی سنا بھی نہیں گیا اکثر خوبصورت اور معیاری اشعار پر خاموشی رہی اور ادنیٰ درجے کے شعروں پر چھتیں پھٹنے لگیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہمارا کام تو صرف واہ واہ کرنا ہے۔ ہمیں شعر سننے اور سمجھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ یہی صورت حال ان تاثراتی کلمات سے بنتی ہے۔ جو اشک اور کلام اشک کے سلسلے میں لوگوں کے لکھ بھیجے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجموعہ کلام میں انہیں شائع کر کے رضا اشک کیا تاثر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اچھی بری رائیں تو آتی ہی رہتی ہیں ان سے شاعر کی تخلیقی شخصیت پر کیا فرق آتا ہے۔ انہیں اتنی بڑی تعداد میں مجموعہ کلام کی زینت بنا کر ممکن ہے رضا اشک نے احباب نوازی سے کام لیا ہو۔ خدا کرے اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو ــــــ اور خدا کرے یہ کبھی نہ ہو کہ یہ رائیں دوست نوازی کے جذبے سے لکھی اور کھینچی گئی ہوں۔ خیر جو بھی ہو لیکن اس کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ مجھ جیسے قارئین کو وہ آزاد و لبیط اور غیر مقید ماحول نہیں ملتا جس میں رضا اشک کو محض ان کے کلام کی مدد سے سمجھا جائے۔ اور یہ طے کیا جائے کہ اردو عصری مزاج و معیار میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ رضا اشک کی تخلیقیت کا عنصر غالب ان کی نظمیں ہیں۔ یہ مزاج اور معیار دونوں اعتبار سے نشیب و فراز کا جو گراف بناتی ہیں وہ اس لحاظ سے حیرت انگیز ہیں کہ ایک طرف عالمی سیاست اور وقوعوں کی گہری اور بصیرت افروز باتیں ہیں اور دوسری طرف بچوں کے لئے بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ ایک طرف بالکل نجی اور ذاتی تجربے کو روزمرہ کے لہجے اور معیار سے پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف گہرے سماجی شعور کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس اتار چڑھاؤ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رضا اشک تخلیق فن کے لئے تجربات کے اخذ و ترک کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت میں پھیلاؤ ہے اور جو تاثر جس سمت سے ذہن و د... رفاری

سے ہوا ہے بے کم و کاست اور بے خراد و بے محابہ
کر دیتی ہیں۔ یہ بات اس لحاظ سے تو اچھی ہے کہ
کی شعری فضا میں حسن معنی کی خصوصیت ہے جسے کسی
طگی کی ضرورت نہیں
کر فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی
تصنع، تکلف، اہتمام، رکھ رکھاؤ، آرائش و
الش، تراش و خراش اور فکرِ قماش سے بے نیاز ہو کر
ی سماجی، تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی شعور و احساس
لیس ہو کر رضا اشک کی جو شاعری ہمارے سامنے آتی
، وہ نظیر اکبر آبادی کی روایت سخن کی یاد دلاتی ہے
وشاعری کو نظیر نے ایک نہایت وسیع اور کشادہ
ہراہ دکھائی تھی، وہ خود بھی بہت دور تک رعب
ب کے ساتھ اس راستے پر چلے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ
اردو شاعری ایسی شاہراہ پر نظیر کے نقش و قدم پر
گی —— مگر پھر یہ دیار دیار میں واپس چلی گئی اور
وں کوچوں کی خاک چھاننے لگی۔ رضا اشک کے تخلیقی
ئے میں کہیں نہ کہیں سے نظیر کی روایت اپنے آپ
دہرانا چاہتی ہے۔ لیکن نظیر کی وسعت نظر، ان کی
مانی دوستی، عوام سے ان کی بے پناہ محبت اور اپنے
ول سے ناگزیر اور غیر مشروط تعلق کو کسی مخصوص نظریہ
ت اور کسی سیاسی وابستگی کی حد بندیوں میں
تار نہیں کیا جا سکتا۔ پتہ نہیں رضا اشک کو یہ
ساس ہوتا ہے یا نہیں۔
مگر ضرور ہوتا ہے —— اس لئے کہ یہ وہی
ا اشک ہیں جو پہلے رضا اشک سستی پوری کے نام سے
تے اور چھپتے تھے۔ اپنی شہرت اور رابطے کی وسعت
بعد انہیں یہ اندازہ ہوا کہ سستی پور انہیں محدود
کے رکھ دے گا۔ اس حصوں سے جگہ کو نام کا لاحقہ

بنا کر دور تک جانا مشکل ہے۔ اپنے اس دُرِ شہوار کو کھو کر
سستی پور پر جو گزرے سو گزرے لیکن رضا اشک
نے تو بخیال خولیش اس حد بندی سے نکل جانے کی کوشش
کی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ شکستِ حصار کی یہ مثالی
مستحسن نہیں ہے لیکن اس سے خود شاعر کے فکر و نظر
کی تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ وسعت اور فراغ
چاہتا ہے۔ اپنے آپ کو ارض و سما میں پھیلانا چاہتا
ہے اور جب وہ اس رم و رفتار اور پرواز کا اہل ہو جائے
گا تو ایک سچے فن کار کی طرح، نظیر اکبر آبادی کی طرح
نظریاتی وابستگی کو بھی ایک حصار سمجھنے لگے گا ——
لیکن وہ منزل ابھی دور ہے، پھر یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ نظیر
کے تخلیقی ورثے کا احیا آج کے بدلے ہوئے حالات میں
فکر و فن کے کسی ڈھانچے کا طلب گار ہوتا ہے۔
رضا اشک کہاں جائیں گے، ان کے فن پارے
انہیں کتنی دور تک لے جا سکتے ہیں ان کے بارے میں
کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ توقعات اور تمناؤں کا معاملہ
یہ ہے کہ یہ اکثر و بیشتر تشنۂ تکمیل ہی رہ جاتی ہے۔

★

ساجدہ زیدی

رضا اشک ۔ ایک فطری شاعر

رضا اشک کی شاعری کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شاعری کی صلاحیت خداداد ہے۔ اتنی خداداد کہ وہ رک کر دم بھی نہیں لیتے۔ لکھ کر بعد میں قلم بھی نہیں لگاتے۔

میری ناقص رائے میں ان کی شاعری خوبیوں اور خامیوں، حسن و قبح دونوں کی بنیاد یہی ہے۔ جس کی طرف تجزیاتی اشاروں پر ہی میری اس تحریر کا دارومدار ہوگا۔

رضا اشک کی شاعری کا خاص وصف، روانی اور بیساختگی ہے۔ طبیعت کی جولانی، الفاظ کی فراوانی، نارسا کی فہرست ہائے طولانی۔ سب انہی بے ساختگی و روانی کے ساخسانے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ میں (خصوصاً نظموں کے ضمن میں) جب کوئی خیال آتا ہے تو اپنے تمام انسلاکات و لوازمات کے ساتھ آتا ہی چلا جاتا ہے۔ بے روک، بے اختیار.... لیکن نظموں پر خیال آرائی میں بعد میں کروں گی۔ پہلے غزلوں کی طرف رجوع کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

رضا اشک کی غزلوں میں ان کی مخصوص روانی بے ساختگی کی کارکردگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ڈکشن میں اگرچہ روائت بھی ہے اور ترقی پسند شاعری کا تتبع بھی۔ لیکن الفاظ عموماً سجل اور رواں ہیں۔ بھدے بھونڈے الفاظ اور ادائیگی کی لوالعجبیت سے رضا اشک کو عموماً سروکار نہیں رہتا۔ جو خیال انہیں ادا کرنا ہوتا ہے اکثر بلا کم و کاست، راست بیانیہ کے انداز میں ادا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غزلوں کے اشعار میں عموماً ایک سطحیت اور عمومیت تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن ناگوار قسم کا گنجلک انداز، دور از کار ایجنز اور غیر شاعرانہ الفاظ و تراکیب وغیرہ در نہیں آتیں۔

غزلوں کا ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ:-

آپ جیتے رہئیے قارون کی دولت کے لئے
مجھ کو حاتم سی سخاوت کے لئے جینا ہے

مجھ کو من کا سودا ہے، لوجھ تجھ کو دھن کا ہے
تجھ کو پیٹ کی دھن ہے مجھ کو فکر فن کی ہے

اور— راج محل کی اے رقاصہ یہ کیا تجھ کو معلوم نہیں تھا
تو بھی کچھ سکوں کی خاطر ناچ سر بازار کرے گی

ادہ سہہ گیا

تم کے پیش یا افتادہ خیالات عامیانہ اور سپاٹ
ہار بیان کے درمیان سے جب جب رضا اشک کا تخلیقی
ہر نکھرتا ہے تو) بعض خوبصورت، موثر اور دلکش اشعار
برق سی چمک جاتی ہے جو قاری کے تخیل اور احساس
اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس نوع کے اشعار کی چند
ثالیں دیکھئے۔ یہی اشعار رضا اشک کی تمام تر شاعری
جواز مہیا کرتے ہیں۔

بیاضِ ہستی پہ آنسوؤں سے
لکھا ہوا انتساب تھی وہ
عظیم صحرائے تشنگی میں
بسیط موجِ سراب تھی وہ

اور حسین امیج، حسین تخیل اور دلنشیں انداز

مزاجاً میں بھی اک شیشہ ہوں لیکن
مثالِ سنگ ٹھہرایا گیا ہوں

جب تک ہے اس جہاں میں سیاہی کا کاروبار
کاغذ پہ ہم اگاتے رہیں گے قلم کا چاند

موسم درد ہے سنگین سہ رات لئے
سم چلی آؤ کبھی فانوس ملاقات لئے

(اگرچہ فیض کی بازگشت معلوم ہوتا ہے لیکن شعر جاذب
نظر ہے۔ امیج خوب ہے اور برمحل بھی) اب ان اشعار
کے تیکھے لب و لہجے پر غور کیجئے۔

وہاں سے اذنِ خرام لے کر، کہو کہ آگے بڑھے زمانہ
تمہارے نقشِ قدم سے جس جا ہمارا نقشِ قدم ملا ہے
فقط یہیں ختم تو نہیں ہے، فسانہ اپنی مسافرت کا
فصیلِ شہرِ طرب سے جا کر بسیط صحرائے غم ملا ہے

پہلے شعر کی مکمل امیج اور دوسرے شعر میں فصیلِ شہر

اور بسیط صحرائے غم، کی امیج کا تضاد و معنوی تعلق،
الفاظ کا تناسب، خیال کا مدھم بہاؤ، اظہار کی
خوش سلیقگی سب کچھ ایک رچی بسی شعری صلاحیت
کے آئینہ دار ہیں۔

آئینۂ ہستی پہ یہ کیسی ہیں خراشیں
پوچھے یہ کوئی ناخنِ اربابِ عمل سے

وہ اپنی روح کی بھٹی میں جل رہا ہوگا
حصارِ جسم کے اندر پگھل رہا ہوگا

اب اور کیا دلِ تیرہ نصیب دیکھو گے
سحر ہوئی تو کرن کی صلیب دیکھو گے

ڈال آئی ہے خود جا کے ہوا خاک کی چادر
بستی سے بہت دور سرِ تربتِ شاہی

ان اشعار میں سبھی استعارے، اور امیج معنی خیز بھی ہیں
اور لفظی نشست و برخواست کے لحاظ سے سبک
اور سجل بھی۔ آئینۂ ہستی پہ خراشیں کی مناسبت سے ارب
عمل کے ناخن ... یہ روح کی بھٹی میں جلنا کی مناسبت سے
حصارِ جسم، اور پھر اس کے اندر اندر پگھلنا — کرن کی
صلیب پر چڑھنا (تیرہ نصیبی کی مناسبت سے)...
یہ سب وہ شعری محاسن ہیں جو شاعر کے بطون میں موج
شعری صلاحیت کا اشاریہ ہیں۔ اس ضمن میں وہ فقرہ
پوری غزل آتی ہے جس کا مطلع ہے

سراپا غم، مجسم بے لبسی ہوں
میں اپنے عہد کی بے چارگی ہوں

رضا اشک کی غزلوں میں کہاں کہاں ایسی ہی بجلیاں
چمک کر انہیں فطری شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی

حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ جو شاعر ایسے اشعار کہنے کا اہل ہے اس کی غزلیات میں بعض بہت بیّن قسم کے نقائص کیسے در آتے ہیں جو نہ صرف شعر کو بے کیف اور سپاٹ و سطحی اور عامیانہ بناتے ہیں بلکہ بسا اوقات محاورہ، تذکیر و تانیث، بحر و اوزان، اور یہاں تک کہ زبان و قواعد کی غلطیوں تک کا مرتکب بنا دیتے ہیں شاعر کو ...... اس قسم کے صرف چند اشعار کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتی ہوں جس سے میرا مقصد عیب جوئی نہیں ہے۔ صرف شاعر سے یہ استفسار کرنا ہے کہ کیا وہ غور و فکر، نظر ثانی، خود احتسابی، کا بالکل ہی قائل نہیں ہے

اور سنجیدگی کا وہ رشتہ قائم کرنے پر مائل نہیں ہے جس کی بنا پر شعری کاوش محض تلاش معنیٔ حیات بن جاتی ہے۔ اور شعری صداقت اپنے عہد کی صداقتوں کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

اب یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے :۔

او دشمنِ اخوت و محبت، کبھی سرِ مقتل عداوت
تمہاری باہیں مرا گلو ہو تو کچھ طبیعت بہل بھی جائے

قطع نظر "او" کے طرز تخاطب کے جو کبھی "تم" کے ساتھ نہیں آتا۔ مصرع اول وزن سے خارج ہے

سوچتا ہوں اب ٹھہرا میں زندگی کی دھوپ میں
رات کس مہتاب کے گہن میں ہم الجھے رہے

قطع نظر پہلے مصرع میں "میں" اور دوسرے میں ہم کے صیغۂ واحد متکلم کے ..... دوسرے مصرع میں گرہن اپنے صحیح تلفظ کے ساتھ خارج از بحر ہے۔ جب تک کہ اس لفظ کو "گرہن" بروزن "برہن" نہ پڑھا جائے جو غلط ہے۔

گھر کچھ ایسے بھی ملے سکوں کی ہر جھنکار پہ
طبلے کے کچھ دھن دھن ملے، گھنگھرو کے کچھ چھن چھن

دونوں مصرعوں کا وزن مختلف ہے۔ بقیہ غزل کا وزن پہلے مصرع کی طرح ہے۔ اس شعر اور پوری غزل کی پیش پا افتادگی کا تو ذکر ہی کیا۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جہاں الفاظ کو توڑ مروڑ کر یا ان کا صحیح تلفظ بگاڑ کر ہی وزن میں فٹ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً (یہاں بھی زبان و بیان کے عامیانہ پن سے قطع نظر کیا گیا ہے۔)

"میں اٹھوں لیکے یہ بربط و چنگ و نے
تم بھی شمع و گلدان لے کر چلو"

(یعنی چہ) شعر صحیح بحر میں صرف "شمع و گلدان" کہکر آتا جو سراسر غلط ہے۔

"کھلتا رہا جیسی بات پہ صدر دفتر تنقید
وہ کام لیا میں نے اک مصرع غزل سے"

اول تو "صدر دفتر تنقید" جمع ہے جبکہ کھلتا رہا فعل واحد ہے۔ پھر "مصرع غزل" کی ترکیب سے شعر میں وہ غلطی اسی انداز سے در آئی ہے جس طرح مذکورہ بالا شعر میں "شمع و گلدان" کی وجہ سے۔

اب اس طرح کے سہو کو ہم کس کھاتے میں ڈالیں ناواقفیت کے یا عدم توجہی کے!

اس قسم کے سہل انگاری بلکہ ناروا فرو گذاشت اکثر جگہ محاوروں کے استعمال میں بھی نظر آتی ہے یا بے محاورہ زبان سے سہواً گریز میں چند مثالیں۔

بھاگے ہیں جس قدر بھی اجالے کی سمت لوگ
سایۂ شام اور بھی ہوتا گیا ہے طول

سینہ بہ سینہ پھولتی پھلتی رہی میری
نیکی مگر وہ دست بدلتی کہاں گئی (جبکہ معنی دا...)
کیا کیا نہ ارماں چھپے تھے نئی نویلی دلہن میں

پاؤں میں زنجیر طلائی، ہاتھ سنہرے کنگن میں

طوفان دلھن کے دل میں چھپ سکتے ہیں۔ خود دلہن میں نہیں۔ یہ اظہار بھی محاورے سے خارج اور بے معنی ہے۔

ہے بہت محبوب وحشی کو سلاسل کی صدا
بج رہی ہیں چوڑیاں ہر سو قریب و دور میں

(میں، حشو اور بے محاورہ ہے)

یوم شب چاند سورج نکلتے رہے
کٹ گئی اشک آدھی صدی شہر میں

(روز و شب با محاورہ ہے، یوم شب بے محاورہ ہے)

لاکھ چمکایا بھی دے دے کے اسے اپنا لہو
آئینہ بن نہ سکا آئینہ گر کی صورت

لہو دے دے کے آئینہ چمکانا (چہ معنی دارد۔ خیال بھی غلط۔ محاورہ بھی غلط۔

فرحانہ، گوہر و نوشاد، مشتری بیگم
ہیں اشک کھو یار ہا کن حسین کھلونوں میں

عام اس سے کہ شعر کس قدر بے لطف ہے۔ اتنے ناموں اور "کن" (حرف اشارہ) کے ساتھ "کھلونوں" آنا چاہئے تھا۔ مگر قافیے کی مجبوری تھی۔ بے چارہ شاعر کیا کرتا؟ قلم زد کرنے کا وہ روادار نہیں۔ کاش رضا اشک کو حشو و زوائد (در اشعار) اور بے تکے اشعار کو قلم زد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو سکتا۔

اب دو ایک ایسے اشعار دیکھئے، جو بہت معمولی سی توجہ سے محاورہ و خیال کی ادائیگی کے اعتبار سے مناسب ہو سکتے تھے۔

"جگا کے چشم تمنا میں خواب کی لذت
دلوں میں حسرت تعبیر چھوڑ جاؤں گا"

ایک ہی تو چشم تمنا ہے۔ کئی دل نہ دلوں — کہاں رہ گئے؟ دلوں کی جگہ، "میں دل بھی"۔

"چراغ دل کو مثال چراغ طور کریں
سیاہیوں سے جلوۂ اکتساب نور کریں"

شعر صوتی اعتبار سے خوب ہے۔ لیکن "چراغ طور" لفظاً اور معناً صحیح نہیں ہے۔ طور پر حضرت موسیٰ کو جلوہ نظر آیا تھا وہ مثال برق تھا، کہ فضا کے سامنے بجلی سی چمکی اور غائب ہو گئی (کوہ طور کو سرمہ بنا کر) چراغ تو دیر تک جلتا ہے۔ محاورہ بھی چراغ طور نہیں ...... بحر کی مجبوری تھی تو یہ مصرع اس طرح بھی ہو سکتا تھا۔

"چراغ دل کو ہمیں مثل برق طور کریں۔"

اپنا ہر تزکیہ افلاس بچائے رکھنا
یعنی ہر بھوک پر اک پیاس بچائے رکھنا

(تزکیہ افلاس خارج از بحر اور بے معنی۔ اس جگہ تزکیہ نفس ہر اعتبار سے بہتر ہوتا اور بحر میں ہوتا)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کھولا بالا (اور اس نوع کے بہت سے دوسرے اشعار) میں محض اوزان، بحور، محاورہ بندش، تلفظ وغیرہ ہی کے عیوب نہیں بلکہ خود بھی یہ اشعار معمولی درجے کے ہیں۔ تاثیر سے خالی ہیں۔ اور سپاٹ ہیں۔ اور کسی لحاظ سے اس قابل نہیں کہ بغیر گہری نظر ثانی کے شائع کرائے جائیں۔ اکثر تو قطعاً قلم زد کر دینے کے قابل ہیں۔

جمع واحد اور تذکیر و تانیث کے سلسلے میں بھی معلوم نہیں رضا اشک اتنے غیر محتاط کیوں ہیں؟

چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

در جاناں تو کوئی دور نہیں ہے لیکن
راستے کا رے دیوار ہوئی ہے دنیا

دیوار مونث ہے "کا" کا محل نہیں۔

فصل آئی ہے اشکوں کے برسات کی

برسات بھی مونث ہے "کے" کی جگہ "کی" کا محل تھا۔

بات آئے گی گاؤں کے اک رات کی

(رات بھی مؤنث ہے)

لان کے اپنے ہرے گھاس بچائے رکھنا

(کہ اپنی ہری گھاس لکھنے میں کیا امر مانع تھا؟)

رہِ طلب میں قدم قدم پہ بڑا کٹھن پیچ وخم ملا ہے

(پیچ وخم کو جمع کی طرح باندھنا مناسب تھا)

بہ ایں ہمہ رضا اشک، عظیم شاعروں کے تتبع میں شاعرانہ تعلّی کی ترغیب سے بھی دامن نہیں بچا سکتے ان کے اکثر اشعار میں تعلّی کا عنصر نمایاں ہے جو کہیں کہیں بہت گراں گذرتا ہے۔ بے تکا بھی معلوم ہوتا ہے۔

میری ناچیز رائے میں شاعر جب تعلیم سفر میں قدم رکھے تو اسے تجربے کے خلوص، شدت احساس، عصری آگہی، فن سے وابستگی اور اپنے میڈیم (زبان وبیان) سے گہرے شغف اور خاطر خواہ شناسائی وغیرہ، جملۂ لوازماتِ فن کی پاسداری کا پورا شعور تو ہونا ہی چاہئیے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ احساس ہونا بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ ہے کہ فن ریاض چاہتا ہے۔ خواہ تخلیق کا دھارا کتنا ہی منہ زور کیوں نہ ہو فن شاعری سہو، حشو و زوائد، اور فنی بے راہ روی کا متحمل نہیں ہو سکتا— زبان وبیان وغیرہ کی غلطیاں تو شاعری کا عیب ہوتی ہی ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان شاعری کو اور شعری جمالیات کو اچھے برے، کچے پکے، سپاٹ، بے جان، بے روح اشعار (یا نظمیں) کہتے چلے جانے سے ہوتا ہے۔ بلا امتیاز، بے روک اور بے محابا— حالی نے شاعر کے اس احساس حسن وقبح، کو قوت متخیلہ کو قوت ممیزہ کا تابع بنانا قرار دیا تھا۔ اس دوئی کی تو میں قائل نہیں کہ قوت متخیلہ پر روک نہیں لگائی جاتی بلکہ تخیل کی کلاہ آفرینی میں جذبہ واحساس، زبان وبیان

ہیئت ومواد سب ایک غیر منقطع اکائی کی صورت جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ہیئت ومواد ہم آہنگ بھی ہوتے مربوط بھی۔ لیکن میرے خیال میں اقلیم شعر میں قدم لئے ہر شاعر میں ایک Implicit کا وصف ہونا ناگزیر ہے۔ ایسی فنی انکساری جو اسے طرف تو اس کا قائل بنا سکے کہ "نالہ ہے بلبل شو خام ابھی" اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی احساس کی موجوں، اور شعور وآگہی کی روشنی کو تھام لیا جائے تو وہ پختہ تر اور تابندہ تر ہو جا۔ وہ ذاتی تجربہ ہو یا مشاہدہ حیات، احساس کا ہی تب کر نکھرتے ہیں۔ تجربہ وہی معتبر ہوتا۔ شخصیت بن جائے۔

اور دوسری طرف شاعر کو خود احتسابی کر سکے۔ اپنی تحریر کا سب سے پہلا نقاد شا ہے۔ تخلیقی اظہار کے بعد اپنی تخلیق سے فاصلہ زمانی فاصلہ اور جذباتی فاصلہ— کہ جتنی ا اسے حشو و زوائد، سہو، لسانی قبح، اور درست سے پاک کیا جا سکے منجملہ از کاوش تخلیق ہے۔

لیکن یہ فنی انکسار جو خود تنقیدی کا ہے اور شاعر کا وصف اولی بھی" مستند ہے مر قسم کے تعلّی سے نہیں، بلکہ شاہد فن کے حضور میں کے جذبۂ عظیم سے آتی ہے۔ مانا کہ شاعری جذ محابا اظہار ہے۔ مگر جذبوں کا مرقع اور تہذیب رضا اشک جیسا شاعر جسے قدرت نے کیا ہے اگر اقلیم شعر میں درانہ نہیں آئے بلکہ لرز سے داخل ہو۔ اپنے نالۂ خام کو سینے میں ذرا چلے، اور اپنے تجربات کا تا اور لے دوڑی کے اسقاط نہ کرتا رہے بلکہ ان کو ایک رچے بسے

ہوش آگہی اور دلسوزی کے قالب میں سموکر تخلیق کی
ہوں میں پایہ جولاں ہو تو اپنی قدرتی استعداد کے ساتھ
ضاف کرسکتا ہے ۔ شاعری مسرت سے بصیرت تک لیجائے
دب ہے ۔

مجھے اعتراف ہے کہ ہر شاعر نہ عظمت کی بلندیوں
ہوسکتا ہے نہ ہی بڑا شاعر بننے کا اہل ہوسکتا ہے ، مزید
اں کسی ایک شاعر کی بھی تمام تخلیق یکساں موثر اور خوبصورت
ہیں ہوسکتی ۔ لیکن وہ اپنے فن پر اپنی استعداد بھر توجہ
دے سکتا ہے ۔ یہ تو ہر شاعر کے بس میں ہے کہ وہ اپنی ذہنی
ع سے پورا کام لے ۔

انہیں اسباب کی بناپر میں نے ابتدا میں عرض کیا
اکہ بے ساختگی اور روانی رضا اشک کی شاعری کی
رت بھی ہے اور کمزوری بھی ۔ قوت یوں ہے کہ اسی کے
بب اس شاعری میں مصنوعیت ۔ کھینچا تانی ۔ نثری نظموں
تکیہ وغیرہ ناگوار صفات نہیں ہیں ۔ اور کمزوری یوں کہ رضا
شک میں بے تکلے اشعار اور حشو و زوائد کو قلمزد کرنے کا
وصلہ ہے اور نہ خود تنقیدی کی پختگی ۔ وہ رک کر دم انہیں
نے ، احتساب نہیں کرتے ، غور و فکر سے جان چراتے ہیں ۔ اور
ڑ یہ سب کرنے کے باوجود اتنی غیر معیاری چیزیں کہنے کے اہل
تو اور کچھ کہنا ہی بیکار ہے ۔

اپنی نظموں میں رضا اشک نے کوئی نئی راہ دریافت
ہی نہیں کی ، خیال ، موضوعات کی گہرائی و گیرائی ، طرز ادا
کی ندرت و خوبی ، کسی بھی اعتبار سے ۔ زیادہ تر موضوعات
اور ان کا طرز اظہار ترقی پسند شاعری سے مستعار ہیں ۔ مثلاً
'عہد الست' ، میں فیض کا تتبع ، 'بچہ اور چاند' میں اقبال کی
بازگشت ، اور کئی نظموں میں خصوصاً "بازار عورت" میں
ساحر کی بازگشت تجزیے کی محتاج نہیں ۔ علاوہ ازیں
موضوعات اکثر و بیشتر چھوٹے اور غیر اہم ہیں ۔ مثلاً عید ،
دیوالی ، البم ، عورت ، شاعر اعظم ، ریڈیو ، الیکشن ،
وغیرہ وغیرہ ۔ جن میں کوئی گہرا نکتہ ہے اور نہ کوئی خاص تاثیر
اور باوجود روانی اور اظہار کی خود زائی کے ، ہیئت کے مجلہ
عناصر بھی بالکل تاثیر سے خالی ہیں ۔ جس کی بڑی وجہ غالباً
یہ ہے کہ اس نوع کی شاعری اب بہت پٹ چکی ہے ۔ ترقی پسند
دور کے عروج میں نظم و نثر دونوں میں اس قسم کے خیالات
اور ڈکشن Exhaust ہوچکے ہیں ۔ اب صرف
ان کی تکرار ہی ہوسکتی ہیں ۔

نظموں کی ایک اور خصوصیت ، جسے میں صرف
رضا اشک ہی سے منسوب کرسکتی ہوں ۔ ہر قسم کی نظموں
میں ہر قسم کے ناموں کی بہتات ہے ۔ رام سیتا ۔ لچھمن ، کیکئی
یشودھرا ، ارجن ، دشرتھ ، میگھناتھ ، راہل ، راون ،
نانک ، گاندھی ، نادر ، ہیر رانجھا ، شاہ وارث وغیرہ وغیرہ
ناموں کی تکرار جو کسی نہ کسی حد تک پچاس فی صد نظموں
میں در آئی ہے ۔ شاعری کو ناگوار حد تک بوجھل بنانے کو
کافی ہے ۔ لیکن اسی پر بس نہیں ۔ ایک نظم ہے 'رنگ منچ'
جس کا آغاز سیدھے سادے رواں دواں انداز میں
ہوتا ہے بلکہ خاصے بامعنی انداز میں ، یک لخت وہ بے
شمار قسم کے ناموں کی اکتا دینے والی فہرست بن جاتی ہے ۔
ایک بند یوں شروع ہوتا ہے ۔

پردہ اٹھتا ہے ، پردہ گرتا ہے
لوگ آتے ہیں ، لوگ جاتے ہیں
ایکٹنگ اپنی سب دکھاتے ہیں
ہرتیا ، بشنو ، مہیش اور شنکر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد کے بیشتر مصرعوں میں تو فقط نام آتے ہیں —
دیوی دیوتا ، شاعر ، ادیب ، فلسفی ، سائنسداں وغیرہ کے
جتنے نام شاعر کے ذہن میں آتے گئے وہ انہیں کسی نہ کسی
طور پر مصرعوں میں فٹ کرتا گیا ، یہاں تک کہ مشتی ستم جنتی

گئی — اور اس مبتدا کی خبر صرف اتنی تھی کہ —

غرض کہ اس طرح تمام ہی لوگ
[illegible]ڈرامے کے ایکسٹرا کی طرح
سر اسٹیج آتے جاتے ہیں — (جو بات پہلے ہی کہی جا چکی ہے، اور کوئی خاص بات بھی نہیں ہے)

معلومات کے اس ذخیرہ کا شعری تاثیر سے کیا واسطہ؟ معلومات تو دور کی بات ہے شاعری تو اسقاطِ علم (Abortion of Knowledge) کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اپنی معلومات یا علم کا بے دریغ اور غیر ہضم شدہ اظہار تو تنقید میں بھی گراں گذرتا ہے۔ علم وہ خوب ہوتا ہے جو خیالات میں جذب ہو جائے، شاعری میں اگر علم کے راست اظہار کی ضرورت ہی آ پڑے، تو ایسے جیسے شعر کے بطن سے ابھرا ہو، یا علم کی چھوٹ سی پڑ گئی ہو۔ کوئی نام یا حوالہ اگر علامت کے طور پر آئے تو معنویت کی توسیع ہوتی ہے۔ لیکن ناموں کی کھتونی سے معنی سمٹ جاتے ہیں۔ اور الفاظ کا ضیاع ہوتا ہے۔ ایک اور نظم ہے جس میں اسی فراوانی سے رضا اشک نے اپنے ہم عصر شعراء کے نام گنائے ہیں۔ فیض اور ن۔م۔ راشد سے لے کر بشیر بدر تک ہر قسم کے شاعر نظم میں جلوہ گر ہیں۔ کچھ اس طرح کہ اس مبتدا کی خبر ناموں کے ہجوم میں کھو گئی جاتی ہے۔

نظم کا فن اتنا آسان فن نہیں کہ جس موضوع کو چاہا۔ عام اس سے کہ وہ کس قدر گھسا پٹا ہے یا اس کی اہمیت کیا ہے — منظوم کر دیا — جس طرح نثری نظم شاعری کے معیار سے کمتر درجے کی چیز ہے اسی طرح منظوم نظم کبھی شاعری نہیں ہو سکتی۔ نظم کا فن غزل سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ گہرائی اور گیرائی دونوں اعتبار سے۔ غزل کے لئے روایات کے [illegible] سانچے موجود ہیں۔ نظم میں اپنی راہ خود نکالنی [illegible] اس کا ہر کام اجتہاد ہے۔ اچھی نظمیہ شاعری [illegible]

"اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے" کی تخلیق آتش کی مستقاضی ہے۔

تم، تربت قمر، لولت اور ہیلٹ، قتل بہاراں بہتر نظمیں ہیں۔ ان میں بھی کہیں کہیں مصرع خارج از وزن ہو جاتا ہے۔ لیکن خیال و زبان کا مجموعی تاثر ان نظموں کے مقابلے میں قابل قبول ہے۔ اگرچہ قتل بہاراں میں فیض کی بازگشت بہت نمایاں ہے۔ لیکن شاید اسی وجہ سے نظم کے خیال و ڈکشن میں آہنگ ہے۔ یہ نظمیں رضا اشک کی اپنی بقیہ نظموں کے مقابلے میں قابل قبول ضرور ہیں لیکن انہیں بھی اچھی نظموں کے کسی انتخاب میں رکھا جانا ممکن نہیں ہے۔

☆☆

—٥—

ماجد الباقری

رضا اشک سستی پوری

منفرد تیشہ بدست شاعر

چند یوم قبل مجھے محمد رضا حسن خاں رضا اشک سستی پوری کے دو شعری مجموعے "تیشے کا سفر" اور "پتھروں کی رہگذر" ملے اور ایک رقعہ بھی، جس میں تحریر تھا: "رسالہ سہیل گیا اپریل کے اواخر میں مجھ پر دو سو صفحات پر مشتمل ایک نمبر نکال رہا ہے ... "سہیل" کا پتہ درج ہے اس پر ایک مضمون ضرور بھیج دیجئے" ان کے اس پرخلوص عمل سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس حقیقت کے باوصف کہ میں ۴۲ برس سے شاعری کر رہا ہوں اور میرا پہلا شعری مجموعہ بھی تاحال منظر عام پر نہیں آیا، میں معروف ادیب یا شاعر ضرور ہوں اور یہ کہ رضا اشک سستی پوری بھی کوئی غیر معروف شاعر نہیں کیونکہ ان کے چند شعری مجموعے منظر عام پر ضرور آئے ہیں فرق صرف حلقۂ قارئین کا پڑتا ہے کہ کون کس حلقے میں پڑھا جاتا ہے۔ اور کون کس میں۔

سقوط ڈھاکا سے قبل میرا کلام نظم و نثر پاکستان کی بہ نسبت بھارت کے بیشتر ادبی جرائد میں شائع ہوتا تھا جس کی وجہ سے میرے معتبر قارئین کا ایک حلقہ بن گیا تھا۔ ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے والد ماجد جناب امجد نجمی سے بھی میری مکاتبت رہی اور "شاخسار" کٹک میں بھی "شب خون" اور "شہپر" الہ آباد کی طرح کلام پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اور شاید رضا اشک بھی جیسا کہ کرامت علی کرامت نے "پتھروں کی رہگذر" کے صفحہ ۱۴۳ پر کہا ہے رضا اشک سستی پوری کے کلام کو پسند کرتا رہا ہو

اپریل ۱۹۹۲ء کا آخری ہفتہ شروع ہونے والا ہے۔ پروفیسر سجاد مرزا محمد اقبال نجمی معمول کے مطابق میری عیادت کے لئے آئے ہیں اور میرے زیر طبع پہلے شعری مجموعہ "لفظ کی چادر" کی کتابت شدہ مسودہ دیتے گئے ہیں تاکہ میں نظر ثانی کے بعد انہیں طباعت کے لئے دے دوں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ رضا اشک کے دو شعری مجموعے تبصرے کے لئے آئے ہیں۔ اس پر سجاد مرزا نے کہا وہ سستی پوری۔ میں نے کہا ہاں! آپ کیسے جانتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں کون نہیں جانتا۔ انہوں نے بھی فہرست ساز، نام نہاد نقادوں کی طرح ایک طویل نظم میں اپنے دبستان کے نام

کر دیئے ہیں۔ ہمارے کسی دوست کا اس میں نام نہیں ہے ۔میں نے جواب میں کہا! مرزا صاحب اب یہ ا
ہے کہ رضا اشک سمستی پوری معروف شاعر ہیں جنہیں یہاں لوگ بھی جانتے ہیں۔

دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ پہلی فرصت میں سہیل گیا کے لئے جلدی جلدی مضمون لکھنے کی
نے دونوں مجموعے رات کی خاموشی میں پڑھ ڈالے۔

قارئین سے مخاطب ہونے سے پہلے میں صرف رضا اشک صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے
مبصرین کی آرا سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ناقدین ادب نے آپ کو صحیح مقام نہیں دیا جبکہ آپ کو ملنا چاہئے
یہ کہتا ہوں کہ آپ ان نام نہاد شہرت پسند شعراء سے بڑے اور اعلیٰ شاعر ہیں۔ جو دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ ا
نام سے شائع کراتے ہیں۔ آپ عہد نو میں ان بے شمار صحافیوں سے بڑے شاعر ہیں۔ جو جرائد میں ادبی
نگراں (ملازم) ہونے کی وجہ سے خود کو شاعر یا ادیب بھی مشہور کرتے ہیں۔ آپ ان نو آموز قلم کار وا
شاعر ہیں جنھوں نے ذرائع وابلاغ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور اپنے اپنے دھڑے بنا لئے ہیں۔ آپ ان
بھی بڑے شاعر ہیں جو اپنی منڈلی میں بجانت بجانت کے چہرے اور آوازیں ممالک غیر میں لے جاتے ہیں
بھی بڑے شاعر ہیں۔ جنھوں نے اپنی شہرت کے لئے اپنی اور اپنے احباب کی اولاد کو ذرائع وابلاغ میں
کتابیں چھاپنے کے لئے پریس کھول دیئے فلمیں بنانے کے لئے زر کثیر مہیا کر دیا۔

رضا اشک سمستی پوری کی شہرت اور مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ جو ان کا کلام ایک بار پڑھ لیتا
جہاں بھی دیکھے ضرور پڑھتا ہے۔

غزل ہو یا نظم رضا سمستی پوری کی شاعری مقبول عام اسلوب کی نمائندہ ہے۔ ظاہرداری اور نفا
ان کا رومانیت گریز اسلوب نگارش انہیں روایتی شاعری کے شکنجے سے دور رکھتا ہے۔ شعر گوئی میں یہ عمل
اس لئے جدت پسندانہ ہے اظہاریت کی طرف ان کا یہ سفر اس طرح جاری رہا تو ان کے شاندار مستقبل
دی جا سکتی ہے۔

"تیشے کا سفر" اور "پتھروں کی رہگذر" کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رضا ا
اور قلم کا تیشہ لے کر پتھروں کی رہگذر پر شاعری کا سفر شروع کیا ہے۔ جو ایک ایسے شہر کی طرف سماج
جہاں طبقاتی اونچ نیچ، ظلم، بے انصافی، تشدد، حق تلفی، اخلاقی پستی جیسے ناپسندیدہ عناصر ہیں
"تیشہ اور پتھر" فن بت تراشی کے اولین لوازمات میں سے ہیں۔ اور اس فن کی تکمیل کے لئے آنکھ اور
ضرورت ہوتی ہے۔ باقی اعضاء ان ہی کی ضروریات کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ رضا اشک نے شعری
طور پر آنکھ کو بہت استعمال کیا ہے۔ اس اعتبار سے میں انہیں "تیسری آنکھ کا شاعر" بھی کہہ سکتا ہو
وہ ایسا سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو دوسرے شعرا کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بعد وہ سچی تصویریں غزل

میں بھر دیتے ہیں جنہیں "ویڈیو کیسٹ" کی طرح ہر عہد میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

یہ صدہا سال لمبی رات پیچیدہ کہانی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ جہاں سے تم کہو مجھکو وہیں سے داستاں لکھوں

شاعر ہو یا عام انسان اگر اس میں قول اور فعل کی ہم آہنگی نہیں ہے اور اس الوقتی ، دروغ گوئی ، ریاکاری ، جھوٹ اور بے ایمانی کو با قاعدہ زندگی کا حصہ بنائے رکھتا ہے تو وہ شاعر تو کیا ایک عام انسان کی حیثیت سے بھی نفرت کے قابل ہے کلام کے مطالعے سے رضا اشک سچی پوری اپنی سماجی زندگی میں انتہائی مخلص اور دردمند انسان نظر آتے ہیں ۔ وہ اور کچھ ہوں نہ ہوں ، شاعر ضرور ہیں ۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جو شعری اظہار مجھے ان کے یہاں ملتا ہے وہ شعر گوئی پہ کل وقتی توجہ دیئے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا ۔ اور دل و دماغ کو اپنے ضمیر کے تقاضوں کے مطابق ہر وقت پتھر یلی رہگذر کو ہموار کرنے کے لئے مصروف رکھنا پڑتا ہے ۔

رضا اشک نے غزل ، آزاد غزل ، قطعہ ، پابند نظم ، آزاد نظم جیسی اصناف سخن میں بھر پور طبع آزمائی کی ہے ۔ ان کا کلام مستند نہ سہی ، بے پناہ فنی ریاضت ، مطالعہ ، مشاہدہ ، ہوش مندی ، اور بے خوفی کا آئینہ دار ہے ۔

"تپتے کا سفر" پر کسی قسم کا کوئی دیباچہ یا تقریظ موجود نہیں ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی خود اعتمادی سے اپنے فن کو صیقل کر رہے ہیں ۔ ان کا اصول سبھی کو پسند کرنا چاہئے ۔ اس اقدار دشمن افراتفری کے دور میں کوئی شخص کسی سے دیباچہ لکھوائے تو ہوتا یہ ہے کہ تخلیق کار کی مقبولیت میں اضافے کے بجائے دیباچہ نگار کے مخالف ڈھیرے کتاب کی تقریبات رونمائی کو کھنڈت کرانے میں جٹ جاتے ہیں ۔ پر تبصرے ہی نہیں ہونے دیتے ۔ اور تخلیق کار کو شاعر ماننے سے انکار کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کسی کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا یا انور سدید نے تحریر کیا ہے تو احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کے ماننے والے شاعر کو شاعر ہی تسلیم نہیں کریں گے ۔ اور اگر دیباچہ احمد ندیم قاسمی تا ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے تو دبستان سرگودھا کی بلبلیں اپنے نالہ و شیون میں بھی اس مصنف شاعر کا نام نہیں آنے دیں گی ۔ میرے اس دعوے کی تصدیق میں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے ہر چھوٹا بڑا شاعر گروہ بندی کی اس لعنت میں خود کو گھٹا ہوا محسوس کرے گا ۔

مجموعوں کو مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رضا اشک پہ ارباب نقد و نظر اعتراضات کرتے رہے ہیں ۔ ان پر اعتراضات کرنے والے شعراء بڑی چابکدستی سے رباعی کے چوبیسوں اوزان میں رباعی کہتے ہیں ۔ اور اعتراض رضا اشک کی شاعری پہ کرتے ہیں لیکن ان موزوں طبع قادر الکلام رباعی گویوں پہ اعتراض ایسے مبتدی کرتے رہتے ہیں جو رباعی کی تقطیع تمام بڑے طیلے اور سارنگی سے کرتے ہیں ۔ تو کیا یہ دوسرا مبتدیوں کا گروہ کوئی بھی تنقید کرتا ہے ؟ یہ سب ماننے نہ ماننے کی باتیں ہیں ۔ اس سے حقیقی شاعر کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ جو بھی کوئی شاعری خود کرتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی ادبی مقام ضرور بنتا چلا جاتا ہے ۔ فیض اور اقبال جیسے شعراء کی شہرت لسانی و عروضی تسامحات کے باوجود کوئی کم نہیں کر سکا ۔ یگانہ اور طباطبائی غالب کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ۔ البتہ ہر چھوٹے بڑے شاعر کو ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس قول سے رہنمائی ضرور

حاصل کرنا چاہئے۔

"غزل کی روایت بڑی ظالم چیز ہے کوئی غزل گو اس سے دامن بچا کر نہیں نکل سکتا۔ لیکن اگر وہ روایت کے چنگل میں پھنس گیا تو پھر انہیں باتوں کو دہراتا رہے گا جو ... بہتر طریقے ... پچھلی نسل کے شعراء کہہ چکے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے لاتعداد شعراء ہیں جو مسلسل غزل کہہ رہے ہیں لیکن ان کی غزل سن کر یا پڑھ کر نہ صرف طبیعت مکدر ہو جاتی ہے بلکہ غزل کے باسی پن سے کفن و کافور کی بو آتی ہے۔ بخلاف اس کے وہ غزل گو جو روایت کا شعور حاصل کر کے اسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کے تجربات سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل کی جاذبیت سننے والوں کو پرکیف کر دیتی ہے"

اب آپ رضا اشک کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس میں کفن و کافور کی بو قطعی نہیں آتی بلکہ خس کی سبز خوشبو روح کو معطر کر دیتی ہے ؎

پاؤں اکڑ دبا سر ٹکا کر رات بھر
سو گیا بچہ کسی فٹ پاتھ پر

دیکھیں تو نکل کر ذرا شیشے کے مکاں سے
پتھر جو برستا ہے وہ آتا ہے کہاں سے

فرشتوں کے پروں سا پاک ستھرا اس کا بستر ہے
مگر گندی سی ایک عادت مجھے اچھی نہیں لگتی

ابھی ہے دیر ذرا دھوپ کے اترنے میں
فصیل شب سے بھی اونچا حصار ظلمت ہے

زمیں تو بانٹ لی مل جل کے تاجداروں نے
دھلا دھلایا ہوا آسمان میرا ہے

اے اشک کیا کہوں سر بازار زندگی
مدت سے بند ہوں کسی دکان کی طرح

رضا اشک کا اسلوب شعری روایتی (کلاسیکل) اس لئے نہیں ہے کہ ان کے کلام پر ترقی پسندانہ لب و لہجہ ... انہوں نے خود بھی ایک جگہ کہا ہے ؎

یہ میرے فن سے ہے شکوہ جدید ذہنوں کو
کہ میری غزلوں کا لہجہ ہے اشتراکی سا

ایک اور مقام پہ انہوں نے کہا ہے ؎

یہ ایک سفر مرا دو راں ہے بغاوت تک　　خیال و خواب نے پہونچا دیا حقیقت تک

لیکن ان کا لہجہ ترقی پسندانہ بھی نہیں ہے کہ اس پر جدید عہد کی حسیات اور لفظیات کی مینا کاری ہے جو غزل میں زیادہ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے جو جدید شعری اسلوب کے آئینہ دار ہیں ؎

اشک میں وقت کی اکائی ہوں　　لمحہ لمحہ صدی میں زندہ ہوں ۔

تمہارا کہنا کہ آدھا گلاس خالی ہے　　میں کہہ رہا ہوں کہ آدھا گلاس پانی ہے

پتا ہر اک سے اپنا پوچھتا ہوں　　میں اپنے واسطے خود اجنبی ہوں

صدیوں کے پل صراط پہ لمحات کا سفر　　یہ کس کی جستجو میں ہے دن رات کا سفر

کتابیں گھر کی زینت بن گئی ہیں　　چلو دیمک اسے چاٹا کرے گی

" ترسیل " اور " ابلاغ " کی جدید آسانشوں کو سامنے رکھتے ہوئے اشک شعر فہمی میں الفاظ کے محدود معنوی حصار سے بھی باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ جس کا اظہار خود انہوں نے اس طرح کیا ہے ؎

ہے لفظ لفظ زباں اور حرف حرف دہن　　ہر ایک شعر مجھے بول چال لگتا ہے ۔

مجھے رائے دینے کا حق تو نہیں پھر بھی اچھی یا بُری بات کا ذکر برمحل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ رضا اشک روایتی لب و لہجہ میں نظم کہنا یک قلم ساقط کر دیں اور کچھ دنوں صرف غزل کو ذریعے اظہار بنائے رکھیں تو جدید شعرا کی فہرست میں بہت آگے تک آ سکتے ہیں۔ اور اس طرح نئی غزل کو اپنے شریک سفر کا بھرپور تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی طور پر رضا اشک سمتی پوری پاکستان اور ہندوستان کو ایک ہی ملک سمجھتے ہیں یہ ایک ایسا صلح پسندانہ اور امن آثار نقطۂ نظر ہے جس نے فلسفی شاعر علامہ اقبال کو ہمالہ، ہندی بچوں کا گیت، ہندی ترانہ اور نیا شوالہ جیسی نظمیں کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جو علامہ اقبال کے اس قول کو حرف حرف دہرا دیتا ہے ؎

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظریاتی سنگم پر رضا اشک کا یہ شعر کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے ؎

عجیب بات ہے جو مسکن اک کرائے کا ہے گزر چکا ہے زمانہ گرچہ ہجرت کا

یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار پر ہندوستان کی سیکولر اور مشترکہ تہذیب کے اثرات کی چھاپ گہری
ابھری ہوئی [illegible] کا یہ نکتہ ان کا سچا مسلمان ہونے کی روشن دلیل ہے ۔ وہ عہد حاضر کی شہری
زندگی میں پائی جانے والی تنہائی، ادھیڑ بن، کرب، انتشار اور بے چہرگیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اور مظلوم
دلانے کے لئے انسانیت دشمن عناصر کے خلاف بغاوت کا منفرد لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ جس میں بے خوفی
گوئی ان کے اسلوب کا خاصہ بن جاتے ہیں۔ یہ وہی اختیار کر سکتا ہے جو بڑی سے بڑی رشوت کو بھی ٹھکرا
اور سچائی پر قربان ہو جانے کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس عالم میں ہے کلاسیکیت ایک ایسا عنصر ہے جو ان کی کمزور ست
تخلیقات کو بھی صحافت کے زمرے میں نہیں آنے دیتا۔ اپنی سرزمین سے عشق اور وطن کی مٹی سے پیار کا ایک ا
یہ کمال ہے کہ رضا اشک سمستی پوری، ڈاکٹر اسلام سندیلوی کی طرح بیشتر تشبیہات، استعارات اور علامتیں اپنی تہذ
چیزوں سے لیتے ہیں۔ اور ہندو دیومالائی تلمیحات کو فنکارانہ حسن کے ساتھ برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس سے یہ بھی
ہے کہ ان کا دل دیگر مذاہب کی کتابوں اور غیر مسلم اقوام سے محبت کرنے کے اسلامی جذبے سے معمور ہے۔ اس اطلا
میں اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں کہ مستقبل کا قاری رضا اشک سمستی پوری کو نظم گو کے بجائے غز
کی حیثیت سے دیکھنے کا آرزومند ہے ۔

...اد مرزا

...نئے امکانات کا شاعر

...ضا اشک کی شعری کائنات کا عمومی منظر نامہ،
...ل سے جنم لینے والے ان رنگوں سے ترتیب
...و اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی نظموں
...وں میں موضوعی تنوع کا فقدان نہیں۔ روزمرہ
...لی واقعات کو بھی اس نے نظر انداز کرنے کی
...ش نہیں کی۔ ان معمولی، عمومی واتفاقی و تاثراتی
...یں بڑی نظموں کے امکانات بھی پوشیدہ ہیں
رضا اشک یقیناً اس کا ادراک رکھتا ہے کہ
...و شبہات کی فضا نئے تہذیبی رویوں کی دین ہے
...ہر اس عصر حاضر کے انسان کا اجتماعی مقدر
...شکوک و شبہات کی اس فضا نے پورے معاشرے
...اپنی پنجوں میں دبوچ رکھا ہے۔ ہمارے عہد کے
...کاروں کے ذہنوں پر اس کا اثر انداز ہونا لازمی
...۔ شاید اسی کارن ان کا اپنے ارد گرد پر سے ہی
...اپنی ذات پر سے بھی اعتماد معدوم ہو چکا ہے!
...نے کچھ ایسا گھیرا کیا ہے کہ ہر انسان نے اپنے
...اطراف فکروں کے حصار کھینچ لئے ہیں اور یوں
...نات کا زندان بن کر رہ گیا ہے۔
...معاشرتی بے چینی، اقدار کا زوال، مہر و محبت کا کال،
...کا جال کچھ ایسے پھیل گیا ہے کہ رضا اشک سے

شہر دو خطوں میں بٹ کر رہ گیا
آدمی کی اک ذرا سی بات ہے

شہر بھی بن باس سا لگنے لگا

رضا اشک کی شاعری میں بلند آہنگ احتجاج ہی نہیں بلکہ یہ شاعری تدبیر کاری کے نت نئے انداز، جدتِ فکر اور معاشرتی تضاد کی آئینہ دار ہے۔ اس کے یہاں مشاہدات اور تجربات کو بلا ترمیم اشعار کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل، رکاوٹ کے بغیر جاری و ساری ہے۔

یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کچھ لوگ جو دیکھا دیکھی تحریکوں کے پیچھے چلتے ہیں جبکہ ان کی جذباتی وابستگی مشکوک ہوتی ہے۔ اس لئے تحریکیں ان کو ساتھ لے کر نہیں چلتیں اور ایسے لکھاری تمام عمر ادب کے بیگار کیمپوں میں گزار دیتے ہیں!

رضا اشک نے اپنی شاعری کو گہرے فلسفیانہ افکار اور دقیق مسائل سے دور رکھا ہے۔ تفہیم اور ترسیل بھی اس کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں بننے پائی۔ اس کے اسلوب کی سادگی اور سادہ گوئی نے ادب کے عام قاری کے دل میں اس کے لئے ایک بلند مقام کا تعین کر لیا ہے۔

رضا اشک کا نظریہ دیکھئے ؎

ہاتھ بیکار ہوں اور پاؤں میں زنجیر ہوں
بھوک اور بھوک کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے

سر پہ منڈلاتے ہوئے جنگ کے طیارے ہوں
سامنے ٹینک اور بم ہو تو غزل ہوتی ہے

اشک جب ہاتھ میں ہوتا ہے قلم کا تیشہ
سر پہ کہسارِ ستم ہو تو غزل ہوتی ہے

پروفیسر انیس صدری

فیض کا علمبردار ۔ رضا اشک

رضا اشک صاحب کے تخلیقی عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ فی الحال میرے مطالعے میں ان کی دو کتابیں "تیشہ کا سفر" اور "پتھروں کی رہگزر" ہے۔

بظاہر تیشے کا عمل سفاکی، جراحی کا عمل ہے لیکن ایسی تعمیر و تخلیق کے نتائج و ثمرات کو سامنے رکھتے ہوئے تیشے کی معنوی علامت پر غور کیجئے کہ اُمید و آرزو اور زندگی کے جہد مسلسل کو تیشے کے عمل نے کیسی زندگی اور تابناکی بخشی ہے اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ تہذیب و تمدن کا جو ارتقائی عمل شروع ہوا ہے اس کی ابتدائی کڑی کا سراغ ہمیں STONEAGE پتھروں کے عہد سے ہی ملتا ہے۔ جہاں زندگی کی ساری توقعات اور آرزوئیں اس تیشے اور پتھروں کی حرکت و عمل سے وابستہ رہی ہے۔ ہڑپا اور موہن جودارو سے اجنتا اور الورا کی بازیافت ہر ایک تفکر لئے ہر جگہ تیشے اور پتھروں کا عمل سفر انسان کے مساوی ہے۔ گویا انسانی تہذیب کے اس عملی سفر کی روشنی میں تلخ و خوشگوار واقعات و واردات کی منظر کشی کو "تیشے کا سفر" اور "پتھروں کی رہگزر" سے موسوم کرنا رضا اشک کے تہذیبی و ثقافتی مطالعہ کی ایک زندہ مثال۔ جہاں الفاظ و تراکیب نئے تجربے اور معنی و مفہوم میں ملی حسیت کے ساتھ سماج کے کرب و بےچینی، نا آسودگی، استحصال اور جمہوری قدروں کی پامالی کے اثرات و نتائج فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

اک سلسلہ کوہ میں "تیشے کا سفر" ہے
پتھر کی جو ہے راہ گزر تیرے لئے ہے

خامہ ایک تیشہ ہے
جو کہ کتنے لفظوں کا سلسلہ بناتا ہے
جانے کتنے لمحوں کا
کتنی بھولی صدیوں سے
فاصلہ ملاتا ہے

رضا اشک نظموں کے شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مربوط ہیں۔ خیال مسلسل اور سلجھا ہوا ہے۔ خیال کے ارتقائی اور مرکزی پیش کش میں اپنی قدرت حاصل ہے۔ زبان پر دسترس ہے اس لئے جو کہنا چاہتے ہیں احساس کی پوری گہرائی و گیرائی سے کہتے ہیں۔ مضامین میں تنوع اور وسعت کے ساتھ ترقی پسند شعری روایت کی وسعت ہے۔ ڈاکٹر مرلیس صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اشک صاحب نے ترقی پسند شعری روایت کو نئی وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ عہد کے معاشرے پر کڑی تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ مسخ ہوتے ہوئے انسانی رشتوں اور رویوں پر طنز کرتے ہیں:

فیض احمد فیض کی ترقی پسندی میں روایت کا جو احترام اردو شاعری میں فیض احمد فیض نے جس مربوط طریقے پر پیش کیا ہے اس کا انداز کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ فیض کی شاعری کا کمال ہے کہ نظم کا ایک مصرعہ آپ کو پوری ژرفت کے ساتھ دوسرے مصرعہ کو پڑھنے کے لئے مجبور کرے گا اور دوسرا تیسرے کے لئے طبیعت کو آمادہ کرے گا یہ تسلسل خیال، لہجے، الفاظ اور بندش پر اعتبار سے آپ محسوس کریں گے۔

پوری اردو شاعری میں فیض کی اس خوبی کا پرتو ہمیں نظر آتا ہے تو رضا اشک کی شاعری میں۔ بنیادی طور پر رضا اشک بھی ترقی پسند ہیں لیکن اردو شاعری کی حسین و خوبصورت روایت کا احترام ان کی شاعری کا جوہر ہے۔ حمید سہروردی نے لکھا ہے کہ " ان کی آواز میں انفرادیت ہے۔ یہ انفرادیت موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے ہے۔"

اک خط تھا جس پہ خون سے لکھا تھا الوداع
آنسو نہیں تھے گویا دل رنگ روٹ تھا
بکھری ہوئی خزاں میں یہ پتی گلاب کی
ان سے کبھی بہار کا رشتہ اٹوٹ تھا

انداز بیان یا تیور فنکار کا وہ جوہر ہے جس سے اس کی شناخت بنتی ہے۔ ہر بڑا فنکار اپنے انداز بیان سے معروف ہوا ہے۔ میر کا نشتر، غالب کا تخیل اور انداز بیان اور اقبال کی فکر ان کے شاعری کی پہچان ہیں۔ اس پس منظر میں رضا اشک کی شاعری کا آپ مطالعہ فرمائیں تو ابتدا ہی سے محسوس کریں گے کہ رضا صاحب نے اپنی آواز اور اپنے لہجے کو اردو شاعری کے ہنگامے میں ڈوبنے سے بچائے رکھا ہے۔ آج اردو شاعری کو عام لوگ ایک آسان اور وقت گذاری کا شغل سمجھتے ہیں اور جہاں فرصت نصیب ہوئی ایک دو غزل لکھتے اور چھپتے بھی ہیں لیکن اسے فن سمجھنے والے لوگ اس فن کا احترام ملحوظ رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں۔

ادب چاہے نثری ہو یا شعری وہ فن ہے اور فن کو برتنے کے لئے فکر لازمی ہے۔ اور فکر بغیر مطالعے کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ مطالعہ تاریخ و تہذیب کا مطالعہ ادبی روایت و ثقافت کا جب ایک فنکار کی زندگی کا لازمی عنصر بن جاتا ہے تو فن جنم لیتا ہے۔ اور فنی قدریں استوار ہوتی ہیں اس نہج سے رضا اشک کی شاعری میں فکر بھی ہے اور فن بھی اور یہ فکر و فن ان کے عمیق مطالعہ کی دین ہے۔

مطالعے کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ فنکار سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ موازنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور حقیقت پسندی کے اعتراف کی عادت ڈالتی ہے۔ رضا اشک جیسے گمنام شاعر کہنا زیادہ صحیح ہوگا نہایت سنجیدہ خاکسار اور حقیقت پسند انسان ہے جس کے فن پر سیدہ نسرین نقاش نے یوں تبصرہ کیا ہے۔

رضا اشک ایک شریف النفس نیک باطن، درد مند اور انصاف پسند انسان ہیں۔ مذہب، معاشرہ، سیاست، اقتصادیات اور ادب کے عمیق مطالعے کا نچوڑ ان کی شاعری میں جگہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں تقلید کے بجائے تنوع اور ندرت خیال کی خوبی نمایاں نظر آتی ہے۔ فکر و جذبہ کی آہنگی اور تسلسل ان کی نظم گوئی کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔ رضا کا مطالعۂ حیات گہرا ہے۔ وہ فرد اور انبوہ اور مشینی نظام کے آپسی تصادم کی کوکھ سے جنم لینے والے سنگین مسائل کو اپنی شاعری کی اساس بناتے ہیں وہ مادی مشکلات اور نظریاتی کشاکش سے نظریں چراتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اشک کی سچائی نے ان کی نظموں اور شعروں پر وہ دھار رکھ دی ہے کہ کسی تیز نشتر کی طرح کہ جھٹ دل کی گہرائیوں میں گھر کر جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

اشک کی شاعری میں چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ بعض الفاظ کو وہ علامت کے طور پر پیش کر کے خاطر خواہ مفہوم پیدا کر دیتے ہیں۔ جس سے شعر میں ایک خاص ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اشک نے بعض بے پناہ شعر کہے ہیں۔ ان اشعار میں نہ تو خطابت ہے نہ خود کلامی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کی ذات کے کسی روزن سے اس کی داخلیت باہر نیک پڑی ہو۔

اتنے اشعار کہہ کر بھی انہیں بڑا فنکار ہونے کا گھمنڈ بالکل نہیں۔ رضا اشک کو جو شہرت ملی ہے وہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ باعتبار فن وہ بہت آگے ہیں لیکن باعتبار معروفیت انہیں بہت پیچھے جگہ ملی ہے۔" رضا اشک غزلیں بھی لکھتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظموں کے شاعر ہیں۔ اور ان کی نظموں کے موضوعات میں فراوانی ہے خصوصاً مردوں اور عورتوں کے استحصال پر ان کی نظر الگ ہیں۔ جیسے 'جمہ میاں کی گھوڑی' بازلت عثمانیہ ہوٹل، تصویریں، قصہ ایک شہر کا، اور انگنی پہ لٹکھا وغیرہ نظمیں ہندوستان معا کا وہ نگارخانہ ہے جہاں عورتوں کے تقدس کی مختلف تصویریں پیش کی گئی ہیں جن کی سراسر آج کے سڑے ہوئے سیاسی اور سماجی نظام کے کے سر جاتی ہے۔ دیکھئے ایک بند نظم بازار عورت

یہ تا تھیا کی دھن یہ طبلے کی دھن دھن
یہ پائل کی لے یہ چھنن چھن چھنن چھن
یہ پنڈت یہ ملا یہ شیخ و برہمن
یہ کلن یہ چھن رسولن بتولن

یہ گورے بدن کی سہ کارہ
خریدو گے بکتی ہے بازار

یہ لٹتی ہوئی بنت حوا کی ٹولی
یہ تاریک زنداں یہ بد رنگ کھولی
یہ فقرے یہ جملے یہ بولی ٹھٹھولی
ہوس کے یہ سکے یہ عصمت کی جھولی

خریدو گے بکتی ہے بازار

" لہجہ کی تیکھی برجستگی۔ اس مجموعہ میں زیادہ دلکش آفریں ہے۔ طنز اور متانت کا جیسا خوبصورت ا کے یہاں ملتا ہے۔ وہ شاد عارفی کے علاوہ کہیں نظ آتا ہے۔" (قمر رئیس)

رضا اشک صاحب کے تخلیقی عمل کا ہے۔ فی الحال میرے مطالعے میں ان کے دو مجموعے اور "پتھروں کی ریگزر" ہے۔

ظاہر ہے تیشے کا عمل سفاکی و جراحی کا

لیکن اس میں مضمر تعبیر و تخلیق کے نتائج و خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے تیشے علامت پر غور کیجئے قوی امید کہ آرزو اور زندگی کے جدید مسلسل پتھروں کے عہد کو تیشے کے عمل نے کیسی زندگی اور تابناکی بخشی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ تہذیب نمونہ کی ارتقائی اور تاریخی عمل میں تیشے کی عملی سفر کہ پتھروں کے عہد سے تہذیب و تمدن کا جو ارتقائی عمل شروع ہوا تھا اس میں سب سے اہم رول تیشے کا سفر ہے۔ ماضی میں زندگی کی ساری توقعات اور آرزوئیں اسی تیشے کی حرکت و عمل سے وابستہ تھیں۔ ہڑپا اور موہن جودڑو سے اجنتا اور الورا کی بازیافت پر غور کیجئے۔ ہر جگہ تیشے کا سفر انسان کے مساوی ہے بلکہ آج کا مصور قلم ہی تو تھا جس کی حسین روداد کا ایک سرا اگر کوہکن فرہاد سے ملتا ہے تو دوسری طرف دشت و بیابان جنگل میں معاش کی خاطر بھیڑیوں سے نبرد آزما حضرت انسان سے

تا بس تہذیب کے اس عمل سفر رضا اشک کا کو تیشہ کہنا اور اس کے سفر مسلسل کی رنگا رنگ تصویر کی روشنی میں تصویر بنا کر اسے تیشے کا سفر سے موسوم کر ان کے تہذیبی و ارتقائی مکالمے کی ایک زندہ مثال ہے جہاں زندگی کی ہما ہمی میں الفاظ و تراکیب کی روانی سے نئے معنی مفہوم میں جدید حسیت ثقافتی کرب و بے چینی، نا آسودگی، استحصال اور جمہوری قدروں کی پامالی کو دیکھا جا سکتا تلخ و خوشگوار واقعات واردات کی منظر کشی کو تیشے کا سفر سے موسوم کرنا رضا اشک کے تہذیبی و ثقافتی مطالعہ کی ایک زندہ مثال ہے۔ جہاں الفاظ و تراکیب کے نئے تجربے اور معنی و مفہوم میں جدید حسیت کے ساتھ آپ کو سماج کی بے چینی۔ نا آسودگی، استحصال اور جمہوری قدروں کی پامالی کے اثرات و نتائج کی فنی تصویر رضا اشک صاحب نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سید احمد قادری

رضا اشک کی شاعری پر ایک نظر

عہد حاضر میں جن اردو شعراء نے اپنے اردگرد کے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی حالات، حیات و کائنات کے اسرار و رموز اور حسن و عشق کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو اپنے منفرد اسلوب اور فنی التزام کے ساتھ پیش کر کے اپنی نمایاں پہچان بنائی ہے، ان میں رضا اشک کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

"شیشے کا سفر" سے لے کر "پتھروں کی رہگزر" تک کے شعری سفر میں رضا اشک کی شاعری نے بتدریج ارتقائی منزلوں کو طے کرتے ہوئے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔

اشک میں وقت کی اکائی ہوں
لمحہ لمحہ، صدی میں زندہ ہوں

تیرے قلم کو اسی آگ کی ضرورت تھی
تم آنسوؤں میں چھپانا نہ اپنی چیخوں کو

جب تک یہ انسان ہے وحشی
شہر کو میں جنگل لکھوں گا

ان اشعار میں جو سماجی احساس، درد و کرب، گھٹن اور ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہے۔ وہ رضا اشک کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ فکر کی بلندی اور فنی آگہی کے ایسے شعری نمونے رضا اشک کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ جن سے متاثر ہو کر ڈاکٹر کرامت علی کرامت کو اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے یہ لکھنا پڑا کہ ———

کوئی اگر مجھ سے پوچھے کہ فراق کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو کے کسی شاعر نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے اردو شاعری کے دامن کو سب سے زیادہ مالا مال کیا ہے تو میں بے تکلف رضا اشک سستی پوری کا نام لوں گا۔ لیکن رضا اشک کا دائرہ عمل ان معنوں فراق سے بھی وسیع تر ہے کہ وہ یونانی اور سامی اساطیر سے لے کر جدید مغربی ادب کے مختلف

کرداروں کو کبھی تلمیحات کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو کبھی علامت کے طور پر اور اس طرح وہ ہمارے سامنے گنجینۂ معنی کا طلسم کھول دیتے ہیں۔ یوں تو ان کا ذہنی سفر ترقی پسندی سے لے کر جدیدیت تک کا ایک طویل فاصلہ طے کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ان کی وابستگی کسی آئیڈیولوجی سے نہیں بلکہ انسان کے ماضی، حال، مستقبل سے ہے۔"

ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے ساتھ ساتھ رضا اشک کی شاعری میں موضوعات کا تنوع، فکری و فنی گیرائی و گہرائی تجربات و مشاہدات کی پرخلوص کارفرمائی روایت کی پاسداری اور عصری حسیت و جدید تقاضے کا پر اعتماد اظہار سے متاثر ہونے والوں میں ادریس احمد دوراں، خواجہ احمد عباس، وحید اختر، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، سلطان اختر، غلام ربانی تاباں، شمس الرحمٰن فاروقی، عنوان چشتی، گوپی چند نارنگ، مظہر امام، علقمہ شبلی، کمال احمد صدیقی، ندا فاضلی، کالی داس رضا گپتا، عابد سہیل، وارث علوی سید ضیاء الرحمٰن ضیا، قمر اعظم ہاشمی، ناوک حمزہ پوری، عبداللہ کمال، حسن نعیم، خواجہ احمد فاروقی، رضا نقوی واہی، سیدہ نسرین نقاش، محمد حسن، بشیر بدر، قمر رئیس، ظ۔ انصاری، مہر دیال شوق، حمید سہروردی، رام لعل اور احمد سجاد وغیرہ جیسے اردو ادب کے نامور نقادوں، شاعروں اور ادیبوں کی طویل فہرست ہے۔ ان مشاہیر کے دل و دماغ کو کہیں نہ کہیں پر رضا اشک کی شاعری نے چھوا ضرور ہے۔ متاثر ضرور کیا ہے۔ میرے خیال میں رضا اشک کی شاعری کی کامیابی کی یہ دلیل ہے۔ ہزار اشعار کے مقابلے میں اگر ایک شعر بھی کسی کو متاثر کرتا ہے۔ دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتا ہے، سوچ و فکر کی دعوت دیتا ہے تو یقینی طور پر شاعر کی عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے رضا اشک کی شاعری نہ صرف فکر و فن کے اعتبار سے کامیاب ہے بلکہ اردو شاعری کی عظمت میں اضافہ کرتی ہے۔

رضا اشک کی غزلیات کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں خاص طور پر وہ نظمیں جن میں شاعر نے ہمارے اندر قومی یکجہتی کے احساسات و جذبات نہ صرف یہ کہ جگایا ہے بلکہ جھنجھوڑا بھی ہے۔ اردو نظموں کے وقار، حسن اور فنی معیار میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "نروان کی تلاش" "بن باس" "دیوداس کی واپسی" "دھرتی کی کہانی" "چھوٹا سا دھنش بان" "یوم جمہوریت" وغیرہ نظمیں ایسی ہیں جو اپنے موضوعات اور فکر و فن کی بلندیوں پر نظر آتی ہیں۔ ہندو دیومالا کو جس خوبصورت انداز میں رضا اشک نے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور علامتوں، استعاروں و تشبیہوں کے جابجا استعمال سے فکر و معنویت کی ایک پوری دنیا آباد کیا ہے وہ یقینی طور پر رضا اشک کو اردو نظم گو شعراء کی مختصر سی فہرست میں نمایاں جگہ دی ہے۔ ان نظموں کے ساتھ ساتھ "نیشے کا سفر" "قتل بہاراں"، "نوجوان فنکار"، "رنگ منچ"، "دعا"، "زندگی کے موڑ پر"، اور "باغی" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں رضا اشک نے عہد حاضر کی سماجی و معاشرتی حیات زندگی، ان کے بدلتے ہوئے حالات اور انسان کے داخلی و خارجی مسائل کو بڑی بے باکی سے نظم کیا ہے۔ اور اپنی ایک خاص فکری و فنی نظریہ، اپنے خوبصورت لب و لہجہ، اسلوب اور مسائل سے انفرادیت بخشی ہے

رضا اشک نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ

قطعات میں بھی معیار، وقار اور معنویت کا جادو جگایا ہے۔
دو مثالیں دیکھئے۔

کس کا دل ہے جو زخم زار نہیں
کس کے سینے میں اک مزار نہیں
زندگی سے فرار ممکن ہے
موت سے تو مگر فرار نہیں

مانگے کے اجالے پہ نہیں جیتے ہیں
ہم بھیک کے پیالے پہ نہیں جیتے ہیں
خود اپنا بدن اوڑھ کے سو جاتے ہیں
بخشش کے دوشالے پہ نہیں جیتے ہیں

رضا اشک کے اسی تخلیقی جوہر نے یقینی طور پر غزلوں نظموں اور قطعات کو بلند مقام عطا کیا ہے جن سے فکر و معنی کی ایک وسیع دنیا آباد نظر آتی ہے۔ اپنی قوت اظہار سے رضا اشک نے شاعری کے مختلف اصناف کو مالا مال کیا ہے اور اپنی انفرادی پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ڈاکٹر رئیس انور

ریڈر شعبۂ اردو، ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگا

رضا اشک ـــ ایک فطری شاعر

رضا اشک ایک تیشہ بردار فطری شاعر ہیں۔ وہ سفر مدام سفر میں یقین رکھتے ہیں۔ اور بہت مردانہ وہ جرات رندانہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبات و احساسات کا فطری بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ کبھی کبھی لسانی ساخت و سانچہ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی فنکارانہ شخصیت کی ہمہ گیری اور جامعیت پر حرف نہیں آتی۔ انہوں نے ہزار رنگ زندگی کے بے شمار جلووں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور کھرے و کھوٹے اور تلخ تجربات حاصل کئے ہیں جو اپنی نوعیت اور معنویت کے اعتبار سے بیش قیمت ہیں۔ ان کا کمال ہے کہ اپنی فنکارانہ شخصیت سے ایسے تجربات کو وہ (خلی) سطح پر تطہیر کرکے اتنا لطیف بنا دیتے ہیں کہ ساری تلخیاں امرت میں بدل جاتی ہیں۔ فکری شاعروں کی وہ بوچھار ہوتی ہے جس کے رنگ و آہنگ میں لطیف طنزیہ کی لہریں بھی ملی ہوئی ہوتی ہیں۔

"قصہ ایک شہر کا"، "سرداوی سنگ"، "آج کے دن"، "پہرا"، "بیزاری"، "چنار کے پیڑ جل رہے ہیں" وغیرہ خاص طور پر ایسی نظمیں ہیں جو فکر و خیال کے دریچے وا کرتی ہیں۔ نظم "قصہ ایک شہر کا" میں ان کی سماجی بصیرت بڑی معنویت کے ساتھ ابھری ہے اس کا پہلا بند یوں ہے ؎

ایک شہر بڑا ہی پیارا تھا
اور سارے جگ سے نیارا تھا
وہ شہر تھا نسلوں، رنگوں کا
طبقوں، فرقوں اور ڈھنگوں کا
بدحالوں، بھوکوں اور ننگوں کا
مزدور، گنوار، کسانوں کا

ان پڑھ، جاہل، بے ڈھنگوں کا

سب کی آنکھوں کا تارا تھا

ایک شہر بڑا ہی پیارا تھا

اور اختتامیہ بند تصویر کے دوسرے رخ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ٹیپ کے مصرعے سے پہلے شاعر نے اپنے فکری انتاج کی ترجمانی بھی کر دی ہے ؎

بستی ہیں وہاں مہ پاروں کی
سڑکوں پہ بہاریں کاروں کی
وہ نگری چاند، ستاروں کی
سب اونچی ملیں، سب اونچے محل
جاگیریں تھیں زرداروں کی

ایک ناگ نے جیون سا کاڑھا تھا

ایک شہر بڑا ہی پیارا تھا،

اگر رضا اشک کی لسانی فروگذاشتوں کو نظر انداز کیا جائے تو "سرد وادی سنگ" بھی عمدہ نظم ہے۔ اس میں سنگ بطور علامت استعمال ہوا ہے خوبی یہ ہے کہ اس علامت کو تناظر اور معنی بدل بدل کر تقریباً ہر مصرعے میں برتا گیا ہے لیکن کسی طرح کا بکھراؤ پیدا نہیں ہوتا بلکہ باطنی ربط برقرار رہتا ہے۔ اسی سے نظم کا ایک فرحت بخش مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے اس نظم کا فکری تسلسل اور فنی انضباط بھی قابل ستائش ہے۔

"چنار کے پیڑ جل رہے ہیں" ایک رواں اور فطری نظم ہے اس میں اشک نے اپنی عصری آگہی کا بڑا توانا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہاں بھی آگہی کا کرب انہیں بکھرنے نہیں دیتا بلکہ بڑی فنکاریت کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں بھی ابھرتا ہے۔

نظموں ہی کی طرح اشک کی غزلیں بھی سلیس رواں اور شعریت بداماں ہیں۔ ان میں حزنیہ لے کے علاوہ سیاسی شعور اور سماجی بصیرت کی حرارت، تابانی اور حلاوت ہے ان کا اسلوب بڑا ستھرا اور نکھرا ہوا ہے ؎

؎ رکھا ہوں رحلِ وقت پہ قرآں کی طرح — آہستہ کھولیئے مجھے جزدان کی طرح

؎ اگر یونہی یہ جو شب خوں شفق پہ ماریں گے — تو گل کشید کریں گے ہوا سے نکہت تک

؎ ابھی ہے دیر ذرا دھوپ کے اترنے کا — فصیلِ شب ہے بھی اونچی حصارِ ظلمت ہے،

؎ مجھے تو گونگے کا مبہم سا ایک اشارہ بھی — زبان درازوں کے جملوں سے معنی خیز لگا

؎ ملی اجازت گفتار ہے جو گونگے کو — میں جانتا ہوں یہ اندھوں کی مہربانی ہے

ہندوستان میں مذہب، نسل، ذات اور فرقہ کی بنیاد پر اختلافات اکثر ابھرتے رہتے ہیں۔ جن کا تخریبی پہلو تاریخ کا تاریک ترین باب ہے۔ موجودہ دور میں یہ پہلو ایک المیہ کی صورت اختیار کر گیا ہے جس پر فنکار اور دانشور اشک بار ہے۔ رضا اشک کا دل گداختہ بھی لہولہان ہے، انہوں نے اپنے محسوسات اور مشاہدات کا بڑی ہنرمندی سے غزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے ؎

؎ دعائیں کس لئے بارش کی تو نے مانگی تھیں — اگل رہا ہے سیہ آسمان آگ، لہو!
؎ عجب نہیں کہ یہ فصلیں سروں کی کاٹیں گے — زمیں پہ بوئیں گے کل جو کسان آگ لہو
؎ لہولہان ہے موسم سروں کی بارش ہے — سحر کا وقت ہے مت کھولنا دریچوں کو
؎ شہر دو خطوں میں بٹ کر رہ گیا — آدمی کی ایک ذرا سی بات پر

سانحہ کربلا سے متعلق افراد کو جدید شاعروں نے لطیف استعارہ خوب برتا ہے۔ اشک کے ہاں بھی تخلیقی سطح پر اس رجحان کی آئینہ داری ہے ؎

نہ معجزہ کوئی۔ الہام، نہ رسالت ہے — یزید و شمر ہیں لاکھوں، خدا کی قدرت ہے
گھرا ہوا ہوں ہر اک سمت سے یزیدوں میں — ہے سر پہ شمر کی تلوار گوشے گوشے سے

اشک معروف ہندوستانی فنکاروں اور دانشوروں کے امتیازات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے دلیو مالائی افراد کے علاوہ کئی فنکاروں کو بھی غزلیہ مزاج میں کھپانے کی کامیاب کوشش کی ہے ؎

کسی نشرت کا فن بے مثال لگتا ہے — وہ اپنے عہد کا زندہ سوال لگتا ہے
؎ ہر اک یگ نے مرا اتہاس لکھا ہے — کہیں بیاس کہیں تلسی داس لکھا ہے
؎ سدھارتھ کی طرح سب کچھ ہم اپنا چھوڑ آئے ہیں
مگر خود کو کبھی بھی آج تک گوتم نہیں لکھا
؎ ابھی خبر ہی نہیں وقت کے سدھارتھ کو — کہ زندگی سے کیا آواگون کا رشتہ ہے

انہوں نے اپنی اپج کی صلاحیت کو غزل کے مستعمل اور مالوس لفظیاتی ذخیرے تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس میں اضافے کا امکان پیدا کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر بسا اوقات ان کے تیور کا تیکھا پن اور لہجے کی جھبن شدید ہو جاتی ہے ؎

؎ تمام عمر وہ چلتا رہا ہلوں کی طرح — مگر یہ عزم کہ جیسے وہ نہال لگتا ہے
؎ مرا وجود ہی کیا وقت کے سمندر میں — بچھا ہوا کسی مچھوے کا جال لگتا ہے
؎ سبھی بتا نا جگمگاتی روشنی کے شہر میں — لالٹینوں کی یہ تم کو روشنی کیسی لگی!
؎ جسم میں قید روح کا پنچھی — جیل میں بند جس طرح نکسل

ہو کہاں اے مجاورِ اردو!   آؤ دیکھو ذرا مزارِ غزل
یہ کھولیاں، یہ جھگیاں غریبوں کی   اے اشک اس سے مرے فکر و فن کا رشتہ ہے

رضا اشک کے فعال اور متحرک تخلیقی ذہن کی عکس ریزی بہت ہموار، رنگا رنگ اور پرکشش ہے ان کے پاس کہنے کو بھی بہت کچھ ہے اور کہنے کا سلیقہ بھی ہے۔ نظموں اور غزلوں میں تازہ اور لطیف حسی تجربات بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ ابھرے ہیں۔ اظہار بھی بڑا مستحکم، برجستہ، پرکار اور فطری ہے۔ موضوع اسلوب اور ہیئت کی متناسب، متوازن اور فطری ۔۔۔ سے ان کا شعری آرٹ نا آشنا اور پرکیف سمت سے ہمکنار ہوتا ہے اور عصری اردو شاعری کی نئی وسعتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

بقیہ: تیشے کا سفر - ایک تاثر

اس نظریے کو واقعی محسوس کیا ہے یا نہیں، اسے اپنے رگ و پے میں اتار لیا ہے یا نہیں اور پھر اسے خلوص کی شدت، احساس کی صداقت کے ساتھ اپنے فن میں ایک وجدانی و جذبی تجربہ بنا کر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے یا نہیں۔ دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جناب رضا اشک نے سماج واد اور ترقی پسندی سے جو کچھ سمجھا ہے اسے محسوس بھی کیا اور اسی احساس نے ان کے اندر ایک مثبت تعمیری مستحکم اور رجائی رویہ پیدا کر دیا ہے۔ جس نے ان کی شاعری کو بیان درد مندی اور شیرینی کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سید ابوالفیض سحر سین ابادی

رضا اشک سمستی پوری — شخصیت اور فن

رضا اشک سمستی پوری بہار کے دور جدید اردو شعراء میں ایک معتبر نام ہے۔ ان کا پورا نام سن خان تخلص رضا اشک اور وطن سمستی پور ہے اسی نسبت سے رضا اشک سمستی پوری کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش مئی ۱۹۴۲ء مونگیر ضلع کے قصبہ دین نگر (شاعر موصوف کی ننہال) میں ہوئی۔ اشک کے والد جناب ڈاکٹر حافظ یوسف خاں سمستی پور کے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر بسلسلہ تحصیل معاش سمستی پور میں مقیم تھے رضا اشک کے نانا کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام لطفاتون تھا۔ ان کی شادی عصمت النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ رضا اشک نے سمستی پور کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ ریلویز کی ملازمت اختیار کرلی۔ اوائل عمر سے ہی رضا کو شعر سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اہل ادب کی صحبت نے

اسے اور بھی پروان چڑھایا۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء سے انہوں نے شعر و شاعری شروع کردی۔ چونکہ فطری طور پر ان کا مزاج شعر گوئی کے لئے موزوں تھا اس لئے انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اور بغیر کسی استاد کی مدد کے یہ جلد ہی موزوں اور با معنی اشعار کہنے لگے۔ اور دو سال کے اندر اندر یعنی اگست ۱۹۶۰ء میں ان کا پہلا کلام بغیر کسی توسط و پیروی کے بمبئی کے معروف رسالہ فلم ستارہ میں شائع ہوا۔ اس پہلی تخلیق کی اشاعت کے ساتھ ہی رضا اشک کو جو غیر متوقع مقبولیت ملی اس نے انہیں بھی حیرت زدہ کر دیا۔ اب کیا تھا؟ ان کے ہمت و حوصلے میں ایسا اضافہ ہوا کہ انہوں نے تادم تحریر شاعری جاری رکھا اور جلد ہی اصناف ادب پر دسترس حاصل کر چکے۔ اس سلسلے میں خود ان کا اپنا یہ کہنا ہے: میں کوئی حرف بہ حرف ... ہوتی ہے

میں وقت کے قدموں کی ابھی دھول ہوں لیکن
کل دیکھنا پلکوں پہ سجائے گا زمانہ

ہوا بھی ایسا ہی اس پہلی تخلیق کی اشاعت کے بعد تعریفی اور توصیفی خطوط کا انبار لگ گیا۔ ملک کے موقر جرائد و رسائل سے تخلیقی تعاون کی فرمائشیں آنے لگیں اور جلد ہی رضا اشک نے جرائد و رسائل ریڈیو اور عوامی مشاعروں میں اپنی عظمت کا سکہ رواں کر دیا۔ یہاں تک کہ پہلا مجموعہ کلام "شیشے کا سفر" مطبوعہ ۱۹۸۶ء کے بعد تو ان کی شہرت کا ڈنکا ملک و بیرون ملک کے کونے کونے میں بج اٹھا۔ اردو کے تمام بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کی مدح سرائی بہ یک زبان ہو کر کی۔ عوام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

رضا اشک کی ابتدائی زندگی اور دوسرے واقعات کے متعلق کوئی جامع معلوماتی مضمون کی عدم دستیابی کے باعث ان کی ابتدائی زندگی کے حالات و کوائف اور شخصیت پر روشنی ڈالنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شاعر نے بھی شاید مصلحتاً یا اپنی خودداری طبع کے باعث شاید یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ اپنا تعارف خود ہی کرائے۔ بات تو بالکل بجا ہے۔ ہر غیرت مند فنکار کے لئے یہ مقام موت ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود کچھ لکھے۔ مگر کیا کیا جائے؟ اس بے حس اور مردہ سماج میں زندوں کی بات تو دور شاید اب مردوں کو بھی اپنے کتبات کی تختی گلے میں ٹانگ کر رہنا ہوگا۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ اہل فن اور اصحاب قلم بھی آپس میں ایک دوسرے کا تعارف پیش کرنے کا فرض نہیں سمجھتے۔ رسمی طور پر فن کے متعلق ہی چند حروف سپرد قلم کرنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔

رضا اشک فطرتاً بڑے ملنسار، خوش طبع اور منکسر المزاج ہیں۔ ایثار و محبت اور ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ غریبوں، مظلوم اور محنت کش طبقے سے انہیں والہانہ محبت ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ ان کی شاعری اور ان کے فن کا محور بھی عناصر ہیں۔ یہ فطرتاً پاک اور بڑے صاف گو ہیں۔ پیٹھ پیچھے کسی کی عیب جوئی کرنے کی بجائے اس کے منہ پر ہی اسے کہنا ان کا شیوہ ہے۔ ان کے اس عادت سے لوگ ان کے شاکی ہیں۔ اس کا اظہار رضا اشک نے ذیل کے چند اشعار میں کیا۔ ملاحظہ ہوں ؎

یہ ٹوٹی کھولیاں یہ جھگیاں غریبوں کی
اے اشک اس سے مرے فکر و فن کا رشتہ ہے

یہ میرے فن سے ہے شکوہ جدید ذہنوں کو
کہ میری غزلوں کا رشتہ ہے اشتراکی کا

تمام وقت میں کچھ قصے بے لباسی کے
تمہارے نام ہی اہل لباس لکھا ہے

اشک وہ عہد دار و رسن ہو یا آزادی کا موسم
تم بتلاؤ میں نے کب صاحب بیگم کے گیت لکھے

اب ذرا ایک نظر رضا اشک کے فن اور ان کی شاعری کی طرف۔ فن کے لغوی معنی کاریگری اور ہنر کے یعنی کسی چیز کی ہیئت بدل کر اس کے اندر حسن و دلکشی اور جاذبیت پیدا کرنے کا نام فن ہے۔ صنف ادب میں فن سے مراد کسی خیال، کسی تحریک یا تحریر کو موزوں و مناسب الفاظ سے زیب دے کر اس میں حسن و جاذبیت، دلکشی و رعنائی پیدا کرنے کا نام فن ہے۔ فنکار اپنی تخلیق

مناسب دبریدہ، اضافہ و تلخیص، الفاظ کے ردوبدل، نشت وفراز اور فنی لوازمات کی مناسب ادائیگی کے بعد جب اپنے قاری کے سامنے مطالعہ ورائے زنی کے لئے جب اسے پیش کرتا ہے تو یہ تخلیق اس کے فن کا درجہ پالی ہے۔ کسی بھی تخلیق کے فن کے درجہ تک پہنچ کر معیار فن پر پورا اترنے اور اسے شاہکار کا درجہ پانے کے لئے فنکار کو بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بارہا کئی کٹھن منزل سے گذرنا پڑتا ہے اور برسوں کیا عمر کے ایک بڑے حصے تک خون جگر جلانا اور ہڈیوں کا چورن بنانا پڑتا ہے۔ اور جب کسی فنکار کی تخلیق میں یہ چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی تخلیق فن کا بہترین نمونہ اور ایک لافانی شاہکار بن جاتا ہے۔ شعر و ادب میں فن یا فن کاری کا مطلب یہ کبھی نہیں کہ شاعر یا ادیب اپنی تخلیق میں بھاری بھرکم اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال کرے یا فارسی و عربی کے پیچیدہ و مشکل تراکیب کے استعمال سے اپنی تخلیق کو مکمل کرے بلکہ فن اور فنکاری تو یہ ہے کہ عام فہم اور روزمرہ کے استعمال میں آنے والے الفاظ کو بھی اس طرح استعمال کرے کہ اس کی تخلیق میں گیرائی و گہرائی حسن و دلکشی، رعنائی و جاذبیت اور معنویت پیدا ہو جائے ن کے متعلق رضا اشک کے یہ خیالات کتنے حق بجانب ہیں اخذ فرمائیں۔

ہم اشک صحیح معنوں میں حسین شہکار اسی کو کہتے ہیں
ہر نقش سے جس کے خونِ دلِ فنکار کی خوشبو آتی ہے

عروجِ فن ہی تو فنکار کی بلندی ہے
کوئی سوال نہیں اس میں قد و قامت کا

ادا اپنے فن کے متعلق ان کا یہ نظریہ بھی ٹھوس حقائق مکتا ہے ؎

ہاں عظمت و رفعت نہ سہی فکر میں میرے
کچھ جدت و ندرت تو میرے فن میں ملے گی

ہر موجِ مئے افکار سے اب اشعار کی خوشبو آتی ہے
اے اشک ترے کردار سے اک فنکار کی خوشبو آتی ہے

مگر رضا اشک فن کی اس بحث میں الجھ کر اپنی تخلیقی صلاحیت کو برباد کرنا نہیں چاہتے اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

آسمانِ فن کو چھو آیا مصور کا قلم
امتیازِ رنگ اور روغن میں ہم الجھے رہے

بات بھی بالکل صحیح ہے رضا اشک کی شاعری غریبوں، مظلوموں، دکھی دلوں اور عام انسانوں کے روزمرہ کے مسائل کی شاعری ہے انہیں کہاں سے رہی مصنوعی فنکاری کی یا فن کے متعلق سوچنے کی فرصت انہیں تو حصارِ ذات سے نکل کر کائنات کے لئے زندہ رہنا ہے ؎

اشک میں آج تک جیتا رہا اپنی خاطر
اب مجھے ساری جماعت کے لئے جینا ہے

رضا اشک کی شاعری میں زندگی کے گوناگوں مسائل، ان کی پیچیدگی، کربِ ذات و کائنات، کرب وجود آگہی، ٹوٹتی بکھرتی اخلاقی قدروں کا کرب۔ غریبوں، مظلوموں، ناچاروں اور مجبوروں سے محبت و ہمدردی کا جذبہ اور ان سے بے لوث و بیکراں محبت کا اظہار ہے۔ انہیں انسانیت سے دوستی اور محبت ہے۔ ہوس پرستوں، ظالموں، زر کے پجاریوں اور انسانیت کے دشمنوں سے شدید نفرت ہے ان کے دلوں میں مزدوروں اور مجبوروں کی قیادت کا جذبہ ہے۔ وہ ان کی زندگی کو خوش حال اور خوشش آئند دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے اندر جوش بے پایاں اور عزم بیکراں ہے۔ وہ سیاہی کے دشمن اور سپیدی کے رسیا ہیں۔ وہ سیاہی کے خلاف اعلان جنگ ہی نہیں کرتے بلکہ

سپاہی کی [illegible] خاتمے تک اس کے خلاف لڑتے رہنے کا عزم مصمم بھی کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ایک نئے خوشحال اور تمام برائیوں سے پاک سماج کی تشکیل کا جذبہ موجزن ہے۔ ایسا سماج جس میں ہر شخص خوش رہے۔ اور ہر کٹیا سے خوشی کی کرن پھوٹے، ہر آنگن خوشحال ہو، لوگوں کو آزادی کا احساس ہو۔ اور دلوں میں آزادی کا احترام ظلم و جبر کا خاتمہ ہو اور اخوت و محبت کے پودے لہلہائیں انہوں نے زندگی کے ہر نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے اشعار میں ماحول کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ رومان کی چھاؤں میں بھی حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کی شاعری میں جمالیات کے نئے تصور کی واضح جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے کلام میں اگر ایک طرف کرب حاضر ہے تو دوسری طرف خوش آئند مستقبل کی بشارت اور اس کے حصول کا عزم کا ذکر بھی۔ یاس و حسرت و ناامیدی کو وہ کبھی اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیتے ہاں ان کا تذکرہ ضرور کر دیتے ہیں۔ زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا بے پناہ حوصلہ ان کے کلام میں ہے۔ مجروح و معذور و بے بس، کراہتی، چیختی، سر پیٹتی اور دم توڑتی انسانیت کے لئے ایک دردمند دل ان کے پاس ہے۔ یہی دردمندی جب نوک قلم سے سنور کر کاغذ کے صفحات پر بکھرتی ہے تو ان کی شاعری کو حسن و ندرت یگانہ اور دلنواز رنگینی و حسن و جاذبیت عطا کر کے ہم عصر شعرا میں مقام منفرد پر لا کر انہیں کھڑا کرتی ہے اور ان کا قد اونچا کرتی ہے۔ ان کے کلام میں موضوع کا تنوع، الفاظ کی ندرت اور خیال کی نکہت ہے۔ گو ان کے کلام میں تیکھاپن اور اظہار میں تیور بھی ہے مگر اس کے باوجود اس میں حقیقت بیانی کا جو جوہر ہے وہ قاری کو ان کے منفی اثرات سے باز رکھتا ہے۔ قاری اس میں اس درجہ تیکھاپن محسوس

کرتا ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کر لینے پر مجبور ہوتا ہے اپنائیت کا یہ جذبہ اسے مٹھاس کا ذائقہ بخشتا ہے۔ رضا اشک ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اس کے قدیم کلچر کے دلدادہ ہیں۔ ان کے ذہن و فکر کے دریچے کشادہ اور کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا انداز بیان صاف سادہ اور تصنع سے پرے ہے۔ رضا اشک کی شاعری میں ان کی ذاتی شریف النفسی، نیک نیتی، انصاف پسندی، حق گوئی، دردمندی، غریب پروری اور بیباکی ہے جو ہر جو ان کے کردار کے جوہر ہیں ان کی واضح اور بھرپور مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ان کے اشعار کی سچائی اور سادگی دلوں میں اتر کر تریاق کا کام کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، داستان عشق، عشوہ و غمزہ ناز و ادا، مادی اور نفسیاتی مسائل اور گوناگوں سماجی اور اخلاقی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور روزمرہ کے واقعات و حادثات پر ان کی گہری نظر ہے۔ خیالات اور بیان میں تسلسل اور فکری جذبہ میں ہم آہنگی ہے۔ انہوں نے الفاظ سے جادو کا کام لیا ہے۔ بعض الفاظ کو علامت کے طور پر استعمال کر کے ایک خاص مفہوم پیدا کر لیا ہے۔ ان سبھی باتوں کے باوجود ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام میں غرور و تکبر کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ان کا مجموعہ "تیشے کا سفر" ہو یا "پتھروں کی رہگزر" ان میں اگر اس قسم کے اشعار کہیں ملتے بھی ہیں تو اپنے معترضین فن کے جواب میں ہیں۔ ان کی شاعری دکھی اور دردمند دل کی آواز ہے۔ ان کے کلام میں طنز کے گہرے تیر کے ساتھ ساتھ ایک باغی انسان کے احساسات کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری یقین محکم، عمل پیہم اور جہد مسلسل کی داعی ہے۔ ان کے افکار میں گیرائی و گہرائی اور وسعت کے ساتھ ساتھ ندرت، نغمگیت اور موسیقیت

کی بھرپور لہر ہے۔ اسلوب بیان میں سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ برجستگی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ عام فہم اور مروجہ ہندی الفاظ کے استعمال نے ان کے کلام میں بلا کی خوبصورتی دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے رضا اشک نے فارسی تراکیب کا استعمال بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں آمد کی بے پناہ کیفیت ہے۔ نظموں میں تو ایسا لگتا ہے کہ خیالات کا ہجوم بیکراں خود بخود چلا آ رہا ہے۔ اور اپنے آپ اشعار کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ غزلوں میں بھی ہو بہو یہی کیفیت ہے۔ پوری کتاب پڑھ جایئے کہیں اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوگا کہ شاعر نے ایک لفظ بھی زائد یا غیر ضروری غیر فطری طور پر دیدہ و دانستہ استعمال کیا ہے۔ آورد کا تو نام و نشان نہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ اور مبہم خیالات سے بھی آپ کو واسطہ نہیں پڑے گا۔ کہیں بھی ذہن پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ جو خیالات دل کے آئینے پر چمکے فوراً منعکس ہو کر صفحہ قرطاس پر بکھر گئے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو بجا طور پر انہیں ایک فطری شاعر ہونے کا دعویدار بناتی ہیں اور اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز و منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ خوبیاں دوسرے شعرا کے یہاں خال خال ہی ملتی ہیں۔ تاریخ اسلام سے لے کر ہندو اساطیر اور ہندی دیو مالائی کتھا تک ان کی پوری گرفت میں ہے۔ رضا کی شاعری نے سفر شعر گوئی کی منزل دشوار زینہ بہ زینہ طے کیا ہے۔ وہ ہر آئیڈیالوجی کا احاطہ کرنے کے باوجود کسی کے غلام نہیں اگر غلامی ہے تو انسانیت کے اصول کی۔ درد ہے تو غریب نادار کچلے ہوئے انسان کا۔ بغاوت ہے تو اس سماج، اس ذہن اور اس نظام سے جس میں انسانیت کی روح کچلی جائے۔ جس میں استحصال، ظلم و زیادتی ہو۔ غم و ماتم ہے تو اعلیٰ انسانی اقدار کی پامالی کا۔ نفرت ہے تو تعصب و تنگ نظری سے۔ محبت ہے تو وطن، انسان اور انسانیت سے، ان کی شاعری پر کبھی کبھی اشتراکی شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اشتراکی نہیں ہیں کیونکہ محض بھوک افلاس جبر و استحصال، ظلم و تشدد، معاشی عدم توازن اور سیاسی عدم استحکام کے خلاف آواز بلند کرنے اور ایک ایسے خوشحال سماج کے قیام کی خواہش جو ان برائیوں سے پاک ہو اس کا نام اشتراکیت نہیں اور نہ ہی ان خیالات کا حامی ادیب و شاعر

اور اشتراکی نظام کے قیام کے لئے ان شعلہ انگیز مسائل کی طرف توجہ دینا اور ان کا حل ڈھونڈ نکالنا ضروری ہے۔ جہاں تک کسی شاعر یا ادیب کا تعلق ہے وہ سماج میں رہتا ہے اور اس کا ادب سماج میں جنم لیتا اور پروان چڑھتا ہے اس لئے ان سماجی مسائل سے وہ قطعی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ادب اور تمام اصناف ادب اپنے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کا اولین مقصد اصلاح معاشرہ اور سماجی و معاشرتی مسائل کی جانب رائے عامہ کی توجہ کو مرکوز کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک میری دانست ہے رضا اشک نے تا دم تحریر اپنے آپ کو کسی سیاسی مسلک کا پابند نہیں کیا ہے۔ ان کا ذہن و فکر آزاد اور قلم ہنوز بیباک ہے۔ ویسے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہیں ایک اشتراکی شاعر یا اشتراکی نظریہ کا شاعر قرار دینے کے لئے ڈھیر سا مواد ہمارے محققین اور نقاد حضرات کو ان کے کلام میں مل جائے گا۔

رضا اشک کی شاعری میں جاں نثار اختر کا رومان جگر کا رنگ تغزل، مجاز اور فراق کی سرمستیاں، فیض کی بغاوت

اور جوش کی ملاحت سب کچھ ہے۔ مگر ان کے اپنے الوکھے اور الوکھے انداز میں انہوں نے لیا سب سے لیکن نہ تو کسی کی تقلید کی اور نہ ہی اس فن میں کسی کے مرید ہوئے۔ ان کا اپنا ایک مخصوص اسلوب اور انداز بیان و اظہار ہے۔ جو انہیں دوسروں سے الگ تھلگ کرکے ان کی انفرادی شخصیت کو ہجوم بے پایاں میں ایک ایسے جداگانہ مقام پر کھڑا کر دیتا ہے جہاں انہیں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک رعنا اشک کی نظم نگاری کا تعلق ہے رعنا اشک بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ انہوں نے پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظمیں لکھی ہیں۔ نظم نگاری بمقابلہ غزل گوئی ایک مشکل فن ہے۔ نظم کا موضوع اور مرکزی خیال محدود ہوتا ہے۔ اس میں الفاظ کے زیر و بم پر کافی توجہ دینی پڑتی ہے۔ خیالات کا تسلسل اور اظہار بیان کی سلاست و روانی پر شاعر کو اپنی نگاہیں کھلی رکھنی پڑتی ہے۔ ضمنی باتیں یا واقعات اس طرح نظم کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں کہ قاری کو کسی پیوندکاری کا احساس ہونے کی بجائے ان کی ضرورت محسوس ہو اور یہ چیزیں گراں بر گوش نہ ہوں۔ اگر نظم پابند ہے تو وزن و بحر کا پورا پورا خیال رکھا جائے اور ردیف و قوافی کا التزام برتا جائے۔ اور اگر آزاد ہے تو اس کے قواعد کی پابندی کرتے ہوئے سارے فنی اور ہیئتی التزامات کو برتا جائے کیونکہ آزاد نظم نہ تو کوئی بے سر پیر کی چیز ہے اور نہ بکواس بیجا یا شئے معلق

رعنا اشک کی دونوں طرح کی نظموں میں سارے فنی اور ہیئتی التزامات کو برتتے ہوئے اس کے حسن و دلکشی اور رعنائی کی پوری طرح قائم رکھا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں بلا کا تاثر ہے۔ الفاظ کے زیر و بم سے انہوں نے اپنی نظموں میں جو سحر انگیزی اور سحر آفرینی کا ماحول بنایا ہے وہ بڑا ہی جاذب نظر اور مسحور کن ہے۔ ان کی نظموں میں تسلسل روانی ہے۔ خیالات و افکار کی موجزنی ہے۔ نغمگیت شعریت اور موسیقیت ہے۔ اس کے ساتھ اعلیٰ و ارفع درجے کے نظم کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ ان کی نظموں کا موضوع عام طور پر معاشرتی اور سماجی استحصال۔ اخلاقی اقدار کی پستی۔ بڑھتی ہوئی لاقانونیت، دہشت گردی، فساد، بھوک۔ روزمرہ کے مسائل، ماضی کے عظمتوں کی جھلکیاں، حال کا ناسور اور خوش آئند مستقبل کا خوابناک تصور یعنی سب کچھ ہے۔ انہیں وطن اور اس کے ذرہ ذرہ سے والہانہ محبت ہے۔ اس کے پہاڑوں، وادیوں، اس کی فضاؤں، اس کی ہواؤں، اس کی ندیوں، کھیتوں، کھلیانوں، کیاریوں، باغوں، لق و دق صحراؤں، گھنے جنگلوں، اس کے پرفضا مقامات، دیوی دیوتاؤں اور بدلتے ہوئے موسموں سے جو والہانہ عشق و محبت ہے اس کی واضح مثالیں ان کی نظموں میں ہیں۔ لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود زبان کی کھردراہٹ اور اظہار کا سپاٹ پن کبھی کبھی ان کی ایک اچھی تحریک کو بھی غیر موثر بنا دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ان کی بے جا طویل گوئی نے ان کی بعض نظموں کے حسن و دلکشی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اور قاری کے لئے بوریت کا سبب بن گئی ہے۔ "ٹانگ کٹی عورت" "ہوتقل بہاران" "ہریا" "اپنا وہی خاور" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں خواہ مخواہ طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ افسوس کہ رعنا اشک نے اختصار و جامعیت کی طرف دھیان نہیں دیا۔ نظم خواہ آزاد ہو یا پابند اسے اتنا جامع ہونا چاہئے کہ اس میں وحدت تاثر قائم رہ سکے اور قاری کو بوریت کا احساس نہ ہونے پائے۔ رعنا اشک نے فسادات کے موضوع پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ لپنے انداز بیان میں الوکھی اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ گرچہ یہ بھی حقیقت

ہے اور اس سے انکار و فرار ناممکن کہ ان میں وہ تاثر اور گیرائی وہ گہرائی نہیں جو دوسرے شعراء مثلاً منظر شہاب کی فسادات سے متعلق نظموں میں ہے۔ (ملاحظہ کریں پیراہن جاں) شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نے فساد کی آگ میں یہ نفسی نفسی خود جھلس کر اور اس کی صعوبتوں کو جھیل کر دل کی گہرائی سے لکھا۔ دوسرے نے عمومی باتوں کا ہی تذکرہ کیا کیونکہ موجوں کے تھپیڑوں میں گھرا ہوا ہی موجوں کا مزہ اور اس وقت کی صعوبتوں کو جانتا ہے۔ پھر بھی اس موضوع پر "چنار کے پیڑ جل رہے ہیں" "یہ مکان کس کا ہے" اور "قتل بہاراں" جیسی نظمیں غنیمت اچھی اور خوبصورت ہیں۔

رضا اشک نے بچوں کے لئے بھی کچھ نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں "بچہ اور چاند" "ایک پہیلی" "دھرتی کی کہانی" "چھوٹا سا دھنش بان" "ننھا سا ترازو" وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں میں کوئی نہ کوئی پیغام تو ضرور ہے مگر یہ نظمیں اپنے زبان و بیان اور لہجہ و انداز فکر کے لحاظ سے صحیح معنوں میں بچوں کی نظمیں کہی جانے کی حقدار نہیں۔ بچوں کے لئے جو بھی تخلیق کی جائے وہ ان کے اپنے معیار کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس کی زبان، اس کا انداز بیان اور مواد ایسا ہو کہ بچے اس آسانی سے زبان زد کر سکیں اور سمجھ بھی سکیں۔ رضا اشک نے تخلیق بچوں کے لئے کی ہے مگر زبان بڑوں کی ہے۔ ملاحظہ ہو ایک مثال ؎

تک رہا ہے دیر سے کیا طفلکِ سیماب خو
جانتا ہوں چاند چھونے کی تجھے ہے آرزو
بھاگیا ہے ہو نہ ہو تجھ کو دیار کہکشاں
دیکھتا ہے اس لئے مڑ مڑ کے سوئے آسماں
کس قدر بیتاب ہے تو اس کو پانے کے لئے
چاہتا ہے چاند مٹھی میں چھپانے کے لئے
آہ اے ناداں یہ تیری دسترس سے دور ہے
پائے انساں واں پہنچنے سے ابھی معذور ہے

الفاظ خط کشیدہ عام ذہن اور کم عمر بچوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ بچوں کی تخلیق کی زبان آسان اور روزمرہ کے ان الفاظ سے کی جائے جسے وہ سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی سہل سے ادق کی جانب بڑھا جائے۔ رضا اشک نے کچھ نظمیں عقیدت کے طور پر بھی کہی ہیں جیسے بنام رضا نقوی، اندرا گاندھی، حضرت شمیم، بھائی شبیر قبلہ — ان نظموں میں ان کے ذاتی تاثرات ہیں جو بڑی فنکاری سے ادا کئے گئے ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ رضا اشک کی نظموں کا اپنا منفرد رنگ و آہنگ اور لہجہ ہے جو نظم گو شعراء کی صف میں انہیں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں حقیقت بیانی، بے باکی اور صاف گوئی ہے۔ وہ الفاظ و بیان کی مصنوعی جادوگری سے دور رہ کر الفاظ کو اپنے خیالات کا پابند بناتے ہیں۔ ان میں وہ دلکشی اور تاثر ہے کہ یہ دیر تک اپنا اثر قاری کے ذہن و دل پر چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ہماری زندگی کے تلخ و شیریں حقائق ہیں جو ہمارے ماضی و حال سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ان میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان سے ہمیں جدوجہد کے لئے عزم اور حوصلہ ملتا ہے۔ ان میں نغمگیت، شعریت اور موسیقیت کی بھرپور لہر ہے۔ مطالعہ کی کمی کے باعث ناقدین فن کے نزدیک ان کی فنی کوتاہیوں کی گرفت لازمی نظر آتی ہے۔ مگر یہ مواد کے مقابلے میں انہیں نظر انداز کرنے کی پوری گنجائش ہے۔

غزل اور اردو شاعری کی ایک مقبول صنف ہے۔

شعرائے کرام نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کے
معنی محبوب سے باتیں کرنا ان کے حسن و جمال کی تعریف
اور داستان عشق و محبت بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس
ایک اچھی غزل کے لئے سوز و گداز، غم و الم، اظہار محرومی
حسرت، حجر و ہجر، معشوق کی بے وفائی، بے اعتنائی اور
تغافل کا ذکر۔ اس کے ظلم و ستم کی داستان، آہ و بکا، ہجر و
وصال کی کیفیات مایوسی و نامرادی وغیرہ جیسے جذبات کا اظہار
ضروری سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدما بالخصوص ماہرین
اور شہنشاہان تغزل کے یہاں جو اشعار ملتے ہیں ان میں
مضامین کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ عشق مجازی
عشق حقیقی کا اظہار بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور رنگ تغزل
گویا انہیں باتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مگر وقت کے گذرنے کے
ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی آئی اور غزلوں کے اشعار میں
تغزل کو قائم رکھتے انسانی زندگی کے عام مسائل اور
روزمرہ پیش میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات نے بھی
غزلوں میں جگہ پانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ فی زمانہ غزل
مضامین کا وسیع کینوس آج ہمارے سامنے ہے۔ رضا
اشک نے بھی غزلیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ غزلوں کے
بارے میں ان کا بھی یہی خیال ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

پا میں زنجیر ستم ہو تو غزل ہوتی ہے
دست فنکار قلم ہو تو غزل ہوتی ہے

ہاتھ بیکار ہو اور پاؤں میں زنجیریں ہوں
بھوک اور بھوک کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے

فن نکھرتا ہے کچھ اور دار پہ چڑھ جانے سے
سر فنکار قلم ہو تو غزل ہوتی ہے

اشک جب ہاتھ میں ہوتی ہے قلم کا تیشہ
سر پہ کہسار ستم ہو تو غزل ہوتی ہے

اور رضا اشک غزلوں کی موجودہ ہیئت کے منحرف ہیں
ملاحظہ ہو ؎

لفظوں کی نمائش کو غزل کہہ نہیں سکتا
کٹیا کو عمارت کا محل کہہ نہیں سکتا

اشک کی غزلیہ شاعری کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ اشک نے کرب ذات سے لے کر کرب کائنات تک کے مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عزم بیکراں، پیام عمل، جہد مسلسل، مسائل زیست و مرگ، موت و حیات، موجودہ سماج کی اخلاقی پستی اور معاشی بدحالی کا تذکرہ۔ ان سے ابھرنے والے مسائل کا ذکر، آج کی شہری زندگی، بھوک افلاس اور اس سے پیدا شدہ مسائل، فساد، غم و مایوسی و محرومی، بڑھتی ہوئی لاقانونیت، بقا و فنا، طنز کے تیکھے تیر، نظام زر، سائنسی ایجادات، جنگ اور اس کی ہولناکیاں، خواہش امن و امان، درس اخوت و محبت سب کچھ ہے۔ عصری حسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کی بعض غزلوں کا انداز خالص رومانی ہے اور ان میں رنگ تغزل کی بھرپور لہر ہے۔

رضا اشک کی غزلوں میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ نغمگیت، شعریت اور موسیقیت کی بھرپور لہر بھی ملتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان دلکش ہے۔ سیدھے سادے عام فہم اور روزمرہ کے استعمال میں آنے والے الفاظ کے استعمال نے ان کی غزلوں میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ بعض ہندی ایسے استعمال کئے گئے ہیں جن کے پیچھے ایک تاریخ پوشیدہ ہے بعض روزمرہ کے ہیں۔ غزل اردو شاعری کی آبرو بھی ہے اور چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن بھی۔ اشک نے کہاں تک اس آبرو کو بچایا ہے اور کہاں تک چاول پر قل ھو اللہ لکھنے جیسے مشکل کام میں کامیابی حاصل کی ہے اس کا فیصلہ میں دوسرے ناقدین فن پر سونپتا ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں رضا اشک نے اپنی

بساط تک اس فرض کو نبھانے کی ایک کامیاب سعی کی ہے

رضا اشک نے آزاد غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن اس صنف میں وہ قاری پر کوئی تاثر چھوڑنے سے قاصر رہے۔ اشک کو اس صنف سخن کی طرف اور دھیان دینے کی ضرورت ہے ورنہ غزل صرف خانہ پری کی ایک کوشش لگتی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بنام حسن شیریں داستانِ تیشہ و کہسار لکھ دینا
جنونِ دل کا افسانہ سرِ دیوار لکھ دینا
اگر اس بے وفا کو تار کر دینا
ہمارا پیار لکھ دینا
وہ حالِ دل اگر پوچھیں
سنا تھا کس طرح دلی کا کل دربار لکھ دینا

آپ ہی فیصلہ کیجئے۔ یہ غزل ہے یا ہزل۔ اس میں کون سی گیرائیت، گہرائیت اور معنی آفرینی ہے۔ آزاد غزل کی بھی اپنی صنفی ہیئتی اور صوتی حیثیت ہے۔ آزاد غزل یا آزاد نظم کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ جو چاہا لکھ دیا جیسے چاہا لکھ دیا۔ بحر کی تخفیف یا اس کے اضافے کے ساتھ اس میں غزل کے سارے مضامین لائے جا سکتے ہیں۔

رضا اشک نے قطعہ گوئی پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دوسرے اصنافِ سخن کی طرح قطعہ بھی ایک مقبول صنف شاعری رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ چار یا چھ مصرعوں کے اندر شاعر ایک مضمون کو باندھ کر اپنے مطلب کی بات کہہ دیتا ہے جس سے سامع اور قاری کی سیری ہو جاتی ہے۔ قطعہ کے اندر موضوعات کے تنوع کی خوبی نے اسے اور بھی مقبول بنا دیا ہے جہاں تک رضا اشک کے قطعات کا تعلق ہے ان کے قطعات میں سلاست و روانی، معنویت اور موسیقیت کی زیریں لہریں موجود ہیں۔ مگر ان کی کتاب "پتھروں کی رہگذر" میں چاند کا ادلیف سے جن قطعات کی تخلیق کی گئی ہے۔ وہ پہلا تو قعات کے برعکس ہیں۔ پہلی نظر میں ان پر نظم کے اشعار کا گمان ہوتا ہے اسی طرح ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد کے لخت جگر کے سانحہ ارتحال پر سپرد قلم کئے گئے قطعات میں خواہ مخواہ نفس مضمون کو طوالت دی گئی ہے جس سے فن قطعہ گوئی کا حسن مجروح ہوا ہے۔ قطعہ گوئی میں اختصار و جامعیت پر گہری نظر رکھنا ہر قطعہ گو شاعر کا فرض اولیں ہے۔ ورنہ اس کی اچھی سے اچھی تحریک بھی بے سود و بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ بہرحال ان کے چند خوبصورت قطعات جو "پتھروں کی رہگذر" سے میں نے لیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مانگے کے اُجالے پہ نہیں جیتے ہیں
ہم بھیک کے پیالے پہ نہیں جیتے ہیں
خود اپنا بدن اوڑھ کے سو جاتے ہیں
بخشش کے اجالے پہ نہیں جیتے ہیں

مرگ ہستی پہ رونا دھونا کیا
یاد ماضی میں عمر کھونا کیا
موت تو اک اٹل حقیقت ہے
اس کی خاطر اداس ہونا کیا

موت کی گرچہ شہریاری ہے
موت کا غم بشر پہ بھاری ہے
لاکھ ہستی پہ یہ کرے یلغار
زندگی کا سفر تو جاری ہے

مسکرایا شعور کا چہرہ
نو بنو حادثات میں ڈھل کر
زندگی کا مہک اٹھا صندل
عشق کی نرم آنچ میں جل کر

رضا اشک نے "حمد" بھی لکھی ہے۔ ان کی تحریر کردہ [illegible] فن کے موجودہ و مروجہ طرز و مزاج اور میزان سے [illegible]انہ ہے۔

رضا اشک کی زبان اگر کہیں کہیں کھردری اور سخت [illegible] الفاظ کو بحر خالص ادبی و شعری زبان نہیں ہے تو اس کے عام بول چال کی زبان ہونے کے باعث اس میں مٹھاس اور اپنائیت کا احساس بھی ہے۔ انہوں نے بھرتی کے الفاظ کے استعمال سے احتراز کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشکل عربی و فارسی تراکیب کے استعمال سے احتراز اور نامانوس و مبہم الفاظ سے حتی الامکان گریز بھی کیا ہے۔ انہوں نے الفاظ کو نئی معنویت اور نئے استعارے عطا کئے ہیں۔ بعض الفاظ کو بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ چند اسموں کے استعمال سے محاکات کی تصویر پیدا کی ہے۔ وشواس، سیلا، جھیلا، ٹیکی۔ چھاتی۔ گیلا امبر، انت، کھوٹ، اوگن، سمئے، بلوان، اندر دھنش، بھاشن سے کارن، سوگند، چلن، روپ رنگ، درشن، شانتی، چھایا، نرمل جل، اندھکار، جیوتی، لکشمن ریکھا، ساتھی سنگی، بندھن، دھنش بان، اگنی پرکھشا، مہورت، دہائی، پاپ پُن، ہتیا، کوی، کویتا، سنگرام، سیناک وغیرہ بہت سارے ہندی کے الفاظ سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ بسا اوقات ایسا احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ ان الفاظ کی جگہ ان کے بدل کے اردو الفاظ کا استعمال کرتے تو ان کے اشعار کے شعری حسن میں اضافہ ہوتا اور اس کی جاذبیت بڑھتی۔

بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ اپنی شاعری کو عام فہم اور عوامی بنا کر ہی انہوں نے شاعروں کی جھرمٹ میں اپنا مقام مخصوص حاصل کیا ہے۔ اور تمام تر تنقیدی پہلوؤں اور [illegible] کے باوجود ناقدان فن کو سر تسلیم خم

کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

آخر میں میں رضا اشک کے فن کو اپنا خراج پیش کرتے ہوئے رخصت چاہوں گا

ترا خون جگر بھی اس میں شامل ہو گیا ہوگا
مصور اس لئے اب تک ترا شہکار زندہ ہے

e Sohail, Gaya.

فیاض حالی

رضا اشک کی نظم نگاری

رضا اشک ان شاعروں میں ہیں جنہوں
روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے اپنے فن
جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ اردو
ری کی روایت کا پس منظر ان کی نگاہوں کے سامنے
ہے۔ اور سنہ ۱۹۶۲ء کے آس پاس اردو میں ابھر
الی جدیدیت کی تحریک سے بھی انہوں نے اثر قبول کیا ہے
غالباً یہی اثر ہے کہ ان کی شاعری میں نئے موضوعات
ر موضوعات کے لئے نئے images کی کثرت نظر
ہے۔ بہر حال یہ بیسویں صدی کے ان شاعروں میں ہیں
کے یہاں موضوع کا تنوع ہے پھر بھی ان کے زیادہ
وعات ایسے ہیں جو ترقی پسندوں کے لئے مقبول
ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کا اسلوب ضرور
ہے۔ ان کی جدت پسندی کا اندازہ تو اسی سے لگایا
سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دونوں مجموعہ کلام کا نام
ترکیبوں کے ساتھ پیش کیا ہے یعنی "تیشے کا سفر"
پتھروں کی رگ گند" یہ دونوں عنوانیں نوعیت کے
لحاظ سے جدید ترکیب کے حامل ہیں۔

ان کے دونوں مجموعوں کو سامنے رکھنے سے اندازہ
ہوگا کہ اشک نظم نگار بھی ہیں اور غزل گو بھی مگر ناقدین
نے ان کے پہلے مجموعے کو سامنے رکھ کر یہ رائے قائم کرلی
ہے کہ ان کی غزلیں ان کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ وقیع
اور اہم ہیں۔ مثلاً سلطان اختر، شمس الرحمٰن فاروقی
اور وارث علوی وغیرہ ان کی غزلوں کو ہی سراہتے نظر
آتے ہیں۔ اور یہ بات صحیح بھی ہے کہ رضا اشک کی غزلیں زیادہ
پراثر ہیں پھر بھی انہوں نے نظم نگاری میں بھی اپنی فکر اور
اپنے تخیل کی جولانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے لئے
انہوں نے موضوعات اپنے گرد و پیش سے لئے ہیں۔ مثلاً
بازار عورت، لگان اور کھلیان، بیلٹ اور بلیٹ،
پندرہ اگست، ریڈیو، دلت خاہ، یوم جمہوریت،
سال نو، اندرا گاندھی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے مجموعوں
کی ان نظموں کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوگا کہ ان
موضوعات کے سلسلے میں رضا اشک کے مشاہدات

قدر شدید ہیں۔ ان کے گرد و پیش کے تجربے کس قدر حقیقی ہیں اور کس نئے انداز سے انہوں نے ان موضوعات پر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو ترقی پسندی کے دائرے سے الگ ان کے تخیل کی پرواز اور زندگی سے متعلق ان کے ذاتی اور انفرادی تصورات کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً قتل بہاراں، دو آوازیں، گریز، رسوائیاں، نروان کی تلاش، چنار کے پیڑ جل رہے ہیں۔ بیزاری، کشمکش، پہلا، اگنی پرکھشا، کرفیو، سرو لادیٔ سنگ وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام نظموں کا مطالعہ ہمیں اس فیصلے پر پہنچاتا ہے کہ رضا اشک بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ جن کے یہاں تخیل اور تصور کی اپنی اہمیت ہے۔ ویسے عام موضوعات کے انتخاب کے لحاظ سے اور پیش کش کے انداز سے ان کا رویہ ترقی پسندانہ نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ترقی پسندوں کے درمیان بیٹھ کر ان کی کچھ باتیں سن کر اور پھر جدیدیوں کے درمیان ان کی کچھ تخلیقات کو سامنے رکھ کر کچھ اثر قبول کر لیا ہے اور پھر انہیں دونوں سے مستعار لے کر تخلیق فن میں لگ گئے ہیں۔ ان کے یہاں غور و فکر کی پختگی میں کمی اسی لئے محسوس ہوتی ہے۔

بہر حال جب یہ ترقی پسند بن کر سامنے آئے ہیں تو ان کے یہاں انقلاب کی ایک خواہش کا احساس ہوتا ہے اور پھر وہی آواز سنائی دینے لگتی ہیں جو عام ترقی پسندوں کی آواز رہی ہے۔ وہی فرسودہ نظام کے خلاف اور سماجی نابرابری اور استحصال کی داستانیں قلمبند ہوئی ہیں۔ اسی سے قبیل کے منفرد ترقی پسند شاعروں سے ان کا آہنگ کچھ جدا محسوس ہوتا ہے۔

یقیناً ان کے یہاں جوش کا سا ہنگامہ خیز لب و لہجہ ہے اور نہ سردار جعفری کی طرح ایک سوچا سمجھا انقلابی مؤقف ہے۔

ہاں جہاں انہوں نے ترقی پسند تصورات سے ہٹ کر ذاتی تصورات اور انفرادی محسوسات کی بنیاد پر شاعری کی ہے وہاں ان کی شاعری یقیناً ان کی اپنی نظر آتی ہے۔ موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

زہر مجھ کو پلایا جائے گا
مجھ پہ الزام ہے بغاوت کا
مجھ کو سولی چڑھایا جائے گا
مجھ پہ الزام ہے بغاوت کا
مجھ کو زندہ جلایا جائے گا
مجھ پہ الزام ہے بغاوت کا

یا نوجوان فنکار کا یہ بند ملاحظہ ہوں

شاعر و قلم کا زور
فصل گل کی آمد پر
نغمۂ گجر سن کر
دستک سحر سن کر
اب کے پھر جو تم آنا
دن کے خیر مقدم کو
آفتاب پھر لانا
ماہتاب پھر لانا
اپنے خود نغمہ کا
انتخاب پھر لانا
اک کتاب پھر لانا

ان اشعار کو سامنے رکھئے محسوس ہوتا ہے کہ رضا اشک

پسند موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اور پھر اپنے
پرور ذہن کے ذریعہ ان موضوعات پر اپنے label
پ لگا دیتے ہیں۔ یہ صورت ان کی بیشتر نظموں میں
تی ہے خواہ وہ قتل بہاراں ہو یا بازار عورت بلٹ
بلیٹ ہو یا وادیٔ کشمیر، ننھا سا تراز و ہو یا ہم جمہوریت
صورت ان کی اپنی ہے اس لئے ترقی پسند بننے کی
شش میں رضا اشک ترقی پسندی اور رومان پروری
جھولا جھولتے رہ جاتے ہیں۔ ان کی تمام نظموں
ابت کی شان ہے اور خطابت اور شاعری ایک
خطابت میں محسوسات اور تجربات کی ڈائرکٹ ترسیل
شش ہوتی ہے۔ مگر شاعری میں محسوسات کے پیکر تراشے
ہیں۔

بہرحال رضا اشک کی تمام نظموں میں خوش آئند
بل کی رومانی اور مثالی تصویر واضح نظر آتی ہے
نانے کچھ نئے موضوعات کو نئے Images
الہ پیش کیا ہے ان میں نئی تشبیہات اور استعارات
لے کر اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس نوعیت
نظمیں قتل بہاراں، نروان کی تلاش، اور زندگی
زہر وغیرہ میں جہاں جدت پسندی کی صورت واضح
زیادہ تر نظمیں ویسی ہیں جہاں ترقی پسندی کا وہ پہلو
دقتی طور پر کسی مسئلے کے پیدا ہونے سے نمایاں ہوتا
ان نظموں میں برابری کی حکمرانی اور علاقائی دہشت
کو شامل کر سکتے ہیں۔ ان جیسی نظموں میں شاعری
سے ہنر پر ہو جاتی ہے۔ انہیں پڑھ کر ایسا لگتا
رضا اشک بزم انسان کے لئے ایک متعین منشور
رہے ہیں۔ مثلاً "تصویریں" کا یہ شعر
ہو۔

ابھی اسے خالق فن فن کو کچھ اونچا اٹھانا ہے
بدلتی ہے ابھی تدبیر فن سے فن کی تقدیریں

یا دھرتی کی کہانی بچوں کے لئے کا یہ اختتامیہ ملاحظہ ہو۔

تم سب اب مل جل کر کوئی ایسی راہ نکالو
یدھ کی اگنی کنڈ سے اپنا یہ سنسار بچا لو

بڑی شاعری Synthesis کے عمل سے جنم لیتی ہے۔ اس میں محسوسات یا جذبات کے ایسے پیکر تراشے جاتے ہیں جو قاری یا سامع کے "ذہن" میں محسوسات کی وہی تصویریں ابھارتے ہیں جو خالق کے ذہن میں تخلیق فن کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ تجربات کا محض ظاہری بیان نامہ جو منظوم ہو اعلیٰ شاعری کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا رضا اشک کی ایسی شاعری جو خطیبانہ نوعیت کی ہے بڑی شاعری نہیں کہی جا سکتی۔ اور ان کی زیادہ تر نظمیں اسی نوعیت کی ہیں۔ جہاں تک نظموں کی ہیئت اور اسلوب کا تعلق ہے ان کی نظموں میں اظہار کے درمیان زنجیری سالمیت بھی نظر نہیں آتی جو موضوع کو ایک ارتقائی تسلسل کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔ ان کی بہت ساری نظموں میں عضویاتی تکمیل کی کمی بھی بری طرح کھٹکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم دیہات میں اندرا گاندھی کشمکش تو خاموشی کیسی وغیرہ کو ہم سامنے رکھ سکتے ہیں۔ ہاں جہاں انہوں نے آزاد نظموں کی کوشش کی ہے وہاں قدرے کامیاب ہیں۔ جیسے قتل بہاراں، باغی یا بازار عورت اور راجہ میاں کی گھوڑی وغیرہ ان میں زبان کی روانی بھی ہے اور ترنم کی سحر سازی بھی۔ چونکا دینے والی باتیں بھی ہیں اور علامتوں کی ندرت بھی۔ پھر بھی ان کی زیادہ تر نظمیں ان کے صحافتی اور خطیبانہ انداز کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ ●●

نقد و نظر

(الف)

تیشے کا سفر — ایک تاثر	سید ضیاء الرحمٰن
تیشے کا سفر — ایک جائزہ	مشتاق احمد وزی
تیشے کا سفر — ایک تجزیہ	نوشاد عالم آزاد
رضا اشک تیشے کا سفر کی روشنی میں	سیدہ نسرین نقاش

سید ضیاء الرحمٰن

صدر شعبۂ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ

تیشے کا سفر — ایک تاثر

گرد و پیش کے طلب دیے گئے سوانحی اشارے کے مطابق محمد رضا حسن خاں نے تیشۂ قلم کا یہ سفر ۱۹۵۸ء میں شروع کیا۔ اس وقت شاعر کی عمر ۲۶ سال تھی۔ سنِ آغازِ شاعری اور عمر کے سلسلے میں اس وضاحت سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ جناب رضا اشک صاحب نے جب ہاتھ میں قلم لیا تو اس وقت وہ شعور و ادراک کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے اور زمانہ و زندگی کے سرد و گرم سے خاصا آشنا ہو چکے تھے۔ میری نظر میں یہ بات بے حد اہم ہے کیوں کہ مشاہدہ تو یہی بتاتا ہے کہ ہمارے یہاں اکثر حضرات نے محض عنفوانِ شباب کی ایک ترنگ کے بطور یاروں کی تفریح کے لئے یا مشاعروں میں واہ واہ کی لالچ میں شاعری شروع کر دی ہمارے یہاں ایک روایت یہ بھی ہے کہ ؎

ہوئے جواں تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

چونکہ شعر و شاعری کو ہماری تہذیبی ثقافت زندگی میں خاصا دخل ہے اس لئے اس روایت کی توسیع کی صورت یہ ہو گئی ہے کہ جوانی کے ساتھ ہی عاشقی اور اس کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری زور و شور سے شروع ہو جاتی ہے۔ عاشقی کی مشقت سے پہلے ایک چسکہ چلنے لگتا ہے۔ بلکہ اکثر تو یہ ہوتا کہ جوانی سے پہلے ہی شاعری کا آغاز ہو جاتا ہے اور بضرورتِ شعری کا پاس کرتے ہوئے کوئی معشوق بھی ڈھونڈ نکالا جاتا ہے لیکن رضا اشک کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ انہوں نے یہ سوچ سمجھ کر ہاتھ میں قلم سنبھالا ہے اور اس دعوے کے ساتھ سنبھالا ہے کہ ؎

ہے اس جہاں میں سیاہی کا کاروبار
کاغذ پہ ہم اٹھاتے رہیں گے قلم کا ہاتھ

رضا اشک شاعری کو شب بیداری کا شغل سمجھتے ہیں اور دانستہ [illegible]

جیسے کہ شعر سے ظاہر ہے وہ خامہ کو ایک ایسا تیشہ تسلیم کرتے ہیں جو لفظوں کا ایک سلسلہ بناکر لمحات عصر کو اگر ایک طرف گذشتہ صدیوں سے جوڑتا ہے تو دوسری طرف انہیں آنے والی صدیوں کا نقیب بھی بنادیتا ہے یعنی وہ یہ جانتے اور مانتے بھی ہیں کہ ادب ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ ہوا کرتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

خامہ ایک تیشہ ہے
جو کہ کتنے لفظوں کا سلسلہ بناتا ہے
جانے کتنے لمحوں کا
کتنی سعولی صدیوں سے
فاصلہ ملاتا ہے
کوہکن کا افسانہ
یہ ہمیں سناتا ہے
جو ئے شیر لاتا ہے
خامے کا یہی تیشہ
آنے والے کل کو بھی
جبکہ عہد شیریں کی
داستاں سنائے گا
جانے کتنے لوگوں کو
کوہکن بنائے گا
خامے کا یہی تیشہ
شوخ ترشے ہیرے سا
فکر و فن کے معبد میں
کل بھی جگمگایا تھا
اب بھی جگمگاتا ہے
کل بھی جگمگائے گا

یعنی ہمارا شاعر شاعری کے فائدے اور مصرف سے واقف ہے زندگی سے اس کے ناگزیر رابطے وہ آ
ماضی اور روایات کا شعر و ادب پر جو اثر ہوتا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک احساس بھی اسے ہے اور وہ یہ
۔ ہر کہ شاعری اچھی اور واقعی شاعری اپنے سماج کے لئے مستقبل کی راہیں ہموار کرتی ہیں ۔ اور پھر یہ کہ شا

تر شے قیمتی ہیرے کی طرح فکر و فن کے معبد میں جھک جھک کر عزم کوہکن اور حسن شیریں کی داستاں سناتی ہے۔ گویا شاعر کو فن کے موضوع و مواد نیز اس کی صورت و نوعیت کا بہت معقول اندازہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اعظم تیشے کا سفر ادب و فن کا ایک موزوں تمثیل اور خود رضا اشک کی شاعری کا ایک کامیاب استعارہ ہے شاعری کے متعلق یہی مطمح نظر ہے کہ جس نے شاعر سے یہ شعر بھی کہلوا لیا ہے کہ ؎

کوہ در کوہ نئی ہنر کی تیاری ہے
سالہا سال سے تیشے کا سفر جاری ہے

یہی تخلیق فن کا عمل بڑا مجاہدہ طلب ہے مگر یہ بے سمت و لاحاصل نہیں، جو نئے شیر اس کا مقصود ہے جسے کی بیات شاعر نے اپنی ہنرمندی سے جس طرح ان دو مختصر مصرعوں میں بیان کر دی ہے وہ اس موضوع پر لکھے گئے کئی مقالوں پر بھاری ہے۔

رضا اشک ایک سچے بہترین شاعر ہیں وہ تلمیذ فطرت ہیں میری معلومات کے مطابق انہوں نے کسی سے نہ اصلاح لی ہے اور نہ مشورہ سخن کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زبان و بیان کے کچھ معمولی فروگذاشتیں ان کے یہاں مل جاتی ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ انشاء اللہ اس طرف بھی توجہ دیں گے۔ مگر یہ بات اپنی جگہ بالکل اٹل اور سچ ہے کہ رضا اشک صاحب ایک شاعر کا دل اور مزاج رکھتے ہیں۔ اپنے بارے میں وہ کہتے ہیں ؎

مزاجاً میں بھی اک تیشہ ہوں لیکن ۔۔ مثال سنگ ٹھکرایا گیا ہوں
میں تشنہ لب فرات زندگی پر ۔۔ اک اک قطرے کو ترسایا گیا ہوں

ایسا مزاج رکھنے والے اس شاعر کو حالات کی ٹھوکروں اور حیات تشنہ کی کے میلوں نے یہاں بھی پہنچایا ہے اور آلام کے مرحلے کے پالنے کا ہنر بھی سکھایا ہے اس کی آنکھوں میں محبوب کا غم بھی ہے اور سینے میں مرحوم ماں کا پیار بھی، فرماتے ہیں۔

میری آنکھوں میں اک محبوب کا غم ہی نہیں ملتا ۔ کہ زردی کیوں ہے تیری غم نواز پلکوں میں

فن میں نگاہ کی یہ وسعت ان کی کئی نظموں مثلاً رات پر کریں یلغار، ایک بانگ کئی عورت، مقتل بہاراں، نشاں، لگان اور کھلیان اور دعا وغیرہ کے علاوہ اس کی بیشتر غزلوں سے بھی آشکارا ہے۔ اپنے مخصوص شاعرانہ رویے کی بنا پر رضا اشک کے لہجے میں بڑا تیکھا پن آ گیا ہے۔ اور یہ تیکھا پن درد اور سوز سے خالی نہیں۔ ان کی شاعری کے وقت کے جلتے چبھتے سوالوں کا جواب چاہتی ہے۔

سالہا سال سے تعبیر کے صحراؤں میں ۔۔ خواب آنکھوں میں ہیں کتنے ہی سوالات لئے
ہے کوئی آج جو جینے سے بچا لے مجھ کو ۔۔ وقت ہر گام پہ ہے خنجر حالات لئے

رضا اشک کی شاعری اپنے اٹھائے ہوئے سوالوں کا جواب بھی دیتی ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ در اصل

مثبت طرز فکر ہے کہ انہوں نے ایک بار شعور آدمی کو زندگی حسی کی لی ہے اسے قبول کرنا چاہئے اور اسے عبد [illegible] موجد بھی وہ رجحان رکھنا چاہئے کہ ایک فن کار اور شاعر کا بھی یہی وطیرہ ہونا چاہئے چنانچہ لکھتے ہیں۔

مستقل ہے زیاں کی فکر بات بات پر
جاری رہے مدام تجربات کا سفر

اور یہ کہ

اسی میں خیر ہے تھکے ہو غبار سفر
کہاں تلک یہ فراز و نشیب دیکھیں گے

اس مثبت انداز فکر نے ہی جناب رضا اشک کے انداز بیان اور لب و لہجہ میں صلابت استواری اور توانائی پیدا کر دی ہے۔ ان کے قلب کے گداز نے مل کر ان کے لہجے کی یاستقامت اور بیان کی وضاحت ایک ایسی برہنہ گفتار پیدا کی ہے جس میں تہذیب بھی ہے اور بانکپن بھی، مٹھاس بھی اور گھلاوٹ بھی۔

رضا اشک صاحب کے ذہن و دماغ پر ہندوستان کی سیکولر اور مشترکہ تہذیب کے گہرے اثرات و نقوش مرتسم ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہندو دیومالا اور ہندوستان کے قدیم کلچر اور اتہاس کا رنگ بھی چوکھا ہے میرے رفیق مخلص پروفیسر ظہیر سید صاحب ایک دن دوران گفتگو بطور خاص رضا اشک کی شاعری کے اس پہلو کو زیر بحث لائے ممکن ہے کچھ لوگوں کو رضا صاحب کی شاعری میں بار بار اس طرح کے حوالے کھٹکتے بھی ہوں لیکن میرا خیال ہے اردو شاعری میں اپنی اس روایتی اور سرمائے اور سرچشمے سے تحریک و فیض کا اکتساب بھی نہایت ضروری ہے ایرخرہ، وجہی، ولی، نظیر، سودا، انشاء، جرأت، مصحفی، شاہ نصیر، بہادر شاہ ظفر سے لے کر محسن کاکوروی، ابن انشا اور ندا فاضلی تک ہندی مسلمانوں میں بہرحال انگلیوں پر گن لئے جانے والے چند لوگ ہی ہیں جنہوں نے اردو کے اصلی مزاج کو پہچان کر اس طرح کے عناصر اپنے کلام میں داخل کئے ہیں۔ رضا اشک صاحب نے اپنی کئی غزلوں میں نیز اپنی چند نظموں مثلاً دیوالی، بن باس، نروان کی تلاش، اور دیوداس کی واپسی، میں ہندو اساطیر و تلمیحات کو نہایت کامیابی کے ساتھ شاعری کا پیراہن عطا کیا ہے۔

رضا اشک صاحب کبھی کسی سیاسی پارٹی میں نہیں رہے لیکن اس وقت کی سب سے اہم اور فعال ترقی پسند تحریک کے اصول و نصب العین سے انہوں نے گہرا اثر ضرور قبول کیا ہے اپنے سینئر ہم عصروں مثلاً فیض اور ساحر کے شانہ بشانہ چلنے کی اپنی بساط بھر کوشش کبھی کبھی انہوں نے کی لیکن اس کے باوجود انہوں نے کسی مخصوص ازم کا لیبل خود پر نہیں لگایا۔ پھر بھی ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سوشلزم اور ترقی پسندی کے نظریات سے انہوں نے بہت کچھ اخذ کیا ہے، نظریات کے سلسلے میں (T.S. ELEET) نے اپنے مقالے میں بڑی مناسب بات کہی ہے۔

دراصل کسی [illegible] کا فی نہیں ہونا چاہئے۔ نظریہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اہم بات یہ ہے کہ شاعر ا

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

مشتاق احمد نوری

"تیشے کا سفر" ایک جائزہ

ایک فن کار چاہے وہ شاعر ہو یا افسانہ نگار ، زمانے کو وہی دیتا ہے جو وہ "تجربات و حادثات" کی شکل میں اس کے پاس جمع ہوتا ہے ۔ اس کے احساسات عام آدمیوں سے زیادہ نرم اور گداز ہوتے ہیں اور وہ معمولی باتوں کو بھی بہت گہرائی سے محسوس کرتا ہے ۔

رضا اشک سمستی پوری نے بھی زمانے سے بہت کچھ سمیٹا ہے اور اسے اپنی شاعری میں سمو دیا ہے ان کے اشعار پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ واقعات پر ان کی گرفت بہت سخت ہے اور انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے ۔

مجھ کو سمجھا گیا دھواں بن کر
غم ہستی کا فلسفہ سگریٹ
زیست جلتی ہوئی سلائی سی
موت جیسے بجھا ہوا سگریٹ

اتنے آسان انداز میں غم ہستی کے فلسفہ کو سمجھنا اور اتنے آسان انداز میں موت و زیست کے فرق کو سمجھانا فن پر ان کی گرفت کی دلیل ہے ۔

"تیشے کا سفر" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے ۱۴۴ ، صفحے کے اس مجموعے میں ۸۲ صفحے پر ۳۷ نظمیں ہیں اور بقیہ صفحات ۶۲ غزلوں پر محیط ہیں ۔ سمستی پور سے رضا اشک کی گہری وابستگی رہی ہے ۔ اور شاعری کا بہترین حصہ اسی شہر کی دین بھی ہے جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے ۔

کتنے جسموں کے صحیفے کتنے چہروں کی کتاب ،
کھل گئیں ہم سے دبستان سمستی پور میں ،

آئیے پہلے ان کی نظموں کا جائزہ لیں ، جو نظمیں خاص طور سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں ان میں "تیشے کا سفر" دعا، رازیں ، رات پر کرنیں ، یلغار ، بولٹ اور بیلیٹ ، دعا اور نگے تیر شامل ہیں ۔ اس کے علاوہ بھی قتل بہاراں ، ایک مانگ کئی عورت بازار عورت ، لگان اور کھلیان ، حنہ میاں کی گھوڑی ، اور باغی بھی قابل توجہ ہیں ۔

ان نظموں کے سرسری جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر اس سرمایہ دارانہ نظام سے متنفر ہے ۔ طبقاتی کش مکش کی جھلک ہر جگہ موجود ہے سرمایہ دار اسے

انسان کی نا آسودگی، زخم خوردگی، سماجی گھٹن اور ایٹمی جنگ سے نفرت کا اظہار نمایاں ہے۔ فنکار کو اپنے اہمیت کا احساس ہے اسی لئے وہ یہ کہہ اٹھتا ہے ؎

میں وقت کے قدموں کی ابھی دھول ہوں لیکن
کل دیکھنا پلکوں پہ سجائے گا زمانہ

فن کار جب اپنے اردگرد کی زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کیا کیا لکھے۔ زندگی سماج کے ٹھیکے داروں کے پنجے میں جکڑی ہوئی جنگ کے شعلوں میں جلتی نظر آنے لگتی ہے کہیں قمقمے پھول زخمی تو کہیں چاند بیمار لگتا ہے کہیں بوڑھے باپ کی عزت سربازار لٹتی نظر آتی ہے۔ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر کونے میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ عراق ایران جنگ ہو یا امریکہ لیبیا پر حملہ کرے۔ اسرائیل عرب پر یلغار کرے یا جافنا میں تامل کو فنا کرنے کی ترکیبیں ہوں، نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ تباہی، معصوموں کا خون، زندگی کا قتل، مگر یہ سب کسی کو نظر نہیں آتا۔ ان مسئلوں کو خوبصورتی سے رعنا اشک نے تانگہ کٹی عورت میں پیش کیا ہے یہ ٹانگ کٹی عورت دراصل سمبل ہے بے بسی کا، تباہی کا اور انسانیت کے خون کا۔

یہ ٹانگ کٹی عورت
اک جنگ کی ماری ہے
پنجاب کی سرحد پر
ایک معرکہ جاری ہے
مذہب کا جنوں ہر سو
انسان پہ طاری ہے
گجرات سلگتا ہے!
بنگال کی باری ہے
آسام کے جنگل میں
اک خوف سا طاری ہے

یہی نہیں ہر جگہ ایسے ہی مناظر ہیں ہر جگہ انسانیت برباد ہو رہی ہے۔ اور پھر شاعر مسجد کے سیہ کاروں، مندر کے گنہ گاروں، چاندی کے پرستاروں اور قوم کے غداروں سے مخاطب ہوتا ہے۔ اور ٹانگ کٹی عورت کی بے بسی کی طرف ان کا دھیان کھینچنا چاہتا ہے۔ جو یہ سب سہتے سہتے اب بالکل خاموش ہو چکی ہے۔

"قتل بہاراں" میں بھی شاعر نے انھیں مسئلوں پر روشنی ڈالی ہے اور فسادکی بربادیوں کے مناظر پیش کئے ہیں۔

"حبہ میاں کی گھوڑی" عنوان سے تو عجیب لگتی ہے مگر عنوان کی بد صورتی میں نظم میں خوبصورتی کا باعث ہوتی ہے ؎

رسوا کبھی سڑک پر گریاں کبھی گلی میں
دیکھا ہے اس کو میں نے قلیوں کی منڈلی میں
آنسو لرز رہا تھا آنکھوں کی انجلی میں
نہ جانے بات کیا ہے آخر اس منچلی میں
غنڈوں سے سینہ زوری
حبہ میاں کی گھوڑی

"حبہ میاں کی گھوڑی" دراصل اس کی بد صورت بیٹی کا نام ہے۔ وہ آوارہ لڑکی محلہ بھر میں بدنام ہے مگر شاعر نے یہ بتایا ہے کہ تباہی کے راستے پر اس نے کن حالات میں چلنا گوارہ کر لیا۔ آیئے دوجہات پر بھی ایک نظر ڈالیں ؎

اس کی بھی زندگی کی کیا خوب داستاں ہے
کتنے ہی سال گذرے بیچارا اس کی ماں ہے
بیٹی ہوئی سیانی، بوڑھا سا اک میاں ہے
دیدے جہیز آتا، پیسہ مگر کہاں ہے
بھائی کرے گا چوری
جمبو میاں کی گھوڑی

نظم "باغی" بھی متوجہ کرتی ہے شاعر آج کے دور کی بے بسی سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ سماج کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ اندر کا سچ ہمارے سامنے آجائے۔ بلبلاتے بچوں، معصوم عورتوں جنگ کی تباہیوں، گاؤں کی بربادی اور بہادروں کے قتل پر افسوس کرنے والا فنکار سچ بول رہا ہے۔ اس لئے اس پر بغاوت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور اس الزام کے بعد شاعر کی جو درگت ہوگی اسے بھی معلوم ہے۔

مجھ پر ظلم ڈھایا جائے گا
زہر مجھکو پلایا جائے گا
مجھکو سولی چڑھایا جائیگا
مجھکو زندہ جلایا جائے گا
مجھ پہ الزام ہے بغاوت کا

عورت جو ماں جیسے مقدس ترین لفظ سے یاد کی جاتی ہے ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا سلوک روا نہ رکھا۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم "چکلہ" میں بہت ہی خوب صورت انداز میں عورت کی بے بسی، سماج کی بے رحمی اور اس کے استحصال کو پیش کیا ہے یہاں بھی رضا ساحر کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔
یہ آغوش مرسل میں پرسوں پلی ہے۔

یہ نام اور لچھمن کی ماں رہ چکی ہے
یہ رشیو کی چھتی میں لگی ہے
یہ مردوں کی خاطر چتا میں جلی ہے
یہ عورت یہ آدم کی غم خوار عورت
خریدو کے بکتی ہے سرکار عورت

ان چکلہ گھروں میں پنپ رہی برائیوں سے پریشان شاعر سوال اٹھاتا ہے ؎

کہو کب تلک جسم بکتا رہے گا ؟
یہ پائل یہ گھنگھرو جھنکتا رہیگا ؟
یہ شعلہ سدا کیا بھڑکتا رہے گا ؟
یہ ناسور کیا یوں ہی رستا رہیگا ؟
اٹھائے گی کب تک یہ ادبار عورت
خریدو گے بکتی ہے سرکار عورت

شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ اس دنیا میں اب لاکھ چیخنے چلانے سے مسئلہ حل ہونے کو نہیں ہے۔ اس لئے اس کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ جاتے ہیں کہ یہی وہ دربار ہے جہاں ہر مانگنے والے کو عطا کیا جاتا ہے ؎

ہر مانگ پہ جھومر رقصاں ہو
ہاتھوں میں حنا کی لالی ہو
ہر باغ رہے محفوظ خزاں
پھولوں سے لدی ہر ڈالی ہو
کندن سے دمکتے کھیتوں میں
گیہوں کی سنہری بالی ہو
ہر صبح کھلے گلزار شفق
ہر شام افق پہ لالی ہو

اس طرح اگر ہم گہری نظر سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت

کھل کر سامنے آتی ہے کہ رعنا اشک نہ صرف خیالات کے معاملہ میں بلکہ الفاظ کی تراش خراش اور تمہید کے معاملہ میں بھی ساحر لدھیانوی کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں ۔ اور ان کی شاعری اور شخصیت کی گہری چھاپ ان پر نظر آتی ہے ۔ نظموں کی اس تجزیے کے بعد ان کی غزلوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ غزلوں میں بھی شاعر انھیں خیالات کا حامل ہے جو نظموں میں نظر آتے ہیں ۔ وہ زمانے کے اس اندھیرے سے پریشان ہے ان کی شدید خواہش ہے کہ ؎

چاند نکلے یا سحر ہو یا اندھیرا پگھلے
کم سے کم کچھ تو ہو تسکین نظر کی صورت

شاعر اپنی بڑائی بیان نہیں کرتا ہے بلکہ وہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ ؎

ہاں عظمت و رفعت نہ سہی فکر میں تیرے
کچھ جدت و ندرت تو مرے فن میں ملے گی

اسے اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ ؎

لاکھ چمکایا بھی دیپے کے لیے اپنا لہو
آئینہ بن نہ سکا آئینہ گر کی صورت

شاعر گاؤں کے ماحول سے بہت متاثر ہے شہر کی زہریلی فضا سے وہ دور رہنا چاہتا ہے مگر کب تک ؟

اب کے پھر جو کال پڑا تو ہر البیلی گاؤں کی گوری
شہر سے سوناگاچی جا کر تن کا کاروبار کرے گی

شہر کی چہل پہل اور گاؤں کی پرسکون زندگی کو شاعر نے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے ؎

ہمارے گاؤں میں اب شام ڈھل رہی ہوگی
تمہارے شہر میں سورج نکل رہا ہوگا ۔

اب اسی سورج کی آڑ لے کر شاعر نے کتنی خوبصورتی سے — آج کے سرمایہ دارانہ نظام اور لیڈرشپ پر کرارا

چہرے پہ اپنے نور کا ڈالے ہوئے نقا
کالک جبین وقت پہ ملتی رہی ہے دھ
کیا دے سکے گی اب یہ زمانے کو روشـ
آغوش شب میں دوستو پلتی رہی ہے وہ

گاؤں میں جو خلوص، ہمدردی، محبت اور بھا
ہے ۔ شہر میں اس کا یکسر فقدان ہے گاؤں کا
آدمی جب شہر کی بھول بھلیوں میں گم ہوتا ۔
کن حالات سے دوچار ہوتا ہے شہر کی جھلک
اشعار میں دیکھئے ؎

لے میرے گاؤں کے وہ شکستہ مکاں تھکر اس بات ک
ایک اونچی حویلی کے سائے تلے لٹ چکی ہے مری ہر خوشی
کم سے کم کوئی تو ایسا ملے دو قدم ہی سہی ساتھ میر
خیریت پوچھ لے اتنی مہلت ملے، کتنی مصروف ہے
قتل سب ہو چکے بوڑھے، بچے، جواں کون کس کس کا ہوتا
کس کی تربت بنے کس کی ارتھی سجے اتنی لاشیں بھی تھیں

اور اس شعر پر بھی غور فرمائیے ؎

آدمی کیا خدا کا بھی گھر جل گیا
آگ اک روز ایسی لگی شہر میں

ان ساری حقیقتوں کے باوجود شاعر مایوس نہیں
اس کے عزائم کی بلندی کا پتہ ان کے یہ اشعار د

بہت بلند سہی تیرگی کی دیواریں
فصیل شب کو اسیر کمند نور کریں

لوگ ہاتھوں میں پتھر اٹھائے رہے
تم یہ شیشے کی دوکان لے کر بیٹھو

کشتی ڈبو دے یا بھرے دریا کو پار کر
ساحل پہ بیٹھے بیٹھے نہ لہریں شمار کر

جب تک ہے اس جہاں میں سیاہی کا کاروبار
کاغذ پہ ہم اگاتے رہیں گے قلم کا چاند

کوہ در کوہ نئی نہر کی تیاری ہے
سالہا سال سے تیشے کا سفر جاری ہے

شاعر صرف حوصلہ ہی بلند نہیں کرتا بلکہ انسانیت کو پہنچتے رہنے کی تمنا بھی اس کے دل میں ہے جس کے اظہار کے لئے اس نے ان اشعار کا سہارا لیا ہے ؎

زندگی کٹتی ہے جن کی رات دن فٹ پاتھ پر
حادثہ ایسا ہو کہ ان کو بھی گھر آنگن ملے

اپنے آنگن کے مہکتے ہوئے پھولوں کیلئے
لان کے اپنے ہرے گھاس بچائے رکھنا
چاٹ جائے نہ کہیں وقت کا دیمک ان کو
اپنے اجداد کا اتہاس بچائے رکھنا

تم بھی زخموں کو مندمل کر لو!
ہم بھی اب دل کے داغ دھولیں گے

اپنی تمناؤں کے اظہار کے بعد شاعر کو وہ دکھ گھیر لیتے ہیں جو اسے زمانے سے ملے ہیں۔ ان کا برملا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا ؎

کبھی پوجا گیا ہوں بت بنا کر
کبھی [illegible] گیا ہوں

میں ایک تشنہ لب فرات زندگی پہ
اک اک قطرے کو ترسایا گیا ہوں

بہتا رہا زمیں پہ انساں کا لہو
چپ چاپ آسماں یہ تماشا دیکھتا رہا

زخم پھولوں کے بھرنے آیا تھا
پی کے رس اڑ گیا مگس کی طرح

چھین لیں گے مرے بدن کا لباس
لوگ یوں اجرت رفو لیں گے

عزت بچا لی بیوی کی ساڑی خرید لی
قیمت میں بخش دی اسے پگڑی اتار کر

سراپا غم مجسم بے بسی ہوں
میں اپنے عہد کی بیچارگی ہوں

مجھے سن لو میں نغمہ ناشنیدہ
مجھے پڑھ لو کہانی ان کہی ہوں

اس کے علاوہ بھی تیشے کا سفر بہت سے خوبصورت اشعار سے بھرا ہے ؎

رنگین ساڑیاں، نہ دوپٹے نہ سوٹ تھا
پیکٹ کھلا تو فوج کی وردی تھی بوٹ تھا

مری آنکھوں میں اک محبوب کا غم ہی نہیں پلتا
مرے سینے میں اک مرحوم ملک کا سانحہ [illegible]

ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد

"تیشے کا سفر" ایک تجزیہ

دلی جذبات وکیفیات کے اظہار کے لئے فن موسیقی کی شہرت عام ہے ۔ لیکن فن شاعری بھی تمام فنون لطیفہ میں جذبات واحساسات کے اظہار کا ایک خوبصورت فن تسلیم کیا گیا ہے ۔ عظیم مفکر میکولے نے تو واضح انداز میں کہہ دیا ۔ شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں شاعر الفاظ کے استعمال اور پرواز تخیل سے وہی کام لیتا ہے جو کام مصور رنگ سے لیتا ہے ۔ گویا شاعری فنکار کے جذبات واحساسات کا لفظی پیکر ہے جو فن کے پردے میں زندگی کی تمام تر توانائی متحرک اقدار وکیفیات کی ترجمانی کرتی ہے بقول عبارت بریلوی :

> "شاعری جذبات کی دلاویز موسیقی ہے احساسات کی حسین مصوری ہے تخیل کا رقص دلفریب ہے ۔ وہ جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی ۔ اس کا اثر دل ودماغ دونوں پر ہوتا ہے وہ حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہے ۔ اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے ۔ وہ جذب وشوق کی ایک لغزش مستانہ ہے ۔ عقل وشعور کا ایک حسین ارتعاش ہے ۔ حسن وجمال کی ایک دل موہ لینے والی اور لطیف تھرتھراہٹ ہے ۔" (جدید تر شاعری ص ۹)

فن شاعری میں غزل فی زمانہ مقبول عام صنف رہی ہے ۔ اس کی غنائیت لوچ اور نکھار کے سبب غزل اپنے آپ میں شاعری کی آبرو ثابت کر چکی ہے ۔ غزل کے علاوہ اگر اردو شاعری میں اگر کسی صنف نے مقبولیت کی حدوں کو عبور کیا وہ ہے صنف نظم ۔ نظم میں فنکار کے گوناگوں تجربات ومشاہدات اور ہمہ گیر جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر پہلو کو سلیقہ مندانہ اور دردمندانہ انداز میں اس فنکارانہ جلال وجمال کے ساتھ منعکس کیا گیا کہ انتہائی کم مدت میں نظم نگاری بھی اردو شاعری کی شگفتہ وشاداب صنف تسلیم کی گئی ہے ۔ ان دونوں عظیم صنفوں کو اگر اردو شاعری کے دائرے سے خارج کر دیا جائے تو اردو شاعری کی حیثیت اندھے کے اس کشکول کی سی ہو جاتی ہے جس میں محض چند کھوٹے سکے ہوں ۔ ان ہی دونوں عظیم صنفوں کے امتزاج نے ایوان شاعری کو منور کیا ہے ۔ آسمان شاعری کے یہ دونوں زریں

ستارے رضا اشک بستی پوری کے مجموعۂ کلام "تیشے کا سفر" میں بھی جگمگا رہے ہیں۔

تیشے کا سفر رضا اشک کی ۳۰ نظموں اور ۲۰ غزلوں کا ایک ایسا حسین، دلکش اور جاذب نظر مجموعہ ہے کہ اسے اردو شاعری کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ تصور کرنے میں کوئی قباحت نہیں مجموعے کا سرسری مطالعہ ہی اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ دونوں ہی صنفوں پر رضا اشک کی گرفت سخت ہے۔ مجموعے کی ابتدا نظم سے ہوتی ہے۔ تیشے کا سفر، دو آوازیں، رات پر کریں یلغار، ایک ٹانگ کٹی عورت، قتل بہاراں، حمہ میاں کی گھوڑی، باغی، بہا بار دو اکادمی، نوجوان فنکارو، بازار عورت، بنک منیجر، بچہ اور چاند، لگان اور کھلیان، الیکشن، بولٹ اور بلیٹ، ایک پہیلی، دعا وادی کشمیر کو سلام، اے نوجوان، پندرہ اگست، جشن غالب، عید، دیوالی، بن باس، نروان کی تلاش، تربت قمر پر، شاعر اعظم، ریڈیو، تم، فیصلہ، الم، عورت، گریز، رسوائیاں، زندگی کے موڑ پر، زلیو واسں کی واپسی، وہ لڑکی وغیرہ نظموں کا مطالعہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ رضا اشک نے ان نظموں کے ذریعہ سماج کے فاسد مادوں کی نشتر زنی کی ہے۔ معاشرتی برائیوں، سماجی ناانصافیوں، باہمی نفرتوں، اور کدورتوں پر یہ نظمیں ایک تازیانے کا حکم رکھتی ہیں ؎

ستم گئی گردشیں مشینوں کی ہاتھ کچھ لاکھ ہو گئے بیکار
بستیاں جلتی ہیں ہریجن کی اور چپ چاپ ہے مری سرکار
دوستو تم کو جشن ہولی میں ہو مبارک یہ خون کا تہوار

(رات پر کریں یلغار)

کس عہد کے بارے میں یہ تم سوچ رہے ہو آیا ہے کبھی اور نہ آئے گا زمانہ
دنیا نے تمہیں آج بھی مصلوب کیا ہے کل بھی تمہیں سولی پہ چڑھائیگا زمانہ

(دو آوازیں)

ایک ڈولی کہیں سے منگائی گئی ایک دولہن کی ارتھی سجائی گئی
ایک مسکن کسی کا اجاڑا گیا ایک مرقد میں لبتی لبائی گئی

(رسوائیاں)

تیشے کا سفر پہ اظہار خیال فرماتے ہوئے جناب مظہر امام رقمطراز ہیں:۔

رضا اشک کی شاعری دور حال کے کرب و انتشار کی آئینہ داری کرتی ہے۔ مگر ایک بہتر مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہے ان کا کلام انقطاع حیات کی دھواں دھواں فضا میں اسیر نہیں۔ بلکہ اس سے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے جد وجہد کا حوصلہ ملتا ہے۔ عہد شناسی اور حالات فہمی نے رضا اشک کو دردمندانہ احساس عطا کیا ہے جو انسانیت کے مجروح دل کی ذمہ دارانہ ترجمانی کرنے پر قادر ہے۔ یہی دردمندانہ احساس

ان کی شاعری کو توانائی اور صلابت بخشتا ہے۔ آنند کے یہاں فروغ طبع خداداد ہے۔ کسب فن کے لئے ریاضت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ احساس نے ان کی شاعری ہماری توقعات کو مہمیز دیتی ہے ۔

(پندار ادبی اڈیشن ۲۶ اگست ۱۹۸۱ء)

مظہر امام کے خیالات حقائق پر مبنی ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رضا اشک کی نظموں میں عصر حاضر کے کرب و انتشار کو اس درد مندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ نظمیں صحیح معنوں میں سحر حلال بن گئی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے ماحول و معاشرے سے بے نیاز فنکار کی فنی صلاحیتیں منفی اقدار حیات کے تنگ دائرے میں محدود رہتی ہیں۔ لیکن وہی فنکار جب ماحول اور معاشرے سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے، زمانے کے نشیب و فراز سے واقف اور ماحول سے متاثر قبول کرتا ہے تو اس کی خوابیدہ صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہو کر قلم سے سیف و سناں اور الفاظ سے برق و شمشیر کا کام لے کر زندگی کی مثبت قدروں کی بنیاد پر فن کی عالی شان عمارت تعمیر کرتا ہے۔ تیشے کا سفر کی نظمیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ رضا اشک بھی انہیں فنکاروں میں ایک ہیں جنھوں نے ماحول و معاشرے سے صرف اپنا رشتہ ہی استوار نہیں کیا ہے بلکہ سرمایہ داری کی لائی ہوئی نحوست، موجودہ معاشرے کی گھٹن، کرب و انتشار، نیوکلیر جنگ کی بھیانک تباہی کی خطرات کی آگاہی، انسانی ذہن و روح کی بیقراری، مشینی عہد کی چیخ کے ساتھ ساتھ ناپاک منصوبوں اور سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لئے قلم سے تیشے کا کام لے کر شاعری کے سفر کا اہتمام کیا ہے۔ یہ رضا اشک کا کمال فن ہے کہ ان خامیوں کے باوجود حسن و عشق کے رومان کی چاشنی اور جمالیاتی حسن سے یہ نظمیں عاری نہیں ہیں۔ بقول اویس احمد دوراں :-

" تیشے کا سفر" ایک ایسے بھولے بھالے البیلے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس کی رگوں میں جمالیاتی حسن رچا بسا ہے۔ شاعر کے کلام میں رنگینی ہے حسن و عشق و رومان کی چاشنی و دلکشی جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ شاعر کے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جو بے حد خوبصورت اور سوز و گداز سے معمور ہے۔ شاعر اپنے دل اور اپنی محبوبہ کی طرح دنیا کو بھی حسین دیکھنے کا آرزومند ہے اس کا طبقاتی تصور اس کے دل میں اتر کر یہ کہتا ہے کہ ہماری خوبصورت دنیا سب کے لئے خوبصورت اس لئے نہیں ہے کہ یہ طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جب تک طبقاتی سماج باقی ہے دنیا مٹھی بھر خون چوسنے والوں کے لئے کشمیر گل اور تمام لوگ خون پسینہ ایک کر کے بھی بھوکے سو جاتے ہیں۔ ان کے لئے صحراؤں میں اُگنے والے ببول کے کانٹے بنی رہے گی۔ جن پر چل چل کر کروڑوں تلوے لہولہان ہیں۔ سیاسی طور پر دو طبقوں میں بٹا ہوا سماج اور دولت کی غلط تقسیم نہ صرف بھوک، بیماری، افلاس کی ناآسودگی اور زخم خوردگی، معاشرہ کی گھٹن، جہالت وغیرہ کو جنم دیتا ہے بلکہ جبر و ظلم و ستم، سماجی ناانصافی، نیوکلیر ہتھیاروں کا بھنڈار اور ستاروں میں پہنچ کر لڑی جانے والی جنگ کے منحوس و ناپاک منصوبوں اور سازشوں کو بھی

جنم دیتا ہے۔ تیشے کا سفر کے شاعر نے اپنے مخصوص رومانی لب و لہجے میں جنگ کی تباہیوں
اور انسان کی ہلاکت آفرینی کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔

اویس احمد دوراں نے حقائق کو واضح الفاظ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ "تیشے کا سفر" کی نظمیں اس حقیقت پر مہر ثبت کرتی ہیں کہ رومانی لب و لہجے میں رضا اشک نے عالم انسانی کی حمایت میں آوازیں بلند کی ہیں اور معاشرے کے کرب کا اظہار کیا ہے۔ ان نظموں کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ یہ نظمیں مختلف ہیتوں میں لکھی گئی ہیں۔ چند نظمیں متبادل قوافی کے مصرعوں پر مشتمل مخصوص ہیئت مربع میں لکھی گئی ہیں۔ جس کا پہلا تجربہ انگریزی سے متاثر ہو کر اردو میں سب سے پہلے برجموہن دتاتریہ کیفی نے کیا تھا..... بقول کیفی :-

"ملکہ وکٹوریہ کی سنہری جوبلی کے موقع پر جو ۱۸۸۷ء میں ہوئی تھی ایک نظم انگریزی اسٹنزاز کے طرز پر لکھی تھی جس کے ہر بند کے صرف چار مصرعے تھے اس طرح کہ پہلا، تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ تھے۔ اسی سال ایک نظم اور بھی لکھی جس میں صرف دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ تھے اس وقت یہ چیزیں انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ آج کل یہ دوسری شکل بہت چلتی ہے "

(کیفیہ، ۲۹۷)

رضا اشک نے مجموعہ "تیشے کا سفر" میں انگریزی اسٹنزاز کے اسی دوسرے قسم کو نہایت ہی خوبصورتی سے اپنایا ہے

لستاطاولوں کی فانوس جھلملاتی ہے	مرے ندیم حسیں مرمریں محلوں میں
میں سوچتا ہوں مرے گھر میں کیوں اندھیرا ہے	کمی سی کیوں ہے ترے قہقہوں کی پائلوں میں

(نظم دلیالی)

تم نے جس راہ کو مدت سے بدل ڈالا ہے	پھر سے وہ راہ دکھلانے کو چلی آئی ہو
اپنے نینوں کے سلگتے ہوئے دیپک لیکر	پیار کے جوت جگانے کو چلی آئی ہو

(نظم گریز)

ان نظموں کے علاوہ تیشے کا سفر میں نظم معریٰ بھی شریک اشاعت ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ قارئین کے ذہن و دل پہ ثابت کرتا ہے کہ شاعر کو فلسفہ حیات کی مثبت قدروں کی بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے کی اتنی لگن تھی کہ وہ تمام دشواریوں، بندشوں اور رکاوٹوں کو توڑتا ہوا منزل کی جانب گامزن ہے گرچہ نظموں سے قافیہ و ردیف کی بندشوں کو توڑنے کا سہرا اردو میں خواجہ الطاف حسین حالی کے سر ہے جو پہلے غیر مقفی نظم کہلائی اور پھر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس کا نام معریٰ رکھا۔ بقول عبدالحلیم شرر :-

"سو دست ہم نظم کی ایک قسم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو انگریزی میں بکثرت موجود ہے مگر اردو میں بالکل نئی اور عجیب چیز نظر آئے گی۔ مشرقی شاعری میں ردیف و قافیہ بہت ضروری

اور لازمی خیال کئے گئے ہیں۔ مگر انگریزی ادب میں ایک جداگانہ وضع کی نظم ایجاد کی گئی ہے۔ جسے بلینک ورس کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا نام اگر غیر مقفیٰ نظم رکھا جائے تو شاید مناسب ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ قافیہ وغیرہ کی قید میں کلام کو محدود اور طبع آزمائی کے میدان کو نہایت ہی تنگ کر دیتی ہیں اگر کوئی ڈرامہ یا مختلف لوگوں کی گفتگو نظم میں ادا کرنی ہو تو مجبوراً جدا جانا پڑتا ہے کہ ہر فقرہ یا ہر خیال جس طرح بنے ہر مصرعہ یا ہر شعر میں ضم کر دیا جائے ظاہر ہے کہ ان قیود کے ساتھ کلام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ قافیہ ہر سلسلہ کو قطع کر دیا کرتا ہے۔ اس مجبوری سے انگریزی میں خالصتاً ڈرامے کے لئے یہ نظم غیر مقفیٰ ایجاد کی گئی ہو۔ جو یہ شان دکھاتی ہے کہ ایک طرف کلام برابر موزوں ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف سلسلہ کلام یوں جاری رہتا ہے کہ اگر مصرعہ مصرعہ جدا کر کے نہ لکھیں تو معلوم ہو کہ گویا بے تکلفی سے نثر میں گفتگو ہو رہی ہے۔ صرف یہی چیز ہے جس نے شیکسپیر اور دیگر شعرائے یورپ کو شہرت کے دربار میں سب سے معزز جگہ دی ہے " (ماہنامہ دلگداز جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۹)

اردو میں بالکل نئی اور عجیب چیز کو عبدالحلیم شرر کے بعد اور رضا اشک سے پہلے بے شمار فنکاروں نے اپنایا، لیکن رضا اشک نے اس فن کے استعمال میں اس فن کی آزادی کا خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے نظم کی دلکشی اور جاذبیت میں ہی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اردو شاعری کے ایک مخصوص سرمائے میں گراں قدر اضافہ بھی کیا ہے ؎

میرے ہمدم
تجھے کیا ہو گیا یکدم
کہ شہرِ زندگی کو چھوڑ کر
تو آج اس شہرِ خموشاں میں
منوں مٹی کے نیچے
آ کے یوں آرام سے چپ چاپ لیٹا ہے
(تربت قمر پر)

اجڑا کھنڈر
سونا منظر
بیوہ پنچھی
زخمی طائر
عریاں خنجر
خونی دھرتی کالا سورج کیلا امبر
(قبل بہاراں)

کئی سال پہلے
کسی موڑ پر
ایک عورت ملی تھی
لباس حیا میں شرافت ملی تھی
گلے مجھ سے آ کر محبت ملی تھی
وہ عورت نہیں کوئی کامنی تھی
(زندگی کے موڑ پر)

خامہ ایک تیشہ ہے
جو کہ کتنے لفظوں کا سلسلہ بناتا ہے
جانے کتنے لمحوں کا
فاصلہ ملاتا ہے
کوہکن کا افسانہ

یشودھرا تھک کے سو گئی
اور راہل بستر پہ جاگتا رہا
مگر سدھارتھ
محل سے باہر نکل چکا ہے
اس کا ہر دوسے ہلا کیا ہے

جوئے شیر لانا ہے
خامہ کا بھی تیشہ
آنے والے کل کو بھی
جبکہ عہدِ شیریں کی
داستاں سنائے گا
جانے کتنے لوگوں کو
کوہکن بنائے گا

(تیشے کا سفر)

بدن پہ گیروا لباس ڈالے
وہ سیدھا جنگل کو جا رہا تھا۔
یہ من ہی من میں وچارتا تھا
یہ دھن یہ دولت
یہ عیش و عشرت
یہ پران کایا
یہ موہ مایا
ہے سب پرایا۔

(نروان کی تلاش)

مذکورہ نظموں کا مطالعہ ذہن و دل میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ یہ نظمیں اردو نظم نگاری کو ایک نئی راہ دکھاتی ہیں نظموں میں ہندی الفاظ کے استعمال سے جو خوبصورتی پیدا کی گئی ہے وہ قابل تعریف ہی نہیں، اردو نظم نگاری میں اضافہ ہیں۔ تیشے کا سفر کی نظموں کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ رضا اشک ہندی الفاظ کے استعمال پر دسترس ہی نہیں رکھتے بلکہ ہندی تہذیب و روایات کی بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ گرچہ غزلوں میں بھی یہ حسن نمایاں ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ نظموں میں ہندی الفاظ و کرداروں کے نام کے استعمال نے اردو نظم نگاری کو ایک نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ جیسے جنم کار، سیتا، ...ری، رادھا، بھارت، بھرپاک، پنڈت، کاشی، شکتی، کٹیا، گیلا امبر، خونی دھرتی، گوتم، درگا، کالی، تلسی، ٹیگور، ...ب، راج پتھ، پران، تیاگ، نردھن، رام، لچھمن، شیو، رنگ منچ، انت، جیون، برہما، وشنو، مہیش، شنکر، ...نیام، بھیم، نارد، گاندھی، پنت، بچن، نرالا، دنکر، رتھ، پاپ، پنیہ، گت، ادگتی، کرن، ارجن، کٹھن سمے، ...، لوک لاج، سہاشن، کندن، دیوالی، نروان، ترنگی، بندے ماترم، اہنسا، پرگتی، روپ، درشن، ارپن، گنگا، ...دھیا، دسرتھ، پتر، پران کشٹ، کوشلیا، مایا، میگھناتھ، چھایا، چتا، کنش، سنگھاسن، جن من گن، پرساشن ...دھرا، لالی، ابھدھار ستھ، وچار، لو، شانتی، پربھو، جگانتر، انت، اسکو، مالز، کامنا، واسنا، اگنی، مرگ ...تنا، مرن، شریر، آتما، ترپتی، ترشنا، موکچھ، موشال، کرشن، پریم، جوت ارتھی وغیرہ ہندی الفاظ و کردار و شعرا ...ناموں کے استعمال کا حسن کارانہ مظاہرہ جس انداز میں تیشے کا سفر میں کیا گیا ہے اردو شاعری اس فنکاری سے ہندی الفاظ کے استعمال کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تیشے کا سفر کی غزلیں اس حقیقت کا غماز ہیں کہ اشک کے موضوعات زندگی ...زندگی کی محرومیاں، غم دوراں، و غم جاناں کا افسوس، تحفظ امن اور جبر و تشدد کے خلاف حق لڑائی ہے گرچہ یہ ...عات محدود غزل کے لئے نئے نہیں ہیں۔ لیکن رضا اشک کے انفرادی لہجے سے ان غزلوں کو ایک نیا آہنگ عطا کیا گیا ...گرچہ بعض خیال کے مطابق نظموں سے عمدہ غزلیں اور بعض کے مطابق غزلوں سے عمدہ نظمیں تسلیم کی گئی ہیں۔ لیکن ...میرے خیال میں تیشے کا سفر کی غزلیں اور نظمیں دونوں ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ کائنات کے غم کو اپنے سینہ پر سہہ کر

اشک نے اپنی غزلوں کو بھی آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین سنگم بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی بہت ہی فنکاری سے غزل کے پیکر میں ڈھالا ہے ؎

کبھی پوجا گیا ہوں بت بنا کر — کبھی مسجد سا میں ڈھایا گیا ہوں
مسیحا ہوں صلیب تیرگی پر — جہاں سورج سا لٹکایا گیا ہوں
میں تشنہ لب فرات زندگی پر — اک ایک قطرے کو ترسایا گیا ہوں

عصر حاضر کی تباہیوں اور بربادیوں کے منتشر ماحول کا ایک جامع منظر اس شعر میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

رقص فرما ہے تباہی کے دہانے کے قریب — مرض مہلک میں گرفتار ہوئی ہے دنیا

انسانیت سوز اعمال و افعال کی عکاسی ذیل کے شعر میں کس قدر خوبصورتی سے ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

چھین لیں گے میرے بدن سے لباس — لوگ لیلا اجرت رفو لیں گے

تلخ حقائق کی وضاحت کا بے باکانہ انداز ملاحظہ فرمائیں ؎

جس کی بازو میں طاقت ہے — اس کا سنگھاسن ہوتا ہے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو غزل فی زمانہ مقبول رہی ہے ہزار ہا اختلافات کے باوجود اس صنف کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عرصہ دراز تک اردو غزل ایرانی شاعری کی کورانہ تقلید کرتی رہی۔ تقسیم ہند اور آزادی کے بعد اردو شاعری کے لب و لہجہ اور طرز فکر میں ایک انقلاب آیا جسے دانشوروں نے ترقی پسندی کا عنوان دیا۔ لب و لہجہ اور طرز فکر میں جو تبدیلی ترقی پسند شعرا نے لائی اسے پایۂ تکمیل پر رضا اشک نے پہنچایا ہے رضا اشک کی غزلوں کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ ہندوستان کے ہی کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کر رہے ہیں جس طرح نظم نگاری میں نظیر اکبر آبادی اپنے لہجے اور موضوعات کی بنا پر ہندوستانی شاعری کا احساس بیدار کرتے ہیں۔ اسی طرح رضا اشک کی غزلوں کا مطالعہ بھی انہیں ہندوستانی شاعر تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے مختلف غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ ظلم کے سو چہرے ہوتے ہیں — کنش کبھی راون ہوتا ہے
؎ اب بھی ہر شام کو برگد کی جٹا کھلتی ہے — کوئی گوتم ہی نہیں امن کی سوغات لئے
؎ جشن آزادی کی جے ہو خیر کی سوراج کی — رام کی دھرتی میں مجھکو ہر طرف راون ملے
؎ جو دوسروں کے غم کو غم اپنا جانتا ہے — میں سوچتا ہوں اس میں کتنی مہانتا ہے
؎ ندی کے پار وہ جلتی ہوئی چتائیں ہیں — یہاں تری مری بچپن کی آتمائیں ہیں

تیشے کا سفر کی غزلوں میں نزاکت احساس کے ساتھ ساتھ دردمندی بھی ہے ازلی انسانیت اور بنیادی انسانی شرافت کے تحفظ کی جدوجہد نمایاں ہے، جنگ جو انسانی اقدار کی تباہ کاری دہشت و بربریت کا سبب ہی ہے

بلکہ انسانیت کی پیشانی کا بد نما داغ ہے ۔ اس کے خلاف امن وشانتی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انسانی تحفظ کے نا ۔ تیغے نے بھی اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہیں ؎

امن و عالم کی طلب گار ہوئی ہے دنیا
دیکھئے برسر پیکار ہوئی ہے دنیا

سیم و زر کے لئے انسان بھی بک جاتے ہیں
کیا کوئی مصر کا بازار ہوئی ہے دنیا

بہتا رہا زمیں پہ انسان کا لہو
چپ چاپ آسمان پہ خدا دیکھتا رہا

آخر کو اشک کون سے شعر جنگ میں
دم توڑتی سسکتی ہوئی امن کی صدا

نہ صرف یہی نہیں کہ اشک انسانیت کی چیخ اور جنگ کی ہولناک فضا کو پیش کر کے فریاد و فغاں کرتے ہیں ۔ بلکہ رضا نکمے نے امن و آشتی کا پیغام بھی ہنرمندی سے اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہے ۔ یک جہتی ، خلوص محبت اور امن و ن کا خوبصورت پیغام اس خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قارئین پر جوش عمل کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے

مجھکو دینا ہے ابھی جبر مشیت کو شکست
اور انسان کی عظمت کے لئے جینا ہے

میں اشکوں سے کے یہ ریز دو بنگ ہونے
تم بھی شمع دکلاں لے کے چلو

تیغے کا سفر کا مجموعی مطالعہ ذہن و دل پر یہ منکشف کرتا ہے کہ شاعر نے نظم و غزل کے پردے میں اپنے عہد کا نوحہ پیش ہے ان کے کلام سے ان کی سیاسی ، معاشی اور ذہنی رجحان کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ جوش عمل ، یک جہتی جذبہ حب الوطنی بلند کرداری اور صالح فکر و نظر کی تبلیغ نمایاں ہے ۔ تیغے کا سفر میں صرف تیغے کے سفر کی صعوبتیں نہیں ہیں بلکہ اس سفر میں ابھرنے والی درد آوازیں بھی ہیں ۔ زخمی پھولوں کی کراہیں بھی ہیں ۔ بیمار چاند کی نقاہت ہے روح کی کشتی کے غرق ہونے کا منظر بھی ہے ۔ ہریجنوں کی بستیوں سے اٹھنے والے شعلے بھی ہیں ۔ خونی کا تہوار بھی ہے ۔ فنکاروں کی آہ و بکا بھی ہے ۔ مترنم سے ٹپکتی ہوئی گردنیں بھی ہیں ۔ اور مہاجن کے ظلم و ستم بھی ۔ یتا کی سچائی ہے مریم کی پاکیزگی بھی ۔ پنجاب کی سرحد کی معرکہ آرائی بھی ہے ، اور انسانی سروں پر مذہب کے جنون کا ر بھی ۔ ڈھتی ہوئی مسجدیں بھی ہیں اور گرتی ہوئی مندریں بھی ، پھٹے ہوئے آنچل بھی ہیں اور کٹی ہوئی چھاتیاں بھی ۔ ہجرت کا ہنگامہ بھی ہے ، دکھ اور درد کی اذیت بھی ہے ۔ جبرئیل کی عظمت بھی ہے ، تانگ کھنچی عورت کی دکھ بھی ہے ۔ رسوائی اور ذلت بھی ہے ابلیس کی شیطنیت بھی ہے ۔ حشر کا منظر بھی ہے لاشوں کا انبار بھی ہے ، یتہ لوٹا لوٹا خوں میں لت پت بھی ہے اجڑا کھنڈر بھی ہے ۔ عریاں خنجر بھی ہے ، خوف و وحشت بھی ہے ۔ ٹینک بھی ، توپ کی حرکت بھی ہے ، جنگ کی لعنت بھی ہے ۔ قحط کا سایہ بھی ہے بھوک کی آندھی بھی ہے ۔ بے کاری بدعملی کی بیماری بھی ہے دھمکی دھمکی امن کا پرچم بھی ہے ۔ لیلیٰ ، شیریں ، عذرا ، زلیخا بھی ہیں درگا اور کالی بھی ہیں ۔ لی تجارت بھی ہے نوجوان فنکاروں سے خطاب بھی ہے ۔ غالب ، میر ، ٹیگور اور تلسی کی عظمت بھی ہے ، زندگی کی

داستان بھی ہے۔ بغاوت کا الزام بھی ہے۔ بے کس و نادار عورت کے فروخت ہونے کا منظر بھی ہے، ملک و
ہر کارنامہ انجام دینے والے سینکڑوں فنکاروں کا ذکر بھی ہے۔ چاند کو مٹھی میں چھپانے کا معصوم احساس بھی ہے
کہکشاں کے پالنے میں جھولنے کی دعائیں بھی ہیں۔ کھلیان اور کھلیان کے کسان کے واقعات بھی ہیں۔ الیکشن کا ذ
ہے۔ باپ اور بیٹے کی جنگ بھی ہے بیلٹ اور بلیٹ کی زور آزمائی بھی ہے۔ بچوں کے لئے ایک پہیلی بھی ہے
خوبصورت دعائیں بھی ہیں۔ وادی کشمیر کو سلام عقیدت بھی ہے پاسبان ملک و ملت سے خطاب بھی ہے۔ ۱۵ اگست
کی دھوم بھی ہے جشن غالب کی چہل پہل بھی ہے۔ عید بھی ہے دیوالی بھی ہے۔ پنچ وٹی بھی ہے اس میں رام کی کٹیا ہے
ہے اپنی پہچان کی تلاش بھی ہے۔ تربت قمر پہ سوال و تنگ دستی بھی ہے شاعر اعظم کی خوش فہمی بھی ہے ریڈیو کی موت
بھی ہے، محبوبہ سے شراب وصل پلانے کی التجا بھی ہے، ساتھ آنے کی دعوت بھی ہے عورت کی عظمت کا احساس بھی
زندگی کے مختلف تصاویر کا البم بھی ہے ظلمت راہ کو قندیل نظر آنے والی نگاہیں بھی ہیں۔ جشن شادی کی شہنائی بھی
دلہن کی ڈولی سے ارتھی تک کے سفر کی رسوائیاں بھی ہیں۔ زندگی کے موڑ پہ محبت کی ملاقات کا منظر بھی ہے، مرحوم ما
کا پیار بھی ہے بھی کیاریوں کے اجڑنے کے غم کا اظہار بھی ہے۔ تباہی کے دہانے پہ کھڑی اس دنیا کا احساس بھی ہے
چاندنی کا نکھار بھی ہے۔ پرکیف بہار بھی ہے۔ بیاض ہستی پر آنسوؤں سے لکھا انتساب بھی ہے گہن زدہ ماہتاب بھی
قدیم دنیا کا خواب بھی ہے۔ صدائے چنگ و رباب بھی ہے۔ زندگی کی الجھن بھی ہے۔ درد کا موسم بھی ہے۔ ز
پر بہتا ہوا انسانی لہو بھی ہے۔ راہ طلب کی دشواریاں بھی ہیں۔ شہری زندگی کی مصروفیت بھی ہے۔ غالب کے مصرعے
ہیں، ذوق کا دیوان بھی ہے۔ پیٹ کی دھن بھی ہے فکر جنون بھی ہے۔ پیار کا جنازہ بھی ہے، دختر انگور بھی ہے
میلی کچیلی حد بھی ہے۔ دبستان ہستی پور بھی ہے۔ چاک چاک دامن بھی ہے، داغ داغ سینہ بھی ہے۔ درد
سفینہ بھی ہے۔ مٹیالی میلی چاندی بھی ہے۔ صحرائے غم کی دھول بھی ہے۔ سر خوشی کے پھول بھی ہیں۔ ریت پر تڑپتی
مچھلیاں بھی ہیں۔ نیند سے بیدار آنکھیں بھی ہیں۔ مرکز جسے کار زار بھی ہے۔ گل کی مہکتی شاخ بھی ہے، غم کی سیاہ
ہے۔ جلتی ہوئی چتائیں بھی ہیں۔ تڑپتی ہوئی آتمائیں بھی ہیں۔ نظموں میں ربط و تسلسل اور ارتقائی کیفیت بھی ہیں
مسلسل و مربوط غزلوں کے کامیاب اور دلچسپ تجربے بھی ہیں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ نیا آہنگ بھی ہے۔
آفاق کی تلاش میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج بھی ہے نئے عہد کے نئے حالات کا احساس بھی ہے ندرت و جدت
طبع بھی ہے۔

مجموعی طور پر رضا اشک بستی پوری نے تیشے کا سفر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ خون جگر کو صرف کر
کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے بلکہ ہنر سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ تیشے کا سفر میں جا بجا جواہرات کی چمک دکھائی دیتی
نظموں میں حسن کارانہ ربط و نظم کا اہتمام ہے تو غزل کے آرٹ کے پیش کش میں بھی فنکارانہ سرمدی کا مظاہرہ ہے
رضا اشک نے مشاہدات و محسوسات کے صنم تراش کر ان سے غزلوں اور نظموں کا پیکر بخشا ہے، نظموں میں جا

احساس کی گرم آنچ ہے تو غزلوں میں عہدِ حاضر کے فنی و فکری نفسیاتی و جذباتی تقاضوں کا بھرپور لحاظ موجود ہے ہر طبقہ شاعر نے آپ بیتی کو جگ بیتی کا نمونہ بنا کر اپنی فنکاری کا لوہا منوایا ہے۔

رضا اشک بھی اس فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات و احساسات کو نظموں اور غزلوں کا پیکر بخش کر عالمگیر احساس بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کے فکر میں پختگی، عظمت، صلابت، تنوع، صحت، ہمہ گیری اور بلند پروازی کا ہے تو فن میں خلوص، ایمانداری، صداقت، توازن اور اعتدال کے ساتھ ساتھ روایات کا احترام بھی ہے۔ اور جدیدیت کو خوش آمدید بھی۔ فکر و فن کے اس حسین امتزاج کا گلدستہ "تپتے کا سفر" اردو شاعری کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اگر اردو دنیا فکر و فن کے اس خوبصورت تحفے کا خاطر خواہ استقبال نہیں کرتی ہے تو اشک کے دل کی یہ آواز ایک فنکار کا مذاق اڑائے گی کہ

کس عہد کے بارے میں یہ تم سوچ رہے ہو — آیا ہے کبھی اور وہ نہ آئے گا زمانہ
دنیا نے تمہیں آج بھی مصلوب کیا ہے — کل بھی تمہیں سولی پہ چڑھائے گا زمانہ

لیکن اس حسین گلدستے کا خاطر خواہ استقبال کیا گیا۔ اور یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آگئی ہے

سید اختر حسین نقاش

رضا اشک

"تیشے کا سفر" کی روشنی میں

مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ تبصرہ لکھوں
مرے خدا مجھے منظور کہ کر کیا لکھوں
(سید اختر حسین نقاش)

رضا اشک سے نہ تو مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہے نہ ہی میں ان کی ذاتی زندگی کے معاملات سے واقف ہوں۔ ان کی تخلیق "تیشے کا سفر" کے مطالعے سے ان کے بارے میں جو رائے میں نے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ رضا اشک ایک شریف النفس، نیک باطن، دردمند اور انصاف پسند انسان ہے۔ مذہب، معاشرہ، سیاست اور اقتصادیات کے عمیق مطالعے کا ثبوت اس کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس کے شعری مجموعۂ کلام کو نظم اور دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک نظموں کا تعلق ہے وہ محض مجاز اور خاص کر سانحے سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے لیکن اس کے یہاں ان کی تقلید کے بجائے تنوع اور ندرت خیال کی خوبی نمایاں نظر آتی ہے۔ تکرار کی ہم آہنگی اور تسلسل اس کی نظم گوئی کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔ جو نظمیں کہ اس نے مروجہ بحروں میں کہی ہیں ان میں کمزور پن نسبتاً کم ہے اور وہ اچھی نظمیں ہیں۔ عمدہ اور کامیاب نظموں میں ان نظموں کا انتخاب بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ "بہار اور وادی کا دکھ"، "بازار عورت"، "وادیٔ کشمیر کو سلام"، "عید"، "دیوالی"، "شاعر اعظم"، "فیصلہ"، "البم"، "کہ رسوائیاں" وغیرہ وغیرہ۔

رضا کا مطالعۂ حیات گہرا ہے۔ وہ فرد اور انبوہ، انبوہ اور مشینی نظام کے آپسی تصادم اور اس تصادم کی کوکھ سے جنم لینے والے سنگین مسائل کو اپنی شاعری کی اساس بناتا ہے۔ وہ مادی مشکلات اور نفسیاتی کشاکش سے نظر نہیں چراتا بلکہ ان کو موضوع سخن بنا کر اپنے اشعار کو حقیقت کے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری آج کے دور کی آئینہ دار بھی ہے اور زندگی کی ترجمان بھی۔ اشک کی سچائی نے اس کی نظموں اور شعروں پر دھار رکھ دی ہے کہ وہ کسی تیز نشتر کی طرح جھٹ دل کی گہرائیوں میں گھر کر جاتے ہیں۔

اشک کی بینائی ایک عام انسان کی بینائی سے زیادہ تیز ہے اور وہ اتفاق دیکھ کر خود اس مصرعہ سے بھانپ لیتا ہے۔ اس کی نظر خوش لباس کو چیر کر روح کے رستے ہوئے ناسوروں کا محاسبہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا لہجہ کہیں کہیں بہت تلخ ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اشک دکھی انسانیت کا شاعر ہے وہ بنی نوع انسان کی خوشحالی اور طمانیت کے خواب دیکھتا ہے۔ امن، محبت اور مساوات کی اعلیٰ انسانی اقدار کو پھلتے اور پھولتے دیکھنا چاہتا ہے لیکن مادّہ پرستی کے اس دور میں اسے اپنے خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی نظر آتی ہے۔ جھوٹ، بے ایمانی، ریاکاری، خود غرضی، اقربا پروری، اور رشوت خوری جو آج کل عام اسنے بہار اردوا کا دی، میں نے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے اشک کی یہ نظم بھی خواہان اردو کے گال پر ایک کرارا طمانچہ ہے۔

اشک ظلم، جبر و ستم، غلامی، غربت، سرمایہ داری اور استحصال کے چلن سے سخت نفرت ہے یہ استحصال خواہ مل مالک مزدور کا کرے یا کوئی زردار کسی بے کس عورت کا، روح تڑپ اٹھتی ہے شاعر کی۔ اشک کی نظمیں جبہ میاں کی گھوڑی، بازار عورت، رسوائیاں، زندگی کے موڑ پر اور وہ لڑکی، ساحر کی نظموں کی طرح عورت کے استحصال کے خلاف نعرۂ بغاوت کا درجہ رکھتی ہیں۔

ساحر کی خوبی تو یہ ہے کہ اس کے یہاں الفاظ میں لوچ اور تراکیب میں لچک ملتی ہے۔ لیکن ساحر اور اشک میں جو بات مجھے مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ساحر کی طرح اشک بھی جو کچھ کہتے ہیں وہ پھولوں میں لپیٹ کر نہیں کہتے ہیں اور لفظوں پر دھار رکھ کر کہتے ہیں ان کی نظموں میں بھی ساحر جیسی کاٹ ملتی ہے۔ ساحر کہتے ہیں ؎

بکتی ہے کہیں بازاروں میں
تلتی ہے کہیں دیناروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے،
عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو
بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو
مردوں نے اسے بازار دیا

اشک کہتے ہیں ؎

یہ بے بس و بے کس و نادار عورت
یہ مجبور و محکوم و لاچار عورت
یہ مردوں کی اک ناز بردار عورت

یہ عصمت کی منڈی یہ بازار عورت
کہاں ہو کہاں ہو خریدار عورت

اب یہ اور بات ہے کہ اشک نے یہ نظم ساحر کی یہ نظم پڑھنے کے بعد کہی ہے ؎

یہ سجو کی نگاہیں حسینوں کی جانب !
یہ بڑھتے ہوئے ہات سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثناخوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں !

عورت کے استعمال کے علاوہ بھی جہاں، جس شکل میں بھی کوئی کسی کا استعمال کرتا ہے اشک اس ظلم کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔ الیکشن، لگان اور کھلیان، لوٹ اور بلیٹ، عید، دیوالی اور دیگر نظموں میں یہ رجحان ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دو نظمیں ایسی بھی ہیں جن کے وسیلے سے انہوں نے اپنی علمیت اور انگریزی ادب سے واقفیت کی کھل کر نمائش کی ہے۔ خاص طور پر "رنگ پنج" میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اشک کی شاعرانہ حیثیت نظم گوئی کی وجہ سے ہے یا غزل گوئی کی وجہ سے۔ اصلیت کچھ بھی ہو لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اشک نے نظم کے علاوہ چمنستانِ غزل میں بھی خوب گل بوٹے کھلائے ہیں اور اس کی آبیاری میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے غزل میں جو روح پھونکی ہے اسے کسی طور پر فراموش نہیں کیا جا سکتا، لیکن غزل پر بھی ان کی نظم گوئی کہیں کہیں حاوی ہوتی نظر آتی ہے ؎

اب کے پھر جو کال پڑا تو ہر البیلی گاؤں کی گوری — پھر سے سونا گاچی جاکر تن کا کاروبار کریگی

راج محل کی اے رقاصہ کیا تجھکو معلوم نہیں تھا — تو بھی کچھ سکوں کی خاطر ناچ سر بازار کریگی

شاعری، مذہب، سیاست، بیوی، بچے، نوکری — زندگی بھر اک نہ اک الجھن میں ہم الجھے رہے

غزل پر نظمیہ انداز کا کبھی کبھی حاوی ہو جانا اس شاعر کے لئے جو نظمیں بھی کہتا ہو کوئی چونکا دینے والی بات نہیں۔ یہ کمزوری مجاز لکھنوی اور ساحر کے یہاں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اشک کی شاعری میں چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ بعض الفاظ کو وہ علامت کے طور پر پیش کر کے خاطر خواہ مفہوم پیدا کر دیتے ہیں۔ جس سے شعر میں ایک خاص ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں لفظ لکیر، حادثات، یا تماشہ جب استعمال ہوتا ہے تو مروجہ مفہوم پیچھے رہ جاتا ہے۔ کہ یہ بات نئی نہیں ہے۔ یہ خوبی اساتذہ کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ اشک نے اس کو ایک خاص سلیقے سے برتا ہے لفظ "تماشہ" کا استعمال دیکھئے ؎

پیدا نگ دلوز یہ جلوے بہات کا منظر ۔۔۔ سیاہ کار تمنّا کا اک تماشا ہے

یہاں تماشا کے ساتھ ایک مخصوص طنز حقارت اور بغاوت کے آثار کی کیفیت وابستہ ہے جو بات میں تاثیر اور ایک خاص لطف پیدا کرتی ہے۔ لفظ تماشا سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے ۔۔۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا

(غالب)

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب ۔۔۔ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

(غالب)

آنکھیں آتش کو نہ ایسے بُت رعنا دکھلا ۔۔۔ پتلیوں کا کسی ناداں کو تماشا دکھلا

(آتش)

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا ۔۔۔ کیا کلیجہ ہے تماشائی کا

کون ہوگا جو نہ محو رخ زیبا ہوگا ۔۔۔ تم اگر سیر کو نکلو گے تماشا ہوگا

(صبا)

ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ "شاعری کی پہلی آواز وہ ہے جو خطاب سے عاری ہو" اگر اس قول کو کسوٹی تسلیم کیا جائے تو ماننا ہوگا کہ اشک نے بعض بے پناہ شعر کہے ہیں۔ ان اشعار میں نہ تو خطابت ہے اور نہ ہی خود کلامی، لگتا ہے جیسے اس کی ذات کسی روزن سے اس کی داخلیت باہر ٹپک پڑی ہو ۔

میں جانتا ہوں کہ زر کی طرح وفائیں بھی ۔۔۔ امیر زادوں کی محفل کی داشتائیں ہیں

یہ کائنات جو مجھکو ملی ہے ورثے میں ۔۔۔ بنام کاتب تقدیر چھوڑ جاؤں گا

دیکھوں تو بظاہر ہوں کوئی نقطۂ مبہم ۔۔۔ سمجھوں تو میں اک مسئلہ غور طلب ہوں

چاک چاک دامن ہے داغ داغ سینہ ہے ۔۔۔ وقت کے شکنجے میں زیست کی حسینہ ہے

دیکھا کبھی جو دہر کو شاعر کی آنکھ سے ۔۔۔ خلاقِ کائنات بھی بر سولِ رہا مسلول

کیا کیا نہ حادثات ہوئے کائنات میں ۔۔۔ اور ہم سمٹ کے رہ گئے اپنی ہی ذات میں

سراپا غمِ محبت ہے جیسے ہوں   [illegible] اپنے غضب کی بجلی ہوں

اشک کے مزاج میں بغاوت ملتی ہے جو شاید زمانے سے چوٹیں کھا کر پیدا ہوئی ہے ؎

اس مکتبِ ہوس میں لے پیکرِ محبت   اب کیا کتابِ دل کے اوراق کھولتا ہے

وہ حوادث کے طوفان میں پس جانے کے بعد بھی ساحر کی طرح یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں جینے سے مرجانا بہتر ہے وہ ہر حال میں جینے کے لئے جد و جہد کرتا ہوا نظر آتا ہے ؎

ایک فرعون کے دعوائے خدائی کے خلاف   ایک موسیٰ کی قیادت کیلئے جینا ہے مجھے

بہت بلند سہی تیرگی کی دیواریں   فصیلِ شب کو اسیرِ کمند لوز کریں

تیشے کا سفر۔ کو اپنی اہلیہ کے نام منسوب کر دینے والا وفادار شوہر مجلہ ہے تو شاعر، حقیقی نہیں تو خیالی محبوبہ ضرور ہوگی جس کے حسن سے وہ اپنے اشعار کے خاکوں میں رنگ بھرتا ہوگا ؎

میں سوچ رہا ہوں ترے مرمر سے بدن کو   تشبیہ اگر دوں بھی تو کیا تاج محل سے

رات بھر جو ملے گئے ہم اس کا جسم بے لباس   جھانک کر دیکھا نہ اس کی روح کے ناسور میں

اشک ایک نیک اور سادہ انسان ہے۔ اتنے اچھے اشعار کہہ کر بھی اسے بڑا فنکار ہونے کا گھمنڈ بالکل نہیں ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں کا دشمن کی طرح جائزہ لیا کرتا ہے۔ بقول اشک ؎

دل ہے شاعر کا تو ناقد کی نظر رکھتا ہوں   اپنا ہر عیب پرکھتا ہوں ہنر کی صورت

اس معیار کی نظمیں اور غزلیں کہنے والے رضا اشک کو جو شہرت ملی ہے وہ ان کی شایانِ شان نہیں ہے۔ باعتبارِ فن وہ بہت آگے ہیں۔ لیکن باعتبارِ معروفیت انہیں بہت پیچھے جگہ ملی ہے ادب میں یہ ناانصافی عام ہے۔ اردو پر سرکار جتنا بھی پیسہ خرچ کرتی ہے وہ چند ایک شخصیتوں کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ وہی چند چہرے ٹی وی اور ریڈیو پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں ایوارڈ ملتے ہیں تو انہیں کو۔ بیرونی ممالک میں اردو کی نمائندگی کے لئے اگر انتخاب ہوتا ہے تو انہیں کا ——— افسوس تو اسی بات کا ہے کہ درمیانی حیثیت کے شاعروں اور ادیبوں کو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اخلاقی اور مالی تعاون نہیں مل پاتا۔ جبکہ اصلی حقدار یہی لوگ ہیں۔ اس کے برعکس پیسہ اور شہرت انہیں چند مخصوص اور جانے پہچانے بوڑھے گدھوں کے پیٹ میں چلی جاتی ہے۔ اس افراتفری کے عالم میں رضا اشک نے اپنے لئے ادب میں جو جگہ بنالی ہے وہ اس کے حقدار بھی ہیں اور مبارکباد کے مستحق بھی۔

———✱———

نقد و نظر

(ب)

پتھروں کی رہ گزر

پتھروں کی رہ گزر — ایک تجزیاتی مطالعہ	تاسما چودھری ستی گی
پتھروں کی رہ گزر	بشیر بدر
پتھروں کی رہ گزر — ایک تجزیاتی مطالعہ	منصور عمر
پتھروں کی رہ گزر پر	انور شمیم
پتھروں کی رہ گزر — ایک تجزیہ	نوشاد عالم آزاد
رضا اشک کے نام	صابر آروی

تارا چرن رستوگی

"پتھروں کی رہ گذر" تجزیاتی مطالعہ

بہ نظر غائر نیز بہ انتقادیاتی طور طریق دیکھنے پر یہ حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے کہ شعری حسیات، مدرکات، محرکات کو سماجیاتی پس منظر لازم و ملزوم ہے۔ سماجی پس منظر یعنی حالات گرد و پیش سے بے تعلق شاعری کسی دنت کی شاعری نہیں کہی جاسکتی۔ آج کل انتشار کا بول بالا ہے۔ ایقانات و اقدارات شکست و ریخت کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ نئے مساویات و تشکیلات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ افراتفری کا عالم ہے۔ ٹیکنالوجی ہمیں نئے آفاق، دائرہ ہائے فکر و نظر دے رہی ہے ہم زندگی کے ساتھ ہم عناں ہیں یا نہیں اس حقیقت بلکہ ضرورت کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ اچھی شاعری ہماری نفسیات، ہمارے تصورات، محرکات کو نئے آہنگ عطا کرتی ہے۔ صوتی وسائل کا ترنمی استعمال کس طور کیا جائے یہ وہ سوال ہے جس کا جواب شاعرانہ حسیات ہی دے سکتی ہیں۔ فنون لطیفہ کے ہر شاہکار میں متضادات ضرور رہنا چاہیں۔ جذباتی توانائی، تاثیر پذیری اور اخلاق مندی۔ بالفاظ دیگر پیش کردہ جذبہ حرکیت خیز ہو۔ جذباتی منطق پر پورا اترتا ہو۔ اور اس کی تخلیق جیون کی سچائیوں پیش کی جائے۔ اثرانگیزی سے بھرپور ہونے کے لئے ہیجانات در ہیجانات گزرتا ہوا جذبہ جب نقطۂ منتہیٰ پر پہونچ جاتا ہے تب ہی اس کو فنی جذبہ کہا جاسکتا ہے۔ اس جذبے میں دل کی منطق کی کارفرمائی نہیں ہوتی ہے اور اس کی تخلیق کرنے میں تعقلات سے کام نہیں لیا جائے۔ فنی جذبات میں تعمیم و تخصیص، دونوں بیک وقت ہونا چاہئے۔ وہ الفاظ جن پر فنی جذبہ کی در و بست کا اہتمام کیا جائے ان میں منسلکات ذہنی و قلبی بیدا کرنے کی صلاحیت ہونا ضروری ہے۔

اب کلام اشک سے رجوع کیا جائے۔ اردو قارئین ہندوستان کے جریدوں میں شائع ہوئے کلام سے بھی لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ اور ان کے دو مجموعہ ہائے کلام "تیشے کا سفر" اور "پتھروں کی رہ گذر" بھی پڑھنے والوں نے پڑھے ہوں گے۔ اور اشک کی ہر کاوش میں سوز و ساز زندگی کی عکاسی ملتی ہے موجودہ دور کے انتشار اور خلفشار کو اشک نے تفریحر

دیکھا ہے عالمِ گرد و پیش متعصبات ذہنی و قلبی ہیئت
کاروں کی چنگیزیت اور مندر و مسجد کے نام پر اپنا الو
سیدھا کرنے کی پرکاریاں۔ تخریب کاری، تشدد
سے پیدا ہونے والے تاثرات، معاشرہ و فرد کی نامحرمی
وغیرہ نے کلامِ اشک کو فی الواقع اشک خیز انگیز بنا دیا
ہے۔ نظمیں اور غزلیں دونوں ہیئتوں میں نفسیاتی و
سماجیاتی پس منظر کو صاف دیکھا جا سکتا ہے مجموعوں
کے نام ہی بتا رہے ہیں کہ زندگی ٹوٹتے رشتے کا سفر بھی ہے
اور تجربوں کی رہگذر بھی ہے۔ ایسی وجہ تسمیہ کو بھی
شعری انداز و اعجاز کہا جا سکتا ہے۔ پہلے غزلوں سے
منتخبہ چند اشعار پر ارتکازِ توجہ کا طالب ہوں ملحوظ
رہے انتخاب ورق گردانی سے عبارت ہے ؎

پابہ زنجیرِ ستم ہو تو غزل ہوتی ہے
دستِ فنکار قلم ہو تو غزل ہوتی ہے

رکھا ہوں رحل وقت پہ قرآن کی طرح
آہستہ کھولئے مجھے جزدان کی طرح

بنیاد ہی ہو جس کی غریبوں کی لہو پر
ہرگز میں اسے تاج محل کہہ نہیں سکتا

وہ اک سفر مرا رومان سے بغاوت تک
خیال و خواب نے پہنچا دیا حقیقت تک

اشک میں وقت کی اکائی ہوں
لمحہ صدی میں زندہ ہوں

سوادِ شہر میں تقریری ہی یہ جو جنگ ہے
ہمارے عہد کے نمرود کی علامت ہے

نہ احتجاج، نہ تحریک نہ کوئی منشور
یہ کیا ہوا ہے میرے شاعروں ادیبوں کو

ہر ایک لمحۂ ہستی بھی اکیس ریزہ لگا
ہوا کے دوش پہ ناکٹ سا مجھکو تیر لگا

کسی شدت کا فن بے مثال لکھتا ہے
وہ اپنے عہد کا زندہ سوال لکھتا ہے

نظر لگی ہے یہ کس مغلیہ حکومت کی
وہ اپنے عہد کا زندہ سوال لکھتا ہے

عجیب بات ہے دو ملک اک کہانی ہے
گذر چکا ہے زمانہ اگرچہ ہجرت کا

ہو جیسے تہذیب آج بھی آریاؤں کی
بڑا حسین ہے یہ گاؤں آدیباسی کا

تمہیں تو اشک ابھی زندگی کی حسرت ہے
یہ تم نے اپنے کو کیوں داوِ پاس لکھا ہے

جہازِ شوق پہ ہم عزم کا کو ملبس ہوں
ندی اور جھیل نہیں راستے جو بحر کی

غزل مستفیض ہوئی عہد میرا بائی سے
مری صدی میں نئے پہنچی ہے اب اکائی تک

ہزاروں سال کی تاریخ سے عبارت ہے
قلم یوں ہی نہیں پہونچا ہے روشنائی تک

سن چکا ہوں میں بہت پچھلی صدی کی داستاں
اب یہ بتلاؤ کہ تم کو یہ صدی کیسی لگی

موت جیسے کہ مصرع فانی
زندگی جس طرح جدید غزل
لڑکا دلّی کا اک قطب مینار
لڑکی اک آگرے کی تاج محل

ہمارے شہر کی کھوئے نہ داستان کوئی
کہو یہاں نہیں اب آکے فاہیان کوئی
وہ اور ہوں گے میسر ہے جن کو تاج محل
ہمیں ملا نہ کرائے کا بھی مکان کوئی

میں جانتا تھا کہ پل بھر کی اک خوشی کیلئے
تمام عمر گئے مل کے ہم کو رونا ہے

ہر صدا میری ستاروں سے گزر
دیکھئے آکاشوانی ہو گئی
یہ صدا گونجے گی ہمیشہ وقت کے مغرب میں
زندگی فانی ہے لیکن غیر فانی ہے غزل

یہ زندگی اک نغمۂ فانی ہی نہیں ہے
ہے نغمۂ خیام بھی، حافظ کی غزل بھی

مثالوں کے انبار لگائے جا سکتے ہیں اشک کا غزلیہ رنگ و لہجہ خالص ہندوستانی ہے۔ اور تشبیہات و استعارات بھی اس سرزمین سے پروان چڑھے ہیں۔ التفاتات میں معنویت و ما بعد لغات مسلکات ذہنی و قلبی، ندرت خیال و تصور، ابتکار (INNTIA-TIVE)۔ اسلوب وغیرہ سبھی اوصاف کی کہکشانی جلوہ در جلوہ موجود ہے۔ لڑکی کو آگرہ کی تاج محل موت کو مصرع فانی، فاہیان الیاد استان گو آئے صدا کو آکاشوانی، کولمبس کا عزم، زندگی کی حسرت اور دلدادہ س تقسیم وطن کے بعد بھی وہی کہانی، آریائی تہذیب کی یاد، آدی باسیوں کا گاؤں دیکھ کر غزل کو میرا بائی، رومان سے بغاوت کے سفر کو حقیقت بتلانا بالکل نئی جہت شعری تسلیم کیا جانا چاہئے۔

نظمیں بھی بڑی کامیاب اور بہت خوب ہیں وارث شاہ سے چھوٹا سا دخشن بیان، لوم جمہوریت سال نو، کشمکش، چناب کے پیڑ جل رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ میں دبستاں ہوں وغیرہ قابل تحسین نظمیں ہیں۔ شاعر کی واقعات حالیہ کی آگاہی اور ان واقعات کا پس منظر اور ان کے پیش منظر گہرے سوچ کے آئینہ دار ہیں۔ دیکھئے ایک دو مثالیں ؎

اب اپنی تربت میں حبہ خاتون سسکتی ہیں
وہ جنگ بازوں کو جنگ کرنے سے روکتی ہیں
وہ ماتمی کے لہو کو آنچل سے پونچھتی ہیں

وہ امن کی فاختہ کے پروں میں شاخ زیتون ہے
شرار شیو میں ڈھل رہے ہیں
چنار کے پیڑ جل رہے ہیں
(چنار کے پیڑ جل رہے ہیں)

تجھ سے کہتی ہوں آج وارث شاہ
کیوں ہے خاموش اپنی قبر سے بول
صفحۂ نو کتاب عشق کا کھول

....

کسی ظالم کے پاپی ہاتھوں نے
پانچ دریا میں زہر گھول دیا
اور دھرتی کو سینچنے کے لئے
ذہن زہر آب اس پہ کھول دیا
(وارث شاہ سے)

وہ ایک بھکاری جو دیکھتے ہو
کبھی اس کے بارے میں سوچتے ہو
کیا آپ اپنے سے پوچھتے ہو
کیا اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے
یا اس مرض کی دوا نہیں ہے
(ایک سوال)

غرض کہ انسانی ہمدردی سے بھرپور، ہم سوزی سے شعلہ بار موضوعات پر نظمیں اشک نے پیش کی ہیں۔ نظم نگاری اور غزل گوئی کے مابین لطیف فرق کو شاعر اشک بخوبی سمجھتا ہے۔ کیونکہ نظموں کے مصرعوں کا ارتباط و انسلاک غزل کے شعر سے مختلف ہوتا ہے۔ موضوعات ندرت لفظیات بہ معنویت پیش کش، مشکلات و مضمرات، اچھا لگی ہوئی تراکیب وغیرہ دلکشی فراہم کرنے والے متصفات ہیں۔ غالباً میرا خیال ہے کہ اشک فی الواقع خد و خال کے شاعر ہیں اور ان کی بابت یہ کہنا حقیقت بیانی ہوگی ؎

آں را کہ عقل بیش غم روزگار بیش

اشک سمستی پوری اچھا شاعر ہے۔ پیارا شاعر ہے اور ہندوستانیت انسانیت کا شاعر ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر

پتھروں کی رہگزر

ادیب احمد دوراں نے ادبی دیانتداری کے
لہ رضا اشک کی نئی شعری کتاب کا تعارف کرایا ہے۔
ا اشک کے شعروں میں جو عالمی انسانیت ہے اس کا تجزیہ
ہے۔ اویس احمد دوراں نے بتایا کہ وہ ظالم، فرقہ پرست،
ہی مفسدوں کے خلاف ہیں اشک کے لاشعور میں ایک
زہبی مذہب ہے۔ اس مذہب کی روح زندگی کی جمالیات
ان کے اظہار میں سادگی و پرکاری ہے۔

اویس احمد دوراں کے تعارفی دیباچے کو پڑھ کر ہر اجنبی
ھنے والے کے دل میں یہ خواہش ہوگی کہ اس کتاب کو ایسی محویت
ھا جائے جس کے بغیر شاعری اپنے پڑھنے والے کو دھوکا
کر چکے سے اس کی نگاہ و دل سے بہت دور ہو جاتی ہے۔
ھنا تنکے، لکڑی کے اور ٹین کے برتن ہو جاتے ہیں۔
کے پہلے مجموعے "شیشے کے سفر" پہ سردار جعفری، ظ انصاری
، غلام ربانی تاباں، گیان چند جین، خواجہ احمد عباس،
، تاثی رکھن بھٹاچاریہ، قمر رئیس، وحید اختر، مظہر امام،
شبلی، کمال احمد صدیقی، ندا فاضلی، عابد سہیل، حسن نعیم،
رضیاء الرحمٰن، قمر اعظم ہاشمی، پروفیسر آزاد گلاٹی، سیدہ

نسرین نقاش، کے علاوہ اور کچھ لوگوں نے اپنی پسندیدگی کا
اظہار کیا ہے۔ اور اصل مجموعے کی نمایاں خوبیوں کی طرف
بطور خاص اشارہ کیا ہے۔ وہ مجموعہ ایسا متنوع ہے کہ ان
معتبر لوگوں نے انھیں الگ زاویوں سے دیکھا تو الگ الگ
خوبیاں نظر آئیں۔ یہی اچھی شاعری کی پہلی شناخت ہے۔
اس میں جہتوں کی پرتیں تہہ بہ تہہ ہوتی ہیں۔ "پتھروں کی رہگزر"
میں اعلیٰ انسانی قدریں، زیادہ نمایاں اور شفاف ہو گئی ہیں۔
شاعر نے دوسرے بزرگ، ہم عمر اور نئے شاعروں کا ذکر جگہ
بہ جگہ بڑی وسیع القلبی سے کیا ہے۔ میں نے ان کی نظمیں اور
غزلیں انتہائی شوق سے پڑھی ہیں اور ان سے لطف اندوز
ہوا ہوں۔ میں خود کو نظموں پر لکھنے کے قابل نہیں سمجھتا اس
لئے میں کرشن ادیب (لدھیانہ پنجاب) کو خط لکھ چکا ہوں۔
وہ ملراج کومل، کمار پاشی، پریم کمار، آزاد گلاٹی کو میری طرف سے
اور اپنی طرف سے لکھیں کہ ان کی نظموں کا تنقیدی تجزیہ کریں۔
مجھے اپنے طور پر یہ واہمہ ضرور ہے کہ میں غزل سے شعر کو چھو لیتا
ہوں۔ یہ بات مجھے میر تقی میر نے بتائی تھی کہ میر درد کے غزل کے
شاعری کو اللہ یہ توفیق دیتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی غزل کی

کی شناخت کرے اور عام پڑھنے والوں کی توجہ ان شعروں کی طرف مبذول کرائے۔

یہ کتاب حمد کے ایسے شعروں سے شروع ہوتی ہے جہاں عبادت شعریت بن گئی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ شعر آنسوؤں میں ڈوب کر لکھے ہیں۔ اور انہیں وہی محسوس کر سکتا ہے جس کا دل اور آنکھ پتھر کے نہ ہوں۔ مثلاً

لب پہ میرے ہر دم دعا صلی علی صل علی
ادنیٰ سالک خادم ہوں میں اس کا جو شہزادہ تیرا
یہ کیا ناقوس و اذاں، یادِ خدا، ذکرِ بتاں
دیر و حرم کے درمیاں کھلتا ہے دروازہ ترا

تو پتھروں کی رہگذر، تو ہی ہے "تیشے کا سفر"
محنت کا مجھ کو دے ثمر، یہ دل ہے دلدادہ ترا

کیا ہو سپاس نامہ ترا، عاجز ہے یہ خامہ مرا
لکھتا ہوں میں عمر بھر کاغذ ہے سادہ ترا

تو ہی مرا لوح و قلم، تو ہی مرا طبل و علم
من تو شدی تو من شدم مجھ کو ہے اندازہ ترا

تجھ سے نظامِ میکدہ پھر محتسب اور رند کیا
ساقی و میخانے ترے، ساغر ترا، بادہ ترا

اقبال نے سچ کہا ہے "نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر" رضا اشک بھی آگ کے اس دریا کو فکر و فن کے پیراہن پہن کر پار کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں غزل کی آگ بھی گلزارِ ابراہیم ہو جاتی ہے۔ غزل کے شعر کا یہ دست دعا ہوتا اس کی روح کو بالیدگی اور دل کو سپردگی عطا کرتا ہے۔

ترا خونِ جگر بھی اس میں شامل ہو گیا ہو گا
مصور اس لئے اب تک ترا شہکار زندہ ہے

میرے دل کا ہے واردات غزل
میرا افسانہ حیات غزل

ہم اشک ہیں صحیح معنوں میں جس کا شہکار اس کو کہتے ہیں
ہر نقش سے جس کے خونِ دلِ فنکار کی خوشبو آتی ہے

پاس زنجیرِ ستم ہو تو غزل ہوتی ہے
دستِ فنکار قلم ہو تو غزل ہوتی ہے

ایک معصوم انسان کی طرح وہ ہر گھر میں ایک بہار کا آنگن دیکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں بزرگوں کی آنکھوں میں خوشیوں اور دعاؤں کے آنسو چمکتے ہوں۔ گھروں میں پھول اور تتلیاں اپنے کاندھے پر بستے دبائے اسکول آتے جاتے ہوں۔ مثلاً

بنام گل موسم گل بہارت جہاں غالب ہو
روش روش پہ گلے سایۂ گلاب میں جام

لیکن یہ خواب، خواب ہی رہتے ہیں اور بھیانک حقیقتیں دل نگاہ کے زخم بن جاتی ہیں۔ ہر طرف ناانصافی ہے۔ شیطانی کیسے کیسے مذہبی بھیس [illegible] مجبور انسانوں کا رقص بسمل رکھتی ہے۔ وہ فسادات پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ فسادات جو ہندو مسلم، ہندو سکھ اور ذات پات کے نام پر ہوتے ہیں یہی کبھی صوبہ پرستی کا زہر بن جاتے ہیں۔ دراصل انسانوں کا لہو بہانے والے، گھروندوں کو گرانے والے، زندگی کی جیتی جھونپڑی جلانے والے نہ ہندو ہیں نہ مسلم نہ سکھ نہ عیسائی۔ ان میں ذات پات کی تفریق کبھی نہیں ہوتی، تو دوسروں کی محنت سے بنائی ہوئی جنت کو آگ دکھاتے ہیں، ان کے کام کا جو کچھ ہوتا ہے لوٹ لے جاتے ہیں، معصوم بیٹیوں اور عصمت مآب گھر کی عورتوں اپنے وحشیانہ ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایسے ماحول میں اکثر شاعر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ فنکارانہ نظم و ضبط سے بے نیاز ہو کر منظوم تحریریں لکھنے لگتے ہیں۔ غزل کا فن آنسو کو درد کا موتی بنانے کا فن ہے اور انہیں انسانیت کی فتح کا انتظار ہے۔

میں ہر ایک عہد میں ہوا مصلوب
پھر بھی ہر اک عہد میں زندہ ہوں

[illegible]

میں جانتا ہوں کہ پل بھر کی اک خوشی کے لئے
تمام عمر گلے مل کے ہم کو رونا ہے

تصوف کے صبر و قناعت ہمارے لہو میں زندہ ہیں۔ مجبور انسان کی آخری پناہ گاہ تصوف ہے جو نمائشی دنیا کی ساری شان و شوکت ہیچ اور لایعنی سمجھتا ہے۔ یہ مخملی بستر، یہ [illegible] زر و جواہر جڑے تاج و تخت، یہ سونے چاندی کی کرسیاں سب باطل کا طلسم ہیں۔ انسان چاہے محلوں کے سطوت میں رہے یا گرد و غبار کی چھوٹی جھونپڑیوں میں۔ سب کا آخری انجام ایک ہے۔ مٹی مٹی سے جا ملتی ہے۔ سب چاندی سونے کے پیراہن، قلعوں کی آہنی دیواریں روح کی پنچھی کی پرواز نہیں روک پاتیں تو پھر روزمرہ زندگی کے لئے یہ جھوٹی شان اور آن بان کیا؟

میرے لئے تو یہ مٹی کا فرش کافی ہے
کسی رئیس کے گھر کرسی اور میز لگا
وہ اور ہوں گے میسر ہے جن کو تاج محل
ہمیں ملا نہ کرائے کا بھی مکان کوئی

ان کے شاعرانہ اسلوب میں لفظیات اور استعارات کا تصور جامد نہیں ہے۔ وہ بول چال کے ان گڑھے لفظوں، انگریزی کے ادھ بنے ہوئے لفظوں کو بھی شاعرانہ حسن و خوبی کے ساتھ برتتے ہیں اور وہ ہر انسان کے انفرادی نگاہ کے زاویے کا احترام کرتے ہوئے اپنا مختلف زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔

تمہارا کہنا کہ آدھا گلاس خالی ہے
میں کہہ رہا ہوں کہ آدھا گلاس پانی ہے

میں حیات کا ایسا اک مسافر ہوں
کہ جیسے شہر کے رستوں سے [illegible] کا رشتہ ہے

[illegible]

ضمیر و اخلاق [illegible] سلطنت کا اک لہو
ذہن شاعر ہندوستان کا اک لہو
خلافِ دیدۂ مقدس قرآن کا اک لہو
کہاں سے آئی بغاوت اذان کا اک لہو

وہ محنت کش انسانوں کی عظمت کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ وقت مظلوم کے اس پہلو پر بھی سوچتے ہیں جہاں انسان کو اس کے بنیادی حقوق ملیں گے۔ [illegible] ہندوستان، اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق مٹ جائے گی۔ انسانی محنت کی لاحاصلی انسان کا مقصود ہرگز نہیں رہ سکتی۔

دن کو کھیتوں میں جا کے مرتا ہوں
رات بھر فیکٹری میں [illegible] ہوں

وہ اپنے شعری تجربوں کے اظہار کے لئے آس پاس کی زندگی یا صدیوں کی مرتی ہوئی تہذیب و ثقافت سے استعارے یا تشبیہ لیتے ہیں۔ انہیں محنت کش، معصوم اور مظلوم انسانوں کی تقدیس کا کیسا خوبصورت احساس ہے۔

رکھا ہوں رحلِ وقت پہ قرآن کی طرح
آہستہ کھولئے مجھے جزدان کی طرح
خوشبو سا بہہ جاؤں گا ہر سو ہواؤں میں
ڈالو نہ مجھ کو آگ میں لوبان کی طرح
برسوں سے یہ چراغ ہے ایمانِ زندگی
قصبے کے اس غریب کے دالان کی طرح

میرے آنگن میں جگ مگ سے کوئی سورج نہیں نکلا
میرے آنگن میں صدیوں سے اندھیری رات طاری ہے

وہ انسانی مقدر کو پوری طرح سمجھتے ہیں کہ ساری خوشیاں ہیں کے بعد کہانی کو مانی میں مل جاتی ہے۔ اسی لئے ان کا لاشعور انہیں اس تصوف کی طرف لے جاتا ہے جو ہماری غزل کا شاید سب سے

ایک کمرہ، اک گلی بدنام سی
سانولی لڑکی سلونی شام سی

شاعر کی آنکھ ہی کسی موجود منظر میں اپنے اعلیٰ تخیل اور صداقت سے ناموجود چیز کا اضافہ کر سکتی ہے۔

جبینِ شام پہ ابھرا تھا زخم کی صورت
ڈھلی ہے رات تو اک داغ ہو رہا ہے چاند

ہمارے یہاں ہر دس پانچ سال کے بعد تخلیقی ذہن یہ شوشہ چھوڑتا ہے کہ غزل کا ایک شعر مکمل اکائی ہے کہ غزل کا مخالف کچھ دنوں بعد غزل کا عاشق صادق یعنی خط۔ اضافہ مرحوم ہو جاتا ہے۔ میکانکی ذہن بس اسی اعتراض کو دہراتا ہے کہ دو مصرعوں میں ساری بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ بیسویں صدی، اکیسویں صدی کی طرف جا رہی ہے۔ ذرا سے کیپسول میں شعر کی جیتی جاگتی زندگی کی موت مقید ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آپ کے فرصت ہے کہ داستانِ امیر حمزہ پڑھے، مثنویوں میں شب گزاری کرے، ناولوں اور لمبی کہانیوں میں دن کاٹے۔ انگریزی، فرانسیسی، جاپانی، چینی اور دنیا کی بڑی زبانوں کو غزل جیسی مختصر صنفِ سخن کی تلاش ہے جس میں ایک زندگی کی کہانی، ایک زمانے کا ماجرا، گزرے عہدوں تہذیبوں کا حسن محفوظ ہو جائے۔ خیر جاپانی میں تین چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی ایک صنفِ سخن ہائیکو کا احیا عالمی پیمانے پر ہو رہا ہے۔ رضا اشک کی یہ غزل بھی اشارہ یہ ہے کہ طویل نظم، ناول، داستان، تہذیبوں کی تاریخ، جنگِ آزادی کے جہاد اور اس کے امر واقعات، سرفروشی کی بیتابیوں کی ہسٹری، سائنس کی جدید ہلاکت خیزی سب کو سمیٹنے، محفوظ رکھنے اور دلوں کا نقش بنا دینے کا ہنر غزل ہے۔ ان کی یہ بیانیہ غزل اسی کا معنی خیز اشارہ ہے۔

قصہ بیتکی ہے، مثنوی کی کہانی ہے غزل
نغمۂ ساحر، بشیر بدر، بانی ہے غزل
اب یہ کچھ روداد بلقیس و سلیماں بھی نہیں
قصہ ہوتی ہے دمینتی کی کہانی ہے غزل
ایک دستاویز ظلمِ گورے کالے قوم کی
ایک روداد سزائے کالا پانی ہے غزل
قصہ جلیانوالہ اور غدر کا واقعہ
تانتیا ٹوپے ہے اور جھانسی کی رانی ہے غزل
اس میں ایٹم کی حرارت اس کی راکٹ کی اڑان
ہیروشیما، ناگاساکی کی کہانی ہے غزل
یہ صدا گونجے گی پیہم وقت کی محراب میں
زندگی فانی ہے لیکن غیر فانی ہے غزل

درج ذیل آخری شعر السیا الثانی کہہ دیا ہے کہ اوپر لکھے شعر میں اسکا موزوں جنزو بن جاتے ہیں۔
شاید مجھے ان کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اکائی کو رضا اشک نے اس طرح نوازا ہے۔

غزل سفر کی ہوئی عہدِ میر ابائی سے
مری صدی میں یہ آ پہنچی ہے اکائی تک

رضا اشک نے زندگی اور دنیا کو اپنے تجربے اور تخ سے دیکھا ہے۔ ان کی غزل کے اچھے شعروں میں جذباتیت جذبوں کی تطہیر بن گئی ہے۔ وہ تجربوں کے ساتھ سر سے کا باندھے ہیں۔ اور یہی وقت غزل کے شاعر کے لئے جان دینے زیادہ کڑے امتحان کا وقت ہے۔ غزل صبر و ضبط کا حسن، انقلاب و جہاد کا عشق ہے، لیکن غزل کے اپنے آداب ہیں جب ایک شعر زندگی کے ماضی، حال اور مستقبل کی اکائی ہے۔ ا کے استعارات زندگی سے منتخب کئے ہوئے تہذیبی پیکر ہیں۔ ا کے فکر کا انداز کھلا کھلا ہے وہ زندگی کے ماضی و حال ا کسی حد تک مستقبل کو غزل کا ایک شعر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔

ظؔ

ڈاکٹر منصور عمر
شعبۂ اردو سی ایم کالج دربھنگہ

پتھروں کی رہگذر کا تجزیاتی مطالعہ

"پتھروں کی رہگذر" رضا اشک صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۹۰ء میں منظرِ عام پر آیا ہے پہلا مجموعۂ کلام غالباً ۱۹۸۷ء میں "تیشے کا سفر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جو میری نظروں سے نہیں گزرا ہے لیکن اس کی قدر و قیمت کا اندازہ "پتھروں کی رہگذر" میں شامل ادیب و فنکار کی قیمتی تاثراتی و تنقیدی آرا سے ہوتا ہے۔ جن ادیب و فنکار کی آرا کو اس کتاب کی زینت بنایا گیا ہے ان میں خواجہ احمد عباس، وحید اختر، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، شارق رکھن سجنا جاریہ، شمس الرحمٰن فاروقی، کرامت علی کرامت، گوپی چند نارنگ، گیان چند، مظہر امام، علقمہ شبلی، کمال احمد صدیقی، ملک زادہ منظور احمد، کالی داس گپتا رضا، عابد سہیل، وارث علوی، سید ضیاء الرحمٰن، قمر اعظم ہاشمی، ناوک حمزہ پوری، بدر الشکال، حسن انجم، خواجہ احمد فاروقی، رضا نقوی واہی، محمد محسن، بشیر بدر، قمر رئیس، ظ انصاری، لام لعل، اور احمد سجاد نیوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کی رائیں شامل کی گئی ہیں۔ کرامت علی کرامت نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

> کوئی اگر مجھ سے پوچھے کہ فراق کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو کے کس شاعر نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا ہے تو میں بلا تکلف رضا اشک مستی پوری کا نام لوں گا۔ لیکن رضا اشک کا دائرۂ عمل ان معنوں میں فراق سے بھی وسیع تر ہے کہ وہ یونانی اور سامی اساطیر سے لیکر جدید مغربی ادب کے مختلف کرداروں کو کبھی تلمیحات کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو کبھی علامت کے طور پر۔ اور اس طرح وہ ہمارے سامنے گنجینۂ معنی کا طلسم کھول دیتے ہیں۔"

کرامت صاحب کی اس رائے سے نہ تو میں اتفاق کر سکتا ہوں، نہ اختلاف، کیوں کہ میں نے "تیشے کا سفر" نہیں پڑھا ہے۔ ہاں "پتھروں کی رہگذر" کی روشنی میں مذکورہ آرا کو صحیح نہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

بہر کیف: رضا اشک صاحب نے "پتھروں کی رہگذر" کا انتساب اردو کے معروف نقاد و ادیب ڈاکٹر محمد حسن کے نام کیا ہے اور اس صفحہ پر اپنا یہ شعر درج کیا ہے ؎

تا خون جگر بھی اس میں شامل ہو گیا ہوگا — معصوم اس لئے ابتک ترا شہکار لگتا ہے

گویا رضا اشک صاحب کو اس بات کا اندازہ ہے کہ جب تک خون جگر کی آمیزش نہ ہو کوئی بھی فن پارہ شاہکار کی شکل اختیار نہیں کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی زندگی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس مجموعے میں دو صفحے کا دیباچہ بھی شامل ہے جسے معروف ترقی پسند شاعر اویس احمد دوراں نے لکھا ہے روایتی طور پر اس مجموعہ کا آغاز حمد سے ہوا ہے لیکن بہ طرز اظہار کے ساتھ حمد کہتے ہیں ؎

ہر نخل سبز، ہر گلکدہ تیرے لئے ہے — گھنگور اندھیرے میں سفر تیرے لئے ہے
نظمیں ہوں یا غزلیں ہوں قصیدہ یا رباعی — ہر حمد و مناجات مگر تیرے لئے ہے
شاعر ہو، مصور ہو، مغنی ہو یا بت گر — ہر ساحری فن کا سحر تیرے لئے ہے
مذہب ہو ادب ہو یا سیاست کہ حکومت — ہر جادۂ ہستی کا سفر تیرے لئے ہے

اور آخری شعر میں شاعر دست بدعا ہے کہ ؎

تو مجھکو زر و مال نہیں دولت فن دے — فنکار ترا دست نگر تیرے لئے ہے

اسی طرح دوسری حمد بھی بے حد خوبصورت اور اچھوتے انداز میں کہی گئی ہے اور وہ عابد و معبود کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

آنکھیں مری عاشق تری جلوے ترے تازہ ترا — تو شہ رگ جاں کے قریب مجھکو ہے اندازہ ترا
تو ہی مرا لوح و قلم، تو ہی مرا انجیل و مسلم — من تو شدی تو من شدم مجھکو ہے اندازہ ترا
تجھ سے نظام میکدہ پھر محتسب اندر کیا — ساقی و میخانہ ترے، ساغر ترا، بادہ ترا

"پتھروں کی رہگذر" کی سب سے آخری نظم کا عنوان ہے "تعارف" جس میں شاعر نے خود اپنا تعارف پیش کیا ہے شعر کی اس پابند نظم کی ردیف ہے "رضا اشک"۔ موضوع کے لحاظ سے اس نظم کو سب سے پہلے رکھنا چاہئے تاکہ قاری شاعر سے پہلے ہی متعارف ہو جائے۔ ملاحظہ ہوں اس نظم کے کچھ اشعار ؎

اس عہد کا بے باک قلم کار رضا اشک — شاعر ہے کبھی اور کبھی فنکار رضا اشک
چاندی کا نہیں ہاتھ میں کانٹے کا قلم ہے — رکھ دیتا ہے لفظوں میں نئی دھار رضا اشک

میں نے بھی اس آخری نظم کا ذکر پہلے اس لئے کیا ہے کہ اس میں شاعر نے جو دعوی کیا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے رضا اشک کی بیشتر نظموں میں بے باکی اور نئی دھار موجود ہے۔ اور ساحر، کیفی، سردار جعفری جیسے ترقی پسند نظریے کے ہیں ان سے رضا اشک بھی متاثر ہیں چنانچہ حالات حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں اپنی نظم کا موضوع بنانے

کیسا یہاں [illegible] سے ... / ... تقریر جل گئی
خطروں بھرا چمن ... سے ٹھہرا / ایسا لگا کہ جنت کشمیر جل گئی
اکثر کی سمت ہنستے پتھر گرے وہ بے گھر ہے / غالب کی شرح میر کی تفسیر جل گئی
نفرت کی اس جلائی ہوئی آگ کی زد میں / نہرو کا خواب باپو کی تعبیر جل گئی

رضا نقوی واہی موجودہ دور کے ایک عظیم طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں اور غالب ایوارڈ سے نوازے جا چکے ہیں۔ اسی موقع پر رضا اشک نے ایک نظم کہا اور عنوان رکھا بنام رضا نقوی واہی (غالب ایوارڈ ملنے پر)۔ اس نظم میں نقوی واہی کا خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے اور سارے دور کے ادیبوں اور فنکاروں پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز مختلف اداروں سے متعلق مختلف ادیبوں کی آپسی رقابت کو بھی بڑے ہی خوبصورت طنزیہ و مزاحیہ انداز میں پیش کیا۔ یہ کہتے ہوئے نظم ختم کی ہے کہ ؎

ادب بھی گویا سیاست کا اک اکھاڑہ ہے / ہے کوئی ڈلبھ بھی یہاں، کوئی باجپائی ہے
کھڑی ہے نظم بھی تنقید کے کٹہرے میں / وکیل، شاہد و منصف تری دہائی ہے

"یہ لڑکیاں" اور "کشمکش"، "جسم فروش لڑکیوں اور جسم فروشی کا اڈہ چلانے والوں سے متعلق نظمیں ہیں۔ سالنامہ اشارہ کے ایک شمارے کو دیکھا اور "بھائی شبیر قبلہ احسانی" بیانیہ نظمیں ہیں۔ اور ان دونوں پر چوٹ ہیں جن سے شاعر کی تخلیقی قوت اور فنکارانہ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "بسرخی تمہارے ساجے کی" بھی نظم ہے۔ اور ادب کے نام پر جو کاروبار ہو رہا ہے اس کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ لیکن کتنا اعتبار سے یکزور نظم "ناسے کہہ دو کہ میں دلبستان ہوں" بھی ایک بیانیہ نظم ہے یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں وہ الزامات ہیں جو شاعر پر خدا کے منکر ہونے کے سلسلے میں لگائے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں شاعر نے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ ؎

نام کا جز میرے محمد ہے / ابن یوسف رضا حسن خاں ہوں
ہوں غلام پاک عبد اللہ / اور حبیبہ کا نور تاباں ہوں
منحرف کیسے ہوں رسالت کا / جب کہ پشتوں سے ہی قریشی ہوں
کہ میں رشدی نہیں حقیقی ہوں / یعنی اسلام کا نگہباں ہوں
... سے جنت ابلیس / پر فرشتوں سا پاک دامن ہوں

پچھلے رحمانیہ ہوٹل ادیبوں اور فنکاروں کا ٹھکانہ تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں فنکار، شاعر، مفکر اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اپنی تازہ ترین تخلیق سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور ان پر تنقید و تبصرہ کیا کرتے ہیں۔ رضا کا تعلق حسن پیٹھ سے ہے۔ جناب موصوف نے رحمانیہ ہوٹل کے علاوہ عثمانیہ ہوٹل کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نام کا کوئی ہوٹل ہے بھی یا نہیں کیونکہ نہ کسی نے رضا اشک کو دیکھا ہے اور نہ مستقل طور سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن انہوں نے عثمانیہ ہوٹل کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ رحمانیہ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس نظم کا پہلا اور چوتھا بند ملاحظہ ہو ؎

اے اشک مرے شہر کا عثمانیہ ہوٹل
اب بن گیا پٹنہ کا یہ رحمانیہ ہوٹل
عثمانیہ ہوٹل مرا رحمانیہ ہوٹل

یہ لازم کہ شعر و سخن، محفل تنقید
یہ چشمک آپس کی، یہ تائید یہ تردید
یہ زیر و زبر، پیش و جزم اور یہ تشدید
تعریف یہ تضحیک یہ تنقیص یہ تمہید
ہو جائے گا کل دیکھنا دیوالیہ ہوٹل
عثمانیہ ہوٹل، مرا رحمانیہ ہوٹل

"پتھروں کی رہگذر" کی غزلیں بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ کیونکہ ان غزلوں میں شاعر نے واردات قلب اور افسانۂ حیات کو موضوع بنایا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

میرے دل کی ہے واردات غزل   میرا افسانۂ حیات غزل

نظم نگاروں کے مقابلے میں غزل گوئی کا فن ایک بے حد نازک عمل ہے لہٰذا غزل لفظوں کی محض نمائش نہیں ہوتی بلکہ اس کا تخلیقی استعمال ہوتا ہے اور رضا اشک کو اس بات کا احساس ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

لفظوں کی نمائش کو غزل کہہ نہیں سکتا   کنایہ کو علامت کا بدل کہہ نہیں سکتا۔

رضا اشک کا شعری و تخلیقی سفر رومان سے حقیقت کی طرف ہے جس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں ؎

وہ اک سفر جو ہوا رومان سے ابتدا تک   خیال و خواب نے پہونچا دیا حقیقت تک

اور جب کوئی فنکار رومان سے حقیقت کی طرف سفر کرتا ہے تو اس کی نظروں کے سامنے زمانہ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اب فنکار کے مشاہدہ پر منحصر کرتا ہے کہ وہ زمانہ کی چھلنی سے اپنے فن کی چھلنی کتنا کچھ چھان پاتا ہے اور کیا کچھ لینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ رضا اشک کی غزلیہ شاعری کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے

پہونچے ہیں کہ انھوں نے ملک کے مسائل اور جدید عہد کے کرب و شکست، نفرت، عداوت، بغاوت، ظلم و جبر وغیرہ کا اور کمر توڑ مہنگائی کو نہایت سنجیدگی سے شعر کرنے میں بڑی فنکاری اور مہارت کے ساتھ بند کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

چاندنی سونے کے گلدان میں — باسی پھولوں کی خوشبو سی رات تھی

سواد شہر میں تھوڑی سی یہ جو جنت ہے — ہمارے عہد کے مزدور کی وراثت ہے

خلاف وید مقدس قرآن، آگ لہو — کہاں سے آ گئی لعنت آغاز آگ لہو
عجب نہیں کہ یہ فصلیں پتھروں کی اگیں — زمیں پہ بوئیں گے کل جو کسان آگ لہو
ہمارے شہر میں آئے جو قافلہ کوئی — کہو نہ لکھے کبھی داستان آگ لہو

زمیں کسی کی مگر اپنا حق جتاتا تھا — وہ شخص اپنے رویے سے امریکہ تھا

رہے رعایا مگر کل یہ سلطنت نہ رہے — پلٹ گیا کہیں تختہ کسی حکومت کا
عجیب بات ہے دو ملک اک کہانی ہے — گزر چکا ہے زمانہ اگرچہ ہجرت کا

موجودہ عہد نے جہاں انسانوں کو بام عروج پر پہونچا دیا ہے وہیں منفی رجحانات اور بے چہرگی سے بھی نوازا ہے اور اس سے ہمارے ادیب و فنکار بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں ؎

تمہارا کہنا کہ آدھا گلاس خالی ہے — میں کہہ رہا ہوں کہ آدھا گلاس پانی ہے

مطالبہ ہے یہ مجھ سے لباس والوں کا — کہ میں لکھوں نہ کبھی قصہ بے لباسی کا

بس اتنی سی بات پہ مجھ سے خفا ہے ساحر زیدی — میں نے کیوں ننگی عورت کے جسم [illegible] کر دیے

ایٹمی جنگ ابھی باضابطہ نہیں لڑی گئی ہے لیکن اب تک جو تجربے ہوئے ہیں اور ہیروشیما ناگاساکی کے بعد دنیا پر جس طرح اس کا استعمال کیا گیا ہے اس سے اس کی ہولناکی اور تباہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے ادیب و فنکار کے ساتھ خود سائنس داں بھی فکر مند ہیں کہ اگر خدانخواستہ ایٹمی جنگ ہوئی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔

بہت لکھا ہے لکھنے والوں نے ایٹم کے بارے میں　　　کسی نے بھی تیرا اے ناگاساکی غم نہیں لکھا

یہ آدمی کی جو زندہ حسین لاشیں ہیں　　　انہیں سنبھال کے رکھو یہی لڑائی تک

مالنگ لاؤ ترقی ہے جو اور پتھر ہٹاؤ　　　آدمی کو کام کرنے دو یہ کمپیوٹر ہٹاؤ

رضا اشک کی شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری کے موضوعات بے حد متنوع ہیں۔ ان کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدت طرازی بھی۔ انہوں نے ان تمام صنعتوں کا استعمال کیا ہے جو ہماری کلاسیکی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں نیز جدید اور اینٹی غزل کی لفظیات سے بھی استفادہ کیا ہے ؎

عجیب یہ عشق ہے کہ سلطنت کو ٹھکرا کر　　　غلام بن کے رہا تاجدار عورت کا

یہ اشک ارض و سما تھی دیار آدن کے　　　یہاں اٹھائے کا ہرگز نہ رام بان کوئی

پاؤں اکڑوں سر ٹکا کر ہاتھ پر　　　سو گیا بچہ کوئی فٹ پاتھ پر
شہر دو ضلعوں میں بٹ کر رہ گیا　　　آدمی کی اک ذرا سی بات پر

اس میں ایٹم کی حرارت اس کی راکٹ کی اڑان　　　ہیروشیما ناگاساکی کی کہانی ہے غزل

ہوا کیا جو برہنہ ہیں سر بازار لادھائیں　　　حمیت ہو تو اپنا منہ چھپا لو دیکھتے کیا ہو

جو کل تھے احمق مطلق وہ ہیں تخت سیاست پر　　　مگر ہم اہل دانش آج بھی ویسے کے ویسے ہیں

"پتھروں کی رہگذر" میں کچھ قطعات بھی شامل ہیں۔ اختر انصاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے قطعات کو مستقل صنف کی حیثیت سے برتا اور روشناس کرایا۔ اور اسے ایک مسلسل ہوئی نظم سے تعبیر کیا چنانچہ اپنے تمام قطعات میں انہوں نے عنوانات بھی لگائے۔

رضا اشک نے گرچہ اس طرح کے قطعات نہیں کہے ہیں لیکن ان کا زیر نظر قطعہ جو کائنات کی تخلیق سے متعلق ہے۔ اختر انصاری کے اصول پر پورا اترتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رضا اشک کو قطعات نگاری پر بھی قدرت حاصل ہے ؎

سب سے پہلے خدا کی ذات بنی　　　اس طرح پھر یہ کائنات بنی

صبح پھوٹی جبینِ آدم سے　　　زلف تھوا سیاہ رات بنی

"پتھر چاند" کی ردیف میں بارہ قطعات ہیں۔ اور ایک دوسرے سے مختلف۔

"آزاد غزل" نے مظہر امام کی زندگی ہی میں باضابطہ صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور ہر شاعر منہ کا مزہ بدلنے ہی کے لئے سہی آزاد غزل ضرور کہہ رہا ہے۔ رضا اشک نے بھی "پتھروں کی رہگذر" میں گیارہ شعر کی ایک آزاد غزل شامل کی ہے۔ غزل اچھی ہے لیکن آخری شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد غزل کو وہ کتنی آزادی دے سکتے ہیں ؎

خلوص دل سے بھیجی ہے غزل اس نے رسالے کو
انکار لکھ دینا　　　صفحہ ۱۶۳

دوسرا مصرعہ خارج از بحر ہے۔ گیارہ شعر کے اکیس مصرعے مفاعیلن مفاعیلن میں ہیں۔ جبکہ بائیسواں مصرعہ ناموزوں ہے۔ اسی طرح اس پورے مجموعے میں کچھ فنی خامیاں راہ پا گئی ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں ؎

اور بھولے سے کسی بزم میں جایا نہ کرو　　　کوئی اشعار، کوئی نظم سنایا نہ کرو　　　صفحہ ۶۳

کوئی کے ساتھ اشعار کا استعمال غلط ہے۔ "چٹان سارے پگھل رہے ہیں" صفحہ ۱۲۸ چٹان مونث ہے۔

دولت کے ترازو پہ دل لوزجہاں کو　　　تولے اسے میزانِ عدل کہہ نہیں سکتا　　　صفحہ ۱۱۶

صحیح لفظ "عَدل" بروزن فِعل ہے۔ جبکہ یہاں فَعَل کے وزن پر ہے۔

"نظام زر بھی یہ شیدا فگن کی زد نہ کو" صفحہ ۱۲۴ یہ مصرعہ بے بحر ہے۔

"تمام کاندھی و نہرو سبھاش لکھا ہے" صفحہ ۱۲۹ پیاس اور اداس کا قافیہ سبھاش نہیں ہو سکتا۔

"ہر گام ہورنگ کیف پا کے نشاں ہیں" صفحہ ۱۴۵ خارج از بحر ہے۔

یہ کیا ہوا کہ ہوتے راہی عدم بھائی　　　اگل رہی تھیں جو چنگاریاں بغاوت کی　　　صفحہ ۱۵۹

اگل رہا تھا ہونا چاہئے۔ "قدم قدم پہ ہے دشمن مرے تعاقب میں" قدم قدم پہ ہیں دشمن مرے تعاقب میں ہونا صفحہ ۱۶۰ ان کے علاوہ بھی کچھ غلطیاں ہیں۔ لیکن ان کو قطع نظر کیا جاتا ہے۔

رضا اشک کا مجموعہ کلام "پتھروں کی رہگذر" اس لحاظ سے اہم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ذاتی نفرت، نسلی عصبیت اور مذہبی جنون و دہشت گردی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اور کسی بھی طرح کے استحصال کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا ہے اور زمین پر عدل و مساوات اخوت و ہمدردی اور اخلاقی قدروں کی آبیاری کی خواہش ظاہر کی ہے اگر ہمارے ادیب و شاعر خلوص کے ساتھ جبر و ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں تو وہ دن دور نہیں جب ایک انسان دوسرے انسان سے حسد کرنا چھوڑ دے گا۔ اور ایک دوسرے کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے گا۔ مجھے امید ہے کہ رضا اشک صاحب جن پتھروں کی رہگذر سے گذر رہے ہیں اس میں وہ کامیاب و کامران ہوں گے۔ اور اپنے قارئین کے لئے ایک مشعل راہ چھوڑ جائیں گے۔

انور شمیم

"پتھروں کی رہگذر" پر "شیشے کا سفر" کرتا شاعر

"شیشے کا سفر" سے "پتھروں کی رہگذر" تک رضا اشک کا ادبی سفر تقریباً ساڑھے تین دہائیوں کا سفر ہے۔ ان پینتیس برسوں کے سفر میں رضا اشک نے جو کچھ اپنے آس پاس بکھرا ہوا پایا ہے یا جو کچھ بھی اپنے معاشرے میں دیکھا اور محسوس کیا ہے، انہیں مشاہدات و تجربات سے اپنا شعری منظر نامہ تیار کیا ہے۔

• پرامیتھس، دیوتاؤں سے آگ چرا کر انسان کو حرارت اور روشنی بخشنا چاہتا تھا — رضا اشک بھی شاعری کے ذریعہ عام انسانی زندگی کو نئے معنی اور نئے مفہوم سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا قلم ایک تیشہ ہے جو کوہ کنی اور سنگ تراشی کرتا ہوا انگشت حیران کن مناظر اور مختلف پوشیدہ اشکال سے آنکھوں کو متعارف کراتا ہے۔

• شاعر — ایک تیشہ ہے/ جو کرتے لمحوں کا اسلوب لاتا ہے/ کتنی صدیوں کا/ فاصلہ طے کرتا ہے/ شاعر کا یہی تیشہ/ خون، ترشے ہیرے کا/ فکر و فن کے معبد میں/ کل بھی چمکتا تھا/ اب بھی چمکتا ہے/ کل بھی چمکتا رہےگا۔"

فکر و فن کے معبد میں عبادت گزار یہ شاعر — انتشار سے دوچار معاشرتی زندگیوں، آگ میں لپٹی، خون میں لت پت بستیوں، کٹتے سروں اور لٹتی عصمتوں کو دیکھ کر جب اپنے اندر، اپنے دردمند فنکار کا دم گھٹتا محسوس کرتا ہے تو اس کے قلم سے "ایک ٹانگ کٹی عورت" جیسی پراثر فکر انگیز اور پرمعنی نظم تخلیق ہوتی ہے۔ جس میں جنگ کی ماری ایک ٹانگ کٹی عورت، اپنی بے چارگی، اپنی مظلومیت اور دنیا کی بربریت اور معاشرہ کے وحشی پن کی داستان ہر روز بیان کرتے کرتے، اچانک بالکل گم سم، چپ، خاموش ہو جاتی ہے — "اب کچھ نہیں کہتی" پوری نظم کے پڑھنے کے بعد نظم کا یہ آخری مصرعہ "اب کچھ نہیں کہتی ہے" قاری کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتا ہے اور ایک سوال ان کے سامنے کھڑا ہوتا ہے کہ وہ ٹانگ کٹی

عورت، کیوں اب کچھ نہیں کہتی ہے ؟؟ اس مسئلے کے حوالے سے اگر اس نظم میں معنی کی تلاش کریں تو نظم کی معنوی وسعت اپنے حجم سے کچھ گنا بڑھ جاتی ہے۔ میں نظم کے چند مصرعے پیش کر رہا ہوں۔ آپ خود دیکھیں۔

" اک ننگی کٹی عورت / فٹ پاتھ پہ رہتی ہے / پنجاب کی سرحد پہ اک معرکہ جاری ہے / .... / اب مجھ سے یہ کہتی ہے / سیتا سی میں ناری ہوں / مریم سی کنواری ہوں / میں جنگ کی ماری ہوں / ...... / پنجاب کی سرحد پہ معرکہ جاری ہے / مذہب کا جنوں ہر سو، انسان پہ طاری ہے / گجرات سلگتا ہے، بنگال کی باری ہے / آسام کے جنگل پر، اک خوف سا طاری ہے / ...... / خوں کی ندی بہتی ہے / ...... / یہ ننگی کٹی عورت ــــ اب کچھ نہیں کہتی ہے "

یہ نظم امن و شانتی کو درہم برہم کرکے مسرا جیوں کی تیزابیت سے بھرپور طنز بھی ہے۔ شیخ و برہمن کی فرقہ آرائی پر اظہار بیزاری بھی اور انسانی بے حسی پر شاعر کا غم و غصہ بھی ــــ

کسی شاعر کے مزاج یا اس کے خیالات و نظریات یا اس کی پہچان کے لئے نظمیں بالخصوص معاون ہوتی ہیں۔ جن میں شاعر کے ذہن کے واضح نقوش اور اس کے صحیح خدوخال بالکل صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے میں اس مقالے میں پہلے ان کی نظموں کے حوالے سے ہی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

رضا اشک کے مشاہدات و تجربات نے انہیں حقائق سے بہت قریب کر دیا ہے۔ وہ کسی بھی تلخ حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرتے ہیں۔ وہ جبر و استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے ہیں اور اپنے تیشہ کی ضرب سے زندگی کی خوفناک سچائیوں کو سب کے سامنے اجاگر کرتے ہیں۔ اس تیشہ زنی کے تیور میں ان کی نظم "حبہ میاں کی کھوڑی" ...

تکمیل تک پہنچتی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ ہر باشعور ذہن اور حساس دل مند شخصیتوں کو دعوت فکر دیتے ہیں، جنھیں حساس غلیظ اور متعفن سماجی ڈھانچے کے جھنجھلا دینے والے تیور سے متعین کیا گیا ہے ــــ آنکھوں کی انجلی میں لرزتے آنسو لئے، سرتاپا زخمی، لہو میں تر، آگ کا سفر طے کرتی ایک مجبور مظلوم عورت کا سماج کے سفید پوشوں اور نام نہاد سماج کے ٹھیکیداروں کے ذریعہ استحصال دیکھ کر، شاعر کے غم و غصہ اور اس کے تاسف کے رد عمل میں جنم لیتی ہے یہ نظم ــــ حبہ میاں کی کھوڑی ــــ یہ نظم علامت تو ہے ہی غربت اور بے بسی میں سانس لیتی، ہر روز لٹتی، ہر روز بکتی، عصمتوں کی، اس کے استحصال کی، ساتھ ہی ساتھ دستاویز ہے سماج کے مکروہ اور کریہہ چہرے کی۔ اور اس سیاسی اور سماجی بے حسی و بے اعتنائیوں پر زناٹے دار تھپڑ بھی ہے۔

اشک صاحب کی نظموں کا کینواس بہت وسیع ہے۔ ان کی نظمیں ایک نقطے سے شروع ہو کر پورے عالم کو محیط کر لیتی ہے۔ میں نے ان کی پوری نظم میں جو خاص بات محسوس کی ہے وہ یہ کہ پوری نظم تو کئی کئی مصرعوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔ لیکن اشک صاحب کی کچھ نظموں کے ایک مصرعہ یا کہیں دو مصرعوں میں ہی مکمل نظم یا پورا افسانہ خیمہ زن ہوتا ہے۔

ان کی شاعری میں صرف اپنی ذات کا دکھ نہیں ہے بلکہ قومی اور بین الاقوامی مسائل و پیچیدگیوں کا ذکر اور پورے عالم انسانیت کا کرب ہے اور ان کے کلام میں صرف ایک شاعر کا ہی نہیں ایک دردمند مفکر کا عکس جھلکتا ہے۔

رضا اشک نے بہت سے معمولی الفاظ کو اپنے کلام میں علامت کے بطور استعمال کرکے اپنی نظموں کو حسن اور معنوی وسعت عطا کی ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے گہرے مطالعہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ...

کے کلام، ہندی الفاظ پر اشک صاحب کی سخت گرفت کا پتہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں، اور غزلوں کے بہت سے اشعار میں ہندی الفاظ کا خوبصورت اور برمحل استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کے اشعار کی ندرت اور ان کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کے گہرے مطالعہ اور واقفیت کا ثمرہ ہے کہ انہوں نے ہندو دیومالائی کرداروں کے استعارات استعمال سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کر سکے ہیں۔ لیکن کسی کسی نظم کی طوالت اور ان میں ناموں کی لمبی فہرست بہت کھلتی ہے۔ جس سے قاری بوجھل پن اور اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے کلام میں تسلسل، برجستگی روانی اور مقصدیت تو قائم رہتی ہے مگر اپنی بات پوری شدت کے ساتھ قاری تک پہنچانے میں اکثر وہ فنی نزاکتوں اور عروضی پابندیوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

رضا اشک ترقی پسند خیالات بلکہ مارکسی نظریات کے حامی ہیں، اور انہیں نظریات کو مقصد حیات مانتے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے اس مارکسٹ، سوشلزم سے بہت پہلے ایک واضح آئین حیات پیش کیا ہے۔ جس میں نسل و فرقہ پرستی، مذہبی تعصب، بغض و نفرت یا انسانی نابرابری روا نہیں ہے اور نہ ہی انسانی آزادی کی پامالی یا اس کے معاشرتی استحصال کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

قصبہ قصبہ، قریہ قریہ، شہروں شہروں، گاؤں گاؤں موڑ موڑ اور گلی گلی ـــــ لاشوں کے انبار، اجڑے کھنڈرات سونے مناظر، زخمی پرندے، عریاں خنجر، کالا سورج، خوف و دہشت اور حیران و وحشت دیکھتا یہ شاعر، تیشے کا سفر کرتا، جب پتھروں کی رہگذر تک پہنچتا ہے تو پہلے سے کہیں زیادہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ ویتنام ہیروشیما، ناگاساکی کی تباہ کاریوں کو گذشتہ مذہبی و نسلی فسادوں کی ہولناکیوں کو اور تمام انتشارات و بدحالیوں کو بھول کر، ننھے معصوم بچوں کا کھیل اور ان کے ہاتھوں کا نرمان "چھوٹا سا دھنش بان"، دیکھ کر شاعر حیرت زدہ رہ جاتا ہے ـ کہ یہ جو کل کے شہری ہیں، ملک و قوم کے مستقبل ہیں۔ یہی بچے جو کل مسند عدل و مساوات پر جلوہ افروز ہونے والے ہیں ـــ وہ بچپن سے ہی خطرناک کھیل کھیلنے لگے ہیں۔ جو صرف وطن عزیز کے لئے ہی نہیں عالم انسانیت کے لئے وبال کا سبب اور ایک بھیانک تباہی کا کارن ہونے والے ہیں۔ رضا اشک حیران تو ہوتے ہی ہیں بچوں کا یہ کھیل اور ان کے ہاتھوں کا نرمان دیکھ کر ساتھ ہی ساتھ ملک و قوم پر آنے والی تباہیوں سے گھبرا بھی جاتے ہیں۔ اسی گھبراہٹ میں یہ نظم "چھوٹا سا دھنش بان" تخلیق پزیر ہوتی ہے۔

گڈی کی قمانچی کا یہ چھوٹا سا دھنش بان/
چھ سال کی بچی کے سبک ہاتھ کا نرمان
میزان کرو چھتر کے اک جنگ کا سامان ـــ
ـــــــ میں ہو گیا حیران !!

آگ میں لپٹی اور خاک و خون میں لت پت بستیوں کو دیکھ کر پہلے تو رضا اشک کا دماغ ہی سلگ اٹھا تھا مگر پتھروں کی رہگذر تک آتے آتے ان کی روح بھی سلگنے لگی ہے۔ اس احساس کی بھرپور ترجمانی انکی نظم "چنار کے پیڑ جل رہے ہیں" کرتی ہے۔ جس احساس کی عکاسی وہ اپنے نام سے نہیں بلکہ کشمیری زبان معروف کشمیری شاعرہ حبہ خاتون کے حوالے سے اس طرح کرتے ہیں۔

" تمام وادی سلگ اٹھی ... پہلو کے چشمے ابل رہے ہیں .... چنار کے پیڑ جل رہے ہیں/ .... / جنوں کی اگنی دھدھک رہی ہے/ ...... / تمام جنت نذیر وادی/ ...... شہید و بسمل کے خون سے تر ہے/ ...... /اب اپنی تربت میں حبہ خاتون چیختی ہے/ وہ جنگ بازوں کو جنگ

کرنے سے روکتی ہے/وہ رائفل کے لہو کو پلکوں سے پونچھتی ہے/وہ امن کی فاختہ کے ہونٹوں میں شاخِ زیتون چاہتی ہے/

تیشے کا سفر اور پتھروں کی رہگذر کے مطالعہ کے بعد بلا جھجک اور بغیر کسی مبالغہ کے کہی جاسکتی ہے کہ رضا اشک صرف شاعر نہیں بلکہ ایک دردمند مفکر، موم جیسا دل رکھنے والے، بالکل سچے اور پرخلوص جذبات رکھنے والے قوم پرست نیک خواہ انسان ہیں۔ ان کی نظموں میں، تیشے کا سفر، ایک ٹانگ کٹی عورت، حبہ میاں کی گھوڑی، قتل بہاراں، نروان کی تلاش، دیوداس کی واپسی، ننھا سا ترازو، چھوٹا سا دھنش بان، چنار کے پیڑ جل رہے ہیں اور یہ مکان کس کا ہے، وغیرہ عصری آگہی سے مملو تو ہیں ہی شاعر کی سچی اور صحیح شناخت بھی کرواتی ہے۔

تیشے کا سفر اور پتھروں کی رہگذر میں صرف نظمیں ہی نہیں بلکہ دونوں مجموعہ کلاموں میں کل ایک سو چودہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ اور یہ غزلیں بھی ان کی شناخت میں، انکی نظموں کی ہی طرح معاون ہیں۔

اشک صاحب ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک سے جڑے رہے ہیں۔ اور آج شاید آج بھی اس تحریک سے وابستہ ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نظموں میں ایک خاص مکتبۂ فکر اور تحریک کے خیالات کی تشہیر ملتی ہے۔ لیکن، انکی غزلوں کو، ان کی نظموں سے الگ رکھ کر دیکھیں تو بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزلیں (چند غزلوں کے کچھ اشعار کے علاوہ) کسی تحریک، رویے، رجحان یا کسی مکتبۂ فکر کی شاعری نہیں ہے۔ میری سمجھ سے غزل بھی یہی چاہتی ہے کہ شاعری تخلیق کائنات کے حوالے سے اس کی شناخت کی جائے۔ لئے کسی مسلک سے جڑے بغیر۔

آج کی غزل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے زمانے کی تبدیلیوں کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ پہلے منزل کی تعریف محدود تھی۔ جس میں حسن و عشق کے مضامین کے علاوہ کسی موضوع کو باندھنے کا خیال بھی نہیں تھا۔ مگر اب اس میں وسعتوں کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔ آج غزل اپنے پرانے، فرسودہ روایتی اصطلاحات اور ہیئت الفاظ کے اندھے کنویں سے باہر نکل کر نئے نئے استعارات، تشبیہات علامات سے بھی مملو ہوئی ہے۔ اور حسن و عشق کے گھٹا ٹوپ اندھیرے غار سے باہر، آج کی سائنسی و صنعتی عہد کی تلخیوں، تہذیبی و ثقافتی ترقی سے پیدا شدہ کربناکیوں، درد ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کی کڑواہٹوں کی فضاؤں سے بھی لمس آشنائی ہوئی ہے۔ اب اس نے اپنے اندر شش جہاتی موضوعات کو سمیٹ لیا ہے۔

رضا اشک ان تبدیلیوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ اپنے آج کے اس عہد میں سانس لیتے ہیں۔ جس کی عکاسی ان کے اشعار میں جا بجا ملتی ہے۔ مسلسل کسی تلخ و ترش موسم میں زندگی جیتے رہنے کے بعد (اس امید کے ساتھ کہ آنے والا موسم ضرور پھولوں اور خوشبوؤں کا موسم ہوگا۔ لیکن سامنے آنے کے بعد ہر موسم پہلے سے زیادہ تیز دھوپ میں سلگتا موسم ہو تو عدم ایقان کا شکار ہونا عین فطری ہے) رضا اشک جس انتشاراتی دور کی فضاؤں میں جیتے رہے ہیں، وہاں انہوں نے ہمیشہ جلن کی سی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ ہر طرف لہولہان موسم، سرد لہو کی بارش کے مناظر اور نفسیاتی شب سے اونچی حصارِ ظلمت دیکھتے رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ کسی خوفناک، غیر یقینی موسم کی آمد کے امکان سے ڈرے سہمے نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ آج ہی کچھ دیر مسکرا لینا چاہتے ہیں کہ پتہ نہیں کل کیا ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ وقت سحر ہے۔ مگر کھڑکیوں کو کھولنا نہیں چاہتے ہیں کہ پتہ نہیں کس طرف کی بھیگی مسموم ہوا اندر در آئے۔ یہ آج کا کتنا خوفناک سچ ہے۔

کون آتا ہے ہم تم کو دیکھ سکیں
کوئی بھی زندگی میں کون جانتا ہے

[illegible] اور [illegible] سی ہے
[illegible] ان [illegible] جلن کی ہے

لہولہان ہے موسم سوچ کی بارش سے
مگر [illegible] وقت ہے [illegible] ان دریچوں کو

ہم [illegible] رہے ہیں جس طرح دور تیرہ شبی
دہرا رہی ہے زندگی تاریخ کربلا

اس شہر کے کچھ قاتل سفاک کے ڈر سے
ہم لوگ کئی دن سے نکلے نہیں گھر سے

ابھی ہے دیر ذرا، دھوپ کے اترنے میں
فصیل شب سے ابھی ار[illegible] ظلمت ہے

رضا شنگی کی جتنی اچھی، پر اثر اور فکر انگیز نظمیں ہیں، اتنی ہی بھرپور ان کی غزلیں بھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں شعور کی پختگی اظہار خیالات کی [illegible] اور [illegible] آگہی ہے۔ وہ اپنی نظموں کی ہی طرح مواد اپنے ارد گرد سے چن چن کر اور آس پاس [illegible] سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں احتجاج کی گونج ہے، [illegible] ایک سے متاثر تنگ نظر [illegible] نہیں ہے۔ وہ جس عہد میں جیتے ہیں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔ وہ اپنے اس عہد کو اس کی [illegible] زندگی، لہولہان [illegible] سکتا چھوڑ کر آواز کی رفتار [illegible] کے ساتھ اس کی حدود سے باہر نہیں نکلتے ہیں [illegible] مشینوں کی آوازیں ہیں، کھو گیا [illegible] زندگی کا شہر میں

[illegible]
اور [illegible]
[illegible] بہاں [illegible]
[illegible]

ہمیں آتا ہی بات [illegible] ہے [illegible] کو
[illegible] میں [illegible] کے [illegible]
[illegible] ہے
[illegible] ہوتا ہے

مسلمانوں کے [illegible] جان نثار رہا ہے اور اندر سے بالکل [illegible] دراستان [illegible] برتری اور ذاتی [illegible] کے پیش نظر طرح طرح کے پروپیگنڈوں کے ذریعہ [illegible] مسلمانوں کی شبیہ [illegible] ہے۔ [illegible] بلکہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان شمار کر کے اس زبان سے اور اس زبان کے بولنے والوں یا اس زبان میں لکھنے والے ادیبوں سے بھی نفرت و کدورت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش [illegible] کے لئے باعث [illegible] مسلمانوں کے [illegible] رضا شنگی [illegible] کی [illegible] کا ثبوت [illegible] کرتے ہیں۔ انہیں [illegible] تکلیف پہنچاتی ہیں۔ ان [illegible] جب وہ ان باتوں کو شدت کے ساتھ سوچتے ہیں تو [illegible] ان کی سوچ کی [illegible] کرنے لگتی [illegible] ایک [illegible] وابستہ ہو کے [illegible] ضبط [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] ان سوچوں سے صرف [illegible] اس طرح [illegible]

ں کر رہے نہیں جھکتے ہیں۔

اکیلا ہی سہی جب میں وندے ماترم کہتا
یہ سوچتا ہے ہجوم شور جے کالی سے گونجو گا

تمام شہر ہی یہ آگ کی نذر بن جاتا
پہنچ سکا نہ مرا ہاتھ ہی سلائی تک

چلو اچھا ہے یہ بھی، دو درختوں کے تصادم سے
گھنے جنگل کی آبادی تو کچھ کچھ گھٹتی جاتی ہے

ذرا بتاؤ تو آب زمزم سے آب گنگا کی دشمنی کیا
ہمیں ملا ہے دیار کاشی، تمہیں دیار حرم ملا ہے

مجھ کو تو ود تکرر نرالا منت تک اچھے لگے
میر اور غالب کی خم کو شاعری کیسی لگی؟

رضا اشک کے یہاں صرف احتجاجی گونج، انقلابی نعرہ اور تنگ
و متعصب ذہنوں پر طنزیات ہی نہیں ہیں بلکہ جمالیاتی
پہلو بھی ہے۔ حسن بھی ہے، عشق بھی ہے اور یہ عشق ان
کے یہاں اپنا ایک الگ اور بلند معنی رکھتا ہے۔ جو صرف جسم
کی لذتوں ہی کی تلاش نہیں کرتا ہے بلکہ جسم کی حد سے گذر کر روح
کو ٹٹولنا چاہتا ہے۔ وہ جسم کی نہیں۔ روح کی خواہشوں کا احترام
کرتے ہیں۔

ہم ترے جسم کے دریچے سے
جھانک کر روح کو ٹٹولیں گے

جسم کی کچھ اور ہی تھی آرزو
روح کی کچھ اور خواہش رات تھی

رضا اشک اپنے آج کے اس عہد میں زندگی جینے کے باوجود گذشتہ
[illegible]

وہ اپنی پرانی تہذیبی روایات اور ماضی کی تاریخ کو بچانے
رکھنا چاہتے ہیں۔ جو نئے سفر کے لئے توانائیاں مہیا کرتی ہیں۔

چاٹ جائے نہ کہیں وقت کا دیمک ان کو
اپنے اجداد کا اتہاس بچائے رکھنا
نہ تخت و تاج سلامت نہ اب حویلی ہے
کھنڈر ہی دور گذشتہ کی اب نشانی ہے
ترکۂ چشتیؒ و نانک کی حفاظت کرنا
ورثۂ حضرت الیاسؒ بچائے رکھنا

اس صدی کی گذشتہ تین دہائیوں میں غزل کی جو جامہ دری ہوئی ہے یا جس غیر ضروری شکست و ریخت سے غزل گذری ہے۔ اس بازیگری اور تماشہ بازی سے الگ رہ کر رضا اشک نے روایات کی پاسداری کے ساتھ غزل کے تقاضوں کو مثبت انداز میں پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی باتوں کی وضاحت کے لئے، طوالت کے خوف سے اب اور کہنے سے گریز کر رہا ہوں۔ رضا اشک غزل کو محدود موضوع کے اظہار کا نہیں بلکہ ملکی غیر ملکی اور بین الملکی مسائل و پیچیدگیوں کا ذریعہ اظہار سمجھتے ہیں ان کی غزلوں کے متعلق ان کے مختلف خیالات ہیں۔ جن کا اظہار کھل کر انہوں نے کیا ہے۔ ان کی اور اپنی بھی باتوں کی شہادت میں اب میں ان کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔ جنہیں پڑھ کر آپ خود فیصلہ فرمائیں گے۔

وطن! غزل میری منسوب تیرے نام سے ہے
کہ تجھ سے مری نگار سخن کا رشتہ ہے
ایک دستاویز مطلق گورے کالے قوم کی
ایک روداد ہزارے کا لا پانی ہے غزل
ہزاروں سال کی تاریخ سے عبارت ہے
قلم یونہی نہیں پہنچا ہے روشنائی تک
یہ ٹوٹی کھڑکیاں، یہ جھگیاں غریبوں کی
لے اشک ان سے مری شاعری کا رشتہ ہے

حصولیابیاں عہد

اور ہمارے مستقبل کی اسکیمیں

صدیوں کے سماجی، اقتصادی جمود کا خاتمہ، فرقہ وارانہ فسادات کے خوفناک خواب بد کا خاتمہ بدعنوانی کے لاثانی قلعوں کا خاتمہ، دلیتوں، پچھڑوں اور اقلیتوں کا اقتصادی، سماجی فروغ اور منصوبہ بند ترقی اور عوامی فلاحی پروگراموں میں بے روک ٹوک ترقی موجودہ حکومت کے دور اقتدار کی قابل ذکر خصوصیات رہی ہیں۔

ریاستی حکومتوں کی سخت کاوشوں کے نتیجہ میں گزشتہ ۲۹ر مہینوں میں کی گئی قابل ذکر کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ جن کی ایک مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

- کوئلہ رائلٹی کے در میں ۳۱ر گنا اضافہ کی منظوری موصول قیمت پر مبنی در مقرر کرانے کی کوشش
- کوئلہ سمیت خاص معدنیات پر سیس لگانے کے ریاستی حکومت کے اختیار کے پھر سے حصول کے لئے مسلسل کوشش۔
- ۱۰۱۷ میگاواٹ کی کوئل کارو اسکیم کو مرکزی حکومت کی سرمایہ کاری سے عملی جامہ پہنانے کی منظوری حاصل
- فتوحہ میں ایک مال گاڑی ٹرمینل کے تعمیر کی منظوری حاصل
- اسپات اور لوہے کے بھاڑا میں یکسانیت کو ختم کرایا گیا
- بہار کی ترقیاتی کی سمت میں ایک لمبی چھلانگ لگانے کے لئے ۵۷ ارب روپے کا راجیو پیکج کو جلد عملی جامہ پہنانے کے لئے زبردست کوششیں کی گئیں
- پٹنہ، بھیلزا ریل پل، چھوٹی گنڈک ریل پل، مظفرپور، نرکٹیا گنج اور ڈیہری، بنجاری، بیرا ڈیہہ، یدونا تھ پور، بھونا ناتھ پور ریل لائنوں کو براڈ گیز میں تبدیل کرنے کی اسکیموں کی منظوری کے لئے موثر کوشش کی گئی
- ہزاری باغ، اور دمکا کو ریل لائن سے جوڑنے گیا اور بھاگلپور مکامہ پل شاہراہوں کو دوہرا کرنے ا ریاست میں انٹر سیٹی ٹرین سسٹم لاگو کرنے کی اسکیم کی مرکزی حکومت کی توجہ مبذول کرائی گئی۔
- منصوبہ کی رقم ۳۸٫۶۶ فیصد دیہی حلقے پر اور کل مقررہ رقم کا ۲۵ فیصد قبائلی حلقہ کے فروغ پر خرچ کرنے کا انتظام۔
- ریاست کی تقریباً ۱۵ ہزار کیلومیٹر دیہی سڑ کی مرمت کے لئے پہلی بار ریاست کے منصوبہ میں رقم کا اہتمام
- زرعی فروغ کے بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے ذاتی آبپاشی پروگرام کے تحت نل کوپ اور بالٹی بورنگ کے لئے اس سال کی اسکیم میں ۹۰ کروڑ روپے کا اہتمام
- کسانوں کے ذمہ ۱۰ ہزار روپے تک کے باقی کی معافی کی گئی جس سے ۲۵ لاکھ کسان فیضیاب ہوئے
- دیہی حلقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کو اولیت

دے کر سبھی مواضعات میں پینے کے پانی کی فراہمی کا نظم کیا گیا۔

- ۵۰ افراد کے لئے پینے کے پانی کے ایک وسیلہ کا پیمانہ مقرر کر کے ۱۴ ہزار مواضعات میں اضافی وسیلہ کی تعمیر کی اسکیم پر کام شروع
- سر پر میلا ڈھلانے کی روایت کو جرم قرار دیا گیا
- پچھلے مالی سال میں مربوط دیہی ترقیات پروگرام کے تحت قریب ۲،۷۰،۶۹۳ خاندانوں کو فیضیاب کیا گیا۔
- چرواہا اسکولوں کا قیام اور اسے چلانے کی غیر معمولی اسکیم شروع۔ اس پروگرام کی ستائش مرکزی حکومت سے لے کر یونیسف تک نے کی
- انتظامیہ اور نظام عدلیہ کو دیہی عوام کے لئے سود مند بنانے کے واسطے مناسب تعداد میں اضلاع سب ڈویژن کی تشکیل نو کی جا رہی ہے
- علاقائی سطح پر تقرریوں، بہار ڈسٹرکٹ سروس میڈیکل اور ٹکنیکل تعلیم میں ریزرویشن کے اصول کو نافذ کیا گیا۔
- صدفی صد پر گرانٹ پر معذوروں کی باز آباد کاری کے لئے ویشالی ضلع کا انتخاب۔
- ندی اور تالاب میں مچھلی مارنے کا مفت اختیار مچھیروں کو دیا گیا
- پاسی بھائیوں کو تاڑی ٹیکس کی معافی۔ تاڑی بیچنے کا مفت اختیار رسوا ہم
- دھوبی بھائیوں کے لئے آسانی سے پر گھاٹ کا انتظام شروع کر دیا گیا
- چھوٹا ناگپور سنتھال پرگنہ حلقہ کے فروغ کے لئے ضروری اقدام کئے گئے۔
- بے یار و مددگار لوگوں کو دی جانے والی سماجی تحفظ پنشن روپے فی ماہ سے بڑھا کر ایک سو روپے کر دی گئی۔
- بے روزگاری بھتہ کی رقم پچاس روپے فی ماہ سے بڑھا کر ایک سو روپے کر دی گئی۔
- مسواک بیچنے والی خواتین کے لئے رین بسیرا اور کھانوں کی تعمیر کی گئی
- رکشہ چلانے والوں اور دیگر غریب لوگوں کے لئے بھی رین بسیرا کی تعمیر کی گئی
- فساد مخالف تین کمپوزٹ بٹالین فورس بنانے کی کارروائی کی گئی۔
- ریاست کے سبھی میڈیکل کالج اسپتالوں اور ضلع اسپتالوں میں مفت دوا مرکز کھولنے کی اسکیم
- پی۔ ایم۔ سی ایچ میں ٹسکو کے تعاون سے ٹاٹا وارڈ کی تعمیر
- حکومت ہند اور ورلڈ بینک کی مدد سے ریاستی حکومت ۲۱۱ بلاکوں آئی۔ سی ڈی ایم پروگرام چلانے
- ۲۵ ہزار پرائمری ٹیچروں کی تقرری کے لئے اشتہار شائع۔ تقرری کے مراحل جلد شروع
- اسکولوں میں بحالی کے لئے ٹریننگ کی شرط ختم۔ تعلیمی مافیایہ کی جڑ پر سخت حملہ
- بہار ایجوکیشن اسکیم کے لئے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۳۶ کروڑ روپے کے خرچ کا انتظام
- ریاست میں چار نئی یونیورسٹیاں قائم کی گئی
- یونیورسٹی اور کالجوں کی تعلیمی ماحول کو صحت مند اور درس و تدریس کے مطابق بنانے کی بھرپور کوشش

صابر آزمی

رضا اشک کے نام

(ان کی کتاب "پتھروں کی رہگذر" دیکھکر)

شاہراہِ زندگی پہ دیدنی ہے دوستو
پتھروں کی رہگذر پہ ایک تیشے کا سفر
آبلہ پائی نے بخشا لطف فرشِ گل جیسے
اس کے نقشِ پا سے روشن رہگذر در رہگذر

جو بگولے راہ میں آئے وہ فیضِ عزم سے
اس کی ہمت کے لئے جھونکے رواں بنتے گئے
تشنگی جتنی بڑھی اس کی تلاشِ علم میں
ساغرِ فکر و نظر رطلِ گراں بنتے گئے

غنچۂ تخئیل سے مہکی فضائے فکر و فن
ہر روش شاداب ہو کر مسکرائی جھوم کے
کھل گئی ستی یوں حلاوت معنی و الفاظ میں
جیسے مہوش مسکرائے اپنے ہی لب چوم کے

واقعات و حادثاتِ زندگی اس کے لئے
دولت کی دولت لئے موجود تھے شام و سحر
شدتِ احساس کی مشعل سے ضو دینے لگا
فکرِ شاعر کے مقدس ذہن کا ہر بام و در

سمت رفتار سے نفرت زندگی کی راہ میں
تیز رفتاری پہ قائم اس کا اسپِ تیز گام
تجربہ کی آنچ نے کندن بنا ڈالا اسے
وہ رفیقِ خوش کلام و خوش ادا و خوش خرام

یوں پرِ پرواز بخشا خالقِ کونین نے
طائرِ تخئیل اڑ کر تا سماک جانے لگا
جو حریف سست رو تھے وہ بچھڑ کر رہ گئے
ان کے ماتھے پہ پسینہ شرم سے آنے لگا

ہم بھی اے اشک اسیرِ دامِ نازِ اشک ہیں یا
دامنِ اخلاص میں گلہائے الفت لائے ہیں
تو سلامت تیرا میخانہ سلامت تا ابد
درد کا تحفہ پئے نذرِ عقیدت لائے ہیں

(۱۔۲ رضا اشک کے دو شعری مجموعے)

تخم تخم

احمد جمال پاشا
کمال احمد صدیق
کرامت حسن کرامت
ستار عاشق عکاشه
صمد بیال شوق

شیشے کا سفر

احمد جمال پاشا

شیشے کا سفر۔ رضا اشک سنبھلپوری کا مجموعۂ کلام
[illegible] اعتبار سے قابل توجہ ہے کہ اس میں روایت کا
[illegible]ت اور انفرادیت کے ساتھ عصری احساس
[illegible] نکھر کر نکلا ہے۔
[illegible] کو اظہار و بیان پر قدرت حاصل ہے۔
[illegible] کی کشتی، بکھرو تن پہ ریاض سے عبارت ہے
[illegible] میں فرد اور سماج جس طرح شکستوں سے دوچار
[illegible] پر مظالم اور [illegible] کی [illegible]
[illegible] کے واقع پر جس طرح مذہبی انتقام کے نام پر انسانی
[illegible] کھیلی جاتی ہے۔ [illegible] اور [illegible] کی [illegible]
[illegible] انتشار، ایک طرف انا کو دامن میں [illegible]
[illegible] جانب [illegible] سے انسانیت فرار کر رہی ہے
[illegible] مذہب کے نام پر [illegible] کے نام سب ہیں مگر مظلوم
[illegible]۔ سماج [illegible] کا شکار ہے۔
[illegible] عزیز [illegible] استعمال
[illegible] کر [illegible] کا [illegible]
[illegible] سے [illegible] سارے [illegible] تقاضات

نئی نسل اور نئے فنکاروں سے ہے۔ جیسا فنکار کی تمنائیں
روشن کریں گے۔ ہمارے سینوں میں محبت کا قندیل کب تک
[illegible] ہے [illegible] کر دیتا ہے۔ دنیا کی عظیم ترین تعلیمات سے [illegible]
کے نام پر سیاست کے کھیل نے انسانیت کو کھا لیا ہے
بے کیفیت مزدوروں سے [illegible] کب تک [illegible] کی [illegible]
کب تک دوسرے کا [illegible] رہیں گے۔ کب [illegible] مگر [illegible]
[illegible] کب تک ہم [illegible] جلتے رہیں گے
ان کے موضوعات ہیں۔

زمانی ناہمواریاں شاعر کے دل و دماغ کو متاثر
کرتی ہیں۔ اس لئے اشک کا لہجہ ایک قسم کا احتجاج ہے
ان کا لہجہ [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے۔ استعارہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

عورت میں بازار حسن اور سماجی بے حسی پر طنز ہے ؎

یہ عورت بنت آدم کی غم خوار عورت
خریدو گے بکتی ہے سرکار عورت ؟

سیاست پر طنزیہ رجحان بھی ان کے یہاں خاصا توانا ہے۔ اکشن ملاحظہ ہو:

ہر طرف سچ کے راج کی جے ہو
جھوٹ کے لوک لاج کی جے ہو
اور سارے سماج کی جے ہو
تخت اور تاج کی ہو جے بابا
تجھکو دیں گے نہ ووٹ لے بابا

اسی طرح ایک پہیلی (بچوں کے لیے) بھی دلچسپ ہے اور چاندی کے جوتے (روپے) کا ذکر ہے۔ جو خادم بھی ہے اور جابر بھی۔ "اے نوجوان" (چینی حملے سے متاثر ہو کر) ایک رجزیہ نظم ہے۔ اور خوب ہے۔ "پندرہ سو جشن غالب، عید، دیوالی ان کا تاثراتی کلام ہے۔ "شاعر اعظم" میں کسی معاصر کی خبر لی گئی ہے طنز و ہجو کا رنگ غالب ہے۔

" ہمارے شہر میں ایک ہیں جو شاعر اعظم
بس اتنی بات پہ ہم سے خفا ہیں ہمدم
کہ ان کو شاعر اعظم نہ کیوں کہا ہم نے
ہمارے شہر کے لیکن یہ شاعر اعظم
مشاعرے میں کبھی جب بلائے جاتے ہیں
کہاں کہاں سے نہ مصرعے اڑا کے لاتے ہیں

....

[illegible]
[illegible]

میں بہت سے اس تماش کے نظر آجائیں گے: تم، نعیم گرا لہر، وغیرہ ان کا رومانی کلام ہے۔

اشک کا مطالعہ خاصا وسیع ہے، زندگی کا اور اکتسابی بھی۔ خصوصاً ہندوستانی اساطیر اور دیومالا کا۔ جو ان کے کلام میں رچ بس سا گیا ہے۔ زمانے پر بھی ان کی اچھی نظر ہے۔ گذشتہ ۲۸ سال کے شعری سفر کی "شیشے کا سفر" ایک اچھی دستاویز ہے۔ ان کے یہاں شاعری زندگی کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اس میں مقصدیت اور معنویت ہے۔ نظم کا سلیقہ ہے۔ ان کا لہجہ بنیادی طور پر استحصال و تضادات پر احتجاج کا ہے۔ انکو پڑھنے کی بلا کسی شرمندگی کی دعوت دی جاسکتی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی، لکھائی، چھپائی اچھی ہے۔ اور قیمت بھی بہت مناسب ہے۔ "شیشے کا سفر" ابھی دستیاب ہے اہل ذوق حضرات اسے منگوا سکتے ہیں۔

تیشے کا سفر

کمال احمد صدیقی

رضا اشک سمستی پوری کا شعری مجموعہ " تیشے کا سفر " پڑھا تو جی خوش ہو گیا۔ مجموعے کا نام ہی اس بات کا اعلان ہے کہ کدال بھی شعر کا موضوع ہو سکتی ہے اور وہ پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے میں شرماتے نہیں۔ پہلی نظم "تیشے کا سفر" رضا اشک کے نظریۂ فن کا اعلان ہے۔

خامہ ایک تیشہ ہے
جو کہ کتنے لفظوں کا سلسلہ بناتا ہے
جانے کتنے لمحوں کا
کتنی [illegible] سے
فاصلہ ملاتا ہے
کوہکن کا افسانہ
یہ ہمیں سناتا ہے
جوئے شیر لاتا ہے
خامے کا بھی تیشہ
آنے والے کل کو بھی
جب کہ عہد شیریں کی
داستاں سنائے گا
جانے کتنے لوگوں کو
کوہکن بنائے گا

خامے کا بھی تیشہ
شوخ ترشے ہیرے سا
فکر و فن کے معبد میں
کل بھی جگمگایا تھا
اب بھی جگمگاتا ہے
کل بھی جگمگائے گا

دیکھنے والی نظروں کے لئے اس نظام جبر و استبداد میں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ نظر آتا ہے جس سے خون کھولتا ہے اور احساس شاعر کو اپنا قلم ایک حربے کے طور پر استعمال کرنے کی تحریک ملتی ہے۔ "ایک ناٹک کئی عورت"، "قتل بہاراں" اور "یا اخی" ان کی اچھی نظمیں ہیں۔ "قتل بہاراں" فیض کے دو مصرعوں سے شروع ہوتی ہے۔

" بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے "
دیکھ کر تیری ارض وطن میں
قصبہ قصبہ قریہ قریہ
آج یہ کیسا حشر بپا ہے
شہروں شہروں گاؤں گاؤں
موذن منبر پہ [illegible]

(بقیہ ۱۲۸ پر)

تیشے کا سفر

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

کوئی اگر مجھ سے پوچھے کہ فراق کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو کے کس شاعر نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے اردو شاعری کے دامن کو سب سے زیادہ مالا مال کیا ہے تو میں بلا تکلف رضا اشک سستی پوری کا نام لونگا۔ لیکن رضا اشک کا دائرہ عمل ان معنوں میں فراق سے بھی وسیع تر ہے کہ وہ یونانی اور سامی اساطیر سے لیکر جدید مغربی ادب کے مختلف کرداروں کو کبھی تلمیحات کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو کبھی علامت کے طور پر۔ اور اس طرح وہ ہمارے سامنے گنجینۂ معنی کا طلسم، کھول دیتے ہیں۔ یوں تو ان کا ذہنی سفر ترقی پسندی سے لے کر جدیدیت تک کا ایک طویل فاصلہ طے کرتا نظر آتا ہے لیکن سچ پوچھیے تو ان کی وابستگی کسی آئیڈیالوجی سے نہیں بلکہ انسان کے ماضی حال اور مستقبل سے ہے۔ ماضی کی طرح حال میں بھی کرن اور ارجن کے درمیان جنگ جاری ہے اور مستقبل میں بھی میگھ ناتھ کی چتا کی راکھ اڑا کر سیتا کو آزاد کرانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اردو کے بہت سے جدید شاعروں نے متھ کی نشاۃ ثانیہ کو فیشن کے طور پر قبول کیا ہے۔ لیکن رضا اشک کے یہاں یہ عمل نہایت فطری طور پر آیا ہے۔ نظم "رنگ منچ" میں ان کے رام، گھنشیام، بھیم، اشوتھامہ

سے لے کر آئن سٹائن، ڈارون، نیوٹن، مارکس، وکٹر کامیو، سارتر اور نذر الاسلام تک سب کو شامل کر لیا ہے۔ ان کی نظمیں بن باس، نروان کی تلاش، ویدویاس کی مایوسی، اور دھرتی کی نہایت موثر اور دلکش ہیں۔ اور ذہن میں دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں ہندو اساطیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اور بڑی خوبی سے کیا گیا ہے ؎

دل تلسی و غم بیاس بچا کے رکھنا
دوستو قصۂ بن باس بچا کے رکھنا

تھا رام کا بھی بن، ہنومان کا بل بھی
راون کوئی سیتا کو بھگا کے گیا جب بھی

رضا اشک اپنی غزلوں میں خالص جدید شاعر بھی نظر نہیں آتے بلکہ اپنی کاٹ کی وجہ سے دوسرے جدید شعراء سے الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے ؎

مزاجاً میں بھی ایک شیشہ ہوں لیکن
مثال سنگ ٹھکرایا گیا ہوں

جب تک یہ انسان ہے وحشی
شہر کو میں جنگل لکھوں گا

فصل آئی ہے اشکوں کے برسات کی
کیا کھلے کوئی سورج مکھی شہر میں

مر ہی گئے مرے بعد ندامت کے لئے لوگ
یہ سوچ کر اس بزم میں، میں زہر بلب ہوں

انہوں نے اپنے بعض اشعار میں کسی فعل کے استعمال کے بجائے چند اسماء کے اجتماع سے پوری تصویر اس طرح کھینچ دی ہے کہ اسماء سے محاکات کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اس قسم کے تجربے اردو میں ہوتے ہیں لیکن بہت کم۔ رضا اشک کے اس نوعیت کے اشعار ملاحظہ فرماتے ہ

زرد موسم، خشک ہوا، سگریٹ
ٹھنڈی کافی بجھا بجھا سگریٹ
کینسر وارڈ، دق زدہ ماحول
آدمی، استخواں، قضا، سگریٹ

گرد کی تہہ سجا ہوا البم ۔ !
دھندلی دھندلی مٹی تصویر

ذیل کے اشعار سے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کا ملا جلا لطف اٹھائیں ہ

گھنگھور گھٹاؤں میں کہاں ڈھونڈ رہے ہو
بجلی کسی دہقان کے خرمن میں ملے گی

کچھ سیہ کاران میں نہانے لگے، کچھ گنہ گار دامن سکھانے لگے، کچھ جفا کار خنجر چلانے لگے۔ بہہ گئی خون کی اک ندی شہر میں، رضا اشک کو استعارہ اور پیکر تراشی میں مہارت تامہ حاصل ہے لیکن کہیں کہیں ان کا لب ولہجہ علامت پسندی سے ہم کنار ہوا ہے ان کی شاعری کی اثر آفرینی کا سبب کیا ہے؟ اس کا جواب انہیں کے الفاظ میں سنئے۔

کچھ خواب چرا لایا ہوں نینوں کے کنول سے
میں لوٹ کے آیا ہوں ابھی شہر غزل سے

نینوں کے کنول سے خواب چرانے والے اس شاعر کو داد نہ دینا خود اپنے ذوق کی توہین ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۳۵ کا

لاشوں کا انبار سجا ہے۔
اور یہ ہے۔ باغی، کا ایک اقتباس :

مجھ پہ الزام ہے بغاوت کا
جنگ میں ایسا ایک منظر تھا
جس نے اپنے نگار خانے میں
ایک ایسی بنائی ہے تصویر
جس میں ایک اپنے دیس کی ابلا
جاڑے کی سرد، ٹھٹھری راتوں میں
شہر کے لیمپ پوسٹ کے نیچے
راجپتھ کے کسی محل کے قریب
بھوک سے پران تیاگ دیتی ہے

اپنا کلچرل، بازیافت، پرانی سنسکرتی کو اجاگر کرنے کے لئے دیس بدیس میں فیسٹول کر کے ہم نے جو ریکارڈ بہ عروج کیا ہے اس پاس سے بہتر تبصرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

تیشے کا سفر

مناظر عاشق ہرگانوی

رضا اشک اپنے زمانے کے آرٹ، فلسفہ، سیاست اور اخلاق کے شدید نکتہ چیں ہیں لیکن ان کی نظموں اور غزلوں میں خلوص نیت اور بلندی فکر نمایاں ہے۔ ان کی نظموں کے دل میں موجودہ ماحول اور سماجی نظم کے سنہری طلسم کو توڑنے کی آرزو ہمیشہ کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔ افسردگی، ارادہ اور امید متلون چیزوں کے سہارے وہ آگے بڑھتے ہیں۔ لبوں پر پژمردہ مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں آنسو:

ٹینک کی آمد، توپ کی حرکت، جنگ کی لعنت
قحط کا سایہ، بھوک کی آندھی اور بے کاری
مندر کے گنہ گارو، مسجد کے سیہ کارو، اے قوم کے غدارو
رانچی میں، بھلائی میں اور ٹاٹا میں رڑکی میں
پریاگ میں، کاشی میں، دلی میں، علی گڑھ میں، خون کی ندی بہتی ہے
(ایک ناٹک کئی عورتیں)

یہاں پر غالب و اقبال کی عظمت نہیں بٹتی
یہاں پر قیس اور فرہاد کی وحشت نہیں بٹتی
یہاں پر خسرو جمشید کی سطوت نہیں بٹتی،
یہاں ساغر کی تو خیرات کی دولت نہیں بٹتی
اگر عظمت کی خواہش ہے تو کیوں آکر رکا ہے
سنا ہے کہ یہاں ایسے ہی لوگوں کی رسائی ہے
(بہار اردو اکیڈمی)

رضا اشک کے یہاں دیکھنے کی طاقت ہے وہ منظر کے اس یا اس پہلو تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ دل تک اتر جاتے ہیں۔ ان کے یہاں دیدۂ بینا اور دل بینا دونوں ہیں:

صدی صدی کی جیون کتھا
یگ یگ تک پل پل لکھوں گا
عشق کی عظمت کے افسانے، انسانی افکار کی باتیں
وہ ہرجائی کیا جانے گی، پیسوں سے جو پیار کرے گی
چاند ستاروں کی سازش سے جگنو کی فرمائش سے
سورج کا نیلام ہوا ہے کالی رات کے آنگن میں
رنگین ساڑیاں نہ دوپٹے نہ سوٹ تھا
پینٹ کلا تو فوج کی وردی کا بوٹ تھا
فرحانہ گوہر نوشاد مشتری بیگم
میں اشک کمو یار ہا کن حسین کھلونوں میں

رضا اشک کی زبان، الفاظ اور طرز بیان ایک ایسے شخص کی مانند ہیں جو خیالات کی حفاظت بھی کرے اور زینت بھی دے۔ رضا اشک بھی کرتے لیکن ان کے یہاں اور گہرائی کا [illegible]

تیشے کا سفر

ہر دیال شوق

ابتدائے آفرینش سے حق اور باطل کی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی آ رہی ہیں۔ تقریباً ہر دور میں انسانی زندگی کسی نہ کسی کشمکش میں مبتلا رہی ہے جس نے انسان کے ذہن و شعور کے تخلیقی قوی کو غیر معمولی ترغیب اور تحریک میسر کی، اور وہ اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے لئے آمادہ اور مجبور ہوا۔ اس نور اور ظلمت کی پیہم جنگ کے علاوہ دوسرا اہم موضوع نظم و ادب میں نمایاں طور پر ابھرا وہ حسن و عشق ہے۔ تقریباً ہر اہل دل ادیب اور شاعر نے لوح و قلم کے ذریعہ اپنی صلاحیت اور علمی استطاعت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنے جذبات اور تاثرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ "تیشے کا سفر" اس سلسلے کا ایک کڑی ہے۔

"تیشے کا سفر" نظموں اور غزلوں پر مشتمل ایک شعری مجموعہ ہے۔ تقریباً اسی صفحات پر نظمیں ہیں جن میں کچھ آزاد اور کچھ قافیہ و ردیف کی قید و بند میں محیط ہیں۔ آخری ساٹھ صفحات پر غزلیں ہیں۔ نظموں میں عہد حاضر کے معاشرہ اور زندگی سے وابستہ تلخ تجربات کا شدید طور پر نہایت ہی موثر انداز میں بیان ہے۔ جو قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر اسے دعوت فکر پر مجبور کرتا ہے۔

شاعر نے جہاں اپنے زور قلم سے انسانی زندگی پر مسلط نفرت، تعصب، مذہبی جنون، علاقائی دہشت گردی اقتصادی اور مجلسی استحصال وغیرہ گھناونے جذبات کا نہایت ہی زوردار الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے، وہاں حسن اور فطرت کی جمالیاتی منظر کشی سے روح کو فرحت بخشی ہے۔ "ایک ٹانگ کٹی عورت"، "بازار عورت"، "گرا اور نوجوان"، "فیصلہ"، "تم"، "پندرہ اگست"، "وادی کشمیر کو سلام" وغیرہ نظمیں شاہکارانہ حیثیت کی حامل ہیں جو مختلف جذبات اور احساسات کے علاوہ حب الوطنی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ بعض نظموں میں ساحر لدھیانوی اور فیض کے سماجی رجحانات کا تقلید پایا جاتا ہے۔ سماج کی زندگی پر خرافات کے غلبے کے باوصف بھی شاعر صالح اقدار کی ابدیت پر یقین محکم ہے۔ مثلاً "نگران" اور "بازار عورت" کے علاوہ چند دوسری نظموں میں بھی شاعر کے اس خوش آئند یقین کا اعادہ ہے۔

زیر نظر کتاب میں غزلیں اپنا مقام ضرور رکھتی ہیں لیکن ان میں بھی اکثر و بیشتر نظم کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے کہ اشک صاحب طبعاً صنف نظم کی جانب مائل ہیں۔ فی زمانہ ایک طرف حسن و عشق کی عریانی اور عمومیت ا

اور دوسری طرف زندگی کی سیاسی اور معاشی دشواریوں نے ادبا اور شعراء کے تخیل اور روئے سخن کو موخر الذکر مسائل کی طرف زیادہ موڑ دیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی تقریباً ہر غزل مطلع سے آگے کسی مضمون کی طرف رجوع کرتی ہے یہ فاضل مصنف کے اس دعوے کے باوجود ہے کہ:

غالب و میر کے دم سے ہی ہی نام غزل
ہم نے بھی تجھ کو سنوارا ہے در و بام غزل

اس میں کلام نہیں کہ موجودہ رجحانات کی روشنی میں اشک کی غزلوں میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ نغمگی، شعریت اور موسیقیت ہے، مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

کسی کا چہرہ جو ندبرہ ہو تو کچھ طبیعت سنبھل بھی جائے
کبھی کبھی ان سے گفتگو ہو تو کچھ طبیعت سنبھل بھی جائے

یہ لوگ کیسے ہیں جو کہ ساحل پر سنگریزوں کو چن رہے ہیں
صدف میں موتی کی جستجو ہو تو کچھ طبیعت سنبھل بھی جائے

پیار کا صندل راکھ ہوا ہے جل کر سوکھ کے ایندھن میں
کیا رکھا ہے گوری تیری پائل کی اس جھن جھن میں

جناب رضا اشک کی زبان شستہ ہے، اسلوب بیان میں برجستگی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کلام میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے عناصر غالب ہیں۔ اردو الفاظ کے ساتھ ساتھ عام فہم مروجہ ہندی الفاظ کے موزوں استعمال نے اس مجموعہ کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے جس میں مرتب ہونا لحاظ سے خوب اور دیدہ زیب ہے۔ (بقیہ صفحہ پر)

کیف واثر

آل احمد سرور
اسلوب احمد انصاری
مجروح سلطان پوری
غلام ربانی تاباں
گوپی چند نارنگ
قمر رئیس
رہاب اشرفی
ستیہ پال آنند
رضا نقوی واہی
بشیر بدر
ندا فاضلی
آزاد گلاٹی
نعیم احمد فاروقی

تاثرات

مکرمی رضا اشک صاحب! تسلیم

چند روز ہوئے آپ کا مجموعۂ کلام "پتھروں کی رہگذر" ملا۔ مختصر طور پر رائے کلام سے متعلق یہ ہے۔

آپ کی شاعری میں جہاں بہ آپ کے خلوص اور شدت احساس کی وجہ سے کلام میں جا بجا شعریت نظر آتی ہے سماجی شعور اور اخلاقی اور تعمیری قدروں کی پاسداری سے کلام میں ایک نثر کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مگر آپ بے جا تفصیلات کے شکار ہو گئے ہیں۔ شاعری میں کیفیت رمز و ایما سے آتی ہے۔ اشارہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ بول چال کی زبان سے تعلق اچھا ہے۔ مگر اس کی خاطر زبان کی صحت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

کئی نظمیں دل کو لگیں۔ مگر آپ کی غزلیں نظموں سے بہتر ہیں۔ اس بات پر غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہے۔ طویل نظموں کے بجائے اگر مختصر نظموں پر توجہ کریں تو شاید بہتر ہو۔ غزلوں کے بہت سے اشعار دل کو چھو لیتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ امید ہے کہ میری صاف گوئی آپ کو ناگوار نہ ہوگی۔ تفصیل میں گیا تو خط بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لئے مختصر لکھا ہوں۔ خدا کرے آپ کی اچھائی ختم نہ ہو سکے۔

آل احمد سرور

غزلیں جستہ جستہ اچھی ہیں۔ اس سے پہلے کا مجموعہ "تیشہ کا سفر" مجھے نہیں ملا۔

اسلوب احمد انصاری

شکریہ جناب اشک!

کتاب کا ارسال کسی تحفہ سعادت سے کم نہیں۔

کتاب پڑھی۔ آپ کے پاس مضامین اور موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ صرف اس انداز بیان کی کمی ہے جس کی ہماری کے ہم سب سرگشتہ ہیں۔ آپ کے یہاں اس کی کمی کچھ زیادہ محسوس ہوئی۔ یہ عالم ہندوستان میں ایک مسئلہ تنہا اس پہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ مگر مجھتا کی مختصر زندہ ہے اس میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی اتفاقاً اظہار یا اسلوب ہر چند سو فیصد کلیتی نہیں ہو سکتا، پھر بھی یہی فنکار کے نسبے کو متعین کرتا ہے یہ تضاد بھی عجیب ہے۔ پھر بھی میرا ایک شعر سنا پسند کیجئے گا۔

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں ہے
بس یہی جادو فقط اشک سے اتفاقاً چھپ کے

محمود سعیدی

آپ کے مجموعہ کی [illegible] زبان و بیان پر قدرت
اور منفرد لہجے نے اس کو نئے سے کی چیز بنا دیا ہے

غلام ربانی تاباںؔ

نظمیں، غزلیں جستہ جستہ پڑھیں۔ آپ کی
عوام دوستی، فکری سرکشی، اور لہجہ کی تیکھی برجستگی، اس
مجموعہ میں زیادہ دلکش اور تاثر آفرین ہے۔ نام نہاد
جدید لہجہ کا جو نکما پن سے عالی شاعری اب باسی ہو گئی ہے۔
آپ نے بغیر کسی UNCONVENTIONAL شعری
اسلوب اپنایا تھا۔ وہ آپ کی شخصیت کا فطری اظہار
تھا۔ اس کی تعمیر میں ترقی پسند شعری روایت سے آپ نے
فائدہ ضرور اٹھایا۔ لیکن اس میں آپ نے اپنی آواز کو
تلاش کیا۔ خلوص فکر اور متانت کا ایسا خوبصورت
امتزاج آپ کے یہاں ملتا ہے۔ وہ شاد عارفی کے
علاوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کی امیجری اور تشبیہات
میں بھی غضب کی تازگی ہے۔ میرے نزدیک تو یہ
شاعری جدید حسیت کی شاعری ہے۔ غزل کے ایسے
اشعار تو کسی جدید شاعر کے یہاں بھی نہیں ملتے جیسے

جب کسی پیکر جسم کی ٹہنی
تب کہیں پھوٹی عقل کی کونپل
جسم میں قید روح کا پنچھی
جیل میں بند جس طرح مجرم

میں ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں "ترقی پسند ادب کے
معمار" اس کے لئے مجھے آپ کے بارے میں پانچ چھ صفحات
کا ایک مضمون لکھنا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں ایک ڈیڑھ
سطر میں آپ کے حالات زندگی کا ہونا ضروری ہے۔
دوسرے حصے میں آپ کی شاعری کا جائزہ ہو۔ اس کام

میں مدد فرمائیے۔ عافیت سے ہوں گے۔
ڈاکٹر [illegible]

آپ کا خط ملا۔ اور شکر نیز کتاب پر
بہت ممنون ہوں کہ آپ توجہ فرماتے رہتے
اور اس سے زیادہ مصروفیت کے سبب [illegible]
کے جواب میں بھی غفلت ہو جاتی ہے۔ [illegible]
آپ کے حالات زندگی ادیبوں کی [illegible]
میں شریک اشاعت ہوگی۔ آپ مطمئن [illegible]

وہاب [illegible]

آپ کی کتاب "پتھروں کی رہگذر [illegible]
ہوں اور آپ کی وسیع اور خوبصورت [illegible]
دنیا میں کھویا ہوا ہوں۔ آپ بے شک قابل [illegible]
ہیں۔ اپنے ہم عصروں کا کس محبت سے ذکر [illegible]
کتنے اچھے اور سچے شاعر ہیں۔ خدا آپ کا [illegible]
نادروں سے ضرور لائے گا۔ ابتدا اس کی [illegible]
وہ جن کی آنکھیں بینا اور کان بہرے ہیں و [illegible]
محسوس کر سکتے ہیں۔ آ[illegible]

[illegible]ث

جب سنبھل کر مطالعہ کیا تو اپنی و[illegible]
ناز ہونے لگا۔ اشک بہت اچھا شاعر ہے۔ [illegible]
نے بیدل، شاد عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی، [illegible]
کو ہی نہیں ساشک کو بھی پیدا کیا ہے۔ [illegible]
مدتوں بعد پیدا ہوتا ہے۔

تارا چرن [illegible]

مجموعہ بہت خوبصورت چھپا۔ [illegible]
خوش ہوا۔ آپ کے پچھلے مجموعے سے [illegible]

طباعت یہ مجموعہ خوب تر ہے۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے اس کے بارے میں میری جو رائے پچھلے مجموعے کو پڑھ کر ہوئی تھی۔ وہ بحمد للہ برقرار ہے۔ اس لئے مزید کچھ لکھنا تضیع اوقات ثابت ہوگا۔

رضا نقوی واہی

برادرم! تسلیم

آپ کے خط بھی ملتے رہے اور مجموعہ بھی موصول ہوا۔ شکریہ۔ بھائی میں کوئی نقاد نہیں ہوں جو کسی کے شعری یا نثری کاوشوں کا تجزیہ کروں۔ اور ان پر اپنی رائے دوں۔

میں آپ ہی کی طرح لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں۔ اگر آپ کی نظر سے میری کتابیں گذری ہوں تو واقف ہوں گے کہ میں نے کبھی کسی دیباچہ یا کسی رائے کو ان میں شامل نہیں کیا ہے۔ میں مزاجاً قاری اور تخلیق کے درمیان کوئی تیسری شمولیت کو گوارا نہیں کرتا۔

شاعری کے تعلق سے میں رائج فارمولوں سے بہت دور ہوں۔ جدید، ترقی پسند، قدیم، جہاں کہیں بھی لب و لہجہ کی شائستگی کے ساتھ چلتی پھرتی زندگی کی جھلکیاں محسوس ہوتی ہیں۔ اچھی لگتی ہے۔

آپ کی شعری ذہانت تو خود اپنا تعارف ہے۔ اسے میری یا اور کسی کی تنقیدی سند کی ضرورت نہیں ہے خدا کرے آپ کا یہ سفر یوں ہی جاری رہے "دیواروں کے بیچ" کی اشاعت میں ابھی دیر ہے۔ مجموعہ مجھ تک پہونچانے کا شکریہ۔ آپ اچھے ہوں گے۔

ندا فاضلی

برادرم رضا صاحب! آداب

"پتھروں کی رہگذر" کا خوبصورت تحفہ مل گیا تھا اس کی رسید اس لئے جلدی نہ کرسکا کہ اس خیال میں رہا کہ مطالعہ کرنے کے بعد مفصل خط لکھوں گا۔ لہٰذا اس میں کچھ وقت لگ گیا کہ ان دنوں مصروفیات بہت زیادہ رہیں۔

میں نے پتھروں کی رہگذر کا مطالعہ کرتے وقت یہ محسوس کیا ہے کہ زندگی اور معاملات زندگی کے بارے میں آپ کا ایک منفرد تعمیری نظریہ ہے۔ منفرد اس لحاظ سے کہ آپ نے ہر مسئلے اور معاملہ کو خود محسوس کیا ہے۔ اس کی شدت اور حدت کو اپنے لہو میں سمویا ہے۔ اور پھر اسے اپنے مخصوص انداز میں شعری قالب عطا کیا ہے۔

آپ کے یہاں طنز کی جو ہلکی زیریں لہر ملتی ہے وہ بھی آپ کے انداز کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔ آپ کے یہاں غم دوست اور غم زندگی کے امتزاج نے چند موثر تخلیقات کو جنم دیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں آپ نے زبان و بیان کے روایتی پابندیوں سے گریز کیا ہے لیکن مجموعی طور پر سلیس زبان اور براہ راست انداز بیان نے آپ کی بیشتر تخلیقات کو "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت عطا کی ہے۔

میری جانب سے شعری سفر کے اس نئے سنگ میل تک آنے کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے گا۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کا یہ شعری سفر منزل بہ منزل جاری رہے۔ اور آپ اس رہگذر کے پتھروں سے شعری شگوفے کھلاتے رہیں سبھی احباب کو سلام کہئے گا۔ کتاب بھجوانے کے لئے مکرر شکریہ۔

رہین محبت

آزاد گلاٹی

رضا اشک صاحب!

آپ کا مجموعہ "پتھروں کی رہگذر" موصول ہوا۔

یہ خط الطعہ سید لکھ رہا ہوں ۔ انتساب بھی اچھا ہے
اب نظم پر توجہ کم ہو رہی ہے جب ہمارے شہروں کے
ہر گلی و کوچے میں سنگ ہوش و گریہ کی شاعروں کی گرہ
ہے ۔ اس فضا میں یہی مناسب ہے کہ روایتی اور رسمی
شاعری کے شہر سے بچا جائے ۔ سب لالی مبارک ہو ۔

گوپی چند نارنگ

مکرمی ! تسلیم

چند روز ہوئے کوئی صاحب "پتھروں کی رہگذر"
کا ایک نسخہ گھر پر دے گئے تھے ظاہر ہے یہ کرم آپ
ہی کا فرمایا ہوگا ۔ اس عنایت اور یاد آوری کے لئے شکریہ
قبول فرمائیں ۔ میں نے جستہ جستہ کتاب کا مطالعہ کیا
اور لطف اندوز ہوا ۔ اسلوب دلچسپ ہے ۔ اور
موضوعات میں بھی فرسودگی نہیں ہے ۔ اور کیا چاہئے ۔
طباعت اچھی ہے مگر کتابت کی غلطیاں توار دو کا مقدر
ہیں ۔ تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے ۔
اس کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں ۔

پروفیسر نسیم احمد فاروقی

تخلیقی سفر

نظمیں

سہیل عظیم آبادی سے ایک ملاقات	رضا اشک مستقیپوری
کچھ ریزہ کے بارے میں	〃
کیوں میں قلم کار لکھوں	〃
کوئی ذی جاہ نہیں تھا	〃
زندگی	〃
سحر ہونے تک	〃
درد	〃
ایک آرزو	〃
شورش خاموشی	〃
غزلیں	〃
قطعات	〃

مجھے تو / سمندر کی صدا / جلی دوپہر / سنہرا حادثہ / بڑا گراں ہے / وادی آبشار / قلم میں آگ / خود کو / لکھا ہے / کہتے ہیں / تحمل ذرا / میں تحفت وتاج / خوشی تو ہوگی / وزیروں / بجھ دماغ / انسان نہیں ہے / شمر ویزید / حرا نزکی / تم تو بہ / فن ہو نیلام / بدن پہ لاٹھی / خیال تو تم وطن میں / وادی آبشار / تم اپنی بھوک / جب میں / ملنگے کے / موت کی / ول تو / کس کا طلسم / سکتا / شعر فہمی۔

رضا اشک سمستی پوری

سہیل عظیم آبادی سے ایک ملاقات

سہیل عظیم آبادی صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات پٹنہ ریڈیو اسٹیشن میں سنہ ۷۶ء میں ہوئی تھی۔
وہ اس وقت آرٹسٹ اسٹاف کی حیثیت سے اردو سیکشن کے انچارج تھے۔ اور مظہر امام پروگرام ایگزیکیٹیو۔ مظ
ہر امام صاحب کی وساطت سے مجھے ایک اردو پروگرام ملا تھا۔ میں جب سمستی پور سے چلنے لگا تو میرے جگری دوست مرحوم
قمر سمستی پوری نے کہا تھا۔ جاؤ مگر سہیل صاحب تمہیں کوئی لفٹ نہیں دیں گے۔ وہ بہت کائیاں ہیں اگر دوبارہ پروگرا
م چاہتے ہو تو جو کچھ بھی ملے سہیل صاحب کو پلا دینا۔ قمر صاحب کی یہ گفتگو مجھے بہت بری لگی اور میں پٹنے چلا آیا۔ مگر راستے
سوچتا رہا ہو سکتا ہے قمر صاحب کا کہنا سچ ہو۔ مگر سہیل عظیم آبادی تو ایک بڑا فنکار ہے۔ وہ کائیاں کیسے ہو سکتا ہے۔
بڑے فنکار عموماً چھوٹے فنکار کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ پھر میں نے انہیں نصاب کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ بار بار رسائل
میں دیکھا ہے۔ ان کے متعلق میرے ذہن میں بڑے خوبصورت اور رومانی خیالات تھے جسے قمر صاحب کے اس جملے سے
بڑا دھچکا لگا۔ یقیناً بہار نے اس سے بڑا افسانہ نگار پیدا نہیں کیا۔ پریم چند کی ادبی روایات کو جس خوش اسلوبی سے انہوں نے
برتا ہے۔ اور انہیں آگے بڑھایا ہے یہ سہیل صاحب ہی کا حصہ ہے۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور راجندر سنگھ بیدی
کی صف میں اگر بہار کے کسی افسانہ نگار کو رکھا جا سکتا ہے تو وہ سہیل عظیم آبادی ہی ہے (غیاث احمد گدی نے اس وقت
یہ مقام حاصل نہیں کیا تھا) بہر کیف انہیں سلجھے خیالات میں گم میں سمستی پور سے پٹنہ چلا آیا ——— ریڈیو اسٹیشن
پہونچ کر میں ان کا دفتر ڈھونڈنے لگا۔ ایک جگہ نیم پلیٹ (Name Plate) دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ غور سے بڑے
جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ "سہیل عظیم آبادی"۔ ایک لمحے تک رک کر سوچتا رہا۔ میں ان سے کیا باتیں کروں گا۔ کہاں ا
کا ایک مستند اور معروف ادیب اور کہاں مجھ جیسا گمنام اور نو مشق شاعر۔ میری ہمت اندر جانے کی نہیں ہو رہی تھی

پھر بھی کلیجہ کڑا کر کے خدا بندہ جو سکا یا تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اندر سے آواز آئی: "کون ہے!" میں گھبرا گیا اور ہکلاتے ہوئے لہجے میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے سہیل صاحب سے ملنا ہے میرا ایک پروگرام ہے۔ اندر کئی اصحاب بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ ایک صاحب کچھ فائلیں الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک صاحب نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہئے کیا کام ہے؟ میں ہی ہوں سہیل عظیم آبادی ـــــ میں چند لمحات تک بت بنا ہوا انہیں دیکھتا رہا۔ اچھا یہی ہیں سہیل عظیم آبادی جن کے افسانے کا ڈنکا ہندو پاک میں برسوں سے گونج رہا ہے۔ اور جو قحط بہار پر کرشن چندر، مخدوم اور ساحر کے دوش بدوش قصبہ قصبہ قریہ قریہ ہندوستان بھر کے دورہ دورہ کر کے یہاں کے کروڑوں سسکتے بلکتے اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کے لیے فنڈ فراہم کرتا رہا ہے ـــــ شانے سے بے نیاز کاندھے تک لہراتا ہوا زلف کسی مفکر کی طرح بڑی بڑی شانت اور گمبھیر آنکھیں ہوا سوچتا اور مسلسل سوچتا ہوا شکن در شکن چہرہ اور لباس ایسا کہ بے ساختہ غالب کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہے ـ

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

سفید لٹھے کا میلا علی گڑھ پائجامہ اور گیروا رنگ کا ٹخنے تک کرتا، آنکھوں پر سفید اور دبیز شیشے والا عینک، ہونٹوں سے لگا ہوا سگار اور سگار کا پیچ در پیچ پھیلتا ہوا اور سمٹتا ہوا دھواں ـــــ سر تا پاؤں کا جائزہ لیتا رہا اور جب میری محویت ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ مجھے رضا اشک کہتے ہیں۔ میرا ایک پروگرام ہے۔

"اچھا آپ ہی رضا اشک ہیں۔ مظہر امام صاحب تو آپ کے بڑے مداح ہیں کیسی ملاقات ہے ان سے آپ کی؟"

بس یوں ہی سی۔ ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب نے بلایا تھا۔ ماہنامہ کتاب کے کسی شمارے میں میں نے تحقیقاتی طور پر آپ کو پڑھا ہے۔ ٹھیک لکھ رہے ہیں۔ سہیل صاحب بولے تو جی، شکریہ، میں ان کا ان دنوں ایک [illegible]

سہیل صاحب! میں بھی آپ کو عرصے سے جانتا ہوں۔ اس وقت سے جب میں دسویں درجہ کا طالب علم تھا۔ ایک کہانی تھی آپ کی میرے کورس میں۔ افسوس کہ عنوان یاد نہیں مگر کہانی مجھے یاد ہے۔ اس کہانی سے میں بہت متاثر تھا۔ اور اب تک کچھ دھندلا دھندلا سا نقش ہے اس کا میرے ذہن میں۔ پھر ماہنامہ کتاب میں آپ کی بھی کئی جاندار کہانیاں پڑھی ہیں۔ ایک کہانی جو حال ہی میں چھپی ہے جس کا مرکزی کردار کوئی سنگ تراش ہے مجھے بہت اچھی لگی مگر وہ کہانی راجندر سنگھ بیدی کی تخلیق سے کسی حد تک ملتی جلتی نظر آتی ہے۔

ہاں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ مگر میری کہانی کا موضوع ان سے الگ ہے بالکل الگ۔ بیدی جی کی کہانی تو بہت پہلے شائع ہوئی تھی رسائل میں۔ سہیل صاحب نے کہا۔

جی ہاں! مگر میرے خیال میں بیدی جی بہت اچھے کہانی کار ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے بعد اب اگر کوئی ایسی کہانیاں لکھ سکتا ہے تو وہ بیدی ہی ہے۔ ویسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا فن فحش اور مخرب اخلاق ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے سہیل صاحب؟ میں نے پوچھا۔

"دیکھئے صاحب یہ فحش و عریانی کا جھگڑا بے سود ہے۔ اصل میں ہمیں فنکار کے Intansion کو دیکھنا چاہئے کہ وہ خود کیا چاہتا ہے۔ اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا یوں ہی SEX کو جگانا چاہتا ہے۔ دوسری صورت میں یقیناً کہانی فحش ہوگی۔ اب اگر کسی مشین کی PISTON کی حرکت کو دیکھ کر کوئی شخص شہوانی کیفیات سے دوچار ہو جائے تو بھلا بتائیے کیا علاج ہے۔ اس کا ہم فنکاروں کے پاس؟

جی ہاں! بالکل درست فرمایا آپ نے۔ سہیل صاحب سے متفق ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ منٹو کے ساتھ بھی ہمارے قارئین اور ناقدین کا یہی رویہ تھا۔ مگر منٹو کی صرف ایک کہانی "کھول دو" اس بات کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اس کہانی میں جب ایک اغوا شدہ لڑکی جو عالم بے ہوشی میں پائی گئی تھی OPERATING ROOM میں ڈاکٹر کے کھڑکی کھول دو کہنے پر جب اپنی ساڑی کھول کر خود کو عریاں کر لیتی ہے تو پورا سماج اور بڑی بے رحمی کے ساتھ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا اس پر اس سے بہتر کہانی اور کیا ہو سکتی ہے۔

جی ہاں جی ہاں! منٹو ایک عظیم فنکار تھا۔ حقیقت نگاری میں اس کا کوئی ثانی نہیں پیدا ہوا۔ اردو ادب میں بلکہ ہندی میں بھی۔ اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی۔ سہیل صاحب نے بڑی وثوق کے ساتھ کہا۔

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک خوبرو نوجوان اندر داخل ہوا۔ آتے ہی اس نے سوال کیا

"آستھانا جی (ہندی سیکشن کے انچارج) میری کہانی نشر نہیں اب تک؟"

"آپ کی کہانی اشلیل تھی اسی لئے SELECT ہی نہیں ہو سکی"

"اشلیل؟ کیا اشلیل تھی اس میں؟" نوجوان نے تیوری پر بل ڈالتے پوچھا۔

"استن (چھاتی) شبد کا پریوگ کیا ہے آپ نے اس کہانی میں"

"تو کیا ہوا شبد کوئی اشلیل نہیں ہوتا۔ اگر اشلیل ہے تو اسے شبد کوش (لغت) سے نکال کیوں نہیں دیتے"

نوجوان کافی ذہین معلوم ہوتا تھا۔ آستھانا جی کو اپنے دلائل سے قائل کئے جا رہا تھا۔ مجبوراً ہمیں بھی اس بحث میں حصہ لینا پڑا۔ سہیل صاحب نے کہا بھائی ابھی کچھ دیر پہلے ہمارا موضوع بحث بھی یہی تھا۔ پھر آپ نے اس کہانی کو دہرایا۔ سہیل صاحب پھر اشلیل اور غیر اشلیل پر ایک لمبی چوڑی تقریر کر گئے۔ مگر ڈیفنس آستھانا جی کا ہی کر رہے تھے۔ مجھے کسی سے کچھ مطلب نہ تھا۔ صرف سہیل صاحب کو متاثر کرنا منشا تھا میرا۔ اس لئے میں نے کہا سہیل صاحب۔ بدقسمتی سے اس لفظ کا استعمال میں نے بھی کیا ہے۔ ایک جگہ ایک غزل میں سہ

حد تو یہ ہے دودھ سے خالی
اب ماں کا استن ہوتا ہے

سہیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اچھا اچھا آپ سنئے یہ ہندی غزل کہی ہے۔
نہیں۔ ہے تو اردو ہی۔ کہیں کہیں ہندی قوافی ٹپک گئے ہیں۔

بحث طول پکڑ گئی تھی۔ میں موقع کی تاک میں تھا۔ پھر ایک موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ڈاکو مان سنگھ کے سوانح نگار نے لکھا ہے ابھی یہ جملہ میرے منہ سے نکلا ہی تھا کہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ سہیل صاحب نے کہا بھائی اسک مناسب ادب کی اس محفل میں ڈاکوؤں، جلادوں اور جیب کتروں کا ذکر......

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ؎ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

اچھا صاحب کہہ جائیے۔ معلوم ہوتا ہے جاسوسی ادب آپ زیادہ پڑھتے ہیں۔ استھانا جی نے طنز کیا۔
جی حضور! راماین مقدس کے جیتا مہاکوی والمیک بھی ڈاکو ہی تھے پہلے۔ مجھ سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو یہ جملہ پھینکا ——

"اور آپ کیا تھے پہلے؟" استھانا جی نے پھر ایک وار کیا مجھ پر
میں نے کہا ؎ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا!
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

استھانا جی نے شعر نہیں سمجھا۔ اس لئے زیر لب مسکرا کر چپ ہو گئے۔ سہیل صاحب نے کہا۔ ہاں بھائی وہ ڈاکو مان سنگھ کا قصہ سنائیے۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکو مان سنگھ کے پاس ایک دن ایک پریس رپورٹر بغرض انٹرویو پہونچا۔ اس نے اس سے بہت سے سوال کئے ان سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔
"کس پولٹیکل پارٹی سے وابستگی ہے آپ کی؟"
"جس پارٹی کا خون اشلیل نہیں ہے" مان سنگھ کا جواب تھا۔
خون تو سب کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ پھر یہ اشلیل کیا؟ رپورٹر نے پوچھا۔
رپورٹر کی زبان سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ مان سنگھ نے اس کا بایاں ہاتھ تھام لیا۔ اور اس کی انگلیوں کے ساتھ ملا کر زمین پر رکھ دیا۔ اور میان سے چمچماتا ہوا تلوار نکال کر رپورٹر کے دائیں ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا —— اسے کاٹ ڈالو۔ اگر تم نہیں کاٹو گے تو میں کاٹ ڈالوں گا۔ خوف سے رپورٹر کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اور وہ لرزنے لگا۔ مان سنگھ نے کہا دیکھا تمہارا خون اشلیل ہے۔ وہ جسم سے نکلتے ہوئے ڈرتا ہے۔ میرا خون اشلیل نہیں ہے۔ یہ بالکل بے خوف، بے باک اور نڈر ہے۔ مان سنگھ کی یہ منطق رپورٹر کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ وہاں سے مزید انٹرویو لئے بغیر اپنی جان بچا کر بھاگا۔
استھانا جی کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں بستی پور سے آیا ہوں تو انہوں نے پوچھا "آپ اروں جی کو جانتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ جی جانتا ہوں۔ اکثر ان کے یہاں آنا جانا ہوتا ہے میرا۔ سہیل صاحب کی بھی کوی اروں سے ملاقات ہو چکی تھی اس لئے انہوں نے استھانا جی سے پوچھا۔ بھئی استھانا صاحب! کئی مہا کاویہ کے رچنا کار پدم شری پیارلال اوتار راہدن کیسے شاعر ہیں؟

اروڑن جی میں رہی درابندرناتھ ٹیگور) بابو کی پرتیبھا ہے استھانا جی نے کہا اور میں یہ ریمارک سن کر زیر لب ہنسی کو چھپانے کی سعی کرتا رہا۔

اس طرح گفتگو چلتی رہی اور کام بھی ہوتا رہا۔ چائے اور کافی بھی آتی رہی۔ سہیل صاحب سگار پر سگار پیتے رہے۔ اسٹلیبل اور غیر اسٹلیبل منش اور غیر منش، ادب غیر ادب، ترقی پسند غیر ترقی پسند، جدید قدیم وغیرہ وغیرہ۔ گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ سہیل صاحب دھواں دھار بول رہے تھے۔ جدید ادب سے انکار کیسے ہے۔ مغرب میں ایلیٹ ملارمیا پاؤنڈ نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ کیا غالب جدید نہیں تھے۔ اقبال جدید نہیں تھے۔ فیض اور مخدوم جدید نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے وقت میں جدید تھے۔ اب بھلے ہی قدیم ہو گئے ہوں۔ منٹو، کرشن، بیدی، عباس، عصمت اور نگار حسین بھی جدید تھے۔ اور میں تو کہتا ہوں کلام حیدری اور اختر اور بینوی بھی جدید ہیں۔ اور میں بھی جدید ہوں یا ہم نے پریم چند کی ادبی روایات کو آگے نہیں بڑھایا ہے۔؟ پھر جدید کیسے نہیں ہوئے۔ آج کے یہ شعرا اور ادبا بھی تو کل ہماری ہی طرح قدیم ہو جائیں گے۔ سہیل صاحب نے مجاز لکھنوی کا ایک شعر کوٹ کیا۔

جو ہو سکے تو ہمیں پائمال کر کے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

تب میں نے قطع کلام کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔

حضور! گستاخی معاف! کن جدید شعرا اور ادبا سے آپ متاثر ہوئے۔؟

کسی سے بھی نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔

اور لوگ کس طرح سمجھتے ہیں۔ میں نے پوچھا

سمجھتے ہوں گے۔ ویسے مجھے موقعہ ہی کہاں جو جدید بھی پڑھوں اور قدیم بھی۔ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ رہا ہوں بہت سماجی اور گھریلو ذمہ داریاں ہیں بال بچے ہیں، شادی بیاہ ہے۔ پھر ان کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت۔ بہت کچھ لکھا لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ابھی بہت سے غیر مطبوعہ مسودے پڑے ہیں۔ یہ چھپ جائے تو پھر کچھ لکھوں۔ بولتے بولتے انہیں یاد آ گیا۔ کارڈ بورڈ پر ایک چھپا ہوا ملفوف دعوت نامہ مجھے دیتے ہوئے کہا ہمارے لڑکے لطیف الرحمٰن کی شادی پر آپ بھی تشریف لائیں میں نے کارڈ لے کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کتنا مخلص ہے سہیل عظیم آبادی میں گیارہ بجے ریڈیو اسٹیشن پہونچا تھا۔ اور اب شام کے پانچ بج چکے تھے۔ جاڑے کی احساس اور تھکی ہوئی تھی۔ اس دوران میں نے تین بار سہیل صاحب کو چائے پلا کر شکریہ ادا کرنا چاہا۔ جب کہتا سہیل صاحب! چلئے چائے

بینے توڑتا کہتے ۔ شہر سے منگواتا ہوں ۔ اور میں بے بس ہو جاتا ۔ اور اس طرح ہر TRIPE میں انہیں چار پانچ جاتے یا کافی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ۔ اور میرے ذہن میں میرے عزیز دوست قمر سستی پوری کا یہ جملہ گونجنے لگتا وہ سہیل تیرا کمائیاں ہے جو کچھ ریڈیو سے ملے سب اس کی ذات پر خرچ کر دینا ۔ سب اس کی ذات پر خرچ کر دینا ۔"

ریڈیو اسٹیشن سنسان ہو چکا تھا ۔ چند کارکن جہاں تہاں رہ گئے تھے ۔ چند لڑکیاں لان میں کھڑی خوش گپیاں لڑا رہی تھیں ۔ مگا سہیل صاحب نے کہا چلئے وقت ختم ہو رہا ہے ۔ آپ کی ریکارڈنگ کر لوں ۔ میں ان کے ہمراہ ریکارڈنگ روم تک آیا ۔ ریکارڈنگ روم میں مجھے ایک گدے دار Chair پر بٹھاتے ہوئے مائک درست کیا ۔ مجھ سے غزلوں کا اسکرپٹ لی ۔ ٹیبل پر پھیلایا اور پڑھنے کا طریقہ سمجھایا ۔ اور OPERATING ROOM جا کر مشین اسٹارٹ کر دیا ۔ لال بتی جلی اور میں نے غزل پڑھنی شروع کر دی ۔

صورت لب معبود ہوں، آدم کا لقب ہوں

منجملہ تخلیق دو عالم ....

پریٹنگ روم سے دوڑ کر آئے اور کہنے لگے ایسے نہیں بھائی ۔ اشعار ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھئے ۔ آواز میں گمبیر تا لائیے اپنی شخصیت کو ڈھالئے کیا آپ نے اچھے شعرا کی غزلیں کبھی ریڈیو پر نہیں سنیں ۔ جمیل مظہری اور واہی صاحب کو تو ضرور سنا ہو گا ۔ جمیل صاحب کی تو آواز بھی اچھی نہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کوئی شاعر آواز کا جادو جگا رہا ہے آپ جلدی جلدی پڑھئے گا تو غزلیں بس دو منٹ میں ختم ہو جائیں گی ۔ بقیہ تین منٹ کا کیا ہو گا ۔ میں نے پوچھا اگر پانچ منٹ سے بڑھ گیا تو ؟ کہا کوئی مضائقہ نہیں میں اڈجسٹ کر لوں گا ۔ وقت بڑھے تو بڑھے گھٹنے نہیں ۔

میں نے پھر غزل شروع کی اس بار گاڑی دوسرے مصرعے پہ آ کر رک گئی ۔ میں نے آپریٹنگ روم کے قد آدم شیشے کے اس پار سہیل صاحب کا جھلایا ہوا چہرہ دیکھا ۔ دوڑ کر آئے ۔ اسکرپٹ مجھ سے لیکر خود اشعار پڑھنا شروع کیا ۔ دیکھئے اس طرح پڑھئے ، رک رک کر ، ٹھہر ٹھہر کر ۔ جس طرح مشاعروں میں پڑھتے ہیں ۔ درمیان میں کچھ کچھ بولتے بھی جائیے ۔ یہ شعر دیکھئے ، توجہ چاہتا ہوں ، غور طلب ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ میں نے اس بار ان کی کاپی کی اور کامیاب رہا ۔ مگر وہ پھر چمکے ۔ واہ بہت خوب ، بہت خوب ۔ ایسے ہی پڑھئے ۔ مگر ٹیبل سے آپ نے اسکرپٹ کیوں اٹھا لیا ۔ دیکھتے نہیں فل سائز کا یہ سن لیٹ پیپر کلف دار کھڑکھڑ کی آواز آ گئی ہے ۔ یا تو پیپر کو ہاتھ ہی میں لئے رہئے یا ٹیبل پر ہی رہنے دیجئے ۔ ریڈ لائٹ جلنے پر ان کا مقام مت بدلئے ۔ دوسرا صفحہ پلٹنا ہو تو نہایت آہستگی سے پلٹئے ۔ میں نے غزل شروع کی ۔ اشعار پڑھتا جاتا اور قد آدم شیشے کے پار ان کے چہرے کے تاثر کو بھی کنکھیوں سے دیکھتے جاتا ۔ دیکھتے دیکھتے ان کا چہرہ غضب ناک ہو گیا ۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس بار وہ مجھ پر برس پڑیں گے ۔ جناب تشریف لے جائیے آئندہ اچھی مشق کر کے آیئے گا ۔ مگر میرے سامنے آتے ہی مسکرانے لگے ۔ کہنے لگے آپ سانس اتنی زور زور سے کیوں لیتے ہیں ۔ اسنو فیلیا پیشینٹ کی طرح ۔ ٹیپ میں ہوں سوں کی آواز آ گئی ہے ۔ بالکل محنت بیکار گئی ۔ آپ نروس ہو رہے

ہیں۔ آپ غزل یوں پڑھتے جیسے سمجھے کہ آپ کو کوئی سن نہیں رہا ہے۔ سہیل صاحب کے اس ریمارک پر میں بہت شرمندہ ہوا اور دل ہی دل میں میر کا یہ شعر دہرانے لگا۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

میں نے پھر اشعار پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار دو بار، تین بار چار بار، بار بار مگر کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جاتی۔ کبھی کاغذ کے آواز، کبھی سانس کی آواز، کبھی جوتے کی آواز، کبھی یہ کبھی وہ۔ اب مجھے اپنے آپ پر خود بھی غصہ آرہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ واپس چلا جاؤں۔ ایسی حالت میں سہیل صاحب کا کیا ردعمل ہوا ہوگا میں نہیں کہہ سکتا۔ میں واقعی نروس ہو چکا تھا۔ چونکہ ریڈیو کے متعلق کوئی میری واقفیت نہیں تھی۔ اور اسے میں بہت بڑی چیز سمجھ رہا تھا۔ کہ میری آواز ہندو پاک کے کروڑوں افراد سنیں گے۔ اسی لئے نروس نس کا دورہ مجھ پر پڑا۔ ورنہ درجنوں مشاعرے میں تحت اللفظ ہی میں میں نے بڑی کامیابی سے غزلیں اور نظمیں پڑھی ہیں۔ میرا سر بار ندامت سے اس وقت اور بھی جھک گیا جب ہندی کے ایک تھرڈ کلاس کے کوی کو سہیل صاحب بلا کے آئے اور اس سے اس کی کویتا مائک پر پڑھوا کر مجھے اس کے لہجے کی نقل کی دعوت دی۔ کوی مہاراج کا سر فخر سے اونچا تھا۔ اور میں ہارے ہوئے جواری کی طرح سر نیچا کئے سوچ رہا تھا۔ کاش کوی جی کسی کوی سمیلن میں میرے ساتھ ہوتے۔

قصہ مختصر یہ کہ بڑی جدوجہد اور کدوکاوش کے بعد میری ریکارڈنگ ہوئی۔ سہیل صاحب مسکراتے ہوئے آئے۔ ان کا صبر اور ضبط دیکھنے کی چیز تھی۔ کبھی کی دید نہ شنید، مگر یہ خلوص یہ اخلاق یہ پیار یہ یگانگت یہ سہیل صاحب کا ہی حصہ تھا۔ بار بار حوصلہ افزائی کرتے۔ گھبرائیے نہیں۔ پہلا پہلا پروگرام ہے۔ آئندہ سے ٹھیک رہے گا۔ آپ ترنم سے کیوں نہیں پڑھتے۔ یہ ریڈیو ہے نا۔ عوامی ذوق کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں مجھ سے کہا چلئے آپ کی ریکارڈنگ اب آپ کو سناؤں۔ محنت تو کرنی پڑی مگر ریکارڈنگ شاندار ہوئی ہے اور جب میں نے پہلی بار اپنی آواز سنی تو ششدر رہ گیا۔ پروگرام نشر ہونے کے بعد احباب کا خیال تھا کہ یہ آواز میری نہیں کسی معمّر اور کہنہ مشق شاعر کی ہے یہ سب سہیل صاحب کا معجزہ تھا۔

شام کے چھ بج گئے۔ سہیل صاحب سلطان گنج جانے کے لئے پا بہ رکاب تھے۔ میں نے اصرار کیا حضور میں نے جب جب چائے کی فرمائش کی آپ نے Pay کیا۔ ایک دفعہ میری جانب سے ہو۔ مسکرانے لگے اور چلئے ہم لوگ فریزر روڈ کے ایک خوبصورت اور سجے سجائے بار میں آگئے اندر داخل ہوتے ہی سلیقے کاؤنٹر پر یہ کی ترتیب سے سجی ہوئی قطاریں دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے یہ شعر نکل گیا۔

قطار شیشہ ہے یا کاروان ہمسراں
خرام [illegible]

سہیل صاحب پھڑک اٹھے۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ مجروح کا؟ میں نے کہا ہاں! کہنے لگے بھائی ترقی پسندوں کا کیا کہنا۔ کیا بات کہی ہے۔ بات میں بات۔ حیات و کائنات سے کتنا گہرا رشتہ تھا۔ اس کا کوئی بات بے مقصد نہیں۔ خطابت تو خطابت ہی سہی، مگر ہمارے یہ جدید شعراء؟ کیا لکھ رہے ہیں یہ لوگ؟ میں بالکل چپ رہا۔ میری ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ان سے بحث کرنے کی۔ میں انہیں ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اب جو میں نے بالکل پھر جائزہ لیا تو سمجھ گیا کہ قمر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ سہیل صاحب بڑا کائیاں ہے۔ سہیل صاحب اب اپنے اصلی رنگ میں آئے تھے۔ بھلا میں نے ان سے کب کہا تھا کہ بار میں چلئے۔ میں تو محض انہیں چائے یا کافی پلانا چاہتا تھا زیادہ سے زیادہ کچھ ناشتہ وغیرہ۔ میں نے بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ سہیل صاحب چلے گی؟ "نہیں"

کیوں کیا آپ نہیں پیتے۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ پیتے ہیں، انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

پیتا تو نہیں مگر پی لوں گا۔ میں نے کہا۔

میں پیتا تو ہوں مگر نہیں پیوں گا۔ سہیل صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے لاکھ اصرار کیا وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ مجبوراً میں نے مٹھائیوں کا آرڈر دیا۔ اسپنج، گلاب جامن، سندلیس، برفی وغیرہ وغیرہ۔ جاتے وقت کاونٹر پر جب ہم پہونچے اور پاکٹ میں ہاتھ ڈال ہی رہا تھا کہ سہیل صاحب نے جھٹ سے pay کر دیا۔ میں نے لاکھ احتجاج کیا۔ ایک نہ سنی۔ کہنے لگے وہ آپ سے پیسے لگا ہی نہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ جب میں آپ کے ہاں آؤں گا تو بدلہ چکا دیجئے گا یہ کہاں ہماری قسمت کہ وہاں پانا ہوتا۔

مسکرانے لگے۔ دیر تک مسکرائے، مصافحہ کیا اور مجھے گلے لگا کر رخصت کیا۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ کہنے لگے کہ لطیف الرحمٰن کی شادی میں آنا مت بھول لئے گا۔ اور لوٹتے ہوئے میں راستہ بھر سوچتا رہا، کتنا مخلص ہے۔ کتنا عظیم ہے سہیل عظیم آبادی۔ آفتاب کی ایک ذرہ کمتر پہ یہ نوازش۔ یہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

اور آج جب سہیل عظیم آبادی ہم میں نہیں ہیں۔ موت کے آہنی پنجے نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انہیں ہم سے چھین لیا ہے۔ ان کا خط میرے ٹیبل پر پڑا ہوا ہے لکھا ہے۔

"آپ لطیف الرحمٰن کی شادی پر نہیں آئے مگر آپ کا لکھا ہوا سہرا آپ کی یاد تازہ کرتا رہا۔"

میں سہیل صاحب کے خط کو بار بار پڑھتا ہوں، آنکھوں سے لگاتا ہوں، چومتا ہوں۔ سہیل صاحب کی ایک یادگار تصویر ہے جس میں ان کا دل دھڑک رہا ہے، ان کی روح مسکرا رہی ہے۔ ان کا جسم حرکت کر رہا ہے اور جسے میں نے حرز جاں کی طرح اپنے دل کی دیوار پر چسپاں کر لیا ہے۔ آہ! سہیل عظیم آبادی تو امر ہے، عظیم ہے، غیر فانی ہے۔

کالا آزار پہچانیے

مرض کے آثار :- رک رک کر تیز بخار آنا، بخار کسی قسم کا ہو سکتا ہے ● کمزوری محسوس کرنا ● جسم میں خون کی کمی ہونا ● جسم کا وزن گھٹنا ● بھوک میں کمی ہونا ● تلی (اسپلین) اور جگر کا بڑھنا ● پیٹ بڑھ جانا ● پرانے مریضوں کے ہاتھ پاؤں اور چہرے کی چمڑی کالا پڑ جانا

آپ اسے پھیلنے سے روک سکتے ہیں :- بالو مکھی اس مرض کے پھیلنے کا سبب ہوتا ہے۔ مرطوب اور نمی والی جگہوں، گھر کی دیواروں کے پھٹے ہوئے دراروں یا چھیدوں، گوبر کے ڈھیر یا جمع کوڑا کرکٹ پر انڈے دیتی ہے۔ اور اپنا خاندان بڑھاتی ہے

علاج :- کالا آزار ہونے کا شبہ ہو تو مریض کو نزدیک کے اسپتال یا ہیلتھ سنٹرز میں ڈاکٹروں کی صلاح کے مطابق علاج کرنا چاہیے۔ اگر جانچ کرنے پر کالا آزار نکلے تو اس کا وقت سے پورا علاج کرانا چاہیے۔ کم از کم 20 سوئی ضرور لگوائیں۔ لگاتار سرکاری اسپتالوں اور ہیلتھ سنٹروں میں مفت علاج ہوتا ہے۔

ڈی۔ڈی۔ٹی کا چھڑکاؤ :- گھروں اور گئوشالوں میں ضرور کرائیں۔ سال میں دو چکر۔ فروری۔مارچ اور مئی جون میں ڈی۔ڈی۔ٹی کا ۵ فیصد گھول چھڑکاؤ کے لئے استعمال میں لائیں۔ اس کے لئے تین پونڈ ڈی۔ڈی۔ٹی (۵۰ فیصد) پاؤڈر کے تین گیلن پانی میں گھول تیار کریں۔

روک تھام :-

(۱) گھر کو صاف ستھرا رکھیں (۲) گھر میں جہاں تک ممکن ہو روشنی کا انتظام کریں (۳) زمین پر نہ سو کر چوکی یا کھاٹ پر سوئیں (۴) ننگے بدن نہ رہیں (۵) رات کو مہین مچھردانی کا استعمال کریں۔

(۶) گھر کے آس پاس پانی کا جماؤ نہیں ہونے دیں

(۷) سونے والے گھر سے گئوشال کو دور رکھیں

(۸) گھر کے آس پاس گوبر کا ڈھیر جمع نہ کریں

(۹) سرسوں تیل سے بنائی گئی چکنی لوشن کا رات میں استعمال کرنے سے بھی اس مرض سے آپ کی حفاظت ہو سکتی ہے

P.R.No 109 D (imf-65) 92-93

کچھ رینو کے بارے میں

رضا اشک بستی پوری

مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۹۹ء کے پندار میں معروف افسانہ نگار جناب رفیع حیدر انجم کا مضمون "اردو نے رینو پیدا نہیں کیا" بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھا۔ مضمون معلوماتی بہت جاندار اور انداز نگارش نہایت دلکش ہے۔ رفیع حیدر صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے پھنیشور ناتھ رینو جیسے اہم اور قابل قدر شخصیت کے ادبی کارناموں سے اردو کے قارئین کو روشناس کراکر ایک اہم ادبی فریضہ ادا کیا ہے۔ گذشتہ بیس سالوں میں ہندی میں رینو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اردو میں ان کا تذکرہ خال خال ہی ملتا ہے۔ بلاشبہ رینو ہندی کے ایسے ادیب ہیں جنہوں نے اپنے آنچلک ناولوں کے ذریعہ ہندی ناول نگاری کو مزید وقار بخشا اور اپنی سہل نگاری سے اسے بول چال کی بھاشا بنا دیا ہے۔ رینو کی اس رویے کی بنا پر ہم رینو کو صحیح معنوں میں عوامی ناول نگار بھی کہہ سکتے ہیں۔ "میلا آنچل" کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ رینو کا دیہی زندگی کے متعلق مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بڑا عمیق و وسیع تھا۔ اور انہوں نے جس سچائی، خلوص اور خوبصورتی سے یہاں کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے۔ اور یہاں کے بول چال، رہن سہن اور سکھ دکھ اور تہذیب و معاشرت کو لباس فن عطا کر کے ناول کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اس کی نظیر ہندی اور اردو میں ناول میں کم ملتی ہے۔ رینو کا قلم گویا کسی حقیقت نگار شاعر کا قلم ہے۔ جو کسی منظر اور واقعہ یا کردار کے باطن و ظاہر میں جھانک کر منظر کے ساتھ پس منظر اور جسم کے ساتھ روح کو بھی کسی مشاق مصور کی طرح صفحۂ قرطاس پر منعکس کر دیتا ہے مگر مضمون میں رفیع حیدر انجم صاحب نے کچھ ایسی باتیں بھی کہی ہیں جن سے کافی حد تک اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ہندی والوں کا دل جیتنے کے لئے اور کچھ رینو کے ہم وطن ہونے کے ناطے ان کا صداقت نگار قلم کہیں کہیں رینو جی کی تعریف میں ضرورت سے زیادہ سیاہی صرف کر گیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد ہندی ادب کا جائزہ لینے پر عالمی سطح کے ایک معتبر کہانی کار اور ناول نگار پھنیشور ناتھ رینو کا نام نظر آتا ہے۔"

ین پریم چند کی روایت کو بنگلہ سے بہتے ہوئے فنکار صرف ہندوستانی ادب میں رینو کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ملیح محمود صاحب نے رینو کی ناول نگاری کی پریم چند کے علاوہ قریب قریب اردو کے تمام اہم ترین قدیم و جدید افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کا رینو سے تقابلی موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "لیکن ان میں سے ایک بھی ناول نگار ایسا نہیں جنہیں پھنیشور ناتھ رینو کی طرح آنچلک کتھاکار اعزاز سمجھا جا سکے"۔ مضمون کے آخر میں وہ رقم طراز ہیں یہ نکتہ قابل فکر یہ ہے کہ اردو ادب میں رینو جیسا آنچلک کتھاکار پیدا نہیں ہوا"۔

اب سوال یہ ہے کہ عالمی سطح پر رینو کی ادبی شخصیت واقعی قابل ذکر اور لائق اعتنا ہے؟ بحیثیت مجموعی کیا رینو صرف اپنی آنچلکتا کے سبب پریم چند، بیدی، منٹو، خواجہ احمد عباس، غیاث احمد گدی، اور رام لعل اور اس سے قبل کے ناول نگاروں سے بڑے فنکار ہیں؟ اور خود اردو کے متذکرہ بالا قلم کاروں کا عالمی سطح پر کیا مقام ہے؟ مزید براں ہندی کے وہ کون سے ناول نگار ہیں جن کے قد کو موپاساں، ٹالسٹائی، میکسم گورکی، چیخوف، دستوئیفسکی اور سارتر وغیرہ کے قد سے ہم ناپ سکتے ہیں؟ اس فیصلے کے بعد ہی ہم پھنیشور ناتھ رینو کے متعلق عالمی سطح پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ دوسرے ہندی کے بڑے ناول نگاروں کی فہرست میں رینو جی کی کون سی جگہ ہے؟ کیا صرف آنچلکتا کی بنیاد پر ہم رینو کو مقام دینے میں حق بجانب ہیں جو دیگر بڑے ہندوستانی ناول نگاروں کا حصہ ہے۔ جیسے بنگلہ میں شرت چند، بنکم چندر، بمل متر وغیرہ۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رینو پہلے آنچلک کتھاکار نہیں ہیں۔ ان کا پہلا آنچلک اپنیاس (ناول) ۱۹۵۴ء میں چھپا ہے۔ اس سے تقریباً تیس سال قبل (۱۹۲۶ء) میں آچاریہ شیو پوجن سہائے نے اپنے ناول "دیہاتی دنیا" میں دیہات کی طرز معاشرت اس کی تہذیب اور وہاں کی غربت و توہم پرستی کی سچی اور مکمل تصویر کشی کی ہے۔ اس ناول میں بھوجپوری آنچل کی منظر کشی اور کردار نگاری ہے۔ پھر دیوکی نندن کھتری کا ناول "چندر کانتا"، پریم چند کا "گئودان"، "کرم بھومی"، "پریم آشرم"، برندا لال ورما کا "تبدیلی کنڈ" اور ناگ ارجن کا "بلچنما" اور بابا بٹیشر کو بھی آنچلک کتھاکار کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ جس میں آنچلکتا کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو پھنیشور ناتھ رینو کے آنچلک ناولوں کا طرۂ امتیاز نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ رینو نے اپنے فکر و فن کا محور و مرکز صرف آنچلکتا کو ہی بنایا۔ اس لئے ان کے یہاں تصویر کا رنگ بہت گہرا اور نکھرا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ رینو نے اپنے ناول "میلا آنچل" کے پیش لفظ میں اپنے اس ناول کو خود آنچلک ناول کا نام نہیں دیا ہوتا تو اس کے قبل کے دیگر ناول نگاروں کی طرح بھی سماجی دیہی حقیقت نگاری ہم رینو اور معاشرتی ناول نویس کی حیثیت سے ہی جانتے۔

پھر بھی اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ رینو نے دیہات کے ایک مخصوص و محدود علاقہ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنا کر وہاں کی آنکھوں دیکھی زندگی اس سچائی اور حسن کاری سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے کہ ہندی کے بڑے بڑے کتھاکاروں اور ناقدوں کو چونکا دیا۔ اور ان کے ناولوں نے عالمی مقبولیت حاصل کر لی ——— اب یہ بات کہ اردو ادب میں

کوئی [illegible]ا نہیں کیا۔ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ یہ اپنی اپنی افتادِ طبع اور مزاج کی بات ہے۔ اگر ہم یہ [illegible] کہ ہندی میں کوئی میر، انیس یا دبیر سا مرثیہ نگار اور جوش و فراق سا رباعی گو کیوں نہیں ہوا۔ اور اردو شاعری میں مہا کاویہ (EPIC) کی روایت نہیں کے برابر ہے تو اس کا جواب کیا ہوگا۔

جہاں تک دیہی زندگی (آنچلک جیون) کی عکاسی کا سوال ہے تو اردو میں بہتر قلم کاروں نے تو یہ کام کیا ہی ہے پریم چند کے بیشتر کہانیوں اور ناولوں کا پس منظر دیہات ہی تو ہے۔ رینو کے میلا آنچل میں دیہات کی حقیقی منظر کشی ضرور ہے ہو سکتا ہے وہ اس معاملے میں پریم چند سے آگے بھی بڑھ گئے ہوں۔ پھر بھی ان کے ناول کا کینوس پریم چند کے ناولوں (خصوصاً گئودان میں تو پورا ہندوستان سما گیا ہے) اس میں کروڑوں کسان اور [illegible] زمیندار اور مہاجن سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ ہوری اور دھنیا پورے ہندوستان کے استحصال زدہ طبقے کے نمائندہ کردار بن گئے جہاں تک مجھے یاد ہے اردو میں راجندر سنگھ بیدی کا معروف ناولٹ ایک چادر میلی سی پنجاب کے دیہات کی ہی کہانی ہے اور اپنی حقیقت نگاری میں لاثانی ہے۔ کیا اسے آنچلکتا کے زمرے میں ہم نہیں رکھ سکتے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ رینو جی کے ناول کا نام "میلا آنچل" بیدی کے "ایک چادر میلی سی" سے ہی مستعار ہے۔

آج سے تقریباً پندرہ یا بیس سال قبل میرے ایک دوست بالیشر اجینیو (ہندی کے جدید کوی) نے مجھے ایک ہندی کے ادیب سے ملایا تھا۔ جو اس وقت دہلی ریڈیو اسٹیشن میں کسی اونچے عہدہ پر فائز ہیں۔ یہ رینو کے قریبی دوستوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں میلا آنچل کی کہانی کو کسی معروف بنگالی ناول نگار کے ایک ناول کا سرقہ ثابت کیا ہے۔ یہ مضمون ہندی رسالہ میں چھپ بھی چکا ہے۔ اس کی صحیح جانکاری ابھی تو نہیں آئندہ دے سکتا ہوں۔

آخر میں یہ بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ رفیع حیدر انجم صاحب نے اردو کے محققوں اور نقادوں کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی تھی۔ مگر چونکہ میں کوئی محقق اور نقاد نہیں ہوں محض ایک قاری ضرور ہوں یہ میری جرأت ہی ہے کہ میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رفیع حیدر انجم صاحب جو ایک سلجھا ہوا ذہن اور بالیدہ افسانوی شعور رکھتے ہیں مجھے میری اس خامہ فرسائی کے لئے معاف فرمائیں گے۔

کیوں میں قلمکار لکھوں

شاعری اگر تہہ افلاک نہیں دے سکتی
شاعری روح کی خوراک تو ہو سکتی ہے
شاعری جسم کو پوشاک نہیں دے سکتی
شاعری جینے کا ادراک نہیں دے سکتی
دل کو یہ حسرت بلقیس تو دے سکتی ہے
تخت اور تاج سلیمان نہیں دے سکتی
شاعری ہاتھ میں تیشہ تو تھما سکتی ہے
قصر پرویز مری جان نہیں دے سکتی
کون پوچھے یہ بھلا مرتبت فردوسی سے
شاعری دولت سلطان نہیں دے سکتی
بشیر غم یہ لہو تھوک کے مرجانے تک
یہ کوئی جینے کا سامان نہیں دے سکتی
شاعری عظمت شہکار تو ہو سکتی ہے
شاعری رفعت گفتار تو ہو سکتی ہے

شاعری پھول اور تلوار تو ہو سکتی ہے
شاعری ٹیپو کی للکار نہیں ہو سکتی
شاعری رانا کا ہتھیار نہیں ہو سکتی
پل میں یہ قوم کی قسمت کو بدل دے تو کہوں
فکر و فن کا یہ نیا تاج محل دے تو کہوں
برف میں آگ اور فصلوں سی غزل دے تو کہوں
شاعری جنگ کا تازہ کوئی حل دے تو کہوں
بات جب یوں ہے تو میں کیوں بھلا اشعار لکھوں
غالب و میر کا میں خود کو پرستار لکھوں
مردہ شاہوں کے قصائد سر دربار لکھوں
کیا ضروری ہے کہ میں خود کو قلمکار لکھوں
کیوں بھلا، کس کے لئے اشک میں فنکار لکھوں

کوئی ذی جاہ نہیں تھا

وہ جادۂ من جانب اللہ نہیں تھا
وہ راہ فرشتوں کی گزرگاہ نہیں تھی
اوتار پیمبر کوئی ہمراہ نہیں تھا
دوزخ سی سلگتی ہوئی اک آتش نمرود
مجرم سے قطار اندر ہیں کھڑے شاہد و مشہود
جاگا ہوا ابلیس اور سویا ہوا معبود
ایسا نہیں جینے کی کوئی چاہ نہیں تھی
مریم کی، مسیحا کی کمک آہ نہیں تھی

جائے بھی کہاں بھاگ کے ہر راہ تھی مسدود
چھپے بھی کہاں کوئی کمین گاہ نہیں تھی
ہر چند یہ حملہ کوئی ناگاہ نہیں تھا
یہ جشن چراغاں تھا غلاموں کے لہو سے
حیرت ہے کہ کوئی وہاں ذی جاہ نہیں تھا

زندگی

میں ملا اک امیر زادے سے
اور پوچھا کہ زندگی کیا ہے ؟
بولا خوش رنگ پھول ہے بابا
میں ملا مفلس جفاکش سے
اور پوچھا کہ زندگی کیا ہے ؟
بولا شاخِ ببول ہے بابا
میں ملا اک بڑے مفکر سے
اور پوچھا کہ زندگی کیا ہے ؟
بولا اک راہِ طول ہے بابا
میں ملا راہبِ کلیسا سے
اور پوچھا کہ زندگی کیا ہے؟
قتل گاہِ رسول ہے بابا
میں ملا اک حرم کے مرشد سے
اور پوچھا کہ زندگی کیا ہے ؟
نیکیوں کا حصول ہے بابا
باتیں جب سن چکا مرا ہمزاد
چپکے سے کان میں کہا اس نے
زیست خالق کی بھول ہے بابا

(غیر مطبوعہ)

سحر ہونے تک

اس سے پہلے کہ خاک ہو جاؤں
حصۂ ارضِ پاک ہو جاؤں
قبرِ مالک پہ بن تحریرہ کا
نوحۂ دردناک ہو جاؤں
زندگی میں ہلاک ہو جاؤں
بھڑکوں ظلمت میں یوں شرر بن کر
منظرِ تابناک ہو جاؤں

اس سے پہلے کہ خاک ہو جاؤں
دیمکوں کی خوراک ہو جاؤں
بن کے مقتول میں فریدوں سا
یادِ ظلمِ ضحاک ہو جاؤں
مسلکِ چارواک[1] اپنا کر
عظمتِ بالزاک ہو جاؤں

اس پہلے کہ خاک ہو جاؤں
جنگ سے میں وناش ہو جاؤں
جسم یہ قاش قاش ہو جائے
ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاؤں
اپنا اک اتہاس ہو جاؤں
اک نئے یگ کی میں کتھا لکھ کر
والمیکی، بیاس ہو جاؤں

[1] قدیم ہندو مفکر جو آخرت کا منکر اور زندگی میں عیش پسندی کا مبلغ تھا

درد

درد جسمانی ہو یا روحانی
چاہے ہو دردِ نوعِ انسانی
درد کا سلسلہ ہے طولانی
درد سے زندگی عبارت ہے
درد ہی انتہائے عشرت ہے
درد سے لرزاں تارِ ہستی ہے
درد سے فن میں کیف و مستی ہے
درد ہے ارتقائے انسانی
اس سے پائندہ عالمِ فانی
درد سے کس لئے گریز کریں
درد کی لے کو اور تیز کریں

ایک آرزو

مرے خدا مرے ہر رنج و غم کو حل کر دے
جو دل پہ داغ لگے ہیں اسے کنول کر دے
غریبِ شہر ہوں کب سے دیارِ غربت میں
اٹھے جو آہ جگر سے اسے غزل کر دے
میں کوئی شاہ نہیں پھر بھی میری عصمت کو
پہنا دے تاج اور ممتاز کا بدل کر دے
میں ان کے واسطے فن کا بناؤں تاج محل
مرے وجود کو اک تیشۂ عمل کر دے
اگرچہ یہ نہیں ممکن تو پھر مرے معبود!
اسے دمینتی بنا دے مجھے تو نل کر دے
وہ مجھ کو موت کی ہاتھوں سے چھین لے بڑھ کر
مری حیات کو تو فاتحِ اجل کر دے
اب اس کے بعد بھی لپکوں کسی بدن کی طرف
یہ بازو کاٹ لے اور پاؤں دونوں شل کر دے

شورشِ خاموشی

لبوں پہ مہرِ خاموشی
بدن میں گھل گیا ہے زہرِ خاموشی
میانِ شہرِ خاموشی
لہو اور آگ کی بارش
خدایا قہرِ خاموشی
اٹھے ہنگامہ
اب ٹوٹے سکوتِ حشرِ خاموشی

قطعات

○

مجھے تو جرأتِ صدام دیدے
کسی ناصر سا مجھکو نام دیدے
جو ویتنام میرا دل بنایا
تو روحِ مصر، جسم شام دیدے

○

سنہرا حادثہ ہونے سے پہلے
روپہلا سلسلہ ہونے سے پہلے
خدانخواستہ پھر سانحہ ہو
کسی کی داشتہ ہونے سے پہلے

○

سمندر کی صدا میں بن گیا ہوں
جزائر کی ہوا میں بن گیا ہوں
پکارا ہے فرات و نیل نے جب
تو موسیٰ کا عصا میں بن گیا ہوں

○

بڑا گراں ہے نہ گنجِ خطیر بیچا کر
ملے بھی تاج نہ دل اور ضمیر بیچا کر
تجھے ہے عظمتِ میر اور نظیر کی سوگند
ہو سر قلم بھی نہ ہرگز سریر بیچا کر

○

ولی و پیر و پیمبر کہاں ہیں
خدا اور داورِ محشر کہاں ہیں
وہ ابرہا اٹھا پھر فیل لے کر
ابابیلوں کا وہ لشکر کہاں ہے

○

وادیٔ آبشار سے لکھنا
یا کہ شہرِ چنار سے لکھنا
چیر اور دیودار جلنے کا
خط ذرا اختصار سے لکھنا

قطعات

○

قلم میں آگ کی حدت نہیں ہے
لہو میں بھوک کی شدت نہیں ہے
بہت فنکار کی شہرت ہے لیکن
مگر فن کی کوئی اجرت نہیں ہے

○

کہتے ہیں مرے شعروں میں اسقام بہت ہیں
میں چپ ہوں یہاں حافظِ خام بہت ہیں
میری طرح کس کس کو یہاں ملتی ہے شہرت
اس شہر میں میرے بھی ہمنام بہت ہیں

○

خود کو نہ کبھی اشک میں نقاد لکھوں گا
لکھنا ہی ہے تو پھر مانی و بہزاد لکھوں گا
برہم ہیں تو برہم رہیں یہ خسرو و پرویز
فرہاد تھا، فرہاد ہوں، فرہاد لکھوں گا

○

نخلِ زر جبکہ بارآور ہو
علم کی ٹہنی ٹوٹ جاتی ہے
لکشمی جس کے پاس ہوتی ہے
سرسوتی اس سے روٹھ جاتی ہے

○

لکھا ہے مری نظم کا عنوان غلط ہے
کل مجھ سے کہیں گے مرا دیوان غلط ہے
یہ لوگ ہیں وہ جو خدا کے رہے منکر
کل تک یہی کہتے تھے کہ قرآن غلط ہے

○

میں تخت و تاج و حکومت خرید سکتا ہوں
نظامِ زر کی معیشت خرید سکتا ہوں
ہمارے کاسے میں جمہوریت کی دولت ہے
میں گاندھی، نہرو کی عظمت خرید سکتا ہوں

قطعات

○

خوشی تو ہوگی یقیناً ترے مؤرخوں کو
سلگتی آگ بنا کر ترے سفینوں کو
میں جانتا تھا کہ میر جعفر کے یہ چیلے قصداً
ضرور لوٹیں گے دلی کے کل مکینوں کو

○

انساں نہیں ہے ایک درندہ ہے جارج بش
بانی شر ہے ظلم کنندہ ہے جارج بش
دنیا میں ایسے کار فلاکت کے باوجود
میں سوچتا ہوں کس طرح زندہ ہے جارج بش

○

وزیرو، شاہوں، رعایتوں کی کیفیت لکھنا
غریب شہر مہاجر کی خیریت لکھنا
دیار پاک کے لئے نیک نام ہم نفسو!
بچشم نم ہمیں یہی حال مملکت لکھنا

○

شبیر و یزید کا سا ستمگر ہے جارج بش
ہٹلر کا ہم خیال و ہمسر ہے جارج بش
اسلام کی شکست کا ناٹک ہے یہ امن کونسل
جس کا کہ اک خطیر ڈائرکٹر ہے جارج بش

○

نجوم و ماہ سا رخشندہ کر دے
مجھے سورج سا تو تابندہ کر دے
وہ کرہ جو ہے صدیوں سے اندھیرا
وہاں کا مجھکو تو باشندہ کر دے

○

تم کو یہ کہنا ہے کہ خدا کارساز ہے
ہر رنج و غم کا حل بھی وہ چارہ ساز ہے
چشم زدن میں کس طرح بغداد لٹ گیا
بولو جواب اس کا کیا امن ساز ہے

قطعات

○

فن ہو نیلام سرِ عام ضروری تو نہیں
عظمتِ فن کا لگے دام ضروری تو نہیں
فکرِ غالب ہو یا وہ پیکرِ چغتائی ہو
اس کو سب کو ملے انعام ضروری تو نہیں

○

وطن میں اپنے الیکشن کا [illegible] ہے
ہے جس کے ہاتھ میں بیلٹ اسی کا [illegible]
یہاں دھاندلی نہیں کیا لوگ [illegible] کہتے ہیں
ہمارے ملک میں جمہوریت ہے [illegible] ہے

○

بدن پہ لاٹھی کی، گولی کی سخت بارش ہے
مری نظر میں وہی منظرِ بیالیس ہے
یہ اہلِ شہر پہ کیسا جنون طاری ہے
ہر ایک ہاتھ میں مشعل ہے اور ماچس ہے

○

تم اپنی بھوک اور غربت کا ذکر مت کرنا
اور اپنی بیوی کی ذلت کا ذکر مت کرنا
تم اپنے ملک کی سرحد سے خط اگر لکھنا
تو اس میں جابر حکومت کا ذکر مت کرنا

○

خیالِ گوتم و لینن کے سمبدھان کا قتل
مہان گاندھی و نہرو کے خاندان کا قتل
یہ میرے ملک میں کیا قتل کی سیاست ہے
خدا گواہ ہے یہاں زبان کا قتل

○

جب میں اپنی صدی کو دیکھتا ہوں
آج کی زندگی کو دیکھتا ہوں
[illegible] کو دیکھتا ہوں [illegible] میں
[illegible] کو دیکھتا ہوں

قطعات

○

راہ کے اجالے پہ نہیں جیتے ہیں
ہم بھیک کے پیالے پہ نہیں جیتے ہیں
خود اپنا بدن اوڑھ کے سو جاتے ہیں
بخشش کے دوشالے پہ نہیں جیتے ہیں

○

کس کا دل ہے جو زخم زار نہیں
کس کے سینے میں اک غبار نہیں
زندگی سے فرار ممکن ہے
موت سے تو مگر فرار نہیں

○

موت کی گرچہ شہر یاری ہے
موت کا حکم بشر پر جاری ہے
لاکھ ہستی پہ یہ کرے یلغار
زندگی کا سفر تو جاری ہے

○

مرگ ہستی پہ رونا دھونا کیا
یاد ماضی میں عمر کھونا کیا
موت تو اک اٹل حقیقت ہے
اس کی خاطر اداس ہونا کیا

○

یوں تو ہر اک بشر کو مرنا ہے
موت کا زہر نوش کرنا ہے
لاکھ ہستی پہ یہ کرے یلغار
زندگی سے تو جنگ کرنا ہے

○

شعر فہمی سے دور ہیں یہ لوگ
آل احمد سرور بنے ہیں یہ لوگ
گفتگو کا بھی کچھ شعور نہیں
ابرِ دانش فشاں ہیں یہ لوگ

درخت لگائیں ۔ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے اہم جان ہے اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔

(۲) یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کے وسائل کا استعمال پورے وویک سے کریں۔

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتے ہوئے اس کی حفاظت آنے والی نسل کے لئے کریں

(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہترین عمل ہے۔ اس سے فرار نقصان دہ ہوگا۔

(۵) بارہ اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات اتنا پراگندہ ہو جائے گا کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا

(۶) سرزمین کے وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے۔

(۷) یہ کون نہیں جانتا کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی اس سرزمین پر پہلے ہوئی تھی۔ انہوں نے ہی ایسے حالات پیدا کئے جس سے انسان کا اس سرزمین پر افزائش ہوئی۔ آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے۔

(۸) درخت لگائیں — جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں

جاری کردہ محکمہ جنگلات و ماحولیات بہار

P.R. No. [illegible]

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شسنہاروی ▲ بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس شسنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

مجلس مشاورت

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر

ایڈیٹر :- جمیل منظر

معاونین :- شکیل احمد حبانی، عبدالقیوم اہدالی، فیضان عزیزی

▲ کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ▲

شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۵۲

بدل اشتراک

- فی شمارہ .... ۵/= روپے
- زر سالانہ .... ۵۰/= روپے
- لائف ممبری .... ۱۰۰۰/= روپے

▲ فہرست ▲

★

★

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل گیا

ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۲۰۵۲۳ ۱

نمود

اردو یونیورسٹی کا استقبال

مرکزی حکومت نے ابھی حال میں یہ فیصلہ لیا ہے کہ ہندوستان میں ایک مرکزی اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ یہ پرانا مطالبہ اور حق تھا۔ جسے دیر ہی سے سہی پورا کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اردو کے لسانی اقلیتی طبقے کی متعدد ضرورتوں اور مطالبوں کے بیچ اگر مرکزی حکومت کے اس ایک منصوبے کو بھی عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اردو آبادی کو اس کے لئے ممنون ہونا چاہئے ہم ادارہ "سہیل" اور اس کے تمام قارئین کی طرف سے حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اپنے امتنان و تشکر کا اظہار کرتے ہیں ——— اور ساتھ ساتھ یہ یاد بھی دلانا چاہتے ہیں کہ یہ اردو زبان ہی ہے جو قومی ہم آہنگی، تہذیبی دلکشی اور ہمارے مخلوط کلچر کی سچی یادگار اور صحیح ترجمان ہے۔ اس حقیقت کا اظہار آزادی کے بعد سے آج تک تمام سیاسی قائدین اور دانشور حضرات بھی کرتے آئے ہیں ـــ لہٰذا اردو کو اس کا حق دیتے ہوئے حکومت کو یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ اس نے کسی لسانی اقلیت پر احسان کیا ہے۔ بلکہ قومی یکجہتی کی تعمیر میں یہ ایک خوش گوار قدم ہے۔ ہندوستان پر آنے والا وقت اس حقیقت کی بہتر طریقے سے توثیق کر سکے گا۔ اردو کو اس کے جائز حقوق دے کر حکومت آنے والی آندھیوں سے لڑنے کے لئے ایک کبھی نہ بجھنے والا چراغ روشن کر سکے گی۔

اس مجوزہ یونیورسٹی کے خدوخال کیا ہوں گے، اس کی ساخت کیا ہوگی، اس کا دائرہ کیا ہوگا ——— یہ اور ان جیسے نکات پر غور و خوض کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل بھی کر لی ہے ـــ اس لئے لگتا ہے کہ یہ اعلان محض اعلان نہیں رہے گا۔

پورا ہندوستان اس حقیقت سے واقف ہے کہ اردو کے تحفظ، اس کی لبقا
اس کے ارتقا کے لحاظ سے بہار تمام ریاستوں میں ممتاز ہے۔ ہندوستان گیر سطح پر ہونے و
اردو کشی کی سازش میں بہار کی حکومتیں اور یہاں کے عوام کا امتیاز ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ان
نے اردو کی مدافعت کی ہے ـــ اور اسی بنا پر آج بہار میں اردو کا استعمال دوسری تمام ریاستو
سے زیادہ ہے۔

اس منظر نامہ کی روشنی میں مرکزی حکومت اگر مجوزہ اردو یونیورسٹی کا صد
دفتر بہار میں قائم کرے تو یہ بات سب سے زیادہ مناسب ہوگی ـــ وہ یوں بھی کہ اس
ریاست میں اب تک کوئی Central University قائم نہیں ہو سکی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کے سامنے یہ جواز سب سے بہتر ہے۔ ریاست بہار
ایک سنٹرل یونیورسٹی بھی مل جائے گی ـــ اور اردو کو اس کے اپنے سب سے بڑے گھر
میں رہنے کا موقع بھی مل سکے گا۔

ـ مسعود منظر ـ

قسط ۵

اصغر علی انجینئر

پریم چند حیات اور فن

پریم چند زندگی بھر فرقہ واریت
لعنت کے خلاف لڑتے رہے۔ اس لئے ضرورت ہے
ہم اس سلسلے میں ان کے خیالات پر کچھ روشنی ڈالیں۔
و ہم جانتے ہی ہیں کہ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست
ناصر ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیتے تھے اور دیش
آزادی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے رہتے تھے
اصل یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ فرقہ واریت کی بنیاد
ہب ہے۔ یہ پڑھ کر کچھ لوگوں کو تعجب ہوگا کیونکہ فرقہ
یست طاقتیں ہمیشہ مذہب کی دہائی دیتی ہیں۔ یہاں تک
ہم میں سے اکثر لوگ تو یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر فرقہ
یت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے تو ہمیں مذہب کی
خ کنی کرنا ہوگی لیکن جو لوگ سیاست پر گہری نظر رکھتے
یا وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقہ واریت کی اصل جڑ
ہب نہیں۔ وہ مفادات ہیں جن کا سیاسی اور معاشی
بدلی سے نقصان ہوتا ہے۔ یہ مفاد پرست عناصر کسی طرح
بی ایک مبنی بر انصاف معاشرہ قائم کرنے دینا نہیں
چاہتے۔ وہ تمام ایسی سیکولر طاقتوں کی زبردست مخالفت
کرتے ہیں جو ایک سیکولر جمہوری نظام قائم کرنے کے حق
میں ہیں۔ ایسے عناصر بھیڑے ہوئے عوام کے مذہبی جذبات
کو مشتعل کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ ان مفاد
پرست عناصر کے لئے مذہب محض ایک آلہ کار ہے اور وہ
مذہب کو آلہ بنا کر اپنے مفادات کی حفاظت کرنا چاہتے
ہیں۔ ہم جب تک فرقہ واریت کے اصلی روپ کو نہیں پہچانیں
گے اس کا ٹھیک طور سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ فرقہ
واریت کی لعنت آج بھی ہمارے جمہوری اور سیکولر معاشرے
کے لئے ایک زبردست خطرہ بنی ہوئی ہے ملک کی آزادی کی
جدوجہد میں بھی اس نے بڑا منفی رول ادا کیا ہے۔

جب بھی عوامی تحریک آزادی کے لئے یا مبنی بر انصاف
معاشرہ قائم کرنے کے لئے زور پکڑتی ہے فرقہ پرست طاقتیں
پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور بغلیں جھانکنے لگتی ہیں۔ لیکن جب
بھی عوامی تحریک کمزور ہوتی ہیں فرقہ پرست طاقتیں آگے
آ کر عوام میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ مذہب کی

میں الجھا کر مفادات پر کوئی چوٹ نہ پڑے۔ عدم تعاون ترک موالات کی تحریک جب زوروں پر تھی اور عوام ے جوش و خروش سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ۔فرقہ پرست لیڈر بغلیں جھانک رہے تھے۔ ان میں ہمت نہ تھی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں کرا ان کی متحدہ طاقت کو توڑ سکیں۔ لیکن ترک ت کی یہ تحریک ۱۹۲۳ء میں چوری چورا واقعہ کے بعد ب واپس لے لی گئی تو فرقہ پرستی نے زور پکڑا اور دونوں ت سے مفاد پرست عناصر نے شدھی اور تبلیغ کے چولے کر ہندو اور مسلم عوام کو لڑانا شروع کر دیا۔ ملک فضا مسموم ہو گئی اور آزادی کے جیالوں کو بڑی ن کا سامنا کرنا پڑا۔

پریم چند آزادی کے متوالے تھے اور ہندوستان بلد انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ظاہر ان کے لئے فرقہ پرستی ایک ناقابل برداشت لعنت تھی ہ ہندوستانی معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنا ہتے تھے تاکہ عوام کی طاقت کمزور نہ ہونے پائے۔ انہوں ہر طرح سے فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کیا اور اس سلسلے مضامین بھی لکھے۔ ہم نے اوپر ان کے چند اقتباسات کا سوراجیہ کا تصور واضح کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ وہ ہندوستان کا ایسا تصور رکھتے تھے جو ہر طرح کی ضا فیوں سے پاک ہو۔ ایسا شخص کیسے فرقہ پرستی ی بھی صورت میں برداشت کر سکتا ہے۔ فرقہ پرستی کی یں ایسے ہی معاشرہ میں پھیلیں ہیں جہاں نابرابری ہو، نیچ ہو، ناانصافی اور مفاد پرستی ہو پریم چند ان باتوں کے خلاف تھے اور فرقہ پرستی کی جڑوں کو ہمارے رے سے اکھاڑے بغیر ان تمام لعنتوں سے بھی نجات مل سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ذہنی

اور تہذیبی پس منظر بھی ایسا تھا جس میں فرقہ پرستی کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ ایک کالستھ گھرانے میں پیدا ہوئے جو ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی روایتوں کا علمبردار تھا۔ ان کی تعلیم بھی شروع میں اردو فارسی زبان میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ایک مسلم مولوی کے ہاتھوں حاصل کی۔ دیہاتوں میں ویسے بھی فرقہ پرستی کی لعنت نہیں پائی جاتی۔ اس کی جڑیں شہری علاقوں میں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں اور پریم چند کا تعلق ایک چھوٹے سے دیہات سے تھا۔ وہ بچپن سے ہی فرقہ واریت کی مسموم فضا سے دور رہے۔ قمر رئیس اپنے مضمون "پریم چند اور فرقہ واریت" میں لکھتے ہیں۔

"پریم چند بھی اس روشن طبع جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور کم و بیش اسی تاریخی شعور اور وسعت ذہنی کے ساتھ انہوں نے ہندوستانی عوام کی معاشرت اور تہذیب کو دریافت کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی صنفی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ سوامی وویکا نند اور آریہ سماجی رہنماؤں کے خیالات سے بھی متاثر رہے اور اس عہد کی بعض کہانیوں اور ناولوں میں ان خیالات کی اشاعت بھی کی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پریم چند یہاں بھی غیر ملکی حکومت کے چنگل سے آزادی اور بیوگی اور چھوت چھات کے خلاف احتجاجی خیالات پر زور دیا ہے —— دوسرے احیا پسندانہ خیالات سے انھوں نے بہت کم تعلق رکھا اور صرف چند برس بعد احیا پرستی کو قدامت پرستی اور فیوڈل طرز کی نقاب سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔ فرقہ واریت کے سلسلے میں قمر رئیس نے بڑی اہم بات کی طرف اشارہ

گیا ہے۔ آریہ سماج فرقہ پرستی کے معاملے میں بے داغ نہیں رہی ہے اور چونکہ پریم چند، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، آریہ سماج تحریک کے بڑے حامی تھے بعض لوگوں کو پریم چند کی طرف سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پریم چند آریہ سماج کے سماجی اصلاح پسندی کے دلدادہ تھے۔ جہاں آریہ سماج نے ویدوں پر زور دیکر احیا پرستی کو جلا دی وہاں اس نے ہندو سماج کی برائیوں کی کڑی نکتہ چینی بھی کی۔ پریم چند خود سماجی اصلاح کے علمبردار تھے اور ان کی اسی ذہنی رجحان نے انہیں آریہ سماج کی طرف کھینچا اور انہوں نے اپنے مضامین اور تخلیقی ادب کے ذریعہ سماجی اصلاحات کا خوب پرچار کیا۔ لیکن انہوں نے آریہ سماج کو احیا پرستی اور بعض حالات میں فرقہ پرستی کی کبھی حمایت نہ کی اس کے برخلاف جب بھی کسی آریہ سماج کے کسی رکن نے فرقہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کی تو پریم چند نے ہر ممکن طریقے سے اس کا مقابلہ کیا۔ جب آریہ سماجیوں نے ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء میں بڑے پیمانے پر شدھی تحریک شروع کی تو پریم چند نے اس کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کے اپنے خط میں دیا نرائن نگم کو اس تحریک سے متعلق یوں لکھا۔" شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں، مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین چار دن میں بھیجوں گا۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اس مضمون کو" زمانہ" میں جگہ دیں گے۔" جس مضمون کا اس خط میں ذکر ہے وہ" قحط الرجال" کے عنوان سے زمانہ کے فروری ۱۹۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے شدھی تحریک کی بھی نکتہ چینی کی اور ان کانگریسی رہنماؤں کی بھی جو اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔" افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس نے

نے بھی اجتماعی طور پر اس تحریک سے الگ تھلگ ر[illegible] کے باوجود انفرادی طور پر اس میں شامل ہونے میں بھی اٹھا نہیں رکھا۔ اتنا ہی نہیں ایک بھی ذمے د[illegible] کانگریسی نیتا نے اعلان کر کے ان تحریکوں کے خ[illegible] آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔"

اسی طرح ۱۹۲۳ء میں چتر سین شاستری کتاب" اسلام کا وِش ورکش" (اسلام کا زہر[illegible] درخت) شائع ہوئی تو پریم چند تڑپ اٹھے۔ ا[illegible] کتاب کا مقصد دین اسلام پر کیچڑ اچھال کر فرقہ وا[illegible] منافرت پیدا کرنا تھا۔ اور ایسی بات پریم چند کد[illegible] برداشت کر سکتے تھے۔ جینندر کمار جین کو اسی[illegible] میں ایک خط میں لکھا۔" ان چتر سین کو کیا ہو گیا۔ اسلام کا وِش ورکش لکھ ڈالا۔ اس کی ایک تنقید لکھواؤ اور وہ کتاب میرے پاس بھیجو۔ اس کمیونل[illegible] کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔" ہندی کے مشہور ر[illegible] بنارسی داس چترویدی کی بھی اس کتاب کے خلاف[illegible] کے لئے ہمت افزائی کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لک[illegible]
" فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ خطرانگیز اور سستی کو[illegible] ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ ر[illegible] کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں لکھوں[illegible] اب جبکہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا[illegible] جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور[illegible] ہمیں اس کی پیروی نہ کرنی چاہئے۔ ہمارا مقصد مقد[illegible] ہے۔ میں آپ کا نوٹ" جاگرن" میں شائع کر رہا ہو[illegible] چند نے اپنے ہندی رسالوں" ہنس" اور" جاگرن" میں ا[illegible] کتاب کے خلاف پر زور احتجاج کیا جس کے نتیجے میں ا[illegible] بڑا حلقہ ان کے خلاف ہو گیا اور بعض لوگوں نے انہیں مارنے کی بھی دھمکی دی۔ اس پر انہوں نے ہی[illegible]

شیورانی دیوی سے کہا کہ اگر ہم ادیب ان دھمکیوں سے ڈر جائیں تو دنیا کو اپنے خیالات دے چکے۔ اپنے ہندی رسالوں میں چتر سین کی کتاب کی کڑی نکتہ چینی کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اور پریم چند نے اسے پوری ہمت سے کیا۔ انہیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یک جہتی بے حد عزیز تھی۔ اور اس مقصد کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔

پریم چند فرقہ واریت کے اصلی روپ سے بھی خوب آگاہ تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ہندی مضمون "فرقہ واریت اور تہذیب" میں یوں رقمطراز ہیں۔

" فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے اسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شاید شرم آتی ہے اس لئے وہ (اس) گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جمایا کرتا ہے۔ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک زندہ رکھنا چاہتا ہے مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب، نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب مگر ہم آج بھی ہندو اور مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ تہذیب کا دھرم سے کوئی تعلق نہیں۔ آریہ تہذیب ہے، ایرانی تہذیب ہے۔ عرب تہذیب ہے لیکن عیسائی تہذیب اور مسلم یا ہندو تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

پریم چند نے یہاں ایک بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تہذیب ایک بہت ہی پیچیدہ سماجی اور اور اقتصادی عمل ہے اور مادی عوامل کسی بھی تہذیب کے بنیادی عناصر ہونے میں اس کا رشتہ صرف مذہب سے جوڑنا غلط ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کا مذہب اور ہندی مسلمانوں کا مذہب ایک ہونے کے باو عرب تہذیب اور ہندی مسلمانوں کی تہذیب میں بڑا بنیا فرق ہے۔ یہی فرق انڈونیشیا اور ایران کے مسلمانوں کی ت میں بھی ہے۔ اگر مذہب ہی تہذیب کی بنیاد ہوتا سارے دنیا کے مسلمانوں اور دوسری طرف عیسائ کی تہذیب ایک ہی ہوتی۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے کہ ایسا نہیں ہے۔ مذہب ایک ہونے کے باوجود بھی الگ الگ ملکوں اور الگ الگ علاقوں کی تہذیبیں الگ الگ ہیں۔ اس لئے اگر فرقہ پرست تہذیب کا سہارا لیتے ہیں تو محض اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے کیوں فرقہ پرستی کا اصل چہرہ بڑا ہی گھناؤنا ہے۔ اس اصلیت اوپری طبقوں کی مفاد پرستی ہے اور سماج میں بنیادی یا انقلابی تبدیلی کے عمل کو روکنے کے یہ مفادات مذہب، تہذیب وغیرہ جیسی باتوں کو ا سہارا بنانا چاہتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے مندرجہ مضمون میں فرقہ پرستی کی اسی اصلیت کو بے نقاب کی

بعض لوگوں نے پریم چند کی ادھر ادھر لکھی چند باتوں کو بنیاد بنا کر ان پر ہندو فرقہ پرست ہونے الزام لگایا ہے۔ مثلاً انہوں نے ۱۹۱۲ء کے اپنے ایک خط میں اردو ہفتہ وار کے سلسلے میں لکھا تھا "آپ کا ہفتہ وار "کامریڈ" کے نمونے کا ہونا چاہیے۔ مگر یا ہندو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا اور اس کی کوشش فضول ہے۔ انسان اپنے ذہنی ارتقا میں مختلف ادوار سے گذرتا ہے۔ پریم چند بھی یقیناً ان مرحلوں سے گذرے ہیں۔ اور اس سے بھی ہم انکار نہیں

کر سکتے کہ [illegible]ان پر مختلف موڈ طاری ہوتے ہیں۔ یہ خط ۱۲ [illegible] کا لکھا ہوا ہے اور چونکہ دوسرے خطوط یا تحریروں میں ان کے یہاں اس قسم کی باتیں عام طور پر نہیں [illegible] پائی جاتیں ہم اس سے یہی نتیجہ نکالیں گے کہ پریم چند ذہنی اور جذباتی طور پر فرقہ پرست کبھی نہیں رہے۔ ان کے دوست دیا نرائن نگم نے بھی اس سلسلے میں گواہی دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو اور مسلمان دونوں سے نالاں رہتے تھے۔ اور تنگ خیال ہندوؤں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔

پریم چند خود ہندو فرقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن جہاں انہیں مسلمانوں کی طرف ہندوؤں کے رویے میں زیادتی نظر آتی تھی وہ بڑی بے باکی سے اس کی مذمت کرتے تھے۔ وہ اس معاملے میں سی۔ آر۔ داس سے زیادہ قریب تھے۔ اپنے مضمون "قحط الرجال" جو فروری ۱۹۲۴ء میں "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا، میں پریم چند نے لکھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں ہندوؤں کا رجحان الزام سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات پر بھی انہیں افسوس تھا کہ ہندوؤں نے خلافت تحریک کے مقاصد کو نہ اچھی طرح سے سمجھا نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے اسے ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور گاندھی جی کی نظر سے نہیں۔ پریم چند یہ بھی سمجھتے تھے کہ مولانا محمد علی اور شوکت علی اور سیف الدین کچلو ہندو مسلم اتحاد کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ انہوں نے سوراج اور اس اتحاد کو ہمیشہ ہم معنی سمجھا ہے۔ اسی لئے وہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں نے اگر ایک کچلو یا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو شدھی تحریک ملک میں ایسی آگ نہ لگاتی۔ پریم چند نے محمد علی شوکت علی کی جوڑی کو رام اور لچھمن کی جوڑی سے تشبیہ دی۔ ایک ہندو بھلا اس سے زیادہ کسی کو کیا خراج عقیدت پیش کر سکتا ہے۔ ہمیں یہاں محمد علی کے خیالات یا بعد کے سیاسی رویئے سے بحث نہیں ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ پریم چند کا ذہن فرقہ واریت کے مسئلے پر اتنا صاف تھا اور ہندو مسلم اتحاد کو وہ کتنی اہمیت دیتے تھے۔ شدھی تحریک کے پریم چند اتنے شدید مخالف تھے کہ وہ اس معاملے میں کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں کو بھی کڑی نکتہ چینی کرنے سے نہ جھجکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ حالانکہ کانگریس کا ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے شدھی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن انفرادی طور پر کانگریس کے ممبروں نے شدھی تحریک کی ہر ممکنہ مدد کی۔ اس کے چوٹی کے لیڈروں میں سے بھی کسی ایک نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ یہاں تک کہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، بھگوان داس اور سری پرکاش جیسے لیڈروں نے بھی۔ جن کے متعلق یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار پوری جرأت سے کر سکتے ہیں، اگر ایک دن اس کی مخالفت کرتے ہیں تو دوسرے دن اس کے خلاف بیان دیدیتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں پریم چند لکھنؤ میں تھے اور اسی دوران وہاں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ اپنے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کے خط میں اس کے متعلق دیا نرائن نگم کو لکھا "ہندو مسلم فساد اب بھی ہو رہے ہیں میں نے جس کی پیشین گوئی کر دی تھی اور جو کچھ میں نے کہا تھا وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ ہندو سبھا دہلی میں سمجھوتے کی راہ میں روڑے اٹکا سکتی ہے۔ لکھنؤ میں ہندوؤں نے فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دی اور انہوں نے زیادتیاں بھی کیں اور یہ سب کر کے موقع واردات سے غائب ہو گئے۔" یہاں ہم نے مدن گوپال

انگریزی کتاب منشی پریم چند - ایک لٹریری بائیوگرافی سے خط کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی تخلیقات کا بھی موضوع بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھیں اور آپس کی غلط فہمیاں دور ہوں۔ اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کے ایک بہت ہی اہم اور تاریخی واقعے کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا۔ انہوں نے کربلا پر ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ نومبر ۱۹۲۴ء میں گنگا پستک مالا کی طرف سے شائع ہوا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام کا زبردست المیہ تصور کیا جاتا ہے اور عام طور پر مسلمانوں کو حضرت امام حسینؑ سے بڑی عقیدت ہے۔ اس ڈرامے میں امام حسینؑ اور ان کے عزیز اور رفقا کی حق کی خاطر لڑائی اور عظیم قربانی کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ پانچ ایکٹ اور ۴۳ سینوں کے اس ڈرامے میں پریم چند نے ساہس راؤ کا ایک ہندو کیریکٹر بھی شامل کر لیا ہے۔ جب امامؑ کربلا کے میدان میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے ساہس راؤ کی سربراہی میں ہندوؤں کا ایک قافلہ وہاں سے گذرتا ہے۔ جب ساہس راؤ اور اس کے ساتھیوں کو علم ہوا کہ حضرت امام حسینؑ حق و انصاف کی خاطر ایک بدکردار حاکم کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو وہ بھی امام کی حمایت میں اس جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مشکوک ہی سہی لیکن یہاں پریم چند کا مقصد ہندو مسلم اتحاد پر زور دینا تھا۔ تاریخی تحقیق کا کام کرنا نہیں۔ کچھ مسلمانوں نے پریم چند کے اس ڈرامے پر تاریخی صحت کے اعتبار سے اعتراض بھی کئے لیکن پریم چند نے اپنے نیک مشن کے پیش نظر ان اختلافات کی پرواہ نہیں کی۔

پریم چند نے کربلا کے ڈرامے کے علاوہ اور بھی کئی کہانیاں ایسی لکھیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندو مسلم ایکتا پر زور دیتی ہیں۔ یا مذہب اسلام کی صحیح اسپرٹ کو ہندوؤں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ نیائے (انصاف) حضرت پیغمبرؐ کی زندگی کے ایک واقعے پر مبنی ہے اور آپ کی انصاف پسندی پر زور دیتی ہے۔ اسی طرح راجہ بھگت راجہ بختیاور سنگھ کی کہانی ہے جو لکھنؤ کے نوابوں سے برطانوی سرکار کے مقابلے میں اپنی وفاداری جتاتا ہے۔ اور اس کی سازشوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ چھما (معافی) ہسپانوی عرب سردار کی کہانی ہے جس کے بیٹے کو ایک عیسائی قتل کر دیتا ہے۔ لیکن حالات کی مجبوری اسے اسی عرب سردار کے یہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے بیٹے کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ لیکن عرب شیخ اسے ایک بار پناہ دینے کا وعدہ کر کے یہ جاننے کے بعد بھی کہ وہ اس کے بیٹے کا قاتل ہے اپنا وعدہ نبھاتا ہے اور اس عیسائی کی حفاظت کرتا ہے۔ "مندر اور مسجد" ایک مسلم زمیندار کی کہانی ہے جو ہندو دھرم کا بھی اتنا ہی احترام کرتا ہے جتنا اسلام کا۔ کچھ تنگ نظر مسلمان اس مسلم زمیندار چودھری عزت علی سے نفرت کرتے ہیں اور جنما شٹمی کے مقدس تہوار کے دن ایک ہندو مندر پر حملہ کر دیتے ہیں چودھری عزت علی اپنے ایک وفادار راجپوت ملازم بھجن سنگھ کو ان مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجتا ہے۔ بھجن سنگھ کے ہاتھوں ان حملہ آوروں میں عزت علی کا داماد اور وارث بھی مارا جاتا ہے۔ بھجن گھبرا کر خودکشی کر لینا چاہتا ہے مگر عزت علی اسے ایسا کرنے سے بچاتا ہے اور کہتا ہے کہ مندر پر حملہ کرنے والے اور ہندوؤں کے مقدس مقام کی بے حرمتی کرنے والے کو یہی سزا ملنی چاہئے تھی۔ قانون کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے عزت علی بھجن سنگھ کو پناہ دیتا

ہے۔ اور جب بھجن سنگھ کو اپنے آپ کو قانون کے ہاتھو
کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے تو عزت علی تنگ نظر
مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود بھجن سنگھ کا دفاع
کرتا ہے۔ جب بھجن سنگھ چھوٹ کر آتا ہے تو ہندو فرقہ
پرست اسے اپنا ہیرو بناتے ہیں اور مسلمانوں سے بدلہ لینے
کے لئے دوسرے جنماشٹمی کے تہوار پر مسجد پر حملہ کر کے
مسلمانوں کو زدوکوب کرتے ہیں۔ عزت علی جس نے بھجن
سنگھ کو بچانے کے لئے اتنا کچھ کیا تھا اور اپنے داماد کا
خون بھی معاف کر دیا تھا، بھجن سنگھ کی اس حرکت کو دیکھ
کر سخت ملول ہوتے ہیں اور اسے مار ڈالنے کا ارادہ کرتے
ہیں۔ بھجن سنگھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ
اپنے مالک سے کہتا ہے کہ آپ ہی نے میری جان بچائی تھی اور
یقیناً آپ کو میری زندگی پر پورا اختیار ہے۔ کل آپ کسی کو
بھیج کر میرا سر منگالیں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میرے
ہی گھر میں مجھے کس نے قتل کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی تخلیقات کے ذریعے بھی
پریم چند نے تمام تعصبات سے بلند ہو کر ہندو مسلم اتحاد
کا پرچار کیا۔ اس کے باوجود بعض تنگ نظر لوگ ان پر
طرح طرح کے الزام عائد کرتے نہیں تھکتے۔ کچھ لوگوں نے
ان پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ وہ مسلم کرداروں کو ہندو
کرداروں کے مقابلے میں مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ لیکن
اگر پریم چند کی تخلیقات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو
یہ بات بالکل سطحی اور بیجا معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ
راج بہادر گوڑ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
"کبھی کبھی کچھ لوگ بد دیانتی سے پریم چند پر یہ اعتراض
کرتے ہیں کہ ان کی ادبی تخلیقات میں پولیس انسپکٹر،
داروغہ وغیرہ جیسے ظالم کردار اکثر مسلمان ہوتے ہیں

اور اسے وہ پریم چند کی "فرقہ پرستانہ" ذ
منسوب کرتے ہیں۔ لیکن حافظ محمد عبداللہ نے
اسمتھ اور ولیم لیمپ کی ایما پر ایک ڈراما "
پولس ڈرامہ" لکھا تھا جہاں بنیا ہے "دھن دا
سب انسپکٹر ہے "رعونت بیگ" اور ہیڈ کانسٹ
"زبردست خاں" اس ڈرامے کا مقصد یہ تھا
کو غیرت دلائی جائے ...... اور اس مضمون
نگار نے بھی تو پولیس سب انسپکٹر اور ہیڈ کا
کو مسلمان دکھایا ہے۔ کیا یہ بھی فرقہ وارانہ تنگ
مجھے یاد پڑتا ہے کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے
مضمون میں اس اعتراض کو غلط بتایا ہے کیونکہ
زمانے میں ان عہدوں پر مسلمان ہوتے بھی تھے ا
نے زندگی ہی سے کیریکٹر لیتے ہیں"

یہ اعتراض اور بھی بالکل لچر معلوم ہونے
جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی کئی کہانیوں میں پریم
مسلم کرداروں کو اعلیٰ اخلاقی نمونوں کے طور پر
ہے۔ "مندر اور مسجد" میں چودھری عزت علی
اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اپنے ناول گئو
مرزا کا کردار بھی پریم چند نے کچھ انسانی کمزو
باوجود بڑی ہمدردی سے ابھارا ہے۔ چنانچہ جو
کے ایک وکیل دوست مسٹر تنخا انہیں دولت کے
کو پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں تو مرزا یوں جو
ہیں۔ "جی نہیں، مجھے یہ بھی منظور نہیں ہے۔ میر
کا ڈائرکٹر، کئی کا منیجنگ ایجنٹ، کئی کا ج
دولت میرے پاؤں چومتی تھی۔ میں جانتا ہو
سے آرام تکلیف کے کتنے سامان جمع کئے جاسکتے
یہ بھی جانتا ہوں کہ دولت انسان کو کتنا خود"

ہے۔ کتنا عیش پسند، کتنا مکار اور کتنا بے غیرت ؟
۔ مرزا صاحب شراب پینے کے لئے گوبر سے پیسا
تے ہیں اور وہ انکار کر دیتا ہے تو پریم چند مرزا
ردار کو یوں پیش کرتے ہیں۔" جب گوبر نے اب کے
انکار کیا تو مرزا مایوس ہو کر چلے گئے۔ شہر میں ان کے
روں ملنے والے تھے کتنے ہی ان کے بدولت بن گئے تھے
ں ہی کی آڑے وقت پر انہوں نے مدد کی تھی مگر ایسوں
ہ ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں ہزاروں لٹکے معلوم
بن سے وہ وقتاً فوقتاً روپیوں کا ڈھیر لگا سکتے تھے
روپے کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ ان کے
میں روپے جیسے کاٹتے تھے۔ کسی نہ کسی بہانے اڑا کر
ن کا دل سکون پاتا تھا۔ مرزا کو پریم چند نے ایک فیاض
ش لیکن نیک باطن کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ ان پر
زام لگانا کہ وہ مسلمان کرداروں کو ظالم اور بد عنوان
ے نظر کے طور پر پیش کرتے ہیں قطعاً لغو اور بے بنیاد
ہے۔ چند گذاراں لمحوں کو چھوڑ کر پریم چند نے کبھی
سلم ایکتا کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس
بلکس ہر ممکنہ طریقے سے اور ہر شکل میں انہوں نے
پرستی پر بھرپور حملے کئے۔

پریم چند ہندو مسلم تنازعے کے متعلق بھی بڑا
نہ ذہن رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسی جاندار زبان
گی سکتے جو عام فہم ہو اور رابطے کی زبان بننے کی
میت رکھتی ہو۔ اس زبان کو اردو یا دیوناگری
ی رسم الخط میں لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک
ن میں لکھتے ہیں۔" رسم الخط کا فیصلہ وقت کرے گا
! وہ جاندار ہے وہ آگے آئے گا۔ دوسرا پیچھے رہ
ے گا۔ رسم الخط کے اختلاف کی بحث کرنا گھوڑے کے آگے
گاڑی کو رکھنا ہے۔ ہمیں اس شرط کو مان کر چلنا چاہئے
کہ ہندی اور اردو دونوں ہی قومی رسم الخط ہیں اور ہمیں
اختیار ہے جس رسم الخط میں اس کو استعمال کریں۔"
زبان کے معاملے میں پریم چند کی نیک نیتی ہی تھی کہ انہوں
نے ایک بڑی ہی معقول اور ٹھوس تجویز رکھی تھی کہ شمالی
ہندوستان کے اسکولوں میں دسویں جماعت تک اردو
اور ہندی دونوں زبانوں کی تعلیم لازمی کر دی جائے
اس کے نتیجے میں دونوں زبانوں کا ارتقا اس ڈھنگ
سے ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آتی جائیں گی۔
اور ایک دن ایسا آئے گا جب دونوں زبانیں ایک
ہو جائیں گی۔ قمر رئیس بالکل صحیح کہتے ہیں " پریم چند
ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جو عرفان رکھتے تھے
اور اس کے تحفظ کے لئے انہوں نے جو تگ و دو کی جیسی
قربانیاں دیں، یہ سعادت اردو کے بہت کم ادیبوں کے
حصے میں آئی ہے۔ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی
پہلی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ ادیب
سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں۔ اس کے آگے
مشعل ہاتھ میں لے کر چلنے والی سچائی ہیں۔ انھوں نے
ہندوستانی سماج کے تضادات کو جس طرح سمجھا تھا اور
اس کے سماجی، تہذیبی اور لسانی مسائل کا دانشمندانہ
حل پیش کیا تھا اگر اس پر عمل ہو سکتا تو کم از کم آج
ملک کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی اور ہو رہی ہے۔ پریم
چند سچ مچ سیاست کے آگے مشعل لے کر چلنے والی سچائی
تھے۔

● خطوط مختصر اور مسودے صاف اور
خوشخط ارسال کیجئے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر سید حامد حسن

کیفی اعظمی کے "آوارہ سجدے" کی تخلیقی تشکیل

"آخر شب" اور کیفی اعظمی کے تیسرے مجموعے "آوارہ سجدے" کی اشاعت کے درمیان تقریباً ۲۷ سال کا طویل عرصہ حائل ہے اور اس لئے مجموعے میں شامل ۴۷ شعری تخلیقات میں سے بھی بیشتر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۴ء تک کے ۱۳ سال کے عرصے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ ان کا اس دور کا سارا سرمایہ نہیں۔ ان منظومات کے علاوہ بھی کیفی نے اس دوران بہت کچھ لکھا ہے اور وہ مختلف وسائل ابلاغ کے ذریعے ان کے پرستاروں تک پہنچا ہے۔ لیکن "آوارہ سجدے" کی شعری تخلیقات اس لحاظ سے نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں کہ ان سے شاعر کے ذہنی سفر اور اس کے تخلیقی کمال کی جہت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ منظومات شاعر کی اس ذات کو بے حجاباً پیش کرتی ہے۔ جس کے درمیان نہ اب رومانیت کی چلمن نظر آتی ہے اور نہ الفاظ کا طلسم۔

"آوارہ سجدے" کے مرحلے تک پہنچنے میں کیفی نے بڑے کالے کوس کاٹے ہیں۔ وہ تجربے کی کڑی دھوپ اور وقت کی بے رحم آنچ سے ہو کر گزرے ہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخی و تندی ان کے لہجے کی کاٹ اور ان کے اظہار کی گرفت بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

"آخر شب" کے شاعر نے ایک یقین، ایک عقیدے اور ایک اعتماد کے ساتھ آغاز سفر کیا تھا۔ انھوں نے کسی کے حسن سے، اپنے جذبۂ عشق سے، فطرت کی شگفتگی اور لطافتوں سے، زندگی کی نکہتوں اور مجبوریوں سے ایک جہان تازہ اور ایک نظام نو کی تعمیر کے لئے حوصلہ و ولولہ حاصل کیا تھا۔ "آوارہ سجدے" میں بھی اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی یقین کی دولت ہے۔ لیکن وقت کے پیچ و خم نے اسے زیادہ محتاط و تلخ کام بنا دیا ہے۔ وہ اب بھی انسانیت کے ساتھ وفا کا عہد رکھنے والی قدروں کا گرویدہ ہے، وہ اب بھی بے انصافی، سفاکی اور بے رحمی کے خلاف سینہ سپر ہے۔ وہ اب بھی عظمت آدم

اور امن عالم کا معترف ہے لیکن ابھی اس کی منزل نہیں
آئی ہے۔ ابھی اس کا سفر ناتمام ہے اور سعی جاری۔ اس
کی قدم کو تھکے نہیں۔ نشیب و فراز نے اسے زیادہ محتاط
بنا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اب یہی سوز نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سر مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

اس نے نذر دل کے لئے اپنی قربان گاہ چن لی تھی اور اپنی
سجدہ گاہ منتخب کر لی تھی۔ لیکن ایک موقع وہ بھی آیا کہ اُسے
محسوس ہوا کہ اس کے سجدے آوارہ ہو چکے ہیں۔ اور وہ
زخم خوردہ لہجے میں کہتا ہے۔

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

"آوارہ سجدے" کا شاعر اسی طبعی ناشکیبائی سے
دوچار ہے۔ یہ ناشکیبائی جو وقت کے بے رحم پست و
بلند سے گذرنے پر پیدا ہوئی ہے۔ وہ ناشکیبائی جو
شاعر کے لئے اندیشوں کی سوغات بھی لائی ہے اور نئے
چیلنج کا سامان بھی۔ کہیں کہیں اس پر اس بے بسی کی پرچھائیں
پڑتی ہے۔

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انھیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سما جاتے ہیں

زلزلوں میں تھی ذرا سی گرمی
وہی اب روز ہی آجاتے ہیں

اور پھر یہ بھی پکار اٹھتا ہے۔

چند ریکھاؤں میں سماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

(دائرہ):

انقلاب کی یہ خواہش، حالات کو بدل ڈا
کی آرزو کتنی قوی ہے اس کا اندازہ ایک اور نظم
"دھماکہ" سے ہوتا ہے جس کے ابتدائی حصے میں شا
دھماکے کی بے معنویت کا معترف ہے۔

کوئی چوراہا ہو چاہے کوئی ناکہ دوستو
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھماکہ دوستو
یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
روٹی دے سکتا نہیں
یہ روزی دے سکتا نہیں
یہ کچھ بھی دے سکتا نہیں

پھر نظم کے آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ اسی بے معنی دھ
کو تخلیق کائنات اور جوہری توانائی کا منبع ا
کرتے ہوئے قبول کر لیتا ہے۔

یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ بھی ایک دھماکہ تھا
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس سے اچھلیں کہکشائیں
جس سے ابھری کائنات

گھر سے جب بھی نکلو باہر دوستو
دھماکے بھر لو اپنی جیب میں
ہر گھڑی ہر دم تازہ دھماکہ دوستو
کون جانے کوئی ذرہ ٹوٹ جائے

"آوارہ سجدے" کی شاعری میں کہیں کہیں ایک
یران، روزگار گزیدہ، جہاں ترسیدہ فرد کی آواز
زگشت سنائی دیتی ہے۔ "دائرہ" "آخری رات"
رہ عادت" جیسی نظموں میں ایک شدید بے بسی کا
ساس فکر و شعور پر حاوی ہو گیا ہے۔ "آخری رات"
ا خود سپردگی اور بے چارگی کا یہ عالم ملاحظہ ہو۔

کوئی کہتا تھا ٹھیک کہتا تھا
سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا
دفن ہونے کو کیوں نہیں تیار
ہوش مندی ہے آج سو جانا
آج کی رات ہم کو سونے دو

رہ عادت" جیسی حسین نظم میں یہی بے چارگی تاریخ کے
پردوں اور وقت کی چھلنی سے چھن کر ایک زہرناک تلخی
یں تبدیل ہو گئی ہے۔

ان نظموں میں کیفی کے مزاج کی دردمندی پوری
طرح ابھر کر آئی ہے۔ لیکن ان کی نظم "چراغاں" کی
طرح یہ کہیں آرزومندی کے مہین پردے سے ابھر
رآتی ہے اور دل میں ترازو ہو جاتی ہے۔ یوم جمہوریہ
کے پس منظر میں وہ کہتے ہیں۔

ایک دو نہیں چھبیس دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے
دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیئے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر نہ جھروکہ نہ منڈیر
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

اس بے نام سی امید کے ساتھ ہی ساتھ کئی منظوما
کیفی کے عزم محکم کی حصہ دار بھی ہیں اور ان کے رگ
ریشے میں کیفی کا یقین ایک مضبوط آہنگ بن کر پیوست
ہو گیا ہے۔ نظم "مکان" کی امید اور انتہا اس پر
سے ہوتی ہے۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی۔

یہی بلند آہنگ حوصلہ مندی "بہرہ" میں ایک
لے حاصل کر لیتی ہے۔

عزم کا کوہ گراں، درد کی دیوار ہیں ہم
زخم کا زخم ہیں، تلوار کی تلوار ہیں ہم
جیسے جھپکی نہیں صدیوں سے یہ بوجھل پلکیں
آج کی رات کچھ اس طرح سے بیدار ہیں ہم
جال سرحد سے اٹھا جال بچھانے والے

کیفی نے اپنی کئی نظموں میں آتخیل سے بر
کا کام لیا ہے۔ لیکن ان کی ساری شاعری شکوکا زما
ہی نہیں اس میں حدیث دلبرانہ بھی شامل ہے اور
کے تخلیقی تخیل نے حسن و عشق میں بڑے لطیف ود

نقوش ترتیب دیئے ہیں۔ کہیں نظم "بوسہ" کے مثل جب
شاعر حسین آنکھوں کو چوم لیتا ہے تو پھول، چاند، ستارے
جیسے سب رقیب بھی قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں۔
اجنتا کی مورتیں رقص کرنے لگتی ہیں اور صدیوں کے
خاموش غار گنگنانے لگتے ہیں اور کہیں

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی ایک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں

آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یوں ہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں
برف پگھلنے ہی لگے

لیکن غزل کی صنف جسے استادانِ سخن نے کاروبارِ عشق کے لئے وقف کر دیا تھا، "آوارہ سجدے" میں فکر و احساس کے نئے گوشوں کو اجاگر کرنے کا کام کرتی ہے۔ ان غزلوں میں کیفی کا کھرا شعری کردار بے عایت بے تکلفی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ پہلے ان غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کر لیجئے۔ پھر آگے بات ہوگی۔

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں
کیا ہو گئے مہربان سائے
جنگل کی ہوائیں آرہی ہیں
کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا
کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی نشاں نہیں ملتا

شاہ نامے لکھے ہیں کھنڈرات کی ہر اینٹ پر
ہر جگہ ہے دفن اک افسانہ تیرے شہر میں
ننگی سڑکوں پر بھٹک کر دیکھ جب مرتی ہے رات
رینگتا ہے ہر طرف ویرانہ تیرے شہر میں

کیفی نے ان غزلوں کو غزل کی روایتی لفظیات، غزل کے روایتی ماحول اور روایتی چونچلوں سے بالکل آزاد کر لیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزل کو نہ تو احساس کے نہاں خانوں میں اسیر کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ تخیل کی طلسمی خیرگی سے اس کو آراستہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ کیفی کی یہ غزلیں ایک پختہ تخلیقی شعور کو ایک جامع ایمائی اظہار فراہم کرنے کا کام سرانجام دیتی ہیں "آوارہ سجدے" کی ۳۷ شعری تخلیقات میں نظریے اور احساس، فکر و تاثر کی جو رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے وہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہر زندہ اور بیدار فرد کی طرح شاعر بھی زندگی کا نئے نئے زاویوں اور نئے نئے پہلوؤں سے تجربہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے، اس کے تلخ و ترش کو چکھنے اور اس کے بلند و پست سے گزرنے کے بعد اس نتیجے پر

چکا ہے کہ زندگی نہ تو خط مستقیم میں حرکت کرتی ہے اور نہ ہی اسے کسی ایک کلیے، کسی ایک طلسم یا کسی اسم اعظم میں قید کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کی صد رنگ جلوہ سامانیاں شاعر و فنکار کے تخلیقی شعور سے نئے سے نئے انداز سے خراج طلب کرتی ہیں اور ہر اعلیٰ فنکار کی طرح کیفی نے اپنی متاع فکر و احساس سے یہ خراج پوری عقیدت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

موجودہ صدی کے پانچویں دہائی میں تحریک کے ساتھ ادب کی وابستگی ایک اہم رجحان بن کر آئی۔ اس کی وجہ سے جہاں ادیبوں کو نظریئے سے وابستگی کی بنا پر ایک خاص قسم کا اعتماد حاصل ہوا وہیں انھوں نے فکر و نظر کے لئے ایک جہت کا تعین بھی کیا۔ کیفی اعظمی کا بھی ترقی پسند تحریک سے قریبی تعلق رہا اور اس تحریک کے بنیادی اصول و عقائد کی بازگشت ان کی تخلیقات میں سنائی دیتی ہے" آوارہ سجدے" میں بھی ان اثرات کی تلاش کے لئے کسی خصوصی کد و کاوش کی احتیاج نہیں۔ لیکن نظریئے سے پر خلوص وابستگی کے باوجود اس مجموعے کی تخلیقات سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ کیفی نے اپنے نظریاتی شعور کو اپنے تخلیقی شعور کے لئے مجبور نہیں بننے دیا ہے۔

"آوارہ سجدے" کی شاعری ایک ایسے فنکار کی شاعری ہے جو ہر دوسری چیز سے زیادہ خود اپنے ذات سے مخلص ہے۔ اسی اخلاص کے نتیجے میں جہاں وہ اپنی آرزوؤں، اندیشوں، اپنی مایوسیوں، اپنی حیرانی اور اپنی دردمندی کا اظہار کرتا ہے۔ وہیں وہ اپنے عقائد، اپنے نظریات، اپنی ترجیحات اور اپنے تصورات کے ساتھ بھی انصاف برتتا ہے۔

"آوارہ سجدے" کا شاعر ایک منصفانہ،
غیر طبقاتی، پر امن سماج کے خواب سجا کر رکھتا ہے
لوٹ کھسوٹ، استحصال، بے انصافی، بے ر
اور حیوانیت کی پوری شدت سے مخالفت کر
یہ عقیدہ اس کی فنی شخصیت کو محدود نہیں کر
بلکہ اس کو مزید فعال بناتا ہے۔ کیونکہ بحیثیت فن
ایک واضح تخئیل اور ایک متعین جہت رکھتا۔
وہ گنجلک تصور، مبہم اظہار اور بے معنی اسا
سے اپنی تخلیقی مجہولیت کا مظاہرہ نہیں کرتا ہ
اور اس کے تخلیقی عمل کا ارتقا اس جہان مع
نقوش کو واضح سے واضح تر بنانے کی سعی میں پو
"آوارہ سجدے" تک پہنچتے پہنچتے کیفی اع
نے فنی کمال کے اس جوہر کو دریافت کر لیا ہے
طرح فنکار کا تخلیقی شعور عام تجربے کی علامتوں
ایک پورے نظام فکر و احساس کے لئے ایک
عظمیٰ کی تعمیر کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ سا
انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ زندگی کی حق
ایک تہہ دار، پہلو دار، اور پیچیدہ حقیقت۔
اس کا جامع اور بھرپور اظہار، متنوع اور رن
رنگ تجرباتی کیفیات اور تاثرات کی مدد سے
ممکن ہے۔

"آوارہ سجدے" کیفی اعظمی کی شاعری کا آ
آخر نہیں بلکہ شاعری کے ساتھ ان کے معاملات
کا ایک درمیانی مرحلہ ہے۔ لیکن یہ داستان عشق
ہے۔ اور کسی سچی داستان کی معنویت اس
عروج پر نہیں بلکہ اس کی سچائی پر منحصر ہوتی ہے"
ڈ

اردو زبان کو فوقیت اور فروغ دیجئے۔

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ ۔ قسط ۸

(الف) سید ظفیر الدین شمس گیاوی

۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء، بہار کے زلزلہ نے قیامت صغریٰ کی یاد دلائی۔ میری عمر دس گیارہ کے درمیان رہی ہوگی۔ اس زلزلہ کے بعد یہ پتہ چلا کہ شاعر کون ہے۔ شعر اور شاعری کیا ہے۔ میرے والد مرحوم کے مصاحبین میں ایک سید ارشاد حسین صاحب تھے۔ جو ابا مرحوم کو بے حد عزیز تھے اور ان کو چھوٹے بھائی (اگر کوئی بھائی ہوتا) جیسا مانتے تھے۔ وہ ابا کے انتقال (۱۹۲۵ء ہوں) کے بعد زیادہ تر کلکتہ رہنے لگے تھے۔ پھر بمبئی چلے گئے اور ہندوستان گیر شہرت ان کے حصے میں آئی۔ ہر فلموں میں میر صاحب کے نام سے میوزک ڈائریکٹر مشہور ہوئے۔ سہراب مودی کے منروا موی ٹون (Min-erva movie ton) کی فلموں میں ان کا نام روشن ہوا۔ جیلر، پکار، سکندر وغیرہ فلموں کے گانے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ پھر سید شوکت حسین رضوی کی فلم زینت کی موسیقی بھی میر صاحب مرحوم کی مرہون منت ہے۔ دوسرے سید ارشاد حسین صاحب تھے۔ یہ میرے ساتھ بمبئی میں رہے اور فلمی حلقوں میں سید صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ فلم سازی میں اپنا نام مختصراً ایم نے ایس۔ ایم نواب (سید مظفر نواب) رکھا تھا۔ تعارف سے پہلے عام طور پر لوگ سید صاحب کو نواب صاحب سمجھتے تھے ان کی ماشاء اللہ ایسی ہی شخصیت تھی اور ذکر کیا کروں۔ ایک فقیرا میاں تھے۔ ہم بچپن سے ان سے بے حد مانوس تھے۔ وہ بٹیر بازی کے ماہر تھے اور یہ ہم بچوں کی دلچسپی کا سبب ہونا ایک فطری رجحان تھا۔ اور پھر ایک شمس صاحب تھے ان کا پورا نام سید ظفیر الدین شمس تھا۔ زلزلہ کے بعد ایک دن انہوں نے ایک نظم سنائی (مسدس تھی) نظم اور نثر کا فرق تو آسانی سے سمجھ چکا تھا۔ مگر مخمس، مسدس، رباعی، غزل وغیرہ اصناف شاعری سے نابلد تھا۔ ان کی مسدس یوں شروع ہوتی ہے۔

سبز گنبد کے [illegible] میری مدد فرمایئے
تاز شِ عرشِ بریں میری مدد فرمایئے
چہرہ انور سے چادر نور کی سرکایئے
تاز شِ عرشِ بریں میری مدد فرمایئے

امتی سرکار کے زیر فلک برباد ہیں
مادر گیتی کے بچے مائل فریاد ہیں

بے حد متاثر ہوا۔ خاص طور پر سبز گنبد کے مکیں پر تو سر دھننے والی بات تھی۔ اب شمس صاحب سے شاعری کی معلومات حاصل کرنے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جناب شفق عمادپوری (مرحوم) کے شاگرد ہیں اور شفق صاحب امیر مینائی کے شاگرد، پھر دھتا فوقتاً غزلیں سناتے اور غزل میں مختلف صنعتیں کیسے لائی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک اور شاعر کا کلام سنایا جو بے حد پسند آیا۔ اس شاعر کا نام داغ دہلوی تھا۔ مجھے جب داغ کے اشعار پسند آئے تو وہ (امیر مینائی کو ہمیشہ منشی امیر مینائی کہتے تھے) امیر مینائی کا شعر یا تو اسی ردیف اور قافیہ میں یا صرف مضمون کی یکسانیت کا شعر دوسرے قافیہ یا ردیف میں سناتے اور کہتے کہ داغ کی شاعری عامیانہ ہے۔ منشی امیر مینائی تو استاد فن ہیں اور اس لئے ابھی آپ بچے ہیں اُن (امیر مینائی) کے اشعار کی بندش کی خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح شمس صاحب سے شاعری بالخصوص غزل کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ چند سالوں کے بعد جب ۳۶ء میں اسکول میں داخلہ لیا تو نصاب کی کتاب میں نظم و نثر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ مگر فلموں کا شوق بھی تھا۔ نیو تھیٹرس، بمبئی ٹاکیز، پربھات وغیرہ کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے۔ اول الذکر میں سہگل کے گانے ہوتے تھے۔ سارے لوگ اس آواز کے دیوانے۔ ہر فلم کا کتابچہ بھی ہوا کرتا تھا۔ جس میں مختصراً کہانی ہوتی اور سارے گانے ہوتے۔ بڑے شوق سے ہر فلم کا کتابچہ خرید کر جمع کرتا۔ محبوب مشغلہ بھی تھا۔ نیو تھیٹرس کے گانے علامہ آرزو لکھنوی لکھتے تھے۔ آرزو صاحب کا شمس صاحب سے ذکر کرنا ضروری تھا۔ بہت تعریف کی اور بولے کہ اس وقت آرزو سے اچھا شاعر ہندوستان میں کوئی نہیں۔ میرے لئے ایک زبردست سند تھی۔ شمس صاحب جو خود شاعر ہیں، آرزو صاحب کو بہتر شاعر گردانتے ہیں۔ میرے ایک عزیز جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ دراصل عزیز تو شادی کے بعد ہوئے۔ (میری بیوی ان کی خالہ دور کی نہیں بلکہ کافی نزدیک رشتہ دار تھیں) یعنی محبوب وارثی مرحوم۔ ان سے ذکر آیا تو بولے کہ آرزو صاحب نہیں جوش اس وقت بہترین شاعر ہیں۔ شمس صاحب سے ذکر کیا۔ بولے غزل میں تو آرزو کا جواب نہیں۔ ہاں جوش نظمیں اچھی کہتے ہیں (یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے)

اس سے پہلے ۳۵ء سے ایک نیا شوق پڑھنے کا بیدار ہوا۔ شمس صاحب مرحوم افراسیاب، کوکب روشن ضمیر، براں شمشیر زن وغیرہ کے قصے ادھر ادھر سے سناتے۔ جادو کے کرشمے وغیرہ۔ یہ سب بہت دلچسپ کہانیاں معلوم ہوتی تھی۔ بولے طلسم ہوشربا پڑھئے۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہوا۔ ظفر نواب پبلک لائبریری سے پہلے طلسم ہفت پیکر (۲ جلدیں) لے کر پڑھی۔ پھر طلسم نور افشاں (تین جلدیں) ا[illegible] طلسم ہوشربا رہا۔ پہلی جلد دوسری اور تیسری۔ چوتھی جلد اوائل اور حصہ دوم یہ دونوں منو لال لائبریری سے منگا کر پڑھنے کا موقع ملا۔ آج جب غور کرتا ہوں

سوس ہوتا ہے کہ ان داستانوں میں لطف اتنا آتا تھا
بیان سے باہر بلکہ یوں سمجھئے کہ نشہ کی عادت جیسی ہوتی
۔ افیون کے عادی کو اگر افیون نہ ملے تو اس کی بری
ت ہوجاتی ہے۔ اور ہر اس شخص کو جو کسی عادت کا
م بن جائے بس سمجھئے کہ ال۔ایس ڈی (LSD) یا
نڈرکس (Mandrax) کی لت لگ جائے۔
طرح ان داستانوں میں بھی کچھ ایسی ہی کشش تھی
رجانے دیجئے۔ شمس صاحب مرحوم کا ذکر کر رہا تھا۔۴۶ء/
بعد اسکول میں داخلہ کے بعد اور مختلف شعرا کی کتابیں
ر کلام پڑھنے کے بعد شمس صاحب مرحوم پر یہ جتانا بچپنا
اب میری بھی واقفیت کافی ہے۔ جب کبھی کوئی غزل
ہ میں آتی شمس صاحب کو سناتا۔ اقبال کا کلام جب
ظر سے گذرا بہت متاثر ہوا اور شمس صاحب کو ایک
ل (غزل سمجھ کر، کیوں کہ ڈھانچہ غزل کا ہی تھا) پڑھ کر
سنائی۔ وہ غزل (؟؟) یہ تھی ؎

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ہندی، نطق اعرابی

وغیرہ وغیرہ بولے کہ اقبال فلسفی شاعر ہیں۔ غزل گو نہیں۔
پھر "شکوہ" کی بہت تعریف کی۔ شمس صاحب بہت
ذہین طباع اور جلد شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔
وجود اس بات کے کہ وہ اشعار کی تقطیع کرنے سے

قاصر تھے۔ (اس کا پتہ چلا جب میں عربی میں آنرز کر رہا
تھا) مگر طبیعت اور غالباً شفق صاحب مرحوم کی اصلاح
کے بعد روانی سے شعر کہتے تھے۔ ایک بار گیا کے ایک مشہور
شاعر نے کسی سے کہا کہ شمس صاحب کو میں لکھ کر دیتا
ہوں۔ یہ سننا تھا کہ چالیس اشعار کی ہجو اپنے اخبار
"ہمزاد" میں ہر اشاعت میں چھاپنے لگے۔ اور یہ پیغام
بھی ان شاعر صاحب کو بھجوا دیا کہ یہ ساری ہجو تو اپنے
خلاف وہی لکھ رہے ہیں۔ بحر بھی قصیدہ کی تھی۔ ایک
مصرع (پہلا) مجھے یاد ہے ؎

اے شریرِ بے حیا اے شاعرِ الّو صفت

اس طرح اپنی زود گوئی اور شعر کہنے کی بے پناہ صلاحیت
کا مظاہرہ کیا۔ ہجو کہنے میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ تام
اس خوبصورتی سے شعر میں لکھ دیتے کہ قاری عش عش
کر جاتا۔ حکیم یٰسین صاحب مرحوم کے خلاف ان کی ہجو میں
تو گیا کے لوگوں کی زبان پر جاری رہے۔ نواب امداد
امام صاحب مرحوم نے ایک حکیم یعقوب صاحب کی ہجو کہی
تھی۔ قافیہ بدل کر شمس صاحب کے انتقال کے بعد ان
کا کلام شائع ہوگیا۔ وہ شیر گھاٹی میں اپنے ایک عزیز کے
گھر دو تین مہینہ رہ کر سرائے فانی سے رخصت ہوئے
کلام کیا ہوا پتہ نہیں۔ خیر دونوں کا کلام یعنی نواب امداد
امام اثر اور پھر شمس صاحب کا کلام :-

رنڈی کی لونڈی کا بنا یار حکموا
کھرپے کی سدا کھاتا رہا مار حکموا
جورو سے کیا کرتا تھا تکرار حکموا
بھڑوؤں سے بھی حجت سر بازار حکموا
دھنونی کے لڑکے نے جو ماموں کہا اس کو (رنڈی)
آرہ سے خفا ہو کے گیا یار حکموا

محلّہ روؤں کو لاتا تھا بلا اپنے وطن سے (لکھنؤ)
آرہ کو سدا رکھتا تھا گلزار حکموا
محفل میں طوائف کو قرینہ سے بٹھاتا
کس درجہ تھا اس کام میں ہشیار حکموا
آنکھوں میں لگا کر بڑے انداز سے کاجل
کیا ہی نظر آتا تھا دھواں دھار حکموا
کمخواب پہنتا تھا کبھی اور کبھی ساٹن
اور باندھتا تھا پوت کی دستار حکموا
رومال گلابی تو کمر بند بسنتی
اور کرتے کو رنگواتا تھا گلنار حکموا
رکھتا تھا چری داڑھی کبھی مونچھ کبھی مانگ
اور دوش تلے گیسوئے خمدار حکموا
کس ناز سے چلتا تھا ہلاتا ہوا چوتڑ
پاجامہ پہن کر کے کلی دار حکموا
چلغوزہ و پستہ سے بھرا رہتا تھا کلہ
معنلے کا بنا پھرتا تھا دلدار حکموا
کیا منصب عالی پہ سرافراز ہے دیکھو
سالوں کے رسالے کا ہے سالار حکموا

اب شمس صاحب کی ہجو سنئے۔ دیکھیں حکیم لٰیسین صاحب اور ان کے سسر عنایت کریم صاحب کے نام وہ کیسے ہجو میں شامل کرتے ہیں۔

ہے بھائی بلاقن کا یہ بدذات حکموا
مشہور ہے سازندوں میں سادات حکموا
مسجد کے بھی چندے کو سمجھ لیتا ہے میراث
اللہ سے بھی کرنے لگا گھات حکموا
سالا تو خدا نے نہ کیا اس کو عنایت
کھاتا ہے مگر سالیوں کی لات حکموا

لنگور کا سر، اونٹ کا قد، بوم کی آنکھیں [1]
اس شکل و شباہت کا ہے بدذات حکموا
لٰیسین پڑھی جائے گی اب اسکے سرہانے
کاٹے گا نہ امسال کی برسات حکموا
داڑھی جسے سمجھے ہو وہ دھوکا ہے نظر کا
ٹھڈی پہ جمائے ہے نباتات حکموا
ہمزاد بہادر سے یہ بولے میاں لطف رو
کچھ تم نے سُنا خوب بشارات حکموا

پھر ایک اور نظم لکھی۔ یاد نہیں۔ مضمون یہ تھا۔ ایک مصرع یاد ہے۔ ؎

مطلب میں آ گئی پھر مہترانی دیکھتے جاؤ

گیا میں "مڑلی پہاڑی" ایک محلہ ہے۔ جہاں بھنگیں رہتی ہیں۔ یہ ملحوظ خاطر رہے۔ جوان مہترانی کو اس نانی مطلب میں لائی ہے اور شکایت یہ ہے کہ شادی ہو چکی مگر اولاد نہیں ہوتی ؎

کوئی بچہ نہیں اب تک بیانی دیکھتے جاؤ

مگہی میں پیدا ہونے کو "بیانا" بولتے ہیں۔ تو شعر سنئے حکیم صاحب فرماتے ہیں ؎

نباتاتی علاج اس کا کروں گا کل پہاڑی پر
ہرا یوں ہوگا نخلِ کامرانی دیکھتے جاؤ

اور اشعار یاد نہیں۔ افسوس۔ مگر حکیم صاحب جب علاج شروع کرتے ہیں تو پھر ان کی کس طرح خاطر تواضع ہوتی ہے یہ دیکھئے۔ ثانی مصرعہ شمس صاحب ہی کا حسو ہے۔

خبر کچھ اس طرح سے لی گئی مڑلی پہاڑی پر
کہ پنچ آئی ہے گھٹنوں تک میانی دیکھتے جاؤ

---

[1] حکیم صاحب کافی دراز قد یعنی چھ فٹ سے زیادہ تھے

اور اشعار یاد نہیں۔ مگر اس سے ان کی ظرافت
فن ہجوگوئی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ انجم صاحب ندیم
لتے تھے۔ مانپوری گویا ان کا تخلص تھا۔ عالم فاضل
جس برادری سے تعلق رکھتے تھے عموماً شراب بنانے
پیشہ کرنے والے تھے۔ کلال کہلاتے تھے۔ انجم صاحب
ہم نے کبھی یہ کاروبار نہ کیا۔ ان کے بارے میں کون
جانتا۔ "طنزیات مانپوری" نے ان کو زندہ جاوید
ہے۔ اب سنئے شمس صاحب کیا کہتے ہیں۔ انجم صاحب
دوستی تھی دشمنی نہ تھی سے

لکھے پڑھے کے ہوئے فاضل اور عبد کلالی کی
پھر خواب میں کیوں ہم کو چکا نظر آتا ہے
تاثیر تعلق سے انجم کی نگاہوں میں
انگور کا ہر دانہ مہوالنظر آتا ہے

کم اشعار لکھ رہا ہوں۔ اس لئے کہ صرف یادداشت
بارے جو کچھ یاد رہ گیا۔ رائے ہری پرشاد صاحب
ایک نہایت معزز رئیس تھے۔ ہومیوپیتھک میں ماہر
بہت سارے غریبوں کا مفت علاج بھی کرتے تھے۔
ان کی شادی شیر گھاٹی ہوئی تھی اور شمس صاحب
گھاٹی کے رہنے والے تھے (دراصل شیر گھاٹی ان کی
تھی) اس لئے بہار کی تہذیب و تمدن کے زیر اثر
ان سے مذاق بھی کرتے تھے۔ رائے صاحب
میونسپلٹی کے چیئرمین جب ہوئے تو انہوں نے یہ طے کیا
میونسپلٹی کے حدود سے طوائفوں کو باہر نکالا جائے۔
ہی پار (پھلگو ندی سے پورب) آباد کرایا جائے۔
کام تھا۔ مہتروں نے اپنی مانگیں رکھیں اور عدم
(Strike) کی دھمکی بھی نہ دی بلکہ اس کو
مہ بھی پہنایا۔ اب شمس صاحب کی شعری صلاحیت

کا اندازہ لگائیں کہ حسن سے ان کا نام شعر میں لاتے ہیں۔

ان مہتروں کو سوجھتی ہے کیا ہری ہری
لڑنے کو ایک رائے ہوئے ہیں ہزار سے

سبحان اللہ۔ کیا دو معنویت سے شعر کہا اور کس حسن سے نام بھی لائے۔ دوسرا شعر جو یاد رہ گیا ہے اس کا ثانی مصرع بھی شمس صاحب ہی کا حصہ ہے۔ دوسرا نہیں کہہ سکتا۔ جس طرح جوش کی بعض ترکیبیں یا بعض مثالیں ایسی ہیں کہ شعر پکار کر کہتا ہے کہ میں جوش کے ذہن کی تخلیق ہوں تو شمس صاحب کا شعر سنئے۔ جس کی جھلک ایک واقعہ کی روشنی ملے گی سے

لڑتا ہے رنڈیوں سے کمر میں نہ زور ہے
دھوتی کو کس رہے ہیں سرنگی کے تار سے

سبحان اللہ تو نہیں کہہ سکتا مگر تعریف نہیں ہو سکتی کہ دھوتی کو سارنگی کے تار سے کسا جا رہا ہے۔ شمس صاحب مرحوم دوسرے شاعروں کا کلام بہت غور سے سنتے تھے۔ داد بھی خوب دیتے تھے۔ سرپر کابری صاحب مرحوم کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور ان کو ایک قادر کلام شاعر کا درجہ دیتے تھے۔ نہایت کشادہ دل تھے۔ اکثر شعراء اپنے سوا دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتے ہیں۔ مگر شمس صاحب بہار کے اور شاعروں کی بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ شمس صاحب شاعری کے علاوہ اور بہت سارے کام سے بھی ملحق رہے تھے۔ برسوں تھیٹر سے بھی وابستہ رہے کلکتہ کے کور نتھین تھیٹر (Corin-thian Theatre) میں اسٹیج پر ایکٹنگ بھی کرتے تھے۔ دوسری تھیٹریکل کمپنی میں ان کے ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے تھے۔ ویسے عام گفتگو میں بھی ان کا لہجہ مکالمے کی ادائیگی سے متعلق رہتا۔ کہاں غصہ کی کیفیت سے بولنا چاہئے۔ کبھی بیماری کی وجہ سے کمزور آواز میں بولنا اور دوسرے

لے اگر غصہ آگیا تو فوراً لہجہ بدل جاتا۔ اخبار بھی برسوں نکالتے رہے۔ "ہمزاد" سے وہ زیادہ مشہور ہوئے [illegible] (۵۰) جب جنگ کے دوران کم ہوگیا [illegible] کا سائز کم ہوتے ہوتے ڈھائی انچ اسکوائر ـ نکلا۔ یہ اخبار انگریزی میں تھا۔ جس کی کتابت [illegible]نے کی تھی۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ شمس صاحب ـ وہ مثل صادق آتی ہے کہ نیش عقرب نہ از پئے کین ست۔ مقتضائے طبیعت اش این است" میں نے فارسی پڑھی نہیں اس لئے غلطی ہو تو معاف کریں گے۔ "ہمزاد" ان سے خریدا گیا تا کہ شمس صاحب پر پابندی لگ جائے۔ مگر وہ بیٹھنے والے شخص نہ تھے۔ فوراً دوسرا اخبار "لال مرچ" نکالا اور یہ ایڈیٹوریل میں اشارہ کیا کہ اس اخبار سے لوگوں کو اور خطرہ محسوس کرنا چاہئے کیونکہ اب "لال مرچ" کا اثر غلط جگہوں پر شاید زیادہ ہو۔ جب "لال مرچ" بھی کسی نے خریدنا چاہا تو نہایت خوشی سے شمس صاحب راضی ہو گئے اور "لال مرچ" بیچ کر کچھ دنوں میں "جلاب" نامی پرچہ (یہ سب ہفتہ واری تھے) نکالا۔ ظاہر ہے اس کے ایڈیٹوریل میں لکھا کہ "لال مرچ" سے اگر کسی کو نقصان ہوگیا ہو تو وہ "جلاب" سے اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ یعنی شکار۔ بندوق ہمیشہ رکھتا۔ شکار بھی کرتے تھے۔ گیا کہ ایک رئیس میر شفاعت حسین صاحب کے پاس شکاری کی حیثیت سے برسوں ملازمت کی۔ ایک بار انہوں نے ہانکا میں ایک شیر (TIGER) کو مار دیا۔ جس پر میر صاحب خفا ہو گئے شمس صاحب ہجو کے ماہر نہ تھے۔ بھی نہایت ملامت سے کہتے۔ ایک رباعی میں میر صاحب کے والد، دادا اور پردادا کے نام نہایت حسن و خوبی سے شامل کئے۔ جوا مصرع یاد ہے کہ ؎

کنند روز محشر شفاعت حسین

میرے پھوپھا کا نام سید علی امام (مرحوم) تھا۔ ان کے دو صاحبزادوں حسن امام صاحب (جو کافی عرصہ ندیم کے ایڈیٹر اور پروپرائٹر تھے۔) اور حسین امام صاحب مرحوم (جو کسی اور تعارف کے محتاج نہیں۔ مسلم لیگ سے بھی وابستہ تھے) سے بھی ربط رکھتے تھے۔ حسن امام صاحب کے مصاحب برسوں رہے۔ حسین امام صاحب کی شادی پر جو اشعار کہے۔ ایک شعر یادگار ہے ؎

اے حسن تم کو مبارک ہو اخی کا سہرا
حق نے دکھلایا حسین ابن علی کا سہرا

ہاں! تو شکار کے سلسلے میں ایک اور بات نہ لکھوں تو ا کی سخت حق تلفی ہوگی۔ وہ مچھلی کا شکار کرنے میں بے ا جواب آپ نہ تھے بلکہ مچھلی کے شکار کے لئے جو ڈور بناتے تھے لوہے سے زیادہ مضبوط ہوتی۔ دھاگے لاکر اور پھر اس پر کیا کیا مسالے لگاتے تھے (ایک دو دن نہیں بلکہ ہفتوں) کہ وہ لوہے کی طرح مضبوط ہو جاتی۔ اب ایک اور خوبی کا بھی ذکر کروں۔ شمس صاحب پر لوگ اکثر مبالغہ بیانی کا الزام رکھتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ وہ نثر میں شاعری کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار کہنے لگے کہ وہ کھدریا (بارہ چٹی گیا ضلع) سے بس میں آرہے تھے۔ گیا میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ ڈوبھی کا مین روڈ پر سے پانی بہہ رہا تھا (وہاں پل تو ان کے انتقال کے بعد بنا) بس ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ کافی بحث کے بعد بھی وہ راضی نہ ہوا کہ یہ خطرہ مول لے تو وہ فوراً پیدل چل پڑے۔ پانی کا بہاؤ تھا۔ ایک

رہا ایسا لگا کہ جنگلوں میں چلے گئے۔ فوراً تیرنا شروع کیا۔ (تیراک بھی زبردست تھے۔ یہ واقعہ تھا) اور کچھ دیر بعد ایک کافی بڑا درخت بہتا ہوا ملا۔ جس کے سہارے وہ گیا کی طرف چلے۔ اور جب بجلی چمکتی تو اس روشنی میں ایک شعر کہہ لیتے (آپ سوچیں گے کہ کیسا کاغذ تھا جس پر وہ بارش میں شعر لکھتے ہوں گے) غرض صبح تک ہی گیا پہنچ گئے۔ اور راستے میں غزل تیار کر چکے تھے۔ مشاعرہ میں شرکت ہو گئی۔ سبحان اللہ۔ ایسے سینکڑوں نثری شعر کہتے۔

ایک اور ماسٹر پیس سنئے۔ چیتے کے شکار میں۔

(میں نہایت مختصر الفاظ میں لکھ رہا ہوں) حسین گنج گئے۔ ایک اوٹ میں بکری پہاڑی پر باندھ کر بیٹھ گئے۔ سورج کے ڈوبنے سے کچھ پہلے چیتا آ گیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ بکری کو مار دیتا شمس صاحب نے فائر (فیر) کر دی وہ اچک کر ایک چٹان کے پیچھے چلا گیا۔ سخت حیرت میں شمس صاحب دوسرے فیر کے منتظر رہے۔ وہ پھر نکلا اور پھر ویسے ہی چلا گیا۔ تعجب کی حد نہ رہی۔ اگر نشانہ غلط ہوتا تو بھاگ جاتا۔ بار بار آنا کیا معنی! غرض تین چار بار کے بعد وہ اب سیدھا شمس صاحب کی طرف آنے لگا۔ سمجھ گئے کہ اس نے دیکھ لیا۔ یہ جھاڑی سے باہر آ گئے۔ چیتا پاس آیا اور ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا — "بیٹا شمس تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں تمہارے بزرگوں میں ہوں۔ یہاں رہتا ہوں۔ بولے۔ "حضور میری اندھی آنکھیں آپ کو پہچاننے سے قاصر رہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔" وہ چلا گیا۔ اللہ ہو، اللہ ہو

(جاری)

بقیہ - کرم جلی

"پھر تو نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا۔ شادی کر لو۔ یہ دوری آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی۔"

منجو جیسے جھنجھلا گئی — میں نے تجھے کتنی بار سمجھایا تھا کہ اسے ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ لیکن آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔"

"تو میں کیا کرتی؟"

"ارے کرم جلی تو اتنا بھی نہیں سمجھتی!" یکایک منجو

غصے سے جیسے چیخ اٹھی — "دانہ ڈالے بغیر کوئی پنچھی پھندے میں پھنستا ہے کبھی؟"

اور ممتاز حیرت سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

فضا ابن فیضی

زمیں پہ پھیلا ہوا آسمان کس کا ہے؟
ترے یقیں کے مقابل، گمان کس کا ہے؟

خسارہ سب کا ہے، سورج کا زخم زدہ رہنا
یہ دھوپ تو ہے مری، سائبان کس کا ہے؟

پرندے خون میں تڑپیں، تو کیا خطا میری
میں تیر ہی سہی، زورِ کمان کس کا ہے؟

شفق شفق، یہ بکھرتا غبار ہے کس کا
افق افق، یہ ابھرتا نشان کس کا ہے؟

سمندر اپنا ہے، لیکن یہ کشتیوں کا سفر
ہوائیں کس کی ہیں، یہ بادبان کس کا ہے؟

جزیرہ جیسے سمندر میں سر ابھارے ہوئے
گلی کے موڑ پہ کچا مکان کس کا ہے؟

بھلا چکا ہوں، میں اپنے قبیلے کی پہچان
جو میری پشت پہ ہے خاندان کس کا ہے؟

ہر اک طلسم بدن میں ہے گم، یہ سوچے کون
کہ ریزہ ریزہ نفس، امتحان کس کا ہے؟

مری خموشیٔ لب، حرف گیر ہے کس کی
ترا سکوتِ نظر، ترجمان کس کا ہے؟

مری زباں تو، کبھی اس قدر نہ تھی سفاک
یہ اُلجھا اُلجھا شکستہ بیان کس کا ہے؟

گرفت میں، مگر، الفاظ کے نہیں آتا
یہ ذکر، میرے ترے درمیان کس کا ہے؟

غزل میں، آج کہاں کا یہ دکھ سمٹ آیا
فضاؔ سے پوچھے کوئی تم کو دھیان کس کا ہے

غزل

بلراج حیرت

سر بہ گریباں دست بداماں
ترک و طلب میں سلسلہ جنباں

کیوں نہیں سمجھا آج تک انساں
فتنۂ دل ہے فتنۂ دوراں

دیکھ لیا اعجازِ بہاراں
پھول بھی نکلے چاک گریباں

اہلِ گلستاں، دشت سواراں[1]
ہم بھی رہے ہیں زلزلہ ساماں

اکثر اٹھے ہیں ایسے بھی طوفاں
روحِ سکوں ہو جن پر قرباں

میرے توسط سے غمِ جاناں
کون ہے رقصاں کون غزل خواں

خیرِ مزاجِ ساقیِ دوراں
ہم بھی یہیں ہیں با غمِ حرماں

تیرا مقدر مجھ سے جڑا ہے
میرا زیاں ہے تیرا بھی نقصاں

مسلک ہستی خود ہستی ہے
مسلکِ ہستی کفر نہ ایماں

اپنے رگ و پے میں بھی لبالو
گلشن بلبل، دشت غزالاں

درد کے رشتے کا یہ کرم ہے
تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں

ہر کس و ناکس پر ہیں افشا
ہم ہیں کہ اب تک خود ہی سے پنہاں

حیرت ابھی تک ہونٹوں میں سلامت
میرا یہی ہے کار نمایاں

[1] نہ جانے شعراء نے اس لفظ کو درخورِ اعتنا کیوں نہیں سمجھا (ب ح)

غزل

نصرت قریشی

نفرتوں کے بیاباں میں اخلاص کے پیرہن کی سکوں بخش خوشبو نہیں
رات کی بیکراں تیرگی میں کہیں، جھلملاتا ہوا کوئی جگنو نہیں
خامشی چاٹ جائے گی دیوار و در، سونی ہو جائے گی خوابوں کی رہگزر
روح بے گھر ہوئی تو سمجھ لیجئے، دشت اجسام میں کوئی آہو نہیں
چاند کی ٹھنڈی پرچھائیوں کے تلے، اپنے پیکر لئے رات بھر ہم جلے
صبح کی گود پائی تو یوں سو گئے، جیسے محرومیوں کی کہیں بو نہیں
ریت اور جھاگ، موجوں کی شہنائیاں، سنسناتی ہوا، ٹھنڈی پروائیاں
ساحلوں سے پرے یہ طلسمی فضا، کوئی دھوکا نہیں، کوئی جادو نہیں
صبح نو یا ایک آہنگِ امید میں ڈھل گئی اور خوابوں کا پیکر بنے
بجھتے چہروں کی ساری شکن ڈھل گئی وقت کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں
زیست بہتی رہی آنسوؤں کی طرح اور گمنامی کی دھول میں کھو گئی
شہرتوں کے دِوانے سنبھل کر بڑھیں دشت گمنامی ہے، شہر خوشبو نہیں
عصرِ نو کا پیمبر، وفا کا امیں، آندھیوں کے نگر میں بھی شمعِ یقیں
ظلمتوں کے پرستار پیچھے ہٹیں، روشنی پر کسی کا بھی قابو نہیں
خول دانشوروں کا چڑھائے ہوئے، خود کو قائد، سخنور، پیمبر کہیں
ہم نے ایسی بھی شخصیتیں دیکھی ہیں، جن میں ادراک کے گل کی خوشبو نہیں
فصلِ افکار پر پھر ہے شبخونِ غم، ٹھہر بکھریں نہ تنکوں کی مانند ہم
ہنس کے سہہ جائیں ہر حادثے کی چبھن، اب تو ہم جیسوں کی ایسی بھی خو نہیں

کرشن پرویز

کرشن پرویز کی غزلیں ہماری قدیم شعری روایات کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں مگر ان کی پرورش و پرداخت آج کے تقاضوں میں ہوتی ہے اس لئے ان کی شاعری میں روایت کی خوبی ہے اور جدت کی وضع بھی۔ کرشن پرویز روایت و جدت کی تقسیم کو لایعنی سمجھتے ہیں۔ بنیادی شے وہ تخلیقی URGE ہے جو فن کار کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے داخل کا اظہار کرے۔ کرشن پرویز کو اس اظہار پر قدرت حاصل ہے۔ اس لئے ان کے لہجے میں توقف نہیں بلکہ فطری بے ساختگی ہے۔ غزل کی پابند ہیئت کس حد تک فطری بے ساختگی کی امین ہو سکتی ہے اور کرشن پرویز اس گرمیٔ اندیشہ کے اظہار کے بعد بھی اس آبگینہ کو کب تک تندیٔ صہبا سے بچا پاتے ہیں — یہ تو مستقبل کی بات ہے لیکن غزل کی اس بھیڑ بھاڑ میں وہ لہجہ کی بے ساختگی، موضوعات کے تنوع، عام مروجہ الفاظ کے ذریعہ تخلیقی رویہ کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور مشکل زمینوں میں اپنے لئے جو وسیع تر قیام گاہ بنا رہے ہیں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مندرجہ ذیل چند غزلیں ایک ساتھ پڑھتے ہوئے ہم کرشن پرویز کے امکانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسعود منظر

کعبہ بھی ہے کاشی بھی یہاں دیر و حرم بھی
اس دل میں ضیا بار خدا بھی ہے صنم بھی
مے خانے سے ہو آئیں تو پھر ساتھ چلیں گے
اے گردش دوراں تو خدا کے لئے تھم بھی
وہ ہم سے گریزاں ہیں تو ہوں شوق سے لیکن
آئیں گے بہت یاد کسی روز تو ہم بھی
دعوا تھا جنہیں ساتھ نبھانے کا عدم تک
وہ ساتھ نہ دے پائے تھے دو چار قدم بھی
اب چاند کوئی خواب کوئی راز نہیں ہے
کھل جائے گا اب اور ستاروں کا بھرم بھی
سمجھا ہے مجھے آج کسی کام کے قابل
یہ ان کی محبت ہے نوازش ہے کرم بھی
یہ دور تجارت ہے کہ اس دور میں ہم نے
بکتے ہوئے دیکھے ہیں کئی اہل قلم بھی
صادق ہے اگر عشق تو پرویز نہ گھبرا
اک روز پگھل جائیں گے پتھر کے صنم بھی

کرشن پرویز

پریشاں گل ہے افسردہ کلی ہے
چمن میں ہر طرف کیوں بے بسی ہے
خدا جانے کہاں پر آ گئے ہم
ہر اک چہرہ یہاں پر اجنبی ہے
محبت سے گریزاں کس لئے ہو
محبت تو وقار آدمی ہے
اسے معراجِ عالم کیسے کہہ دیں
پریشاں آدمی سے آدمی ہے
خیال آبرو نہ پاسِ رتبہ
ہوا کیسی زمانے میں چلی ہے
غضب یہ ہے کہ شمشیرِ نفس بھی
ہوس کے زہر میں ڈوبی ہوئی ہے
مسرت خاک ہو پرویز دل کو
خوشی بھی غم کی صورت میں ملی ہے

ہر قدم پر اک انوکھے نام سے جانے گئے
حسن والے بھی زمانے میں خدا مانے گئے
کس قدر بہروپئے ہیں آج کی دنیا کے لوگ
رہبروں کے بھیس میں رہزن نہ پہچانے گئے
دیر میں کعبہ میں گلشن میں سکوں ملتا نہیں
کس نگر میں ہم نہ اپنے دل کو بہلانے گئے
پی لیا جن کی ہوس نے ابن آدم کا لہو
وقت کی تاریخ میں وہ حکمراں مانے گئے
زندگانی کی ڈگر میں وقت کے ہر موڑ پر
دوستوں کے بھیس میں کچھ لوگ پہچانے گئے
کھل گئے پرویز چاک دل گلوں کو دیکھ کر
ہم جو خاروں سے چمن میں چاک سلوانے گئے

اڑ رہی ہے ہر طرف پت جھڑ کی دھول
زندگی ہے یا کوئی سوکھا ببول
ذکرِ بیش و کم سراسر ہے فضول
جو بھی دیں گے آپ وہ سب کچھ قبول
جو چلا واپس نہ پھر وہ ہو سکا
پیار کی راہوں کے کیسے ہیں اصول
بے بسی، حسرت، تمنا، آرزو
زیست کی خاطر کیا قبول
اپنا چہرہ بھی نظر آتا نہیں
دل کے شیشے پر جمی ہے کتنی دھول
جو ہوا اچھا ہوا اب چھوڑیئے
بات کو پرویز کیوں دیتے ہو طول

کستک پرویز

جب شدتِ جنوں میں ذرا سی کمی ہوئی
دیکھا ہے بنفسِ شام و سحر بھی تھمی ہوئی
گزری ہے سوگوار ہوا چیختی ہوئی
کیا پھر دیارِ دل میں کہیں خودکشی ہوئی؟
ہم نے تمام رات جلائے چراغِ دل
تب تری انجمن میں کہیں روشنی ہوئی
اتری غموں کی گرد تو حیران رہ گئے
کل رات اپنے آپ سے مل کر خوشی ہوئی
ہنستے ذرا ہلے تو سبھی چونک جائیں گے
دنیا ہے اپنے آپ سے اتنی ڈری ہوئی
آئی مصوری تو دکھاتا کمالِ فن
شرم و حیا کے بار سے پلکیں جھکی ہوئی
یہ واردات پھولوں نے دیکھی تو رو دیئے
شاخوں سے تھی بہار کی جھولی بھری ہوئی
یہ بات کس کے شعلۂ رخسار سے کہوں
ک برف سی ہے میرے لبوں پر جمی ہوئی
پرویز ایک شعر بھی اس نے نہیں سنا
منسوب جس کے نام تری شاعری ہوئی

سکونِ دل کی ضرورت تھی دل لگی کے لئے
سکون ہی نہ ملا ہم کو دو گھڑی کے لئے
چراغِ راہ بنے تھے جو ہر کسی کے لئے
وہ لوگ آج پریشاں ہیں روشنی کے لئے
ہر ایک درد تو اس کی دوا کرے کوئی
ہزار غم ہیں زمانے میں آدمی کے لئے
کبھی چمن کی بہاروں کو ناز تھا جن پر
ترس رہے ہیں وہ کانٹوں سے دوستی کے لئے
ہر ایک شخص زمانے میں اب پریشاں ہے
کہیں یہ درد کے ہاتھوں کہیں خوشی کے لئے
الجھ کے دامِ قفس میں تو مر گئے لاکھوں
بہت ہی کم ہیں جو مرتے ہیں زندگی کے لئے
جہاں بھی زیست میں پرتوِ تیرگی پائی
الجھ پڑے ہیں اندھیروں سے روشنی کے لئے

جن پر تھا بھروسہ کہ ہیں غمخوار کی مانند
وہ بیٹھ گئے ریت کی دیوار کی مانند
اے زیست کبھی ہنس کے ادھر سے بھی گزر جا
ہم بھی ہیں کھڑے تیرے طلبگار کی مانند
کھلنے کو تو کھلتے لالۂ صحرا کی طرح ہم
دنیا کی نگاہوں میں رہے خار کی مانند
اس دردِ محبت نے کیا دل کا یہ عالم
آزاد بھی ہو کر ہیں گرفتار کی مانند
گھائل ہے اگر روحِ محبت تو ذرا دیکھ
عریاں ہے شبِ ماہ بھی تلوار کی مانند
کیسے ہو بھلا آپ کے وعدوں کا بھروسہ
اقرار بھی ہوتا ہے تو انکار کی مانند

غزلیں

غزلیں

کوشش پرویز

خون میں ڈوبے ہوئے رنگ کے کالے پتھر
بن کے مجنوں کوئی آج بھی کھائے پتھر

اہلِ دنیا نے بھی سجدوں میں جھکایا سر کو
ہم نے اس رنگ سے اس روپ میں ڈھالے پتھر

جذبۂ شوق ہو کامل تو خدا ملتا ہے
دل نہ مانے تو یہ مسجد پہ شوالے پتھر

ہم تو ہیروں کی تمنا میں چلے تھے گھر سے
وقت کی جیب سے نکلے تھے نرالے پتھر

کب کنارے پہ سلامت وہ پہنچ پائے گی
جس کی کشتی میں ہر اک شخص نے ڈالے پتھر

زخم پرویزؔ زمانے میں دکھائیں کس کو
لوگ تو آئے تھے ہاتھوں میں سنبھالے پتھر

کسی صورت نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
بجھے جاتے ہیں دل چہروں کی ویرانی نہیں جاتی

خدا کا نام لینے کو تو لیتے ہیں سبھی لیکن
خدا کی بات دنیا میں کہیں مانی نہیں جاتی

حقیقت خود بخود ہوگی نمایاں لاکھ پردوں سے
دلیلوں سے مثالوں سے کبھی جانی نہیں جاتی

اگرچہ اس میں لاکھوں حسرتوں کے پھول کھلتے ہیں
مگر پھر بھی مرے اس دل کی ویرانی نہیں جاتی

نظامِ میکدہ بدلا، نئے ساقی، نئی محفل
مگر اس پر بھی لوگوں کی پریشانی نہیں جاتی

جنوں کی منزلوں تک کس طرح پرویزؔ پہنچو گے
اگر دستِ خرد کی خاک بھی چھانی نہیں جاتی

احمد سعیدی (بنگلہ دیش)

کٹی جلی

ہاشم علی کچھ دنوں سے بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے طیش میں آکر ممتاز کو اپنے شوہر سے خلع تو دلوا دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اب تک وہ اس کے لئے کوئی دوسرا مناسب رشتہ تلاش نہ کر سکا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے ممتاز کے رنگ ڈھنگ بھی اسے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ دن دن بھر ادِھر اُدھر گاؤں میں بھٹکتی رہتی اور گھر کے کام کاج میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہو۔ اور وہ اپنی گمشدہ شئے گاؤں میں ادھر ادھر ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔

ممتاز کو اگر اس کا شوہر تین وقت میں سے ایک وقت بھی کھانے کو دیتا اور دو وقت اسے بھوکا رکھتا تب بھی ہاشم علی اپنی بیٹی کو ہرگز خلع نہ دلواتا، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لئے ممتاز کو استعمال کرنے لگا ہے تو وہ جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ اپنی بیٹی کو پال پوس کر اس نے اس لئے تو بڑا نہیں کیا تھا اور اس لئے بیاہ نہیں دیا تھا کہ وہ دوسروں کی تفریح کا سامان بنے۔ اسے کلام کی بے غیرتی پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ میں داؤ لے کر جائے اور اس کا سر دو ٹکڑے کر دے اور جیل چلا جائے۔ مگر اس کی بیوی منجو نے اسے سمجھایا کہ زیادہ ہنگامہ کرنے کی بجائے بہتر یہی ہوگا کہ ممتاز کو اس کے شوہر سے چھڑا لیا جائے۔

اس وقت ہاشم علی نے سوچا بھی نہ تھا کہ شوہر سے چھڑا لینے کے بعد ایک مسئلہ تو حل ہو جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی دوسری شادی کرنے کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ اگر اس کی مالی حالت کچھ بہتر ہوتی تو کبھی وہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔ پہلا تو حالت یہ تھی کہ ایک شام کھانے کے بعد دوسری شام کے لئے سوچنا پڑتا تھا۔ پھر وہ ممتاز کی پہلی ہی شادی میں اس قدر مقروض ہو گیا تھا کہ ابھی تک اس کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اب اس

کی دوسری شادی میں اگر وہ کسی سے قرض بھی مانگے تو
کون دے گا؟ ادھر ممتاز کے پاگل پن نے اسے اور بھی
پریشان کر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ اس کا
گلا دبا دے اور ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ہی ختم کر دے، پھر
سوچتا، ابھی زخم تازہ ہے، اس لئے یہ کھلائی بوکھلائی
پھرتی ہے۔ کچھ دنوں بعد آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائے گی۔ شوہر
کتنا ہی ناکارہ کیوں نہ ہو، تھوڑی بہت کشش تو ضرور
ہوتی ہے

ہاشم علی کی سب سے بڑی پریشانی ممتاز کے
کھانے اور کپڑے کی تھی۔ شادی سے پہلے تو وہ جیسے
تیسے کپڑے بھی پہن لیتی تھی اور اگر نمک بھات بھی ملے
تو خاموشی سے کھا لیتی تھی۔ لیکن اب تو اس کا دماغ ہی
خراب ہو گیا تھا۔ سالن کے بغیر نوالہ اس کے حلق سے
نیچے نہیں اترتا تھا اور چھاپے کی ساڑی کے سوا کوئی دوسری
ساڑی پہننے کو تیار نہیں تھی۔ ہاشم علی کے لئے یہ دونوں
چیزیں بڑی مہنگی تھیں۔

ہاشم علی کو ممتاز کی فکر نے نیم پاگل کر دیا تھا۔
ہاشم علی کسلا کا کام کر کے یومیہ جو کماتا تھا وہ اس مہنگائی
کے دور میں اس کی بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے
ناکافی تھا۔ گھر کی چھاؤنی کرنی ہو۔ بیڑا لگانا ہو، کھیت
میں دھان نرم کرنی ہو، خود رونے پودوں کو صاف کرنا ہو
یا فصل کاٹنی ہو۔ وہ سارے کام کر لیتا تھا۔ اس کے
عوض اسے دن میں بھرپیٹ کھانے کو مل جاتا تھا اور شام
کو ایک سیر چاول اور دو ٹاکا نقد ملتا تھا۔ اس محدود
آمدنی میں اسے اپنا بیوی اور دو بچوں کا پیٹ پالنا مشکل
تھا۔ اب اوپر سے ممتاز کا بوجھ ایک بار پھر اس کے کاندھوں
پر آ پڑا تھا۔

ممتاز کی شادی کے بعد وہ بہت خوش تھا کہ
چلو ایک آدمی کا خرچ تو کم ہوا۔ ایک آدمی کا خرچ
ایک دن میں کم سے کم آدھا سیر چاول تھا۔ اس نے کبھی
حساب تو نہیں کیا تھا۔ لیکن ممتاز بھی ایک وقت میں آدھ
پاؤ چاول سے کم کیا کھاتی ہوگی؟ اسے کیا معلوم تھا کہ ممتاز
کی ازدواجی زندگی کی مدت اتنی مختصر ہوگی۔ اس کی شادی
کو ابھی ایک سال بھی تو پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس
مدت میں وہ سہاگن بھی بنی اور مطلقہ بھی ہو گئی۔ ہاشم علی
کو اب وہ اپنے سینے پر رکھی ہوئی ایک بھاری سل کی طرح
لگ رہی تھی۔

اگر ہاشم علی کو روزانہ کام ملتا رہتا تو بھی کسی طرح
زندگی کی گاڑی کو کھینچ لیتا۔ لیکن سال میں تین مہینے ایسے
گزرتے تھے جب گاؤں میں کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ بارش کے
دنوں میں گھر کی چھاؤنی کا کام بند ہوتا۔ کھیتوں میں دھان
اور پٹ سن کی فصلیں کھڑی ہوتی تھیں۔ اس لئے کھیتوں
میں بھی کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ بس آندھی طوفان میں
اگر کسی کا بیڑا ٹوٹ جاتا یا جھونپڑی اڑ جاتی تو عارضی طور
پر چند دنوں کا کام مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی نہیں ملتا
تھا کہ اس کی طرح گاؤں میں اور بھی تو لوگ موجود تھے۔ اس
کے جیسے دوسرے لوگ تو مہینے میں پائی پائی جوڑ کر تھوڑی
بہت رقم پس انداز کر لیتے تھے۔ برسات میں اس کو خرچ
کرتے تھے۔ لیکن ہاشم علی کے لئے پائی پائی جوڑنے کی نوبت
ہی نہیں آتی تھی، وہ تو ہمیشہ مقروض ہی رہتا تھا۔ برسات
میں وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پھنسانے والی بانس کی ڈارکی
بنا کر اپنے خرچ پورا کرتا تھا۔ ایک دو ڈارکی خود بھی دریا
کنارے بٹھا دیتا تھا۔ اس سے بھی تھوڑی بہت آمدنی
ہو جاتی تھی، مگر اس میں بھی کبھی کبھی کھوہ مار ہو اس کے

اچھے دام نہیں ملتے تھے۔

اس کی بیوی منجو نے جب سرگوشیوں میں اسے بتایا کہ سامنے والے گاؤں کا ایک لڑکا ممتاز میں دلچسپی لینے لگا ہے اور ممتاز بھی اس کی آنکھ بچا کر ندی کنارے اس سے ملنے جلنے لگی ہے تو ہاشم علی کو اچانک اپنے سینے پر رکھی ہوئی سل سرکتی سی محسوس ہوئی۔

جب منجو نے اسے یہ بتایا کہ وہ فیضو دیوانی کا بیٹا واجد ہے تو ہاشم علی کو اور بھی خوشی ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ فیضو دیوانی کھاتا پیتا گرہست تھا اس کے پاس پچاسوں بیگہ زمین تھی۔ واجد گرچہ شادی شدہ تھا، اس کے دو بچے بھی تھے۔ مگر یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ گاؤں کے کھاتے پیتے گھرانے یوں بھی دو تین شادیاں کر کے سبھوں کے ساتھ نباہ کرتے چلے آ رہے تھے۔ ایسی شادیاں ناکام بھی ہوتی تھیں۔ لیکن بہت کم۔ خود واجد کی بھی تو دو سوتیلی مائیں تھیں۔

"تم اسے بلا کر بات کیوں نہیں کرتی ؟" ہاشم علی نے بیوی سے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

"چھپ چھپ کر ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر اسے ممتاز پسند ہے تو شادی کر لے۔"

ہاشم علی نے اپنی بات ختم کر کے سوچا، چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ جب دونوں نے خود ہی ایک دوسرے کو پسند کر لیا ہے تو شادی کے بعد نباہ بھی ہو جائے گی۔ ممتاز کی پہلی شادی تو اس نے اس کی مرضی کے بغیر ہی کر دیا تھا۔ اس میں اس کا قصور بھی کیا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا ممتاز کے سکھ کے لئے ہی تو کیا تھا۔ کلام کی اپنی پان بیڑی کی دکان تھی، صورت شکل کا اچھا تھا۔ جوان تھا، تندرست تھا، گھر میں صرف اس کی ماں تھی۔ نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن باپ عرصہ ہوا مر چکا تھا۔ ایسا گھر تو نصیبوں سے ہی ملتا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ کلام کے اندر اتنی زیادہ شیطنیت بھری ہوئی تھی۔ پھر اس کی ماں بھی کون سی اچھی عورت تھی۔ بڑھاپے میں ہر جگہ عشق لڑاتی پھرتی تھی۔۔ واجد اگر اس سے بیاہ کر لے تو سدا سکھ میں رہے گی۔

ہاشم علی دل ہی دل میں خوشی محسوس کرنے لگا

"میں اسے کل ہی کھانے پر بلا بھیجتی ہوں۔" منجو نے کہا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

واجد علی جب ہاشم علی کے گھر آیا تو وہ اپنے ساتھ پانچ سیر باسمتی چاول اور ایک بڑی سی ہلسا مچھلی بھی لیتا آیا

منجو نے کہا: "تم یہ سب کیوں لے کر آئے ہو۔ ہم غریب ہیں تو کیا ہوا، کیا تمہیں ایک شام کھانا بھی نہیں کھلا سکتے ؟"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" واجد نے جواب دیا ۔۔ "خالی ہاتھ کسی کے یہاں جانے میں بدشگونی ہوتی ہے نا اس لئے۔"

ہاشم علی آنگن میں بیٹھا ہوا بہ ظاہر انجان اور بے تعلق بنا بیڑی پیتا رہا لیکن دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آتے ہیں۔ کھاتا پیتا گھرانہ ہے اس کا۔ اس کے لئے تو یہ سب کچھ معمولی سی بات ہے" گولا ماچا" میں سینکڑوں من چاول بھرا ہوا ہوگا۔ اس میں سے پانچ سیر چاول نکال لینا تو ویسے ہی ہے جیسے دریا سے ایک لوٹا پانی نکال لیا جائے۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال ابھر آیا۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے، واجد ممتاز کو اپنے گھر نہ لے جا کر یہیں رکھے اور خرچ دیتا رہے ؟" ہاشم علی کو اس خیال سے بڑی طمانیت محسوس ہوئی۔ ایسا ہو تو بہت

ہی اچھا ہوگا ۔ اس بہانے اس کے بھی دکھ دلدّر دور ہو جائیں گے!

منجو نے باسمتی چاول کا بھات اور رہسا مچھلی کی ترکاری پکا کر واجد کو کھلایا اور کھانا کھانے کے بعد وہ دیر تک آنگن میں بیٹھا منجو اور ممتاز سے باتیں کرتا رہا ۔

اب واجد روزانہ آنے لگا ۔ وہ ہر روز اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ لے کر ضرور آتا ۔ منجو اسے ہر روز ٹوکتی ۔ مگر واجد علی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا ۔

کچھ دنوں کے بعد منجو نے ہاشم علی سے کہا ۔" وہ دونوں ہم لوگوں کے سامنے بات کرنے میں شرماتے ہیں ۔ کھل کر کوئی بات نہیں کر سکتے ۔ میں نے سوچا ہے ۔ اب سے ان دونوں کو گھر میں بٹھا دیا کریں گے ، تم کیا کہتے ہو؟"

" ٹھیک ہے ، پھر میں باہر چلا جاؤں گا ۔" ہاشم علی نے جواب دیا ۔" تم ان پر نظر رکھنا ۔"

" وہ تو میں رکھوں گی ، تم فکر نہ کرو ۔"

اس دن کے بعد واجد جب بھی آتا ، ممتاز اُسے لے جا کر گھر کے اندر بٹھاتی ۔ ہاشم علی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے باہر چلا جاتا اور منجو گھر کے دروازہ کے سامنے بیٹھی پہرہ دیتی رہتی ۔ اگر کبھی اتفاق سے گاؤں کی کوئی عورت آجاتی یا کوئی مرد آنکلتا تو وہ وہاں سے اٹھ کر آنگن میں آجاتی ۔

ہاشم علی اس دن گھر میں تنہا تھا ۔ منجو اور ممتاز ایک ساتھ کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں ۔ واجد نے آتے ہی جیب سے ایک پیکٹ بیڑی نکال کر ہاشم علی کی طرف بڑھا دیا ۔" یہ لیجئے ابا ۔ یہ آپ کے لئے لے کر آیا ہوں ۔"

ہاشم علی کو اس کا ابا کہہ کر مخاطب کرنا ، بہت اچھا لگا ۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا ۔ واجد کا ابا کہہ کر مخاطب کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اس نے ممتاز سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔

" وہ تو ٹھیک ہے واجد میاں ۔" ہاشم علی نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا ۔" مگر تم شادی کب کر رہے ہو؟"

" بس ہفتہ دس دن کے اندر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔" واجد نے جواب دیا ۔" زرینہ کو راضی کر لیا ہے ۔ پہلے تو وہ بہت روئی دھوئی لیکن بعد میں مان گئی ہے ۔ عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے ۔ مگر سوتن کا نام سنتے ہی ناگن کی طرح پھن جوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ اب صرف باپ جان کو راضی کرنا باقی ہے ۔ جس دن باپ جان راضی ہو گئے ، اسی دن قاضی کو لے کر آجاؤں گا ۔"

" اور تمہاری ماں ۔"

" ماں کچھ نہیں بولے گی ۔"

تھوڑے دنوں تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا ۔ واجد شام ہوتے ہی آجاتا اور رات کا کھانا کھا کر ایک دو گھنٹے بعد چلا جاتا ۔ پھر اچانک اس نے آنا جانا بالکل بند کر دیا ۔

ابتدا میں تو ان دونوں میاں بیوی نے تو یہی سمجھا کہ شاید گھر میں کام کاج میں الجھ گیا ہو ، یا گاؤں سے باہر کسی سے ملنے چلا گیا ہوگا یا تو پھر دھان بیچنے ہاٹ جاتا ہو ۔ اس لئے فرصت نہ ملتی ہو ۔ لیکن جب دس بارہ دن گذر گئے اور واجد ایکبار بھی نہیں آیا تو منجو کو تشویش سی ہونے لگی ۔

اس نے ممتاز سے پوچھا ۔" کیا بات ہے اب واجد ایک دم ادھر نہیں آتا ، تم سے کوئی جھگڑا وگڑا تو نہیں ہوا ؟"

" نہیں تو ۔" ممتاز نے جواب دیا ۔" مگر ادھر وہ بہت ضد کرنے لگا تھا ۔"

" ضد کرنے لگا تھا ، کس بات کے لئے ؟"

" کہتا تھا ، چند دنوں کے بعد ہی تو ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی ، پھر یہ دوری کیوں ہے ؟"

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری

آخری صلیب (شعری مجموعہ)

مصنف :- شان بھارتی

صفحات :- ۱۴۴ قیمت :- ۱۴۰/ روپے

'آخری صلیب' پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مقدمہ پڑھنے کے بعد ان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ 'شان بھارتی کی غزلیں جستجو رکھتی ہیں۔ دلکشی رکھتی ہیں اور الفاظ میں پاکیزگی ہے۔' شان بھارتی کا کلام شگفتہ اور عصری حسیت کا حامل ہے جس کا مطالعہ دل و دماغ دونوں کو سرور و کیف بخشتا ہے لیکن وہی ان کی سخن وری کو پسند کرے گا جسے عرفان علم حاصل ہے۔ مثلاً

طلب ہو گر تجھے عرفان علم کی
جناب شان کے اشعار پڑھنا

ایسے شعری مجموعہ کی میرے خیال میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس میں قاری کو بیک نگاہ اپنی طرف متوجہ کرنے والے اشعار اچھی خاصی تعداد میں ہوں۔ 'آخری صلیب' کو میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ شان بھارتی کے درج ذیل اشعار بلاشبہ تخلیقیت افروز ہیں۔

قرار سے نہیں رکھتیں سکون کی موجیں
کہ مسئلوں کا بھنور ہی کنارہ ہے میرا

اپنے اندر کی طہارت سے لپٹیاں ہوں بہت
جسم لپٹا ہے گناہوں کے کفن میں ایسا

تجلیوں سے کوئی رسم و راہ ہو نہ سکی
ہوں وہ سحر کہ ابھی تک میں شب گزیدہ ہوں

بٹ رہی تھی جہاں پیمانِ وفا کی سوغات
شان کشکول میں ہم وعدہ اٹھا لائے تھے

[illegible] برہم ہے زمانے کا مزاج
ایک کوزے میں جو ہم دریا اٹھا لائے تھے

لگا کہ اب بھی جہاں میں خلوص زندہ ہے
ملا کبھی جو کوئی آشنا سلیقے سے

مدد ہی کر رہا ہوں دوستوں کی
مصیبت پھر اٹھانا چاہتا ہوں

شان بھارتی جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس کی گونج ان کی شاعری میں موجود ہے اس میں کوئلہ کی کانوں سے تعلق رکھنے والی زندگی کا دلکش انعکاس بھی ہے اور اہل وطن کی زبوں حالی کا مرثیہ بھی۔ شان بھارتی کے لب و لہجہ میں ایک البیلا پن بھی ہے۔ مختصر یہ کہ شان بھارتی کا یہ شعری مجموعہ داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج رکھنے والا مجموعہ ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا

کتابت اوسط درجے کی ہے لیکن طباعت آفسیٹ پر ہوئی ہے۔ کتاب مجلد اور سرورق معنی خیز ہے۔

علامہ نادم بلخی

شہرِ خیال

سہیل شمارہ ۵۲/۵۳ میں مشمولہ مضمون بہ عنوان "مولانا حالی سے تنقیدی افکار" کے بارے میں کچھ معروضات پر پروفیسر گیان چند کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ حالی انگریزی سے نابلد محض تھے لہٰذا جو کچھ "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھا گیا وہ سب مانگے کا اجالا سمجھا جائے گا۔ چکبست نے بھی اعتراض اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔ مقصد شعر و شاعری کا اطلاع دینے والا کون تھا؟ اردو تنقید کیونکہ مضمرات ذہنی و نفسیاتی سے ملوث رہی ہے لہٰذا فروغ پذیر نہیں ہو سکتی ہے۔ پروفیسر گیان چند صاحب اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ہی ایسے قابلِ تعریف کوائف کے ادیب ہیں جن سے اس نوعیت کے ادبیاتی نکات پر روشنی ڈالنے کی استدعا کی جا سکتی ہے۔

شمارے میں شامل سبھی تحریریں بہت اچھی ہیں۔ فضا ابن فیضی اور کرشن موہن دونوں اچھے شاعر ہیں۔ غزلیات پسند آئیں۔

● تارا چرن رستوگی، گوہاٹی

سہیل کے حالیہ شمارے میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ مطلع ہے

وہ آرزو نہ سہی قربِ بندگی ہی سہی
رہِ حیات میں سجدوں کی روشنی ہی سہی

اس میں ایک فاش غلطی در آئی ہے۔ یعنی دو اشعار ایک ایک مصرع بطور ایک شعر کے شائع ہو گیا۔ جس سے معنویت اور ردیف و قافیہ دونوں مجروح ہوئے ہیں۔ وہ دو اشعار یوں ہیں :

نباہنا ہے کشاکش سے تادمِ آخر
خدائی نہ سہی آلامِ بندگی ہی سہی

ہوا کی زد پہ لرزتی، دیئے کی لو ہی تو ہوں
میں بجھ بھی جاؤں تو اک پل کی روشنی ہی سہی

اشاعت میں پہلا اور تیسرا مصرع (مندرجہ بالا) بطور ایک شعر کے چھپ گئے، یہ تو یاد نہیں کہ یہ سہو میری ہی روا روی کی نتیجہ ہے یا کاتب کی۔ لیکن اس کی تصحیح ضروری ہے ورنہ یہ فنی خامی میرے حساب میں لکھی جائے گی

● ساجدہ زیدی، علی گڑھ

سہیل کا نیا شمارہ اپنی تمام فکری توانائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔

میں سہیل کا مختصر ترین مگر جامعیت کا بہت پہلے سے معترف ہوں۔ اور دلی تمنا ہے کہ اس کو وہ تمام سہولتیں وسائل و ذرائع مہیا ہوں جو ایک معیاری مجلہ کے لئے از حد ضروری ہیں۔ معنوی خصوصیات کے ساتھ صوری آمیزش بھی ہو تو "سہیل" مزید دل آویز و دیدہ زیب بن جائے۔ لیکن نامساعد حالات میں اس فکر انگیز روش کو جاری رکھے ہوئے ہیں اس سے تو آپ حضرات کس طرح نبرد آزما ہوں گے یہ تو

آپ کا دل ہی جانتا ہوگا۔ ہم قلم کار اور اس کے باشعور قارئین نفس محسوس ہی کرسکتے ہیں۔ اور اپنی نیک خواہشات اور دعائیں ہی نچھاور کرسکتے ہیں۔

مجموعی طور پر سابقہ جریدوں کی طرح یہ شمارہ بھی اپنے دامن میں فکر و احساس کے موتی بکھیرے ہوئے ہے۔ خصوصیت سے عاشور کاظمی صاحب کا "پیغام" ارباب فکر کے نام" تمام جریدے پر محیط ہے۔ ان بدلتے حالات میں ارباب فکر کے لئے ایک لمحۂ فکریہ اور ایک سوالیہ نشان بھی ہے۔ میں تو اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے مقامی دانشوروں کو اس کی ایک ایک کاپی فوٹو کاپی کرکے تقسیم کردی اور دو کاپی مقامی" روزنامے، ندیم اور آفتاب" جدید کو بھی برائے اشاعت سپرد کردیں اس کی ایک کاپی منسلک کررہا ہوں اور یہ سب تگ و دو بغیر آپ کی ایما و منشا طلب خواہش کے وجود میں کس جذبے کے تحت وجود میں آگئی میں خود نہیں جانتا ہوں۔

پروفیسر علیم اللہ حالی مجھے خوب جانتے ہیں ۶۰ تا ۷۰ء کے اواخر میں موصوف سے خاصا تحریری رابطہ رہا ہے۔ ان کے رسالے ماہنامہ" صبح نو" میں میرا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ میرے اولین شعری انتخاب" نغمۂ شعور" پر حالی صاحب کا تبصرہ میری اگلی منزل کے لئے مشعل راہ بنا ہے۔ میری کوتاہی اور بے عملی ہے کہ محترم سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ آپ موصوف تک میرا بہت بہت سلام پہنچا دیں۔

● عبدالمتین نیاز۔ بھوپال

سہیل باقاعدہ مل رہا ہے۔ جناب سید علی مظفر کا شائع ہونے والا مضمون" میرا کندہ طبع لوگ" بہت شاندار ہے۔ جناب قیصر عثمانی صاحب کا" سید فضل کریم فضلی" پر لکھا گیا خاکہ بہت پسند آیا۔ ایک ادیب اور شاعر کی زندگی سنوارنے میں اتفاقات کا کتنا بڑا ہاتھ رہتا ہے اس کو پڑھ کر اس کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے بھی ایشیا کے عظیم مصنف ابن صفی نے لکھا ہے کہ کامیاب زندگی ذہانت اور موقع سے فائدہ اٹھانے سے کہیں زیادہ استقلال اور توجہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

● عبدالسلام کوثر، شاہ دیونگر

"سہیل" شمارہ ۵ کے بعد شمارہ ۶ بھی بہت کم وقفے میں مل گیا۔ مبارک ہو۔ اس بار لندن سے جناب عاشور کاظمی کا خط بہ نام ڈاکٹر علیم اللہ حالی بہت ہی اہمیت اور توجہ کا حامل ہے۔ آپ نے بھی اس خط کو خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے یہ آپ کی مدبرانہ دانائی ہے۔ کاظمی صاحب کی تمام باتیں نہایت سنجیدہ اور درست ہیں۔ آج کے قلم کاروں، ادیبوں اور شاعروں کی فکر کیا ہو اور انہیں کس طرح اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برا ہونا چاہئے۔ اس بارے میں کاظمی صاحب کے احساسات بالکل بجا ہیں اور ان سے پورے طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اشتراکیت اور ترقی پسندی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک محدود اور مخصوص طبقہ ہی اشتراکیت کے اصولوں سے اتفاق کرسکتا ہے۔ مگر ترقی پسند ادب کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے اور رہے گی اور اس ادب سے کسی کا اتفاق نہ کرنا ایک غیر دانشمندانہ فعل ہوگا۔ ترقی پسند ادب جو پوری انسانی برادری کے لئے اصلاح اور ترقی کی ایک کوشش ہے۔ اس میں ہاتھ بٹانا ہر ادیب و شاعر کا بنیادی اور اخلاقی فرض بنتا ہے۔ لیکن اس عمل کو تنہا اشتراکیت کے پرچم تلے مرتکز کرنا قابل قبول نہیں۔

بلکہ اس جہد اور کوشش میں ہر روشن مکتب فکر کا تعاون
اور اشتراکیت [illegible] شاعر جنہوں نے ترقی
پسند [illegible] کی تحریک کو صرف اشتراکیت کے دائرہ کار میں محدود
کرنا چاہا اور اس کے لئے ادب میں نعرے بازی یا پروپگنڈہ
جیسے غیر فطری عنصر کو شامل کیا وہ آگے نہیں چل سکے اور وقت
نے انہیں فراموش کر دیا (بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہی لوگ ترقی پسند
تحریک کے لئے رکاوٹ بھی بنے) اور برخلاف ان کے وہ لوگ
بہت مقبول ہوئے جنہوں نے اشتراکیت کے فلسفہ سے ذہنی
ہمدردی رکھنے کے باوجود ایک ایسا عوامی ادب پیش کیا جسے
سب نے اپنا ادب سمجھا اور اس میں اپنے ذاتی افکار و احساسات
کا عکس پایا۔ منٹو، کرشن چندر، مجاز، فیض، سردار جعفری
اور احمد ندیم قاسمی ایسے ہی مقبول قلم کاروں میں شمار کئے
جاتے ہیں۔ اور آج بھی رفعت سروش، ندا فاضلی، افتخار عارف،
احمد فراز، کشور ناہید، قمر رئیس، اصغر علی انجینیئر، یا علیم اللہ
حالی جیسے شاعر اور دانشور قبول عام ادب کی ہی پیروی
کرتے نظر آتے ہیں۔ جناب قمر رئیس کا یہ بیان کہ "یہ
تحریک بعض حساس ذہن رکھنے والے ادیبوں، شاعروں
اور دانشوروں کی جذباتی امنگ اور خواہش کو شعوری
سطح پر برتنے اور اس کو قومی اور بین الاقوامی صورتحال
سے مرتب کرنے کا نتیجہ ہے۔" (انشا، قمر رئیس نمبر صفحہ ۱۱۸)

یا پھر ان کا یہ کہنا کہ ——

"ترقی پسند تحریک دراصل ایک متحدہ محاذ کی حیثیت
رکھتی ہے۔ اس میں نہ تو سب مارکسٹ اور کمیونسٹ ہیں
اور نہ سب گاندھی ازم کے پرچارک جیسے حیات اللہ انصاری،
کمیونسٹ جیسے سجاد ظہیر اور فیض اور مذہب کے پرستار
جیسے حسرت موہانی اور محض روشن خیال جیسے محمد علی
ردولوی، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار جیسے
لوگ شامل رہے۔ یہ سب حضرات جداگانہ سیاسی نظر
رکھتے تھے۔ لیکن بعض مشترکہ اقدار پر سب متفق تھے۔۔
تحریک نے ان پر کبھی کوئی خاص نظریہ تھوپنے کی کوشش
نہیں کی۔" (انشا قمر رئیس نمبر صفحہ ۱۱۶) ترقی پسند تحریک
کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ متذکرہ خیالات کی روشنی
میں اشتراکیت کو کلی طور پر ترقی پسند ادب سے جوڑے
رہنا غیر مناسب اور غیر موزوں دعویٰ معلوم ہوتا ہے
اشتراکیت کا جو بھی حشر ہوا وہ لوگوں کے سامنے آ چکا۔
اور اب سرمایہ دار امریکی اور یوروپی طاقتوں کے مظالم
اور جارحیت کے نقشے بھی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں جن کے
خلاف قلم اٹھانا اور احتجاج کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے
اور میں بھی عاشور کاظمی صاحب کی اس اپیل پر لبیک
کہتا ہوں۔

قیصر اقبال، مونگیر (بہار)

ماہنامہ سہیل کا تازہ شمارہ سے نظر نواز ہوا۔ یہ
ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ سہیل کے شہر خیال میں اظہار
خیال کا معقول انتظام ہے۔ جس میں مشمولات پر کھلے
الفاظ میں تعریف و تحسین کے ساتھ ساتھ تنقید کی بھی گنجائش
ہوتی ہے۔ نمود بے حد معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔ غزلوں میں
کرشن موہن، مدہوش بلگرامی، رسول ساقی، مشتاق صدف
اور قاضی انصار نے مخاطب کیا۔ فضا ابن فیضی کی غزل پڑھ
سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کہہ لینے کے بعد انہوں نے دوبارہ
درست کرنے کی زحمت نہیں کی ہے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ
نظمیں بھی شائع کریں۔ قسطوں کا سلسلہ بند کریں اور افسانوں
کو جگہ دیں۔

کاوش آفاقی، علی گڑھ

" سہیل " کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ مشمولات میں
" مولانا حالی سے۔ تنقیدی افکار " ایک کار آمد
ہے۔ افسانہ " آسمان سے آسمان تک " موضوع کے
سے گرچہ پرانا ہے لیکن خیالوں کی ترتیب اور جملوں
نے اس موضوع کو نیا حوصلہ عطا کر دیا ہے ۔
فسانے کا کلائمکس اپنے ذاتی احساسات سے
کر پیش کر سکیں ۔ افسانے کا آخری جملہ بلکہ آخری
م توازن کا حامل ہے۔ شعری حصہ معیاری ہے
ابتدائی غزلیں بے حد پسند آئیں ۔ رضا اشک
مدت سے انتظار ہے ۔

● مسحور قیصر، مونگیر

سہیل کے نئے شمارے میں آپ کے نمود کا یہ
جو قوم قصے کہانیوں کو حقیقت سمجھنے لگتی ہے اس
ت بھی کہانیوں کی طرح موہوم ہو جاتی ہے " چونکا
نہ ہے ۔ اور اسے پڑھ کر میں بھی چونک پڑا ۔ لیکن
نک " نے مجھے ایک سوال بھی سجھایا ۔ جو میں آپ
نا چاہوں گا ۔ کیا قصے کہانیوں کا اصل مقصد ان
م ہو جانا ہی ہے ؟ اداریئے کا عنوان تو ٹھیک
سچائی سے گریز " مگر یہ کیا بات ہوئی کہ " سچائی
یہ کرنے والوں پر انگلی اٹھانے والا خود سچائی سے
گیا ۔
شمارے کی اکلوتی کہانی " آسمان سے آسمان تک "
پسند آئی کہ ایک اچھے خاصے گھر میں کام کرنے والی
کے گھر کا مفصل ذکر کیا گیا ہے ۔ میں اپنے گاؤں
ا طرح کی بہت سی نوکرانیوں کے گھروں میں آیا جایا
ں ـــــ ● محمد حامد، دربھنگہ

محمد حامد صاحب! نمود کے محولہ بالا جملے کے سلسلے
میں آپ کے تاثرات کا اندازہ نہیں ہوتا، پتہ نہیں آپ نے
اس کی داد دینا چاہی ہے یا اس پر اعتراض کرنا چاہا ہے ـــ
اس جملے کی معنوی وسعت اور اس کی دہشت ریزی کو جس
حالیہ سیاسی و سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیے تھا شاید
اس کی طرف آپ کا ذہن نہیں گیا ۔ ورنہ آپ اعتراض
کا کوئی مقام پیدا نہیں کرتے ۔ آپ کا سوال ہے کہ " کیا
قصے کہانیوں کا اصلی مقصد ان کا موہوم ہو جانا ہی ہے "
ـــ نمود میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی بلکہ صرف یہ
مفہوم مترشح ہوتا ہے کہ کہانی وہ بیان ہے جو بادی النظر
میں حقیقت معلوم ہو لیکن عدم وقوع کی وجہ سے وہ غیر
حقیقی، تخیلی، تصوراتی اور تخلیقی ہوتی ہے ۔ کہانی
کی تخلیق ہی اس لئے ہوتی ہے کہ غیر وقوع پذیر کو اس
طرح پیش کر دیا جائے کہ وہ عین وقوع پذیر معلوم ہو ۔
FACT اور FICTIOUS کے اس لطیف فرق کو
سمجھ لیا جائے تو جائے اعتراض نہیں رہتی
ـــ مسعود منظر ۔

درخت لگائیں۔ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے زیادہ اشرف المخلوقات اور عقل مند مخلوق ہے
اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض اولین ہے
(۲) یہ اس کا پورا فرض ہے کہ اس کے حاصل شدہ ذرائع کا استعمال پورے ویدک سے کریں۔
(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقہ سے نہیں کرتے ہوئے
اس کی حفاظت آنے والی نسل کے لئے کریں۔
(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہتر لائحہ عمل ہے۔ اس سے فرار نقصان دہ ہوگی

(۵) باڑھ اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات
اتنا پراگندہ ہو جائے گا کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا۔

(۶) سرزمین کا وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر
جنگلات اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے
(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی انسان اس سرزمین پر
پہلے ہوئی تھی۔ انہوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے جس سے
انسان کا اس سرزمین پر افزائش ہوئی۔ آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے۔

(۸) درخت لگائیے ـــــ جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت

کریں اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں

جاری کردہ: محکمہ جنگلات و ماحولیات، بہار

P.R. No 1563 (INF-B4) 92-93

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شنہاروی مرحوم — بیادگار :- زین العابدین آثم و ادریس شنہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

فہرست

▲ اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی ▲

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
- ایڈیٹر :- جمیل منظر

معاونین :- شکیل احمد جبالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

▲ کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ▲

- شمارہ ۱۱ — جلد ۵۲

بدلِ اشتراک

- فی شمارہ ——— ۵ روپے
- زرِ سالانہ ——— ۵۰ روپے
- لائف ممبری ——— ۵۵۱ روپے

▲ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سُہیل

ریور سائیڈ روڈ، گیا

فون :- ۲۱۵۷۳

آپسی میل، ایکتا اور ہم آہنگی

قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے، نہ کسی خاص مذہب کا، یہ سبھی فرقوں، زبانوں، مذہبوں اور تہذیب و تمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ کوندر، رابندر اور قاضی نذرالاسلام یا دنکھا اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں تلسی اور کبیر کے گیت گائے ہیں۔ ملک کے گاؤں گھر میں گائے جاتے ہیں۔ کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے۔

آیئے، ہم سب مل کر قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

P.R.-169 D (INF-93) 92-93

نمود

بہار اُردو اکادمی

بہار میں اردو اکادمی اب تک قائم ہے یہ بات اس طرح صحیح کہی جاسکتی ہے کہ ہنوز اس کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا گیا ہے ورنہ جہاں تک کارکردگی اور خدمات کا مسئلہ ہے اکادمی کا وجود و عدم دونوں برابر ہے۔ اکادمی کیوں روبہ زوال ہے۔ اس کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو بات خاصی طویل ہو جائے گی، ابھی اس کا موقع نہیں ہے لیکن اتنی بات طے ہے کہ ادھر چند برسوں سے اردو کے ادبا و شعراء، ناقدین اور صحافی حضرات سب ہی اس کی طرف سے بے اطمینانی کے شکار ہیں۔ اونچے اونچے اور بڑے بڑے منصوبوں پر عمل تو کیا ہوگا عام اور معمول کے کام بھی انجام نہیں پاتے۔ اکادمی کے ارباب کو یہ شکایت ہے کہ حکومت اس کا گرانٹ نہیں بڑھاتی اس لئے منصوبوں کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ لیکن یہ فضا ایکا ایک کیسے پیدا ہو گئی کہ روزمرہ کے کام بھی نہیں ہو پاتے۔ ظاہر ہے کہ سابقہ گرانٹ کی رقم تو مل ہی جاتی ہے۔ پھر یہ تعطل کیوں۔ نہ مسودات اشاعت کے لئے طلب ہوتے ہیں نہ اشاعت کے لئے امداد ہوتی ہے۔ نہ کتابوں پر انعامات ملتے ہیں، نہ تقریبات ہوتی ہیں نہ لائبریریوں کے ساتھ تعاون ہوتا ہے۔ غرض کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ اکادمی کیا صرف چند ملازمین کے مشاہرے دیتے رہنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

ہم نے پہلے بھی اکادمی کے ارباب کو اس امر کی طرف متوجہ کیا تھا اور پھر کرتے ہیں کہ پوری ریاست میں محض ایک آدھ ادبی رسالے ہیں اور یہ مسلسل خسارے برداشت کر رہے ہیں۔ اکادمی کی ذمہ داری ہے کہ شعر و ادب کی تخلیقی روایت کو زندہ رکھنے کے لئے ان رسائل کی مالی امداد کرے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تو اتنا تو ضرور کرنا چاہئے کہ وہ ہر ماہ ان رسائل کی سو دو سو کاپیاں خریدے اور ان لائبریریوں میں تقسیم کرے جن کو وہ امداد پہنچانا چاہتی ہے۔ اس طرح بیک وقت دو اہم اور ضروری کام انجام پا سکتے ہیں۔ ایک تو ان رسالوں کے ساتھ معمولی تعاون ہو جائے گا اور دوم یہ کہ بہار کی لائبریریوں تک اور ان کے ذریعہ ادب کے قارئین تک ہر ماہ ادب و شاعری کی تازہ ترین تحریریں اور تخلیقات پہنچ جائیں گی۔

ہمیں امید ہے کہ اکادمی کا انتظامیہ درست رہے تو یہ کام موجودہ مالی صورت حال میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے ـــــ کاش ارباب اختیار کو اس منصوبے کی شدید ضرورت اور اس کی افادیت کا احساس ہو جائے۔

ـــ مسعود منظر ـــ

اصغر علی انجینئر

پریم چند۔ حیات اور فن

قسط ۹

پریم چند اور ہندوستانی کسان

یہ کہنا کسی طرح کا مبالغہ نہ ہوگا کہ پریم چند نے اپنا قلم ہندوستان کے دیہات، اور اس میں بسنے والے غریب کسانوں کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو موثر طریقے سے پیش کرنے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ ان کی شاہکار کہانی کفن اور ان کا شاہکار ناول گئودان" دونوں ہی ہندوستانی دیہات کی زندگی سے متعلق ہیں اور دونوں کے مرکزی کردار غریب کسان طبقے اور ان کے جینے کی جدوجہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر پریم چند کی دیہاتی زندگی اور غریب کسانوں کے روزمرہ مسائل پر گہری نظر نہ ہوتی تو ایسی شاہکاروں کی تخلیق ممکن نہ ہوتی۔ پریم چند کی تخلیقات میں ہمیں شمالی ہندوستان کے دیہاتوں کے یادگار خاکے ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ جاندار خاکہ ہمیں آج بھی اردو کے یہاں مشکل سے ملیں گے۔

ڈاکٹر پی۔ سی۔ جوشی کا خیال ہے کہ بالزاک، زولا، اور ڈکنس جاگیرداری نظام کے زوال پر گہری نظر رکھتے ہیں اور تخلیقی ادب میں اسی سے وابستہ المیہ ڈرامے کو پیش کرنے سے عالمی ادب میں امر ہوگئے اور پریم چند ناول نگار کی حیثیت سے عالمی ادب میں مرتبہ حاصل کرلیا۔ کیونکہ ان کا قلم زندگی سے دھڑکتے ہوئے وہ المناک مرقع پیش کرتا ہے جو ہندوستانی دیہات پر برطانوی سامراج کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ کچھ اختلافات کے باوجود پی۔ سی۔ جوشی سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پریم چند خود کسان نہیں تھے نہ ہی کسان جاتی سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ البتہ وہ اپنے دیہات لمہی میں ان کے قریب ضرور رہے تھے۔ اور اپنے تعلیمی پیشے میں بھی اکثر انہیں ماسٹر کی حیثیت سے بھی اور پھر انسپکٹر کی حیثیت سے بھی اکثر کسانوں سے سابقہ پڑا تھا ان کی دردوں بھنی اور سینے میں

دھڑکتا ہوا انسانی ہمدردی سے معمور دل، یہی ان کا قیمتی اثاثہ تھا جس نے ان کے قلم میں کسانوں کی غربت اور استحصال کے ایسے زندہ جاوید مرقع بنوائے۔

گوبر جب شہر میں رہ کر دوسری بار جب اپنے گاؤں لوٹتا ہے تو اپنے گھر اور گاؤں کی حالت زار اس سے دیکھی اور سہی نہیں جاتی۔ پریم چند اس وقت کسانوں کی حالت زار کا نقشہ گئودان میں یوں پیش کرتے ہیں۔

"گوبر نے گھر پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت واپس جائے۔ گھر کا ایک حصہ گرنے کے قریب تھا۔ دروازے پر صرف ایک بیل بندھا ہوا تھا اور وہ بھی ادھ مرا سا۔ دھنیاں اور ہوری دونوں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ مگر گوبر کا جی اچاٹ تھا۔ اب اس گھر کے سنبھلنے کی کیا امید ہے؟ وہ غلامی کرتا ہے مگر پیٹ بھر کھاتا تو ہے۔ صرف ایک ہی مالک کا تو نوکر ہے یہاں تو جسے دیکھو وہی رعب جماتا ہے۔ غلامی ہے مگر خشک! محنت کر کے اناج پیدا کرو اور جو روپئے ملیں وہ دوسرے کو دیدو۔ اور آپ بیٹھے ہوئے "رام رام" جپو۔ دادا ہی کا کلیجہ ہے کہ یہ سب سہتے ہیں اسی سے تو ایک دن نہ سہا جائے اور یہ حالت کچھ ہوری ہی کی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی۔ ایسا ایک آدمی بھی نہیں جس کی حالت زار نہ ہو، گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بیٹھی ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے۔ کام کرتے تھے۔ پستے تھے۔ صرف اس لئے کہ ایسا ہونا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی امنگ، گویا ان کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو۔ جیٹھ کے دن ہیں۔ ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔ بہت کچھ اناج تو کھلیان میں ہی تل کر مہاجنوں اور کارندوں کی نذر ہو چکا ہے اور جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں کا ہے۔ مستقبل تاریکی کی طرح ان کے سامنے ہے جس میں انہیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔"

اور اس پستی اور غربت کا نتیجہ بھی کتنا بھیانک ہے۔ "ان سے دھیلے دھیلے کے لئے بے ایمانی کرا لو۔ مٹھی بھر اناج کے لئے لاٹھیاں چلوا لو۔ پستی کی وہ انتہا ہے جب آدمی عزت و غیرت کو بھی بھول جاتا ہے۔"

لیکن پریم چند کی کسانوں اور ان کے بے رحمانہ استحصال سے ہمدردی ان کے ادب میں سستی جذباتیت پیدا نہیں کرتی ان کا قلم حقیقت نگاری اور حقیقت کا دامن ان سے نہیں چھوٹتا۔ وہ دیہات اور کسانوں کا کوئی رومانی تصور قائم نہیں کرتے۔ ان کے پیر دیہات کے سنگلاخ زمین پر ہی جمے رہتے ہیں۔ محض تخیل کے سہارے خیالی دنیا میں پرواز نہیں کرتے۔ وہ کسان کی فطرت کو بھی اسی طرح پیش کرتے ہیں۔ جیسا اسے اپنے مشاہدے کے ذریعہ پاتے ہیں۔ اس کی کمزوریوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ چنانچہ گئودان میں کسان کی فطرت کو انہوں نے یوں پیش کیا ہے۔

"کسان پکا سوارتھی ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اس کی گانٹھ سے رشوت کے پیسے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ میں بھی وہ چوکس ہوتا ہے، سود کی ایک پائی چھڑانے کے لئے وہ مہاجن کی گھنٹوں خوشامد کرتا ہے۔ جب تک یقین نہ ہو جائے، وہ کسی کے بہکاوے میں نہیں آتا، لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا ساتھ دیتے ہوئے گذرتی ہے۔"

پریم چند [illegible] ہم اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں، کسان کے بنیادی [illegible] کی اس کی فطرت کو جیسا پایا ویسے ہی پیش [illegible] پریم چند کا بھی حقیقت پسندانہ رویہ ہے جو سستی جذباتیت سے ان کا دامن بچائے رکھتا ہے۔ ورنہ گئودان میں بھی کئی ایسے موقع تھے کہ کمتر درجے کا فنکار اس جذباتیت کا آسانی سے فنکار ہو جاتا ہے۔

پریم چند حقیقت نگار تھے اتنا کہہ دینا بھی کافی نہیں ہوگا۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں سماجی حقیقت کو جوں کا توں پیش نہیں کیا بلکہ اس کی طرف انتقادی رویہ اختیار کیا اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پریم چند انتقادی حقیقت نگار تھے۔ وہ اپنے دور کے موجودہ سماج سے قطعاً مطمئن نہیں تھے۔ ان حالات کو جن کی وجہ سے کسان کو اتنی محنت و مشقت کے باوجود دو وقت کی اطمینان سے روٹی تک میسر نہیں ہوتی تھی بدلنا چاہتے تھے۔ پریم چند نظریات کے اعتبار سے کئی ارتقائی مراحل سے گذرے۔ اپنے ابتدائی دور میں، جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں، وہ آریہ سماج کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کی اکثر کہانیاں اس دور میں مذہبی اور سماجی اصلاح کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ پھر وہ قومی جنگ آزادی میں کود پڑے اور مہاتما گاندھی کے نظریات سے بے حد متاثر ہوئے۔ گاندھی جی خود کسان کی غربت اور ہلاکت پر کڑھتے تھے مگر وہ تبدیلیٔ قلب پر یقین رکھتے تھے اور بہت سے استحصال کرنے والے زمینداروں کو اچھے اور نیک زمینداروں میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ زمیندار اپنے طبقاتی مفاد کو سچائی اور نیکی کی طاقت پر قربان کر سکتا ہے۔ شروع میں پریم چند نے بھی گاندھی جی کے زیر اثر یہ اختیار کیا اور تبدیلیٔ قلب پر زور دیتے رہے۔ "[illegible]" اور "پریم آشرم" اسی قبیل کے ناول ہیں۔ "میدان عمل" پریم چند نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان وقفہ میں لکھا ہے اور پریم چند کی زندگی کا یہ دور ان ذہنی اور نظریاتی تبدیلی میں اہم موڑ کا دور ہے۔ میدان عمل میں اس تبدیلی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس ناول میں ہمیں پہلی مرتبہ طبقاتی مفادات اور کسانوں کو طبقاتی جدوجہد کا قدرے واضح شعور ہے۔ لیکن اب تک پریم چند نے فیصلہ کن موڑ نہ اختیار کیا تھا۔ اگرچہ اس ناول کے کئی کردار گاندھی سے پریم چند کے انحراف کا پتہ دیتے ہیں لیکن اس پرانا آدرشی مواد بھی موجود ہے۔

پریم چند کے ذہنی رویے میں تبدیلی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ۱۹۲۹ء سے عالمی کساد بازاری ہو چکی تھی اور کسانوں کی مفلوک الحالی میں ابتری پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود زمینداروں کا [illegible] کم نہ ہوتا تھا۔ نہ ہی سرکاری عہدہ داران کے ساتھ رعایت کرنے کے لئے تیار تھے۔ پریم چند اکثر دیہاتوں کا دورہ کرتے اور اس ابتری اور کسانوں کی بے بسی کا [illegible] کرتے۔ ظاہر ہے ایسا دل متعلق حالات میں زمینداروں کی تبدیلیٔ قلب پر ایمان لانا پریم چند جیسے حساس فنکار کے لئے بہت مشکل تھا۔ میدان عمل میں اس بازاری اور بے رحمانہ استحصال کا ذکر بھی آتا ہے چنانچہ اس ناول کا ایک کردار امرکانت کہتا ہے

"یکایک جنسوں کا بھاؤ گر گیا اور اس جا پہنچا جتنا چالیس سال پہلے تھا ...... جب

اور جتن کی جنس ایک میں بکے تو (کسان) غریب کیا کرے کہاں سے لگان دے۔ کہاں سے دستوریاں دے۔ کہاں سے قرض چکائے ..... اور یہ حالت کچھ اس علاقے کی نہ تھی، سارے صوبے، سارے ملک۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی کساد بازاری تھی۔ ایک طرف کسانوں کی یہ مفلوک الحالی ہے اور دوسری طرف اسی علاقے کے زمیندار مہنت آشارام کی عیش و عشرت کی زندگی ہے۔ ان کے عالی شان محل میں ٹھاکر دوارہ بھی ہے۔ آشارام اور ان کے بھگت اور مرید انواع و اقسام کی غذائیں تناول کرتے ہیں۔ پھل، میوے، عطر، پھول، اگر اور چندن کے ساتھ ریشمی کپڑے اور قیمتی تحائف بھی موجود ہیں۔ فیل خانے میں ہاتھی جھومتے ہیں۔ اصطبل میں ایک سے ایک اعلیٰ گھوڑے ہیں جنہیں کھانے کے لئے بادام اور ملائی دی جاتی ہے اور انتہا یہ ہے کہ مہنت جی روز آرتی سے پہلے پانچ من دودھ سے نہاتے ہیں۔ امرکانت اس الف لیلوی زندگی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ کسانوں کے پاس تو کڑی محنت و مشقت کے باوجود مہنت جی کی لگان کی آدھی رقم چکانے کے پیسے ہیں نہ پیٹ بھر چٹنی روٹی کھانے کے لیکن مہنت جی کے کارکن ہیں کہ جبر اور طاقت سے لگان کی رقم وصول کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آتمانند جو قدرے انتہا پسند ہے امرکانت کی اس تجویز سے اختلاف کرتا ہے کہ مہنت جی سے لگان میں چھوٹ کی محض درخواست کی جائے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ سب کسان چل کر مہنت جی سے لگان کا مطالبہ کر لیں اور جب تک وہ کسانوں کے مطالبات نہ مانیں ٹھاکر دوارے میں کوئی کام نہ ہونے دیں۔ لیکن عمل امرکانت کی تجویز پر ہی ہوتا ہے۔ مہنت جی علاقے کے حاکم سے مل کر لگان میں [illegible] کرتا ہے لیکن محض اس لئے گرفتار کر لیا جاتا ہے کہ وہ جذباتی تقریر کرتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اس علاقے کے کسان آتمانند کی قیادت میں جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ حکومت کی مشینری، فوج، پولس مہنت جی کی حمایت میں آجاتی ہے اور پورے علاقے میں دہشت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ گو پریم چند مہنت آشارام کے کردار میں مذہب، سرمایہ اور زمیندارانہ اقتدار کو یکجا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے دوست دیانرائن نگم "زمانہ" کے پریم چند نمبر میں لکھتے ہیں۔

" پریم چند نابرابری کی لڑائی میں تشدد کے خیال سے مشتبہ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا، اور وہ اس کے لئے قوم کو جلد سے جلد تیار کر لینا چاہتے تھے۔ [illegible] تو ان کا خیال تھا کہ ان سے ٹکر لئے بغیر کام نہ چلے گا۔"

ان تمام باتوں کے باوجود اس ناول میں پریم چند کا رویہ مذبذب ہے۔ وہ [illegible] اور عدم تشدد سے مایوس ہو چکے ہیں۔ لیکن اب بھی فیصلہ کن انداز میں اس سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی رائے بالکل درست ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ پریم چند اس ناول میں متوسط طبقہ کی قیادت کو شک کی نظر سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن ابھی اس پر ان کا اعتقاد باقی ہے شاید اس لئے کہ وہ خود بھی اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اس کی کمزوریوں اور غلط کاریوں کا ادراک رکھنے کے باوجود انہیں اس سے ہمدردی تھی۔ یہی سبب ہے کہ آتمانند کے مقابلے میں وہ آخر امرکانت اور اس کے عقائد کی جیت دکھاتے ہیں۔"

لیکن [illegible]

کے مخالف [illegible] اصلاحی نظریئے سے فیصلہ کن علیحدگی
اور [illegible] ہے۔ گئودان میں یہ بات
ظاہر ہو جاتی ہے کہ پریم چند کا اب اصلاح اور تبدیلی قلب
پر ایمان نہیں رہا۔ رائے صاحب جو ایک روشن خیال
زمیندار ہیں اور غریب کسانوں سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں
لیکن اس کے باوجود اپنے طبقاتی مفادات سے دستبردار
ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ رائے صاحب کو اپنے طبقاتی
کردار اور ان کے طبقے کے ذریعے کئے جانے والے استحصال کا
اچھی طرح سے شعور ہے، انہیں اپنی طبقاتی مجبوریوں اور
میکانزم کا بھی احساس ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

"ہمارے پاس علاقے، محل، سواریاں، نوکر چاکر،
قرض، بیسوائیں کیا نہیں ہے۔ مگر اس کے دل میں طاقت
نہیں، خودداری نہیں وہ اور چاہے کچھ ہو انسان نہیں
ہے۔ جس دشمن کے خوف سے رات کو نیند نہ آتی ہو جس
کے دکھ پر سب ہنسیں اور رونے والا کوئی نہ ہو، جس کی
چوٹی دوسروں کے پیچھے دبی ہو جو عیش و عشرت کے نشے
میں اپنے کو بالکل بھول گیا ہو، جو حاکموں کے تلوے
چاٹتا ہو۔ اور اپنے ماتحتوں کا خون چوستا ہو، اسے
میں سکھی نہیں کہتا وہ تو دنیا کا سب سے بڑا بدنصیب
جاندار ہے۔" لیکن حقیقت اور تلخ حقیقت یہ ہے
کہ اس احساس کے باوجود رائے صاحب اپنی موجودہ
حالت کو ہی پسند کرتے ہیں۔ اپنے عیش و عشرت کے
لئے انہیں حاکموں کے تلوے چاٹنے کی خاطر بھی گوارا
ہے اور اپنے آسامیوں یعنی غریب کسانوں کا خون چوسنے
کو غیر انسانی جرأت بھی۔ حالانکہ ہوری ان کا نہایت
وفادار اور چہیتا آسامی ہے لیکن جب ہوری کی
[illegible] کو ایک نچلی ذات کی ایسی

لڑکی سے شادی ہو جانے پر ہوری پر سخت جرمانہ
کیا گیا ہے اس بات کی خبر رائے صاحب کو ملتی
رائے صاحب پنچوں پر اور اپنے کارندوں پر ذرا
ناراض نہیں ہوتے کہ ہوری پر جرمانہ کر کے اسے
تباہ کیا گیا بلکہ اس لئے کہ جرمانے کی رقم انہیں
ہوئے پنچ اور کارندے کیوں ہضم کر گئے۔ گویا پریم
اب سماج کے طبقاتی کردار سے بھی اور انسانی فطرت
بھی اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اور طبقاتی م
اور انسانی شعور کے تضادات کو گہرائی میں اتر کر
ہیں اور ان کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ
کا باریکی سے مطالعہ کرتے ہیں اگر وہ اپنے آدر
واد اور اصلاح پسندی سے آزاد نہ ہوئے ہوتے
صاحب کا کردار گئودان میں کچھ اور ہی ہوتا۔ گئو
میں پریم چند نے رائے صاحب کے تہہ دار اور پیچیدہ
کردار کو پیش کر کے یہ بات جتانے کی کوشش
کہ جب تک سماج کا طبقاتی کردار نہیں بدلتا ر
صاحب جیسے باشعور اور روشن خیال زمیندا
سماج میں رہتے ہوئے اپنے مفادات سے نجات
نہیں کر سکتے۔ حیاتیاتی جبلّت (جس میں بھوک
وغیرہ شامل ہیں اور جو کسی بھی سماج میں نہیں بدل
کو چھوڑ کر انسانی جبلّت کا ایک ایسا ناقابل تغیر
نہیں کا دار و مدار سماجی ساخت و پرداخت پر ہوتا
رائے صاحب جیسے افراد کی جبلّت کچھ اور ہی
اگر سماجی ساخت و پرداخت میں ذاتی جبلیت بنی
حیثیت نہ رکھتی۔ اس لئے محض تبدیلی قلب سے
نہیں بدل سکتا کیونکہ طبقاتی سماج میں انسانی
خواہشات کے مقابل [illegible]

ثابت ہوتے ہیں۔ آدرش اور مفادات کی کشمکش میں آخرالذکر کی ہی فتح ہوتی ہے۔ پریم چند نے گئو دان میں کسانوں کے استحصال کا بڑا دلخراش نقشہ کھینچا ہے۔ گئو دان پڑھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ پریم چند نے دیہات کی زندگی کا بڑا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ کسان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا بھی ہے جو گئو دان میں ان کی قلم کی زد میں نہ آیا ہو۔ وہ استحصال کے مختلف پہلوؤں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ گوبر ہولی کے تہوار پر مہاجن کی نقل کراتا۔ کسان کو مہاجن کس طرح نچوڑتا ہے اس کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ پریم چند اسے یوں بیان کرتے ہیں

"کسان آکر اور ٹھاکر کے پیروں پر گر کر رونے لگتا ہے۔ بڑی مشکل سے ٹھاکر روپے دینے پر راضی ہوتے ہیں جب کاغذ لکھا جاتا ہے اور اسامی کے ہاتھ میں پانچ روپے رکھ دیئے جاتے ہیں تو وہ چکرا کر پوچھتا ہے "یہ تو پانچ ہی ہیں مالک"۔

"پانچ نہیں دس ہیں، گھر جا کر گننا"
"نہیں سرکار، پانچ ہیں"
"ایک روپیہ نذرانے کا ہوا کہ نہیں؟"
"ہاں سرکار"
"ایک لکھائی کا"
"ہاں سرکار"
"ایک کاگد (کاغذ) کا ؟"
"ہاں سرکار"
"ایک دستوری کا ؟"
"پانچ نکد، دس ہوئے کہ نہیں ؟"
"ہاں سرکار! اب یہ پانچوں بھی میری ہاتھ سے رکھ لیجئے۔

نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کا نذرانہ ہے اور ایک بڑی ٹھکرائن کا۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے کو اور ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کو۔ رہا ایک روپیہ سو وہ آپ کے کریا کرم کے لئے"

دراصل مکالمے کے ان آخری جملوں میں نہ صرف گہرا طنز ہے بلکہ ان میں کسان کا اپنا شعور بھی چھپا ہوا ہے اس کا جس طرح مہاجنوں اور زمینداروں کے ہاتھ استحصال ہوتا ہے وہ اچھی طرح سمجھتا ہے لیکن اس پورے نظام میں وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے دست و پا پاتا ہے۔ بعض ناقدوں نے گئو دان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا مرکزی کردار ہوری بغاوت نہیں کرتا اور خاموشی سے سارے مظالم برداشت کرتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں یہ اعتراض ٹھوس نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا ظالمانہ نظام یقیناً بغاوت کا متقاضی ہے اور بغاوتیں ہوئی بھی ہیں لیکن شروع سے ہوری کے کردار کا انقشان ایسا ہے کہ جو ہندوستانی دیہاتی معاشرے کی تقدیر پرستی (Fatalism) سے میل کھاتا ہے۔ ہوری کا بغاوت کرنا اس کے کردار اور اس معاشرے اور اس نسل کے مزاج کے خلاف جاتا جس کی وہ پیداوار ہے۔ اور یہ پریم چند کے لئے حقیقت نگاری کے خلاف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقت نگاری محض، خارجی حالات کی عکاسی نہیں ہے اس میں نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کا تصور اور آدرش اور موجودہ حقیقت کی طرف ناقدانہ رویہ بھی شامل ہوتا ہے لیکن موجودہ حقیقت کی بعض باتیں بنیادی ہوتی ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا حقیقت نگاری کو مجروح کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہوری کو پریم چند موجودہ سماج کا

سید مسلی مظفر

پراگندہ طبع لوگ — قسط ۹

(ب) نواب امداد امام اثرؔ اور بے نظیر شاہ وارثیؒ مرحوم

اشوگیا دی کے (ویسے میرے نانا ہی تھے) اور بے نظیر شاہ صاحب میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں ہی بھگلو ندی کے دوسرے یعنی مشرقی کنارے پر رہتے تھے۔ دونوں کو ہی بچپن میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب مرحوم اکثر نانا ابا سے ملنے آتے تھے۔ نانا ابا ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اشعار کی اس زمانہ میں سمجھ بالکل نہ تھی۔ پھر بھی سن لیتا تھا۔ کچھ کلام ان کی زبانی سُنا تحت اللفظ پڑھتے تھے اور اکثر ران پر جوش میں ہاتھ مار کر کہتے تھے۔ مثلاً یہ شعر

خدا کی بخشی ہوئی ہے نعمت آخر یہ کچھ کم نہیں کہ وقعت
ملی ہے جب عزت سیادت خطاب ہم لے کے کیا کریں گے

پھر بھی نواب اور شمس العلما کے خطاب سے نوازے گئے۔ چھوٹی بحروں میں صفائی سے غزلیں کہتے۔ ایک بار مجھے یاد ہے۔ نانا ابا سے بولے " خلیل بابو جانتے ہو سہل ممتنع کیا ہے۔ تو سنو۔ اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر، پچھتر، چھہتر، ستہتر، اٹھتر، شعر ہو گیا۔ نواب صاحب سے ادبی

دنیا اتنی واقف ہے کہ شاید میں کچھ بھی نہ بتا سکوں۔ Genius تھے۔ اس لئے تمام انسان سے الگ بشر؟ آم کے ٹوکرے سے اگر آپ نے ایک آم اٹھایا اور دبا کر دیکھا (اکثر لوگ آم دبا کر دیکھنے کے عادی ہیں) تو نواب صاحب کو غصہ آگیا۔ بولے بابو آپ نے آم دبا دیا! زہر ہو گیا۔ آم کو دبانا نہیں چاہئے۔ اس پر بس نہیں پورا ٹوکرا آم کا گڑھا کھدوا کر دفن کرا دیتے کہ سب زہر ہو گیا۔ ایک دبانے سے سب زہر کیسے ہو سکتا ہے یہ تو عام انسان کی بات ہوئی Genius میں تو کچھ علٰحدہ ہی بات (جس کو انگریزی میں Eccentricity کہتے ہیں) ہو جاتی ہے۔

(ب) بے نظیر شاہ وارثیؒ مرحوم

نواب امداد امام اثرؔ کے بعد کچھ باتیں بے نظیر شاہ صاحب کے متعلق۔

نواب صاحب کا ذکر آپ کو کچھ تشنگی بخش

غور پر رقم نہ کیا اور آج تک گئے دوسرے شاعر کے تذکرہ پر۔ تو بات یہ ہے کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ دونوں ہی اول الذکر اور موخر الذکر کو بچپن میں دیکھا۔ شعر کیا ہے شاعری کیا ہے اس سے لگاؤ تھا ہی نہیں۔ جو سنا وہ لکھ دیا ہے۔ اول الذکر کے بارے میں میں کیا لکھوں وہ ہندوستان بھر میں مشہور ہیں صرف ادبی حیثیت (یعنی شاعر اور ناقد یا تذکرہ نگار) سے ہی نہیں بلکہ نباتات پر بھی ان کی کتاب موجود ہے۔ جو سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ موخر الذکر ایک طویل قامت (غالباً چھ فٹ چھ انچ) بزرگ دکھائی دیتے تھے۔ وارثی فقیر، تہبند پوش، [illegible] دبلے پتلے گورے چٹے۔ نہایت وجیہہ۔ کھڑاؤں استعمال کرتے تھے۔ نانا ابا مرحوم موٹر بھیج کر آنگلہ سے آپ کو کم از کم ہفتہ میں ایک بار زحمت دیتے تھے۔ وہ شعر و شاعری پر گفتگو کرتے۔ اشعار سناتے (میری سمجھ سے باہر) جو میں سنتا ضرور تھا لیکن یاد کیا کرتا۔ جب تک شعر سمجھ میں نہ آئے۔ یاد کیسے رہ سکتا ہے۔ ہاں بعد میں شمس صاحب مرحوم سے جب کبھی بے نظیر شاہ صاحب کا ذکر آتا تو وہ بہت تعریف کرتے اور ان کو ایک قادر الکلام شاعر اور استاد فن بتاتے۔ ایک غزل کی خصوصی طور پر تعریف کرتے تھے کہ ایک آسمان کے قافیہ میں پوری غزل کہہ دی مگر ہر بار نیا آسمان (مضمون) دکھایا مثلاً (شمس صاحب سے سُن کر)

شب غم دیکھتا ہوں اٹھ کے ہر بار
وہی [illegible] کوئی اور آسماں ہے

مطلع کچھ یاد آگیا۔

خوشی کیا ان دلوں جو مہرباں ہے
یہ ظالم آسماں پھر آسماں ہے

(ج) جناب شفق رضوی عمادپوری مرحوم

شفق صاحب مرحوم سے شرف نیاز تو حاصل کر چکا تھا جب نانا ابا مرحوم سے ۱۹۳۶ء ستمبر کی ۹ تاریخ کو نانا ابا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شفق صاحب نانا ابا کو اشعار سناتے تھے۔ دیکھتا رہتا تھا مگر چونکہ شمس صاحب کے استاد تھے اور شمس صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے استاد فن ہونے کے معترف بھی تھے لہٰذا شفق مرحوم صاحب کے بارے میں شمس صاحب کی سند کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی بڑی عزت دل میں تھی۔ نانا ابا کے انتقال کے بعد اکثر وہ ظفر منزل ہی میں قیام کرتے تھے۔ گیا کے رئیس میر شفاعت حسین صاحب مرحوم سے رشتہ داری بھی تھی۔ پہلے وہاں ٹھہرتے تھے۔ شاعر کیسے تھے۔ یہ اس وقت تو سمجھ نہ سکا۔ مگر فرشتہ خصلت انسان معلوم ہوتے تھے۔ مثلاً رمضان کا مہینہ ہے۔ افطار کے وقت دسترخوان پر کافی چیزیں ہوتیں۔ میٹھے میں [illegible] ہوتی۔ شمس صاحب کہتے کہ استاد (چونکہ ان کو ثقل سماعت تھی) کو جو کہئے مان لیتے ہیں اور نمونہ کے طور پر کہتے کہ استاد [illegible] کو قلیہ کے ساتھ کھائیے اور وہ نہایت معصومیت کے ساتھ [illegible] شوربے میں ڈبو کر کھا لیتے پھر خالو ابا مرحوم ٹوک دیتے کہ مولانا یہ میٹھا ہے۔ شمس صاحب تو [illegible] کہہ رہے۔ مولانا لاحول ولا قوۃ کہہ کر چھوڑ دیتے۔ نوکر رکابی بدل دیتا۔ شمس صاحب پر جب تک عرق کا مقدمہ چل رہا تھا جو حکیم [illegible] صاحب

صاحب مرحوم نے ان کے خلاف کیا تھا۔ اس زمانے میں مولانا تشریف لائے ہوئے تھے۔ شمس صاحب بولے کہ تم لوگوں کی دل آزاری کیوں کرتے ہو۔ شاعری کا مقصد لوگوں کی دل آزاری ہرگز نہیں۔ شمس صاحب کہتے کہ حضور انہوں نے مسجد کا چندہ ہضم کر لیا ہے۔ بولے مار بیٹے بہر۔ ۔ ۔ ۔ کہ آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں۔ مسجد کی کمیٹی ہوگی۔ وہ لوگ ان سے باز پرس کریں گے آپ کون ہوتے ہیں۔ شمس صاحب نے بات بدل کر کہا۔ "استاد دیکھئے کس حسن سے ان کا نام لکھا ہے" یٰسین پڑھی جائے گی اب اس کے سرہانے۔ کاٹے گا نہ امسال کی برسات کا کوا" بولے خیر جانے دیجئے وہ برسات کا میں یا نہ کاٹیں مگر آپ کو تو کاٹنے لگے۔ اس سے مولانا مرحوم کی طبیعت کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کلام میں یقینی طور پر پختگی تو ہوگی ہی ـــ حسرت موہانی مرحوم نے بھی شفق صاحب مرحوم کا تذکرہ کیا ہے۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اس زمانے میں لوگ شعر کے حسن و قبح پر گہری نظر رکھتے تھے افسوس مولانا کا کلام دستیاب نہیں۔ غالباً ضائع ہوگیا ہوگا۔ اندازہ یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری جس کو مشق فن سے زیادہ لگاؤ اور شعریت سے کم تعلق رہتا ہے اسی انداز فکر سے اشعار کہے گئے ہوں گے۔ ایک شعر یاد آرہا ہے۔

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آبیٹھو
سفیدی ہے، سیاہی ہے شفق ہے ابر باراں ہے

زیادہ حد ادب ہے۔

(ح) سریر گیاوی

ـــ سریر صاحب بھی لکھنؤ اسکول کی پیداوار تھے۔ شمس صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے پہلے شفق صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مگر سریر صاحب کہتے تھے کہ وہ حضرت جلیل مانکپوری شاگرد امیر مینائی سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ کلام میں پختگی تھی۔ پڑھنے کا انداز تحت اللفظ مگر آواز نہایت ہی بار سماعت تھی۔ صرف مولینا حسرت موہانی مرحوم ان سے زیادہ خراب آواز سے اپنا خوبصورت کلام پڑھتے تھے (حسرت موہانی مرحوم کو میں نے ریڈیو پر سنا تھا) میں سریر صاحب سے کہا کرتا تھا کہ آپ کا کلام مجھے امیر مینائی کے کلام جیسا معلوم ہوتا۔ مرحوم یہ شعر سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ میری مراد یہ تھی کہ امیر مینائی کی طرح آپ بھی مشق فن کر رہے ہیں۔ یہ تو میری رائے ہے کوئی ضروری نہیں کہ قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں۔

سریر صاحب مرحوم شمس صاحب کی طرح کشادہ دل نہیں تھے یعنی دیگر شعراء کو ویسے داد نہیں دیتے جیسے شمس صاحب۔ مثلاً ۱۹۴۲ء میں جب گیا میں نیاز احمد صاحب مرحوم ڈسٹرکٹ اور سیشن جج تھے اور ان کی تحریک پر ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں جگر مرادآبادی، روشن صدیقی، قدیر لکھنوی اور شفیق جونپوری جیسے شعراء جلیلے ہوئے۔ سریر صاحب مشاعرہ کے بعد ان لوگوں کے بارے میں ایک نظم کہی۔ جس کا ایک مصرع یہ تھا "کچھ یوپی کے قوال بھی تھے" آپ اس سے بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مرحوم کا کیا ردعمل ہوا تھا ـــ برخلاف اس کے شمس صاحب نے جگر صاحب اور قدیر لکھنوی کو دل کھول کر داد دی اور ان کی...

میں دونوں کی بے حد تعریف کی۔ سرپرصاحب مرحوم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ کسی شاعر کو صرف تخلص سے نہیں یاد کرتے بلکہ شاعر کا پورا نام لیتے مثلاً شیخ ابراہیم ذوق، خواجہ حیدر علی آتش، علی محمد شاد، شبیر حسن خاں جوش۔ لوگ واقف تھے۔ ایک بار ایسے ہی مضمون پر دوسرے شاعروں (پورا نام لے کر) کا کلام سناتے بولے اور اسی مضمون کو کمترین نے یوں کہا ہے تو ایک صاحب بولے کہ حضور کمترین کا پورا نام کیا ہے۔ یہ سُن کر خفا ہو گئے۔ ان کا کلام یاد تو نہیں مگر ایک غزل جو انہوں نے راسخ دہلوی کی غزل پڑھ کر لکھی اور مجھے بمبئی بھیجی تھی وہ پیش کر رہا ہوں ۔ "نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے" ردیف تھی۔

شب غم گزرتی ہے جو میرے دل پر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
یہ افسانۂ دردِ غم بندہ پرور نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
اکھڑتی ہیں سانسیں چراغِ سحر ہوں۔ گھڑی بھر کا مہمان المختصر ہوں
جس عالم میں ہے اب مری جانِ مضطر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم ....
بہت دل میں ہے شکوۂ بے وفائی بہت کچھ ہیں صدمات داغِ جدائی
کہوں تو بھلا میں کہوں تم سے کیوں کر نہ میں کہہ سکوں گا نہ ...
بیاں مجھ سے ہوگا نہ حال پریشاں ہے ناگفتہ بہ اضطرابِ دل و جاں
اب ان کا نہ سننا ہے سننے سے بہتر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم ...
بلا جو صعوباتِ دردِ نہانی کہوں تم سے کیا طول ہے یہ کہانی
بہت مختصر ہو کے ہے ایک دفتر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم کہہ ...
جو کہنا تھا مجھ کو وہ میں کہہ چکا ہوں جو سننا تھا تم کو وہ تم سُن چکے ہو
رہی حالِ بے تابیِ دل مکرر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم کہہ ...
سر تری اپنی غزلیں سناؤں تمہیں کیا پکڑ لو گے ہاتھوں سے سُن کر کلیجہ
ہر اک شعر ہے میرا اک تیر و نشتر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے

کلام کی پختگی، فن پر گرفت ظاہر ہے۔ اب آپ کو راسخ دہلوی کی غزل بھی سنا دوں شاید آپ کو لطف آئے گا۔ خاص کر ایک شعر تو مجھے بے حد پسند ہے۔

یہ پوچھو شبِ ہجر کیسی ہے کیوں کر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
زباں کاٹ دوں لاؤ دو مجھ کو خنجر۔ نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے
گھڑی دو گھڑی کا ہے روزِ قیامت مجھے کہنی ہے غم کی لمبی حکایت
نہ ہوں جمع جب تک کہ دو چار محشر نہ میں کہہ سکوں گا نہ میں کہہ...
سنو کیا کہ تم کو ہے عذرِ نزاکت کہوں کیا نہیں مجھ میں کہنے کی طاقت
مجھے ہے یہ مشکل تمہیں ہے یہ دوبھر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
کروں کس طرح تم سے شکوہ عدو کا کہ ہو جاؤ گے سُن کے شعلہ بھبھوکا
پتنگے لگیں گے بہت بندہ پرور نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
تمہیں دیکھ کر ہے عجب دل کی حالت نہ کہنے کے قابل نہ سننے کے قابل
اُدھر تم ہو تصویر اِدھر میں ہوں پتھر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن ....
مرے دردِ دل کی کہانی نہ سننا۔ سنو بھی تو میری زبانی نہ سننا
کہ رہ جاؤ گے ہاتھ سے دل پکڑ کر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم کہہ ...
گلے بے وفائی کا فرصت میں سن لو، بلا کر کسی وقت خلوت میں سن لو
بہت بھیڑ ہو جائے گی روزِ محشر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے
نہ تم سن سکو گے نہ میں کہہ سکوں گا ہوئے شُن کے تم بہرے میں کہہ کے گونگا
یہ سچ ہے کہ راسخ غزل اس سے بہتر نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے

مجھے یہ شعر بے حد پسند ہے کہ "بہت بھیڑ ہو جائے گی" کیا خیال ہے۔ دونوں غزلوں میں تقابلی لحاظ سے آپ کو کون غزل پسند آئے گی مجھے بھی کچھ اندازہ ہے شاید غلط اندازہ نہ ہو۔

(جاری)

براہ کرم ڈاک ٹکٹ عنقریب ارسال کریں

ماں کی یاد

[illegible] راہی

غمناک خلوتوں میں جو آتی ہے ماں کی یاد
ممتا کی بزم کیف سجاتی ہے ماں کی یاد

دکھڑوں سے تلملا کے تڑپتی ہے جب بھی روح
آرام جاں کے جام پلاتی ہے ماں کی یاد

تنہائیوں کے عالم بے یار و دوست میں
خاموشیوں کی یاد سناتی ہے ماں کی یاد

دھڑکن کو دل کی دے کے مہک کا سرور خاص
سرمد کی کیفیات جگاتی ہے ماں کی یاد

کٹتی نہیں جو شام سے غم کی پہاڑ رات
لوری کا لمس دے کے سلاتی ہے ماں کی یاد

غربت کے تنگ و تار نصیبوں کے درمیاں
تاریکیوں کو نور بناتی ہے ماں کی یاد

کھوئی ہوئی نشاط پلٹتی ہو جس طرح
رگ رگ میں سوز و ساز جگاتی ہے ماں کی یاد

اے موت دیکھ یہ بھی بقا کا ہے ایک روپ
آتی ہے مجھ کو آج بھی آتی ہے ماں کی یاد

یہ رسم و راہ روزِ ازل کا خلوص ہے
فرقت کی تشنگی کو مٹاتی ہے ماں کی یاد

راہی اٹوٹ سلسلے فطرت کی دین ہیں
امروز و دی کا فرق مٹاتی ہے ماں کی یاد

ڈاکٹر محبوب راہی

چاند، سورج، شفق، کہکشاں ختم شد
اب اڑوں کس طرف آسماں ختم شد
رہگزار یقیں تا بحدِ نظر . . . .
سبزہ زارِ خیال و گماں ختم شد
رشتے ناطے سبھی جوں کے توں ہیں، مگر
اک تقدس جو تھا درمیاں ختم شد
پھر ہوا یوں کہ آنکھ ایکدم کھل گئی
مختصر یہ کہ بس داستاں ختم شد
رونقیں سب گھروں کی دفاتر میں ہیں
بیویاں ختم شد، بیٹیاں ختم شد
فکر کے سارے گل بوٹے مرجھا گئے
ذہن کی ساری شادابیاں ختم شد
اس نے آتے ہی سب کھڑکیاں کھول دیں
دفعتاً سر میں تھا جو دھواں ختم شد
ذہن کو اب نچوڑوں تو نکلے غزل
تھی کبھی وہ جو طبعِ رواں ختم شد

دل ہو فولاد کا، پتھر کا جگر ہو تو چلو
تم مری طرح جو بیباک، نڈر ہو تو چلو
منزلِ عشق ہے، رستہ ہے یا انگاروں کا
اس حقیقت کی اگر تم کو خبر ہو تو چلو
سر کو شانوں پہ سجانا ہو تو گھر بیٹھے رہو
ہاتھ میں نیزہ، ہتھیلی پہ جو سر ہو تو چلو
بے ہنر ہو تو اٹھو، جاؤ، کہیں ڈوب مرو
ہاں اگر ہاتھ میں کچھ نقدِ ہنر ہو تو چلو
لمس سجدوں سے جبینیں ہوں جہاں طولانی
آستاں ایسا ہو ایسا کوئی در ہو تو چلو
وہ ہے پتھر نہیں اشکوں سے پگھلنے والا
ہاں! اگر دیدۂ دل خون میں تر ہو تو چلو
روند ڈالی ہیں زمینیں تو کبھی اے راہی
آسمانوں کا جو درپیش سفر ہو تو چلو

غزلیں

[illegible]تین نیاز

[illegible] الوداع کا منظر ابھی سے ہے
[illegible] آنکھ سمندر ابھی سے ہے
[illegible] میں تیری سماعت کے تسئیں
[illegible] دماغ گل تر ابھی سے ہے
[illegible] جانے کیسا ہوگا جنگ کا
[illegible] تو درد کا پیکر ابھی سے ہے
[illegible] کب آئیں گے، کھلتا نہیں مگر
[illegible] انتظار ساعتوں کا سفر ابھی سے ہے
[illegible] شام درد تو بجھ جائے گا یہ نور
[illegible] آئینہ تو مکدر ابھی سے ہے
[illegible] بخشنے والے اب اور بس
[illegible] کا تیرے بوجھ تو سر پر ابھی سے ہے
[illegible] ابھی سے رکھئے امید کرم نیاز
[illegible] پہ اپنی رنج کا پتھر ابھی سے ہے

عبدالسلام کوثر

آستینوں میں اگر سانپ نہ پالے ہوتے
اپنی قسمت میں اندھیرے نہ اجالے ہوتے
قیس کے آپ اگر چاہنے والے ہوتے
آپ کے پاؤں میں مہندی نہیں چھالے ہوتے
ہم کو تقدیر سنبھلنے کا جو موقع دیتی
ہم زمانے میں زمانے سے نرالے ہوتے
زندگی کچھ تو سلیقے سے گزرتی اپنی،
ہم کو ماں باپ طریقے سے جو پالے ہوتے
جذب کر لیتا میں آنکھوں سے نہ بہنے دیتا
تیرے جذبات اگر میرے حوالے ہوتے
ہم سیاست کو تجارت نہیں سمجھے ورنہ
اپنے ہاتھوں میں بھی سونے کے نوالے ہوتے
جائسی، رابعہ، میرا کو اگر پڑھ لیتا
تیری آنکھوں میں تعصب کے نہ جالے ہوتے
اس کے جو چاہنے والے ہیں سبھی ایک نہیں
ورنہ کوثر نہ یہ مسجد نہ شوالے ہوتے

شاہد عزیز

دور تک پھیلا ہوا ہے آسماں
میں نکل کر جسم سے جاؤں کہاں

آپ کے شکوے سبھی سچ ہیں مگر
کون سنتا ہے پرانی داستاں

ہر طرف سے آگ کی لپٹوں میں ہے
بچ نہیں سکتا ہے اب تو یہ مکاں

جانے کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہے وہ
جانے کس کو کھو چکا ہے وہ یہاں

پتھروں کے شہر میں آیا ہوں میں
اور بنا دوں گا اسے اب گلستاں

ناخداؤں پر بھروسہ کس لئے
کشتیاں تو کھینچتے ہیں بادباں

رہے گا کب تلک وہ آسماں پر
پرندہ آئے گا نیچے اُتر کر

اسے بھی دشمنی کا غم نہیں ہے
مجھے بھی ناز کب تھا دوستی پر

سمندر دشت کی جانب گیا تھا
مگر آیا نہیں اب تک پلٹ کر

مسلسل میں پکارے جا رہا ہوں
کبھی تو دیکھ لے گا وہ پلٹ کر

تمام دشت میں اس نے گھما دیا مجھ کو
جگہ جگہ پہ سمندر دکھا دیا مجھ کو

لڑا دیا مجھے کالی ہواؤں سے اس نے
گزرتی رات کا سایہ بنا دیا مجھ کو

پھر آسمان کو شاید زمیں مل جائے
اس انتظار کی حد پر بٹھا دیا مجھ کو

میں بھاگ نکلا بدن کے حصار سے لیکن
وہ کیسی آگ تھی جس نے جلا دیا مجھ کو

مرے وجود کو دھرتی پہ دفن کر کے اب
نہ جانے کون سا پیکر بنا دیا مجھ کو

گوہر جمالی

جب ترے ہاتھ میں ہو میرا مقدر لکھنا
کاتب وقت مری ذات کو بہتر لکھنا
لاکھ چھیڑیں کہ صداقت کا قرینہ تجھ میں
خود کو صحرا کو مرے دوست سمندر لکھنا
چاندنی گر نہ آئے کبھی تیرے گھر میں
اپنی راتوں کو ہمیشہ ہی منور لکھنا
شاعری جس کی ہے مانگی ہوئی اہل فن سے
مصلحت کہتی ہے اس کو بھی سخنور لکھنا
ان کی تحریر پہ ہم کیسے بھروسہ کر لیں
جن کا شیوہ ہے رفیقوں کو ستمگر لکھنا

بیٹھے ہوئے ہیں [illegible] ٹھیک ہے
تشنہ لبی کے [illegible] سمندر ہی ٹھیک ہے
کیا فرق ہے بچے تو ہم ڈوب ہی چکے
طوفاں میں اب ہمارے یہ [illegible] ہی ٹھیک ہے
بیٹھے ہیں شاہ وقت کو دینے کے واسطے
ان کا خیال ہے کہ یہ [illegible] سر ہی ٹھیک ہے
تا عمر ہم کو چین سے جینے نہیں دیا
کم بخت! یہ ضمیر تو مر کر ہی ٹھیک ہے
سنتے ہیں کھل گئی ہے حق و باطل میں آج پھر
خوش ہیں، جو ہو رہا ہے، وہ باہر ہی ٹھیک ہے
پھولوں کی سیج سب کو میسر کہاں [illegible]
مسند چھوڑ دے، یہ [illegible] کا بستر ہی ٹھیک ہے

حسرت [illegible]ی

آدمی جو گیا خلاؤں میں
زہر بھر دے گا وہ فضاؤں میں
[illegible] مسافت کو
منزلت کر میری [illegible]
دیکھو اجالے [illegible]
کھو گئے عہد وفا [illegible] میں
مجھ کو رکھنا نہ بے وفاؤں میں
بادباں بھی نہیں ہے کشتی میں
ناؤ کیسے چلے ہواؤں میں
آندھیوں میں بھی ہے خدا کا کرم
جل رہا ہو دیا ہواؤں میں
[illegible] گنہگار ہو حسرت
[illegible] دعاؤں میں

[illegible] جاوید

جب دل ہی نہیں روشن، تحریر کہاں روشن
الفاظ بھی کالے ہیں، ہر بات بھی کالی ہے
یہ سوچ کے میں چپ ہوں کہنے کو بہت کچھ ہے
اس دور میں سچ کہنا ماں باپ کی گالی ہے
جب تک نہ حقیقت ہو، عرفان نہیں ممکن
ہر حسن قیاسی ہے، ہر بات خیالی ہے
جو کچھ بھی یہاں سوچو، خود ہی کے لئے سوچو
جاوید یہی سب نے اب دل میں بسالی ہے

راز اعظمی

جہانِ حیا سوز دن رات ہوگی
نئی طرز ہوگی نئی بات ہوگی
سکوں دل کو ہوگا تو آنسو رکیں گے
نہ اٹھے گا بادل نہ برسات ہوگی
بوقت سفر یہ بتا دیجئے گا
کہاں آپ سے پھر ملاقات ہوگی
بسر دن تو کر لوں گا چل پھر کے لیکن
تمہیں یاد آؤ گے جب رات ہوگی
خوشی کے طلبگار ہی غم سہیں گے
جہاں آج دن ہے وہاں رات ہوگی
زمانہ محبت میں جب دیگا دھوکا
سہارے کی خاطر تری ذات ہوگی
وہ صحنِ گلستاں ہو یا ہو بیاباں
کہیں راز سے تو ملاقات ہوگی

بیتاب کیفی

[illegible] اتنا دھوکا چاہیے تھا
[illegible] دل کی [illegible] چاہیے تھا
[illegible] اور [illegible] چاہیے تھا
[illegible] وفا [illegible] چاہیے تھا
زندگی [illegible] بن جانے کبھی
راہ میں پھولوں کا سایہ چاہیے تھا
ابھی [illegible] میں سنبھلنا چاہیے تھا
[illegible] دھواں [illegible] چاہیے تھا
[illegible]

درد کو پڑھنا بڑا دشوار سمجھا
زندگی کچھ اور دھوکا چاہیے تھا
ہر بشر بیتاب ہے کہتا ہے یہی
ہم وہ الفت کا علاقہ چاہتے ہیں

مشرف عالم ذوقی

مسلمان

قسط ۴

— ترجمہ —
تبسم فاطمہ

(غلامی کے آخری دنوں سے ۱۹۸۶ء تک)

سڑک پر ہنگامہ مچ گیا

شٹر جلدی جلدی گرنے لگے۔ دکانیں بند ہونے لگیں لوگ تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بالکنی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کے درمیان سے تھوڑا سا سر نکال کر یہ منظر گوہر جان نے بھی دیکھا۔ چاروں طرف افراتفری مچی تھی آس پاس کی کھلی کھڑکیوں سے جھانکتے طوائفوں کے درمیان، آنکھوں آنکھوں میں وحشت کے کچھ مکالمے بھی ہوگئے۔

مکالمے — سناٹے بھرے
مکالمے — ایک سنگین چپ لئے
مکالمے — آنکھوں آنکھوں میں جیسے موت دیکھتے ہوئے۔ تلاش کرتے ہوئے۔

جب تک گوہر جان کمرے میں بھاگتی، بدی ماما لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آچکے تھے۔ ان پر ویسے وحشت سوار تھی۔ پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

پھٹی پھٹی آنکھیں لئے افروز نے بائی اماں کو دیکھا۔ بدی ماما دروازے کی طرف ہنہناتے ہوئے بھاگے تھے۔

بائی اماں لگ بھگ چیخ اٹھیں۔

"پاگل ہو گئے ہو بدی — باہر طوفان مچا ہے۔"

"ہوں .... ہاں ...."

"کدھر جا رہے ہو۔"

"ہوں .... ہاں ...."

"دماغ خراب ہو گیا ہے ...."

بدی دوبارہ پلنگ پر آکر بیٹھ گئے۔ سر کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ پھر کسی ننھے بچے کی طرح بستر پر لیٹ گئے۔

ایک سازندے نے آکر خبر دی — "بری خبر ہے۔ حالات کچھ اچھے نہیں، ہندوؤں کے دھارمک جلوس کے نتیجے میں مسلمانوں نے بھی اپنا جلوس نکالا تھا بم بخت پاگل کتے نے کاٹا تھا۔ تقریریں بھی کیں — جو جی میں آیا،

گالیاں دیں۔ سرکار کو بھی۔ ان کے نیتاؤں کو بھی۔ اور تو اور۔ ان کے دھرم کو بھی۔ نتیجے میں لاٹھی چل گئی۔ نیوسٹی ایریا میں کافی ہنگامہ ہے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے کئی گھر پھونک دیئے۔"

"باپ رے۔"

بائی اماں ایکدم سے چونک پڑیں۔ اب کیا ہوگا پروردگار ۔۔۔ نیوسٹی ایریا یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اماں نے خوفزدہ آنکھوں سے افروز کو دیکھا۔ پھر لڑکھڑائی آواز میں بولیں۔ دیکھتی کیا ہو ۔۔۔ قرآن پاک نکالو ۔۔۔ سورہ یٰسین کی تلاوت کرو۔ اللہ پاک ہر بری بلا سے محفوظ رکھتے ۔۔۔ آمین۔"

طاق پر قرآن شریف پڑا تھا۔ بائی اماں نے جزدان سے قرآن شریف نکالا۔ آنکھوں سے لگایا۔ پھر پڑھنے بیٹھ گئیں۔ تبھی باہر اچانک تیز شور بلند ہوا۔ جیسے ہزاروں پٹاخے مل کر ایک ساتھ چھوٹ گئے ہوں۔ جے بجرنگ بلی کے نعروں سے پوری فضا چونک گئی۔

بائی اماں کو جیسے کاٹو تو خون نہیں۔

"یا پروردگار قسمت کو کون سے دن دیکھنے ہیں ... ؟" آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی ۔۔۔

بڑی ماما کانپتے ہوئے بستر سے اٹھے۔ پھر جیسے بیہوش ہو کر گر پڑے۔

افروز تیزی سے چیخی ۔۔۔

اماں تیزی سے بالکنی کی طرف بھاگیں۔

آگے ۔۔۔ باڑے پر کا، صلاح الدین کا مکان آگ میں دھوں دھوں کر کے جل رہا تھا۔

"یا الہی ....

دہشت کی آگ جیسے ان کو بھی جلاتی چلی گئی۔

"نہیں ۔۔۔ بائی اماں کے جسم کے اندر جیسے خوف کے ڈھیروں سانپ گھس گئے۔

"اب کیا ہوگا ؟"

"ہائے اللہ اب کیا ہوگا ؟" آنکھوں کے آگے بس یہی خوف بھرا سوال پینڈولم کی طرح جھول رہا تھا ۔۔۔ ہونٹوں تک کتنی ہی آیتیں آکر چپ لگا گئیں۔ ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

اب ۔۔۔ ؟

یہ سوال تو افروز کی آنکھوں میں بھی تھا ۔۔۔

بائی اماں نے دروازے کو ٹھوک ٹھاک کر دیکھا ٹھیک سے بند ہے یا نہیں۔ آس پاس کا ماحول بھی عجیب تھا۔ وحشت ناک سروں میں پاس پڑوس کی عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

بائی اماں اور افروز، دونوں پاس پاس سکتے جیسی حالت میں کھڑے۔ زمین پر بیہوش پڑے ۔۔۔ بڑی ماما کو گھور رہے تھے۔

بڑھتی آوازوں کا شور جیسے ایکدم سے بہت قریب آگیا۔

بائی اماں کی آنکھوں میں موت سما گئی ۔۔۔

یا .... ال .... لہ ....

چیخ و پکار جیسے کان کے پردے پھاڑ رہے تھے۔

بائی اماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخیں ۔۔۔ افروز، باہر والی کھڑکی [illegible]

.... تو اس سے اتر کر بھاگ جاتا۔ میں ..."

قریب سے موت کو دیکھ کر عجیب سا سہما ہوا سا محسوس ہو رہا تھا — باہر شور تھے۔ آسمان پر پھیلتا، پھیلتا دھواں تھا۔

اور اچانک بائی اماں کے دروازے پر ایک زوردار دھماکہ ہوا — دروازے کی چولیں ہل گئیں۔

" افروز ... جلدی کرو ..."

بائی اماں تھر تھر کانپنے لگیں ...

دروازے پر جیسے موت کا تانڈو رقص شروع ہو گیا۔ دروازہ جھول رہا تھا۔ لات، جیسے برابر پڑ رہی تھی۔

افروز تیزی سے کھڑکی پر چڑھ گئی۔ اب سوچنے سمجھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ دوسری طرف خالی چھت تھی۔ کھڑکی اور چھت کے درمیان فاصلہ کم تھا۔ قریب ڈیڑھ فٹ کا —

بائی اماں کا پورا جسم جیسے تھر تھر کانپ رہا تھا .....

دروازے پر مستقل لاتوں کی بوچھار ہو رہی تھی ...

ایک .....

دو .....

تین .....

پھر گالیوں کے شور ابھرے —

اور پھر وہ ہوا، جیسے ہونا ہی تھا۔ دروازہ ایک تیز دھکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ بائی اماں کی ایک دلدوز چیخ آسمان کو چھید کرتی چلی گئی۔

سامنے — تنے چہرے، ہاتھوں میں جلتی مشعل لئے جہانگیرا کھڑا تھا۔ اور جہانگیرا کے پیچھے کئی لوگ نعرہ لگاتے، سفاک چہروں کے ساتھ بائی اماں کو دیکھ رہے تھے۔

پھر اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔

بڑی ماما کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ اس سے پہلے کہ دہشت گرد کچھ کر پاتے، وہ تیزی سے اٹھا اور بالکنی سے سڑک پر چھلانگ لگا چکے تھے۔

بائی اماں کا دل جیسے باہر آ گیا۔

سامنے موت ناچ رہی تھی۔

بائی اماں خوفزدہ آنکھوں سے اب جہانگیرا کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

" افروز کہاں ہے ...؟"

" و .... ہ ....."

بائی اماں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

" افروز کہاں ہے ...؟"

بائی اماں نے خوفزدہ آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا جو اب خالی پڑی تھی۔

" بھگا دیا —؟"

جہانگیرا نے غصے میں گرم گرم جلتی ہوئی مشعال بائی اماں کے چہرے سے سٹا دیا۔ بائی اماں نے ایک تیز ذبح ہونے والے جانور کی طرح بھیانک چیخ ماری۔

جہانگیرا دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ اسے دُور بھاگتا ہوا ایک سایہ نظر آیا۔

" چلو —"

جہانگیرا نے اشارہ کیا۔

مشعال بردار لوگوں نے بائی اماں کے گھر کو آگ لگا دی — باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

[illegible] خوفناک چیخیں تو دیر تک بلند ہوتی رہیں۔

پھر آواز خاموش ہو گئی۔
دہشت گرد سائے کے پیچھے بھاگ چکے تھے اور بانی اماں کا مکان شعلوں کی داستان لکھ رہا تھا۔

کیسے مسعود الزام دیا جائے.... موت تو جیسے سب کے تعاقب میں نکل چکی ہے.....
فروزا کا سینہ اب بھی خوف سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے کود گئی نہیں تو اور کیا کرتی...
سامنے موت تھی... آگے پیچھے۔ دائیں بائیں۔
چاروں طرف....
اس پر جیسے دہشت سوار تھی۔
باہر دروازہ جل رہا تھا۔ پل میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ کود جائے گی اور وہ کود گئی۔
اڑھائی تین فٹ کی اونچائی کم نہیں ہوتی لیکن ایسے وقت میں انسان کے پاس زبردست ہمت آ جاتی ہے۔ اس کے پاس دو تین ہمت سے بڑھ کے تھے۔

افروزا سرپٹ دوڑتی چلی گئی۔
ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا۔
اس کا اپنا مکان دھواں دھواں بھبک رہا تھا۔ شعلے آسمان چھو رہے تھے۔ ذرا دور پر اس نے بے رحم سایوں کو دیکھا اور وہ سرپٹ بھاگتی گئی۔
بھاگتے بھاگتے وہ کب ایک پولیس جیپ سے ٹکرائی، پتہ بھی نہیں چلا۔
اس کی سانس پھول رہی تھی۔
سامنے والے کو اس نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک باوردی آفیسر تھا۔ وہ شاید سلجھا ہوا [illegible] تھا۔

"یہاں کوئی جان پہچان کا ہے؟"
"نہیں۔"
اس کا چہرہ خوف سے ڈول گیا۔
"کوئی رشتہ دار؟"
"نہیں۔"
"کوئی ایسی جگہ جہاں تمہیں چھوڑ سکوں؟"
جی ___
ایک لمحے کو اچانک اسے نواب صاحب کے گھر کی یاد آ گئی۔ بانی اماں نے ایک دن باتوں میں نواب صاحب کی حویلی کا ذکر چھیڑا تھا۔ اس نے بھی پتہ بتا دیا۔
باوردی افسر چونک پڑا۔
"ارے یہ تو نواب صاحب کا گھر ہے؟"
"مجھے وہیں چھوڑ دیجئے۔ لیکن...."
اس نے خوف سے تھرتھری لیتے ہوئے افسر سے کہا۔ "لیکن پلیز، آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے ورنہ پتہ نہیں نواب صاحب کیا سوچ لیں۔"
باوردی افسر نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔
"ٹھیک ہے۔ یہ جگہ محفوظ ہے۔"
انسپکٹر نے اسے جیپ پر بٹھا لیا۔ جیپ چل پڑی۔ افروزا کا سینہ اب بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک پرانی حویلی کے آگے جیپ [illegible]

دیکھیں پڑھ ... انسپکٹر نے جیپ روک دی ۔ اشارہ کیا ۔

"یہی ہے ۔ آپ یہاں پہلے بھی کبھی آئی ہیں ؟"

"نہیں ۔"

"کوئی بات نہیں ۔"

یہ علاقہ سچ مچ محفوظ تھا لیکن شاید شہر میں ہونے والے دنگوں کی خبر یہاں والوں کو مل چکی تھی ۔

گھر، دروازے، کھڑکیاں سب بند تھے ۔

سڑک سنسان ۔

"یہی ہے ؟"

"یہی ہے نواب صاحب کی حویلی ۔"

زردی مائل اور رونق سے محروم ، جھڑتی دیواروں والی اس حویلی کو غور سے دیکھا افروز نے ۔

خوف سے سانسیں اب تک پھولی ہوئی تھیں ۔

حویلی کا بڑا سا پھاٹک اب اس کے ہاتھوں کی جنبش کا منتظر تھا ۔

پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی ۔ گھگھیاتی ہوئی آواز اس کے منہ سے نکلی ...

کھو... لیے ... خدا کے واسطے دروازہ کھولئے ...

پھر ـــ دروازے کے پاس آکر یہ دوڑتے ہوئے چند قدم ٹھٹھک گئے

دروازہ کھل گیا ـــ

افروز نے سوچا، پھولی آنکھوں سے دیکھا ، دروازے پر اسکی ایک ہم عمر لڑکی کھڑی تھی ۔

ـــ لڑکی کے پیچھے ، عمر میں اس سے دو ایک برس بڑا ایک لڑکا کھڑا تھا ۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا ۔

"کون ہو تم ۔"

"نواب صاحب ..... ہیں ؟"

ابھی اس کے لب پر لفظ تھرتھرائے ہی تھے کہ نواب صاحب ظاہر ہوگئے ۔ اسے لٹی لٹی حالت میں دیکھ کر جیسے وہ اپنی جگہ پتھر ہوگئے ۔

"تم .... یہ سب "

نواب صاحب نے پیچھے پلٹ کر اپنی بیوی اور بچوں کی طرف دیکھا "میرے دوست کی بیٹی ہے ۔ اندر آجاؤ بیٹی ۔"

افروز اندر آگئی ۔

نواب صاحب نے اشارہ سے سب کو جانے کے لئے کہا اور افروز کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے ۔

(جاری ہے)

سہیل جامی

دہلیز

سلیم پور جانے کے لئے اوشا بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ سامنے ہوٹل سے نکل کر ایک لڑکی بس کی لائن میں آکر کھڑی ہوگئی اور اس کے پیچھے ہی ایک لڑکا ہوٹل سے نکلا جو سڑک پار کرکے بس اسٹاپ پر آگیا اور لڑکی سے واپس ہوٹل چلنے کے لئے اصرار کرنے لگا — دونوں کے درمیان ہو رہی باتوں کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ اوشا چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اور پھر اسے سارا ماجرا سمجھنے میں دیر بھی نہ لگی۔

اتنے میں بس آگئی اوشا نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر جھانکا۔ دیکھتی کیا ہے کہ وہ لڑکا اسے منانے میں کامیاب ہوگیا اور دونوں ہی واپس ہوٹل کی طرف چل پڑے بس چل چکی تھی اور دوسرے لوگ جو اسی اسٹاپ سے بس میں سوار ہوئے تھے آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے

"ارے، کون نہیں جانتا اسے....."

ابھی اوشا ان کی باتیں پوری طرح سن بھی نہ سکی تھی کہ اس کے اپنے خیالات پیچھے کی طرف بھاگنے لگے — اس دن وہ کتنا خوش تھی جب رویندر اس کے دروازے پر دولہا بن کر آیا تھا اور اس کی سہیلیاں اس کی خوبصورتی اور جسامت کو دیکھ کر اوشا کی خوش آئند زندگی پر رشک کرنے لگی تھی۔

"دیکھ نا کتنا خوبصورت ہے....." رادھا بولی ہی تھی کہ انجنا بیچ میں ہی بول پڑی۔

"اپنی اوشا بھی کچھ کم ہے کیا؟ بڑی مشکل سے ایسی جوڑی ملتی ہے" پاس کھڑی ارچنا بھلا کیسے خاموش رہتی۔

"اس کا جسم تو دیکھ، کیسا کسرتی ہے اپنی اوشا تو اس کی باہوں میں سما کر پھولی نہ سمائے گی" پھر دور سے ایک آواز آئی جو شاید مردولا کی تھی "گال تو دیکھ کیسا لال لگ رہا ہے۔ ذرا پن مارو کہ خون نکل آئے۔"

"تو نے تو اس کی ہائٹ دیکھی ہی نہیں۔ اس کی ساری خوبصورتی تو اس کی ہائٹ پر منحصر ہے۔"

غرض جتنی منہ اتنی باتیں۔ اوشا ان کی [illegible]

کر چکا [illegible] رہی تھی — اور پھر اوشا نے دہلیز [illegible]
[illegible] پر بیٹھا کر لیا۔ جہاں کے [illegible] اس
کے [illegible] اجنبی — اس اجنبی
کمرے میں تنہا ایک روم میں خاموشی پھیلی آنے والے
لمحے کے انتظار میں بند ہو گئی۔ رات آدھی ہو چکی
تھی اور رویندر اپنے دوستوں میں بیٹھے ہنسی مذاق
کر رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے دوست آج
ارادہ کر کے ہی آئے تھے کہ ساری رات رویندر یہاں کا
ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ جب اوشا سے نہ رہا گیا تو آخر
[illegible] پڑیں۔ "رویندر کیا تیری بہو کوری ساری
رات ایسی ہی جاگتی رہے گی؟"

ان کی آواز سن کر رویندر نے دوستوں سے
[illegible] آہستہ آہستہ چلتے ہوئے روم میں
داخل ہو گیا۔ اس وقت اوشا کا کلیجہ بڑی بے ترتیبی
سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس نے کسی طرح ساری ہمت
[illegible] رویندر کے پاؤں چھوئے اور اس کے قدموں
کی [illegible] ہی پھیل۔

رویندر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی ہتھیلی اپنے
ہاتھوں میں لے کر مہندی بھرے ہتھیلی کو بڑے غور سے دیکھنے
لگا پھر بولا "اوشا! تمہارے گورے ہاتھوں میں مہندی
کتنی کھل رہی ہے"

اوشا اپنے آپ ہی شرما گئی۔ اسے آج سب
کچھ [illegible] تھا۔ کمرے میں پھیلی ہلکی روشنی،
پھولوں [illegible] اور اس پر [illegible] رات کی [illegible] اور قریب
بیٹھا رویندر — بس جو احساس تھا وہ
[illegible] رویندر کی نیند سے بوجھل آنکھیں"
"[illegible] نیند بہت زوروں سے آ رہی ہے"

"[illegible] ساری [illegible] گزار [illegible] کی وجہ
سے رہی ہے"

پھر اوشا نے اسے گود میں [illegible] بچہ کی
[illegible] — لیکن خود اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں
[illegible] آخر نیند آتی بھی تو کیسے، اس نے تو اس رات
انتظار میں کتنی راتیں جاگ کر گزار دی تھی —
خیالوں میں [illegible] ابھرتے اوشا نے ساری رات
یوں کاٹ دی۔

شادی کے بعد کی وہ پہلی رات اور اس
کئی راتیں رویندر کو تھپکیاں دے کر سلاتے [illegible]
کے اندر ایک عجیب سی شکست کی دیوار قائم [illegible]
پہلی بار جب وہ میکے آئی تو سہیلیوں [illegible]
کی بھابیوں نے اسے گھیر کر کتنا چھیڑا تھا، کہ
سہاگ رات کی رسیلی باتیں پوچھی تھی۔ اور [illegible]
نے مسکرا کر، شرما کر [illegible] چھپا لی تھی۔

کچھ دن میکے میں رہنے کے بعد جب سسر[illegible]
تو اپنے دلہن کا چولا اتار کر ایک آدرش عورت
اپنے ساس کے ساتھ سارا دن کاموں میں لگی
رہتی لیکن جوں ہی رات آتی اس کے تصور سے [illegible]
جاگ اور پھر ساری رات بستر پر کروٹیں [illegible]
بدلتی۔ [illegible] اوشا کی [illegible] میں کیا تھا اور نہ رویندر
اس موضوع پر کوئی شروع ہوتے — ویسے تو
ساری خوشیاں اسے حاصل تھی — [illegible]
پر اپنا پیار پانے میں رویندر نے کوئی کسر نہ
چھوڑی تھی۔ اس کی ہر خواہش رویندر اس کے منہ
آنے سے پہلے پوری کر دیتا۔ آئے دن اسے
[illegible] روز شام اسے اسکوٹر پر بٹھا کر گھمانے

اور انگریزات کا کھانا باہر کسی اچھے ہوٹل میں کھلاتا۔ لیکن ان باتوں کے باوجود اوشا رات کے تصور سے کانپ جاتی۔

اسی طرح زندگی کا ایک طویل عرصہ گزر گیا۔۔۔ ساس بھی اسے بے انتہا چاہتی اور کسی طرح اسے دکھی نہ ہونے دیتی، تب اسے احساس ہوا کہ یہ راز اس کی ساس پر بھی عیاں تھا اس نے جان بوجھ کر ایک عورت کو اتنی بڑی دلدل میں دھکیل دیا۔۔۔ ذرا بھی اس نے عورت کی مجبوری کو سوچا بھی نہیں

آخر ایک دن اس نے ساری ہمت یکجا کر کے رویندر سے پوچھ ہی لیا۔ "کیا تمہیں اس کا احساس پہلے نہ تھا؟"

"کیسے ہوتا: میں تھا اپنے کالج میں اول آنے والا طالب علم۔۔۔ اپنی تعلیمی زندگی میں اس قدر معروف رہا کہ دوسری طرف جھانکنے کا موقع نہ ملا۔۔۔ جب M.Sc کے آخری سال میں تھا تو ایک واقعہ ایسا سامنے آیا اور مجھے اس کا علم ہو گیا۔ میری زندگی میں میری ماں اور چھوٹا بھائی شیلندر کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ میں نے اپنی تعلیمی زندگی کے خاتمے کے بعد اس کا تذکرہ اپنی ماں سے کیا اور ماں نے مختلف ڈاکٹروں سے۔

اسی اثنا میں ماں نے شادی کا مسئلہ میرے سامنے رکھ دیا تو میں نے انکار کر دیا لیکن بہت بہانے اور ڈاکٹروں کی تسلی دلانے کے بعد میں نے "ہاں" کر دی۔ اور پھر جو کچھ ہوا تمہارے سامنے ہے۔"

سچائی سن کر اوشا نے رویندر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا فیصلہ کر لیا اور تپتی ریت پر ایک بوند پانی کو ترستی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن وہ خود بھی نہ جانتی تھی کہ ریت پر بنائے ہوئے محل اچانک بھربھرا کر گرنے لگیں گے۔۔۔ اوشا اپنے دل کی زبان کو سی لیتی اور سمجھا بھی لیتی لیکن تن کی زبان وہ کس کر بھی ان سنی کرنے کی لاکھ کوشش کرتی پر تن کے سارے تار ایک ساتھ جھنجھنا اٹھتے، ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے اس کا روم روم جھوم اٹھتا۔ تب اسے محسوس ہوتا کہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ آخر وہ سوچتی یہ درد بھی کیسا ہے جو کسی سے کہہ نہ سکتی، بانٹ نہ سکتی اور اکیلے سہہ نہ سکتی۔

رویندر کا چھوٹا بھائی شیلندر اب تک ہوسٹل میں رہ کر پڑھ رہا تھا۔ تعلیم پوری کر کے اچھے نتیجے کے ساتھ اپنے کالج کی گرل فرینڈ ارچنا کو اپنا جیون ساتھی بنانے کی تجویز لے کر ماں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ماں نے تو سارے گھر کی ذمہ داری اوشا پر ہی چھوڑ رکھی تھی۔ وہ بولیں: "اپنی بھابی سے پوچھ۔" جیسا وہ ٹھیک سمجھے اور اوشا شیلندر کی پسند کو دلہن بنا کر گھر لے آئی۔

ارچنا۔۔۔ جتنا دیکھنے میں سندر تھی اتنا ہی وہ عملی زندگی میں تھی۔ اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے اوپر لے لیا اور اوشا کو تو کچھ کرنے ہی نہ دیتی۔ کہتی۔۔۔ "دیدی اتنے دنوں سے تو تم کر ہی رہی تھیں۔ اب مجھے کرنے دو۔ تم جا کر آرام کرو۔" اور اس کے برتاؤ سے نہال ہو جاتی۔

اوشا کے ہی کمرے سے سٹا ہوا ارچنا کے سونے کا کمرہ تھا۔ دیر رات گئے دبی دبی کھلکھلاہٹ اور ہنسی

تذا تو ... اوشا کے تپتے صحرا میں ریت اڑا کر جل دیتی اور ... کروٹ بدلتی ہوئی ساری رات گزار دیتی۔ جیسے ... بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ جب ہی تو ایک دن بہت خوش خوش موڈ میں آیا اور اوشا سے کہنے لگا۔

"ایک بات کہوں اوشا۔ برا تو نہ مانوگی؟"

"ایسی کون سی بات ہے بتاؤ تو بھلا؟"

"نہیں پہلے وعدہ کرو۔"

"اچھا بابا۔ وعدہ کرتی ہوں۔"

"اوشا! تم مجھ سے طلاق لے لو۔" اس نے یہ بات اتنے سپاٹ لہجے میں کہی کہ وہ ایکدم بوکھلا گئی۔

پھر وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "اوشا! ابھی تم جوان ہو، خوبصورت ہو اور جسم کی کشش باقی ہے، تم سے کوئی بھی شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ اس لئے تم مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو اور پھر تمہارے پاس تو معقول وجہ بھی ہے۔"

اتنا سنتے ہی اوشا روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی ——— "رویندر ایسا تم نے سوچا ہی کیوں؟ کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ میں نے اگنی کو ساکھشی مان کر ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسم کھائی تھی۔ تو کیا تم مجھے اپنے ساتھ مرنے نہیں دو گے۔"

"نہیں اوشا ایسی بات نہیں۔ میں تو تمہاری خوشی کے لئے ہی ایسا کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں! مجھے ایسی خوشی نہیں چاہئے۔ میں تو اپنی ہی زندگی میں خوش ہوں۔ ایسا تم دوبارہ نہ سوچنا رویندر ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔"

... ہی مجبور ہو گیا ——— زندگی معمول ...

——— سے گزرنے لگی۔ اسی درمیان ارچنا کے پاؤں بھاری ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔

ارچنا سے جب اس کا بیٹا نہ سنبھلتا تو اوشا کو آرام سے ایک جگہ بٹھا دیتی اور اپنا بچہ اس کے گود میں رکھ کر گھر کے باقی کام کو نپٹانے لگ جاتی اور بولتی جاتی: "دیدی یہ تو مجھ سے سنبھلتا ہی نہیں تم ہی اسے سنبھالو۔" اور وہ اسے گود میں لئے دونوں ہی دنیا میں کھوئی رہتی اور ہوش تب آتا جب کہ کنمناتا راجو آنچل میں منہ مارنے لگتا اور اس کے اندر کی ممتا جاگنے لگتی۔ تب اوشا ارچنا کو آواز دینے لگتی۔

"ارچنا دیکھو، راجو کو بھوک لگی ہے۔ اسے دودھ پلا دو۔"

پھر ارچنا راجو کو گود میں لے کر کہنے لگتی۔ "دیدی فکر مت کرو۔ جب تمہارے بیٹا ہوگا میں بھی اسے اتنے ہی پیار سے سنبھالوں گی۔"

اپنا بیٹا ہونے کی بات سن کر اس کے دل کے تمام تار جھنجھنا اٹھتے۔ اور وہ ہنس دیتی۔

جب سے راجو پیدا ہوا تھا رویندر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اوشا کچھ زیادہ ہی اداس رہنے لگی ہے تبھی تو ایک دن اس سے بول بیٹھا! "تمہیں بھی تو خواہش ہوتی ہوگی کہ تمہارا بھی ایک ننھا سا گول مٹول بیٹا" اور وہ ہنس کر ٹال جاتی ——— لیکن رویندر کچھ زیادہ ہی سیریس تھا کہنے لگا ——— "اوشا! اگر تم اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کسی ... کا سہارا لینا ...

چاہو تو میری طرف سے پوری اجازت ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا اور تمہارے بچے کو بھی میں اپنا مانوں گا۔ ساتھ یہ بھی یقین رکھو کہ یہ راز کسی پر عیاں نہ ہوگا۔"

اوشا ایکدم پریشان ہوگئی اور دونوں ہاتھوں سے رویندر کو پکڑ کر بول اٹھی۔

"رویندر آج پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں جانتا ہوں اور غلط بھی نہیں کہہ رہا ہوں ۔۔ اوشا تمہیں بتاؤں کیا کسی کو بھوک لگی ہو تو وہ ایک دن۔ دو دن ہی تو بھوکا رہ سکتا ہے۔ ساری زندگی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اور جب میں تمہیں کوئی سکھ نہیں دے سکتا اور تم وہی سکھ کسی اور سے حاصل کر سکتی ہو تو میں تمہاری خواہش کا گلا گھونٹنے پر مجبور کیوں کروں۔ آخر تم بھی تو انسان ہو کوئی پتھر تو نہیں؟"

"رویندر۔ یہی سمجھو کہ میں پتھر ہوگئی ہوں اور رہی تن کے سکھ کی بات تو یہی سمجھوں گی کہ یہ سکھ میرے حصے میں نہیں تھا۔"

کہنے کو تو اوشا یہ کہہ گئی لیکن جب سے رویندر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اوشا کی کسی ہوئی ڈور آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی گئی اور اسے رہ رہ کر کالج کا ساتھی ویاس یاد آنے لگا۔ جس کے ساتھ وقت کا زیادہ تر حصہ گزارہ کرتی تھی۔۔ شادی بھی اس وجہ سے نہ کر سکی کہ ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا تھا کہ دونوں کی شادی اشبھ ہوگی اور بعد میں اسے الگ کی زندگی گزارنی پڑے گی۔

آج اسے رہ رہ کر ویاس کی یاد آرہی تھی۔ آج تو رویندر کے آفس جاتے ہی وہ بن سنور کر ویاس سے ملنے نکل پڑی۔

اتنے ہی میں بس ایک جھٹکے سے رکی اور اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ سوچنے لگی۔ وہ لڑکی تو پیٹ کی بھوک کے لئے یہ سب کرنے کو مجبور ہوئی ۔۔ لیکن میں؟ میں تو اس سے بھی زیادہ نیچے گر گئی ہوں۔ ایک سکھی پریوار کی بہو اور کسی بھلے انسان کی پتنی۔ آج اپنے تن اور مامتا کی بھوک کے لئے کس راہ پر چل پڑی ہوں؟"

پھر اوشا کو لگا کسی دن اس کی طرف دیکھ کر بھی لوگ اسی طرح کانا پھوسی کریں گے۔۔ "ارے کون نہیں جانتا اسے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" تو پھر کیا فرق رہ جائے گا اس لڑکی میں اور مجھ میں۔

اتنا سوچتے ہی اوشا اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کنڈکٹر سے بولی۔ "پلیز! مجھے یہیں اتار دیں۔"

بس سے اتر کر اوشا نے وہیں کھڑی ٹیکسی پکڑی اور واپس اپنے گھر پہنچ گئی۔

ختم

بقیہ ۔۔ بہت باسی

اوتار کہیں نظر نہیں آتے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"نہیں نہیں انسان تو اس مقام سے ہزاروں سال آگے نکل چکا ہے ۔۔ وہ تو روشنی کا مکمل مینارہ بن چکا ہے ۔۔" اس نے سر اٹھا کر دیکھا چیان کا وہ بڑا سا تودہ اس پر سایہ فگن تھا۔

ختم

صفیہ رحمانی

پربت باسی

خاموش اٹھا گہرا سرد راکھ
پر اسرار اتنا کہ راکھ کے اندر کی چنگاری
پھونک مارتے ہی سلگ اٹھی اور حدت کی گرماہٹ
کے ساتھ اس کے چہرے کے نقوش بدلنے لگے۔

میں کون ہوں —
روشنی کہاں ہے —
انسان آج اپنے آپ سے نا آشنا کیوں ہے —
ایسا لگتا ہے ہر کوئی اپنے ذہنی انتشار، سماجی افراتفری اور نابرابری کی صلیب اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانے پر مجبور ہے۔

مگر کیوں —

سوال اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتے اور وہ الجھن سے بے چین ہو جاتا۔

اس کی عورت مزید تنہا کر رکھ گئی۔ ایک ٹکڑا چلم کے منہ میں ڈال کر سانسوں کو کھینچ کر دھواں نکالنے لگا۔ ساتھ ہی کڑوے منہ بھی بناتا رہا۔ اس سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو بڑبڑانے لگا۔

اب وہ چیز کہاں ملتی ہے۔ وہ خاک دھویں جیسی لذت۔ ٹھیکے کی طرح پیسہ لگ جاتا ہے۔ مگر دیے میں دیکھو تو طبیعت ہوا سی ہو جائے۔ اچھے تمباکو تو باہر بھیج دیئے جاتے ہیں بابو لوگوں کے لئے۔ بابو لوگوں کو اچھی چیز ہی ملتی رہتی ہے۔ کبھی خراب نہیں ملتی۔ بالچہ اور مزدوروں ہی کو ابتر ہے۔

وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ کسی طرح بابا کی ڈانٹ سن کر گاؤں کے اسکول میں چار کلاس تک پڑھ لیا ہے۔ جب پڑھنے کا سمے تو تب تو ندی پر جا کر باندھ بندھتے دیکھا کرتا تھا۔ وہیں اس نے ایک بابو کو بھی دیکھا تھا۔ بہت سارے مزدور اس کی ماتحتی کرتے تھے۔ کھانے میں سالن اور شراب ضرور لیتا تھا۔ شراب اس کے لئے شہر سے آتی تھی اور مزدور بھات چاول ابال کر اس کی ماڑی کے ساتھ کھاتے تھے۔ کوئی کوئی نمک ملا لیتے تھے سواد کے لئے۔ اس کے

کے قریب سے ہی باندھ بنایا گیا ہے۔ برسات میں ندی کا پانی اس کے گاؤں میں بھر جاتا تھا اور کبھی کبھی سیلابی حالت پیدا ہو جاتی تھی۔ لوگ گاؤں چھوڑ کر ناطے داروں کے یہاں چلے جاتے تھے۔ مگر اس نے گاؤں نہیں چھوڑا۔ چھوڑ کر جاتا بھی کہاں۔ کون تھا ں کا۔

پانی واپس ندی کی کوکھ میں چلا جاتا۔ تب اس کے نوں دیواروں کی جڑ سے بہت ساری مٹیاں بھی بہہ جاتا جس سے بنیاد کمزور ہو جاتی اور وہ بے چارہ ت کی یہ ستم ظریفی سہنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس وقت لگتا کہ وہ اندر سے بہت ہی کمزور اور ضعیف ہو گیا ان ہی دیواروں کی طرح۔

لیکن جب سے سرکار نے باندھ باندھی ہے ندی کا پانی گاؤں کی طرف نہیں آتا۔ اب کوئی گاؤں چھوڑ کر نہیں جاتا بلکہ باندھ ان کے لئے تفریح گاہ بن گیا ہے۔ دور دور تک صرف پانی اور پانیوں کی لہریں ت ہی اچھی لگتی ہے۔

گاؤں والوں کی بہت ساری زمینیں باندھ کی ہو گئی ہیں۔ اس کی اپنی تھوڑی بہت زمین بھی چلی ہے۔ ویسے تو سرکار نے سب کے معاوضے چکائے مگر وہی چھ کے چار چار کے دو۔ دام کے دام کسی کو ملا۔ چلو اچھا ہے گاؤں کی بلا تو ٹلی۔ تبھی تو بے چین رہتا تھا۔ اس سال مون سون بھی خوب جم کے ہے۔ ندی میں پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور گاؤں طرف بھی کھیتوں میں مون سون کا پانی بھر گیا ہے بے خطرے کی بات نہیں ہے۔

ایک بار؟ کی چنتا ضرور کھائے جا رہی ہے۔

گھر کا ہر پیڑ کئی جگہوں سے جھکنے لگا ہے۔ اگلے سال تک تو رہیا ما بھی ٹھہر گیا تھا۔ بلیوں نے لاکر اُلٹ پلٹ دیئے ہیں۔ شاید ان کی لڑائی بہت اور خوفناک ہوتی ہے۔ آواز بھی تو بہانے ہر کمرے کی سی نکالتی ہیں۔

کوئی بات ہوئی تو سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔ اس کی بیوی تھی۔

"کیا ہے......؟"

"پہلی بڑکی نے بتایا ہے......"

"تونے کیا کہا......؟"

"ابھی نہیں......"

"اچھا رکھ دے......"

کبھی کوئی نئی چیز بنائی ہے تو بھجوا دیتی ہے۔ اچھی بڑی بہو ہے وہ۔ سنبھلی بھی ہے۔ دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ بیک میں نہیں۔ چھوٹا لڑکا بھی تو الگ ہی رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دو بوڑھی جانوں کا بھار بھی اس کے سر ہے۔ چولہا چوکا الگ ہو گیا ہے۔ بس چار سے پانچ اسے صاف نے کے بعد ہی گھر کا بٹوارہ بھی ہو جائے گا۔

اچھا ہے خوش تو ہیں ــــ

بڑا لڑکا حیکندی میں کام کرتا ہے۔ کوئی کلرک ہے شاید ــــ گن گن کر طلب لاتا ہے۔ منجھلا شہر میں چلنے والی مہنگی مہنگی گاڑیوں کا مستری ہے۔ سنتے ہیں اچھی کمائی ہے اس کی۔ اس نے تو اپنا گراج بھی کھول لیا ہے۔ اور چھوٹا ــــ اس نے بھی منیہاری کی دکان کھول رکھی ہے۔ اس کا بیاہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ آشا ہے اگلے سال ــــ

[...]ے لڑکے شہر ہی میں رہتے ہیں۔ پر سب تہوار پر [...]ے ہیں۔ بڑکا کبھی کبھار ان کے لئے ایک دو جوڑے کپڑے بھی لیتا آتا ہے۔ وہ منع بھی کرتا ہے۔ آخر ان کا اپنا بھی تو خرچ ہے۔ بڑکا کے چار اور منجھلا کے تین بچے ہیں۔ پہلے سب ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ ایک ہی چولہے پر سب کا کھانا بنتا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے کیا ہوا کہ ایک دھاگے سے ٹوٹ کر مالا کے موتیوں کی طرح سب الگ الگ ہو گئے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا ——

وہ بچپن سے دیکھتا آرہا تھا۔ پرکھوں سے بھی "اس" کے بارے میں بہت ساری کتھائیں سن چکا تھا مگر اچانک عجیب و غریب باتیں سن کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا ——

"یہ ہمارا ہے ——"

"نہیں ہمارا ہے ——"

"ہمارے پرانے گرنتھوں میں اس کی نشان ہی ہے ——"

"ہمارے پاس بھی اس کی بہت ساری شہادتیں ہیں ——"

"خبردار جو تو نے اسے اپنا کہا ——"

"اپنے حقوق پر کسی کا دخل ہم بھی برداشت نہیں کریں گے۔"

"خون کی ندی بہے گی"

"بزدل ہم بھی نہیں۔"

اچانک گاؤں کی ہوا بدلنے لگی تھی۔ جہاں ہر دھرم، ہر طبقے کے لوگ ایک دوسرے کا کاٹا کھاتے تھے اب وہاں سب کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت تھی۔ ماحول دھندلا دھندلا سا گیا۔ کچھ بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر اس دھندلکے کے پس پردہ ایک دو، تین، چار سائے نظر آرہے تھے جو سیدھے سادے گاؤں والوں کے جذبات سے کھیل کر ہم نوالہ اور ہم پیالہ بنے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ چاروں گاؤں کی معزز ہستیاں تھیں بظاہر لوگوں کے دکھ درد میں کام آنے والیں۔ ابھی کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے۔ گاؤں کی پگلی نہ جانے کس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ گاؤں والوں نے اسے گاؤں سے نکال دینا چاہا تھا مگر ان معزز ہستیوں نے انسانیت کا واسطہ دے کر اس پر رحم کرنے کی درخواست کی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ رام پور کے ہسپتال میں داخل بھی کرا دیا تھا۔ جہاں اس نے ایک حسین و جمیل بچے کو جنم دیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بچہ انہیں نیک دل لوگوں کی مہربانیوں کی بدولت میں اناتھ آشرم میں پل رہا ہے تب گاؤں والوں کی نظروں میں ان کا مان سمان کس قدر بڑھ گیا تھا۔ سب انہیں دیوتا کا اوتار ہی سمجھنے لگے تھے۔

مگر یہ کیا —— شرافت کا چوغا لگا کر ان سفید پوشوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے پورے گاؤں کی شانتی اور بھائی چارے کو داؤں پر لگا دیا تھا۔ گاؤں کے بہتیرے سیدھے سادے لوگ گمراہی کے غار میں کھو چکے تھے مگر کچھ پرانے لوگ آج بھی سچائی سے واقف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شگوفہ محض ذاتی غرض کی تکمیل کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس گاؤں کی اتہاس میں خون کے دھبے پڑ جاتے معاملہ عدالت کی شرن میں پہنچ گیا۔ گاؤں کے حقیقت اور انصاف پسند لوگوں کے ساتھ ساتھ اس نے بھی سچائی کی حمایت کی اور انجام آخر جھوٹ کو منہ کی

[illegible]
[illegible] روشنی میں آ گئے
[illegible] روشنی کے پیچھے پیچھے ہوئے جب
اندھیرے نے انہیں [illegible] اور پھر [illegible] واپس
[illegible] اور ایک نئے طریقے سے اپنا وثوق و اعتماد
[illegible] کیا۔ کس کو راتوں میں کیا پکانا ہے۔ کس
کے یہاں کون سی نئی بات ہوتی ہے۔ سب کی خبر ان کے
پاس ہوتی۔ اِدھر کی شکایت اُدھر۔ اُدھر کی تاک
جھانک اِدھر کرنا ہی ان کا نصب العین تھا اور ان
کی [illegible] فطرت کے حساب سے وہ اپنے گھر کو بھی
[illegible] سے نہیں بچا سکتا۔ تمہاری آمدنی زیادہ ہے
[illegible] تمہارا خرچ کم ہے اس کا زیادہ، جیسی گمراہ
کن [illegible] نے مالا کے موتیوں کو بکھیر کر رکھ دیا۔

ازل سے ہی انسان روشنی کی تلاش میں رہا ہے اور
[illegible] احساس نے [illegible] منزلوں کو حاصل
[illegible] ابتدا میں انسان جنگل اور پہاڑ کی گپھاؤں
میں [illegible] بسر کرتا تھا۔ چرند پرند کو دیکھ کر اس کے
[illegible] ہوا۔ جس کی پہچان ہوتی تو طرز زندگی
[illegible] اور اس نے پیڑ کی چھال
[illegible] سے خود کو ڈھکا چھپایا۔ اور جیسے
[illegible] منزلوں کو چھونا شروع
[illegible] روشنی [illegible] آ گئی اور پھر تبدیلیاں
[illegible]

[illegible]
اور اس نے ان [illegible] پر [illegible]
کہ جب وہ اندھیرے میں تھا [illegible]
تھا۔ اور یہ مخلوق اپنی جگہ مطلق [illegible]
احساسات نے اس سے سکون اور [illegible]
اور یہ چیز ہوا کے لئے روشنی کے
اور جب اس نے اپنی ذات کو [illegible]
پایا تو عوامی فلاح و بہبود کا [illegible]
اقتدار اور سماجی نظم و ضبط کا [illegible]
میں آئی۔

اور تب سے انسان ترقی کرتا [illegible]
اور آج روشنی اتنی بڑھ گئی [illegible]
اپنی قوت کھونے پر مجبور ہے۔ [illegible]
اندھیرے کا گمان ہونے لگا [illegible]
اپنے ارد گرد عدم تحفظ کا احساس
نے حقے کی آگ کو ہوا [illegible]

جو سرد پڑ چکی تھی [illegible]
راکھ کے ڈھیر کو [illegible] کیا اور [illegible]
کرنے لگا۔ کبھی کبھی اسے [illegible]
گھٹنوں کے درمیان [illegible]
[illegible] کیا سوچا [illegible]
[illegible]

کے باہر [illegible] پربت بدستور استادہ ہے۔ بچپن میں اس کے سورگ باسی بابا نے ادھر جانے کی ممانعت کی وصیت فرمائی تھی اس کے متعلق گاؤں والوں کی رائے بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا اس کا بابا ادھر جانے سے کیوں روکتا تھا۔ ایک بار اس کے گاؤں میں ایک سنت آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک بار پربت باسیوں کی وجہ سے یہ گاؤں بھیانک سنکٹ میں پڑے گا اور بھاری جان و مال کا نقصان ہوگا۔ اس کے بعد سنت چلا گیا تھا اور گاؤں والوں کے من میں اس پربت کی طرف سے میل جم گئی تھی۔ وہ خود بھی اسے کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پربت کی اوپری سطح پر جو چٹان کا بڑا سا تودہ ہے اسے پربت باسی ضرور کبھی کھسکا دیں گے جس کے نیچے اس کا پورا گاؤں دب کر ختم ہو جائے گا۔ اور اس طرح پربت باسیوں کی اس گاؤں سے پرانی دشمنی پوری ہو جائے گی۔

پھر وہ سوچتا ——

یہ پربت باسی ہوتے کیسے ہیں ——

کیا ہم انسانوں کی طرح ——

نہیں —— ہم انسان تو روشنی والے ہیں۔ اندھیرے کے مقام سے ہزاروں برس آگے نکل آئے ہیں۔

ہمارا پورا وجود روشنی کا ہے۔ اس سے روشنی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔

اگر پربت باسی ہماری طرح روشنی والے ہوتے تو ہرگز ہمارے گاؤں کا برا نہیں سوچتے۔

ہم تو ...... ہم تو روشنی کے منارہ ہیں۔

پتہ نہیں رات کا کون سا پہر ہے۔ اسے نیند نہیں آ رہی یا کہ وہ سونا ہی نہیں چاہتا۔ شاید اسے نیند نہیں آ رہی ورنہ کوئی نہ کوئی صورت آنکھ لگ ہی جاتی۔ وہ اٹھا اور برتن میں پانی لیا اور ادھر سارے کے باہر نکل گیا پورا گاؤں سویا ہوا ہے۔ ایسے میں گاؤں کا بھولاپن کتنا بڑھ گیا ہے۔ گویا پورا چاند آدھی رات اور آسمانی لحاف میں کوئی معصوم بچہ سو رہا ہے۔ دھان کے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ صرف اس کا اوپری سرا نظر آ رہا ہے۔

اسے احساس ہوا کہ اس کے پاؤں میں کچھ لگ رہا ہے۔ بعید از امکان یہاں پانی دیکھ کر اسے حیرت انتہا نہ رہی۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ پانی بڑھتا جا رہا تھا..... آگے تو اور پانی ....

ایک کربناک چیخ رات کے سینے میں اترتی چلی گئی پورا گاؤں نیند سے جاگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کہرام مچ گیا۔ لوگ بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ کوئی بچہ کو لئے ...... کوئی بوڑھی ماں کو کھینچے۔ سب کا رخ پربت کی جانب تھا اور پھر پربت پر پورا گاؤں ہی بس گیا۔ کوئی چیخ رہا ہے کوئی رو رہا ہے، کوئی چھاتی پیٹ رہا ہے، اور کوئی خاموش نگاہوں سے خوبصورت گاؤں کی جگہ نظر آ رہے صرف چھپر کی منڈیروں کو دیکھ رہا ہے جن پر مرغیاں اور دوسرے جاندار پناہ گزیں تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی اور پانیوں کی بے تحاشہ بھیڑ —— کسی نے باندھ کا آہنی گیٹ کھول دیا ہے۔

" یہ کام کس کا ہو سکتا ہے۔؟" اس نے سوچا

" کہیں پربت باسی —؟" اس کی نگاہ پربت پر بسے پورے گاؤں کا جائزہ لینے لگی۔ مگر اسے وہ دیوتا کے

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر ایک کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی)

نام کتاب :- **سرمایۂ احساس**
مصنف :- صابر آروی
سال اشاعت :- ۱۹۹۲ء ● صفحات :- ۲۸۸
سائز :- ڈیمائی ● قیمت :- ۷۰ روپے
پتہ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴
بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴
سید ناظم حسین، حسین منزل، محلہ مہادیوہ، آرا

صابر آروی کی شخصیت بحیثیت ایک خوش فکر شاعر محتاج تعارف نہیں لگ بھگ یہ ساٹھ سال کی عمر پاچکے ہیں اور چالیس برسوں سے مشق سخن جاری ہے جس کا نتیجہ یہ شعری سرمایہ بعنوان "سرمایۂ احساس" ہے۔ اپنی اس پیش کش کا انتساب انہوں نے اپنے والد سید خادم حسین مرحوم اور اپنی شریک حیات محترمہ ساجدہ کے نام کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ کہنہ مشق بزرگ شاعر و ناقد نبیرہ شاد عظیم آبادی مرحوم یعنی حضرت بہزاد فاطمی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ صابر آروی کی شخصیت اور شاعری کا عنوان لے کر ایک وقیع مضمون پروفیسر ڈاکٹر شمیم احمد کا بھی اس میں داخل ہے اور صابر صاحب کے بھائی شاکر آروی صاحب نے بھی ایک مضمون میں اپنے برادر محترم کی خانگی زندگی اور ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ خود مصنف کتاب نے بھی اپنی ایک تحریر "میرا ادبی شعوری سفر" کے عنوان سے داخل کتاب کیا ہے۔

مذکورہ بالا چاروں مضامین اپنے اپنے طور پر اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ بہزاد فاطمی صاحب نے صابر آروی صاحب کی شاعری کا ان کے اشعار کی روشنی میں ناقدانہ جائزہ لے کر ان کو ایک خوش فکر اور باصلاحیت فنکار دکھایا ہے۔ اور موصوف کے پیش نظر زیادہ تر صابر صاحب کی غزلیں ہی رہی ہیں۔ ڈاکٹر شمیم احمد صاحب نے اپنے مضمون میں ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری دونوں ہی کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ "ان کے یہاں رومانی، نیم انقلابی موضوعات بھی ہیں اور کلاسیکی [illegible]

... مجموعے میں نظموں کی مجموعی تعداد سنتیس ہے۔ اور ... میں امن، سنگل دیپ، منتشر دور حیات، عکس فردا، دعوت، حیو رنگی کی ایک شام، سراب زلیست، جنگ، کی حیثیت سانیٹوں کی ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں قطعات و رباعیات ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۲۶ ہے ان میں ۲۴ رباعیاں اور قطعات صرف دو ہیں۔

صابر آروی کا ادبی سفر ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے اس وقت وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اور ان دنوں پٹنہ میں موجودہ صدر بہار ودھان سبھا جناب غلام سرور کی سرکردگی میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ایک انجمن "حلقۂ احباب نوجوان" کے نام سے قائم تھی۔ جس کے جلسے کم و بیش ہر ہفتہ میٹنگ ہوٹل یا اسلامیہ ہال کے کسی گوشے میں ہوتے تھے۔ بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو انہیں نوجوانوں میں سے کچھ حضرات مثلاً نوشاد نوری، یونس رمزی مرحوم، ادم بلخی، مقبول سلیم وغیرہ نے قائم کی۔ اس مجموعے میں اس عہد کی بھی تخلیقات ہیں اور اول تا آخر آپ پوری کتاب کا مطالعہ کریں گے تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ یہ کتاب صاحب کتاب کے فکر و فن کا تدریجی ارتقا دکھلانے والی ایک تصنیف ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ حسب ذیل نتیجہ برآمد کرتا ہے۔

شاعر کے فکر و فن میں شروع ہی سے سبک روی رہی ہے اور ترقی پسند تحریک کے پرآشوب دور میں بھی ترقی پسندی کا علمبردار ہونے کے باوجود شورش اور کھلی نعرے بازی سے اس کا کلام مبرّا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس ماحول میں انہوں نے ہوش سنبھالا وہ خالص ادبی تھا۔ اور جو شہر ان کا وطن ہے وہ بقول ش۔م۔ عارف آروی "شہر سخن" ہے۔ شعر و شاعری کا جو کارواں فی الحال صابر آروی تک پہنچا وہ صفیر بلگرامی، بعد آروی اور صابر صاحب کے والد مرحوم خادم آروی سے ہوتا ہوا پہنچا ہے۔ اور ترقی پسند تحریک کے جس معروف شاعر پرویز شاہدی مرحوم سے صابر آروی متاثر ہوئے وہ بھی شہر آروی سے ہوتے ہوئے اپنا سلسلہ اسی کڑی سے رکھتا ہے۔ جو آگے بڑھ کر میر امان علی سحر سے ہوتا ہوا شیخ امام بخش ناسخ تک پہنچتا ہے۔

چنانچہ کلاسیکیت کا دامن صابر آروی کسی طرح چھوڑ سکتے تھے۔ اپنے عہد کے نمائندہ ہونے کے باوجود وہ عصری شعور سے تو مبرا نہیں رہے لیکن ماضی کی قدروں کو بھی سمیٹنے کے لئے کوشاں رہے۔

نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ صابر آروی کی شاعری عصری حسیت و شعور اور کلاسیکی اقدار کا ایک حسین سنگم بن گئی ہے۔

ترقی پسند تحریک کا زور رفتہ رفتہ گھٹتا گیا اور اس کی جگہ جدیدیت نے لے لی۔ مبہم علامت نگاری کا دور شروع ہوا نئے ڈکشن کی جستجو میں جدید شعرا سفر پر کمربستہ ہوئے اور اس دور میں بھی جو ۱۹۶۰ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اردو شاعری، پراگندگی کا شکار ہوئی۔ صابر آروی نے جذباتی طور پر اس تحریک کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کی علمبردار وہ شاعری جو کبھی کبھی چوں چوں کا مربہ بن گئی ہے اس کی طرف صابر کا فن نہیں جھکا۔ اس مجموعے میں بعنوان خدا کے فضل کے نام ایک نظم ضرور ہے۔ لیکن کلام صابر میں کہیں بھی بہت جذباتی شعر کہنا ایسا کہاں مشکل ہے کر نہیں سکا۔

سے محبت کو جو تیج میں لئے ٹھرا کھڑا رہا
کھڑکی کا پردہ کھینچ دیا رات ہو گئی

اس مجموعہ میں جو مقدمہ اور تقریظیں ہیں ان کی
ی میں صابر آروی ایک کامیاب نظم نگار اور غزل
گوں ثابت ہوتے ہیں۔ نظموں کی کئی نوعیتیں ہیں۔
صاحب نے انکی رومانی شاعری کو نیم رومانی کہا
لیکن سچ پوچھئے تو ان کی ویسی رومانی شاعری
ن کے عہد شباب سے تعلق رکھتی ہے۔ خالص
نی مواد رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم
س کالج، تصویر، انتظار کی، لگن، حسن فسردہ،
نقش حسین، جشن بہاراں، مدھر کامنا، منگل دیپ
، ہمسفر وغیرہ۔

ترقی پسندی سے متاثر ہو کر جو نظمیں انہوں نے
ہیں ان میں نور سحر دور نہیں، سکوں کی بزم میں
تر پہنچ ہی گیا۔ امن، جنگ، سراب زیست،
نے، دامن دل نذر کریں، دست ساقی سے پھر ایک جام
باز کی موت پر) ساعت آخری شب، امن کا پیامی،
ش کلامی (پرویز شاہدی مرحوم کو خراج عقیدت،
نداں (فیض اور سجاد ظہیر کی گرفتاری سے متاثر ہو کر)
ایسی نظمیں ہیں جو ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے
یجے میں ملبوس عن ہوئیں۔ ان نظموں کے علاوہ
نظمیں ہیں جو شخصیات یا کسی مقام کی اہمیت سے
ہو کر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً کل اور آج (جلال چالوی کے
آشنا اور عزا آشنا (عید کے موقع پر) تسخیر الورسٹ
اور تنزنگ کے نام ایچ کالج (پروفیسر
الحق سے متعلق دو اہم نظم) نذر غالب، کون
عصمت صفی احمد کے نکاح کے موقع پر) جان

انجمن ہی نہیں (مولانا آزاد کی موت سے متاثر ہو کر)
احوال جنوں (لندن میں مقیم سراج کھلاڑی کے نام)
فضل حق آزاد کو خراج عقیدت پیش کرنے والی نظم،
اختر اورینوی سے متعلق دو نظمیں جنبش نوک قلم،
نذر جشن اختر، پھول یونہی کھلے (عزیز سنبلی کی سالگرہ
کے موقع پر) نذر جمیل (جمیل مظہری سے متعلق)، قاضی
عبدالودود کی رحلت پر کہی گئی نظم نذرانۂ عقیدت،
نذر خدا بخش خاں، شاہد رام نگری کی موت سے
متاثر ہو کر کہی گئی نظم نذرانۂ عقیدت، عصمت چغتائی
کی موت سے متاثر ہو کر کہی گئی نظم حقائق کی داستان
گو، نظم رضا اشک کے نام، نذر دوست، وغیرہ۔

صابر آروی کی نظم نگاری کا اجمالی جائزہ
جب ہم لیتے ہیں تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی کوئی
بھی نظم بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔ اس کی طوالت
اوسط درجہ کی ہے۔ اور کچھ نظمیں تو ایسی ہیں۔ جن کو
مختصر ہی ہم کہیں گے۔ نظم میں مواد کی پیشکش کامیاب
اسی وقت ہوگی جبکہ اول تا آخر اس میں تنظیم ہو۔
اسی تنظیم پر اول تا آخر ارتقائی تسلسل قائم رہتا ہے
اور نظم اختتامی حصہ میں قاری کو تاثیر مہیا کرتی
ہے۔ صابر آروی کی بیشتر نظموں میں یہ خوبیاں
موجود ہیں اور نظم جس قدر مختصر ہے۔ ایسی خوبیاں
اس میں بدرجہ اتم ہیں۔

اس میں لگ بھگ صابر کے دس عدد سانٹ
بھی ہیں۔ یہ ایک مغربی صنف شاعری ہے اور مغرب
سے اس کے تین قسمیں ہمارے یہاں داخل ہوئی ہیں۔
ایک وہ سانٹ جو پیٹرارکی کہلاتی ہے۔ دوسرا وہ سانٹ
جو اسپنسری کہلاتا ہے۔ تیسرا وہ سانٹ جو شیکسپیری

کہلاتا ہے۔ جب اردو ادب میں یہ صنف داخل ہوئی تو اختر شیرانی نے ایک نیا پیٹرن دیا۔ چنانچہ اس پیٹرن کو ڈاکٹر حنیف کیفی نے شیرانوی پیٹرن سے گردانا۔ سانٹ کے کامیاب شاعروں میں زیادہ نہیں۔ ان میں ن م راشد، اختر شیرانی، حنیف کیفی، عزیز تمنائی، نریش کمار شاد، اختر الایمان، عظیم الدین احمد وغیرہ زیادہ مشہور ہوئے۔ عظیم احمد سچ پوچھئے تو اردو کے وہ سانٹ نگار گذرے ہیں جنہوں نے اس صنف سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔ اس لئے کہ بزم نگار کلکتہ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں سب سے پہلے انکا ایک سانیٹ بعنوان "فریاد عظیم" آیا۔ عظیم صاحب مرحوم نے تینوں ہی مشہور پیٹرنوں پر کامیاب طبع آزمائی کی۔ ان تین مواضعوں کے سانیٹ اچھی خاصی تعداد میں ان کے مجموعہ کلام "گل نغمہ" میں موجود ہیں۔ اس طرح صوبہ بہار کا اردو سانیٹ نگاری میں شروع ہی سے بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ عظیم صاحب کے بعد کلیم الدین احمد مرحوم، پروفیسر اختر قادری مرحوم، ولی الرحمٰن مرحوم، معصوم شیر گھاٹوی، احمد عظیم آبادی، صابر آروی اور یہ خاکسار نے اس صنف سے دلچسپی لی، جس کے نتیجہ میں اس نے "چودہ طبق" سو سے زائد سانیٹ کا مجموعہ ذرا اور آغازِ سحر، ذوق سفر میں بھی اس کے لگ بھگ پچیس(۲۵) سانیٹ ہیں۔ سرمایہ احساس پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ سانیٹ نگاری کی بھرپور صلاحیت تو صابر آروی میں موجود ہے لیکن انہوں نے خصوصی دھیان اس صنف کی طرف نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پیٹرارکی اور اسپنسری پیٹرنوں کا کوئی سانیٹ نہیں ہے۔ لیکن جو سانیٹ اس مجموعے میں ہیں وہ بڑے ہی شگفتہ ہیں۔ ان کے نام اوپر درج کئے جا چکے ہیں۔ ان کے سانیٹ میں آخری دو مصرعے جو کپلٹ کی حیثیت رکھتے ہیں بڑے ہی شگفتہ اور موثر ہوتے ہیں۔ مثال میں سراب زیست کا کپلٹ ملاحظہ کیجئے ؎

آج تاریکیٔ شب ہے تو سحر کل ہوگی
زندگی پھول کے سیجوں پہ بسر کل ہوگی

اس مجموعے کے آخر میں قطعات و رباعیات ہیں۔ قطعات تو صرف دو عدد ہیں لیکن رباعیاں زیادہ ہیں۔ اور زیادہ تر رباعیاں نہایت ہی شگفتہ اور موثر ہیں۔ صابر آروی فطرتاً شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں آمد زیادہ اور آورد کم۔ آپ محسوس کریں گے اور بہت غور کیجئے گا تو ایسا احساس ہوگا کہ کلام صابر میں جگہ جگہ آورد پر آمد کا غلبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عروضی اور رموز و نکات سے بہت زیادہ واقف نہ ہونے کے باوجود ان کے یہاں عروضی لغزشیں آپ نہیں محسوس کریں گے۔

"سرمایۂ احساس" سے تعلق رکھنے والی رباعیاں ہیں۔ رباعی جس کی اپنی مخصوص بحریں ہوتی ہیں جو سب کی بحر ہزج سالم سے نکلی ہیں۔ ان بحروں میں ۲۴ کو مخصوص کر دیا گیا ہے اور ان ۲۴ بحروں کو دو دائروں اخرب اور اخرم میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ صابر آروی کی رباعیاں دونوں دائروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ فراق گورکھپوری کی طرح ماہر کی رباعیوں میں عروضی جیسی لغزشیں نہیں ہیں جن سے روشناس ہوتے ہی ڈاکٹر گیان چند جین کو فراق کی عروضی لغزشوں پر ایک مضمون لکھنے کی ضرورت پڑی۔ سچ تو یہ کہوں گا کہ ماہر آروی رباعی گوئی کی طرف خصوصی دھیان دیں تو

وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر پنشن یافتہ ہو چکے ہیں۔ ان
کے پاس موقع ہے کہ وہ ایک رباعی کا مجموعہ اپنی فطری صلاحیتوں
اور افتاد طبع سے کام لے کر اردو شاعری کو ضرور دیں۔

صابر آروی کی شاعری کا "سرمایۂ احساس" کی
روشنی میں اجمالی جائزہ لینے کے نتیجے میں ہم یہ پاتے ہیں کہ ان
کے فکری دائرے محدود نہیں۔ گھر، گھر سے باہر قریہ،
شہر، پورے ملک سے آگے سارے عالم کو سمیٹے ہوئے
ہے۔ اس طرح کی تخلیقیں اس مجموعے میں اداسی ہے۔ ان
ا تخلیق افروز صلاحیت اور وسعت انشاء اللہ تعالیٰ
ائے گی۔

توقع ہے کہ "سرمایۂ احساس" کے بعد وہ
یک ایسا شعری مجموعہ اردو شاعری کو دیں گے جو انہیں
ام آفاقیت سے ہمکنار کرے گا امید ایسی ہی ہے۔ اس
ے کہ وہ غم یار کو غم دوراں بنانے کے قائل ہو چکے ہیں۔
بس نے انہیں تخلیق افروز بشارت دی ہے۔ اور ایسا
عر ان سے کہلوایا ہے ؎

اے غم زیست ترا ساتھ غنیمت ہے مجھے
ورنہ اب صرف غم یار میں کیا رکھا ہے

توقع ہے کہ یہ شعری مجموعہ قدر کی نگاہ سے دیکھا
جائے گا اور اس کی مدحت سرائی بھی ہوگی۔

● نادم بلخی

(بقیہ ۔ پریم چند)

پیش کیا ہے۔ اور گوبر کو نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کے نمائندہ کے طور پر
بر کے مزاج میں نہ صرف بغاوت ہے بلکہ وہ گاؤں کے مقابلے میں شہر کو
سند کرتا ہے۔ شہر نئی صنعتی تہذیب کی علامت ہے اور گاؤں پرانی جاگیردارانہ
تہذیب کی۔ گوبر کا دیہات سے شہر کو جانا نئی ابھرتی تہذیب کی
رف منتقلی کی علامت ہے۔

احساسات رؤف جاوید کے یہاں ملتی ہیں۔ رؤف جاوید
کی آواز صرف لاشعور چیخ نہیں۔ ایسے ہیجان اور سمجھی
جا سکتی ہے صاف اور نمایاں ہے واضح اور نمایاں
ہے۔ رؤف جاوید نے جو اسلوب سخن اپنایا، وہاں سے
جدید تر اسالیب سخن سے بھی اتفاق کیا۔ بہرحال رؤف
جاوید ان شاعروں میں سے ہیں جن سے مستقبل میں کافی امیدیں
وابستہ ہیں۔ سوالوں کی بوچھار سے کچھ اشعار درج
کر رہا ہوں !!

جس نے کاندھوں پہ کبھی خود کو اٹھایا ہوگا
اس نے جیون کو بڑے پاس سے دیکھا ہوگا

گریں کبھی خون کا پانی تو پھر بھی کیا ہوگا
دلوں کی آہ سے پتھر پگھل نہیں سکتے

ملے جو راہ میں اپنا اسے بناتے رہو
ہمیشہ ملنسار رہے ہاتھ یوں ملاتے رہو

سارے حصار توڑ کے باہر نکل کے دیکھ
دنیا بہت بڑی ہے کہیں اور چل کے دیکھ

آنے والا ہے شاید کوئی انقلاب
ہر طرف سے سوالوں کی بوچھار ہے

کاغذ، کتابت، طباعت ہر لحاظ سے یہ مجموعہ معیاری ہے
مجھے یقین ہے کہ سوالوں کی بوچھار قبولیت کی سند حاصل
کرے گا۔

● اظہر نیر

سوالوں کی بوچھار

شاعر: رؤف جاوید
نوعیت: مجموعہ کلام
صفحات: [illegible] قیمت: ۲۰ روپے
پتہ: سیفی لائبریری، سورگنج، دولیشا، مدھیہ پردیش ۴۲۳۸
(۲) اجنتا آرٹ لیتھو پریس عنبالکی کوٹ نمبرا لشکر، گوالیار (ایم پی)

شعروادب نہایت سنجیدہ اور لطیف فن ہے اور یہ فن اتنی عظیم طاقت رکھتا ہے کہ اگر یہ صحیح نظریہ حیات کے تحت اپنا عمل دکھائے تو بگڑے سے بگڑے سماج کے لئے بناؤ کا ذریعہ بن کر تاریخ انسانی میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر فنکار کا شعور صالح ہے تو وہ غزل کے نازک و جاذب نظر خد و خال کو مجروح کئے بغیر بڑی حد تک زندگی کے مختلف شعبوں کی موثر آئینہ داری کر سکتا ہے۔ وہ لوگ قابل ذکر ہیں جنہوں نے صحت مند، جدت، خوش آئند تجربات ومشاہدات سے شعروادب کی کشادہ کر رہے ہیں۔ ان شعراء میں ایک نام رؤف جاوید کا بھی ہے، "سوالوں کی بوچھار" رؤف جاوید کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اپنے تخلیقی سفر میں رؤف جاوید نے عصری اور تجدیدی الفاظ وافکار کو برتنے کے مرحلے میں بے خیال وافکار میں ایک نئی روشنی آئی ہے۔ "سوالوں کی بوچھار" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ رؤف جاوید کی شاعری میں موضوع، مواد، فکروخیال، جذبہ، احساس، علامت، اشاریت، جدوجہد ناکامی امید، تشبیہ، استعارہ کی تازہ کاری اور جدت طرازی بھی ہے۔ رؤف جاوید کی شاعری کو پرکھتے ہیں تو ہمیں کسی طرح کی مایوسی نہیں ہوتی بلکہ غزل کا یہ شعر ہمیں ان کی شاعری کے مطالعہ کرنے کی طرف رجوع کرتا ہے۔

ایک آنکھ اپنے ذہن میں پیدا کرو جناب
کچھ اور صاف وقت کا چہرہ دکھائی دے

شاعر کو اگر انسانی عظمت کا احساس و ذہن میں پیدا کرنے والی آن و بان، خلوص کی گرمی پیدا نہ ہو، شاعر کے لئے موجودہ سماج ظلمت شب سے کم نہیں! اس کے پاس ایسی تحریک ہے جو سورج کے کرن جیسی ہے جس سے اندھیرے چھٹیں گے روشنی پھوٹے گی۔

وہ ایک شخص جو مجھ میں شریک ہے اب تک
وہ دیکھتا ہے ہمیشہ گھٹا بڑھا کے مجھے

ہر شب سمندروں میں اترتے رہے ہیں ہم
ہر صبح کرنوں جیسے بکھرتے رہے ہیں ہم

ہر ایک شخص ہی بے حس دکھائی دیتا ہے
عجیب شہر ہے کس کس سے اب لڑا جائے

مشہور نقاد و شاعر ڈاکٹر عنوان چشتی، سوالوں کی بوچھار، پر حرف آغاز کے تحت اظہار خیال کیا ہے — "سوالوں کی بوچھار" ایک ایسے شخص کے شعری تجربوں کی دستاویز ہے جو زندگی کے خارزاروں میں اپنے وجود کی بقا کے لئے زخم کھاتا اور مسکراتا ہوا گامزن ہے۔

رؤف جاوید نے روایتی غزلوں اور ان کے فکرو آہنگ سے ہٹ کر جب وجودیت کی راہ اپنائی تو انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے۔ ان کے فکر میں اپنا پن، جدت اور وسعت نظر آتی ہے دور حاضر کے جدید ترین شعراء کے یہاں عام طور پر جو خیالات و احساسات کی رنگا رنگی اور نظر محسوس ہوتی ہیں وہی

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سہسرامی ٭ بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریسی سہسرامی

ماہنامہ سہیل گیا

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد محسن
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

جوائنٹ ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، نعمان عزیزی

• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

شمارہ ۱۲ جلد ۵۲

٭ فہرست ٭

بدلِ اشتراک

فی شمارہ ---- ۵/- روپے
زرِ سالانہ ---- ۵۰/- روپے
لائف ممبری ---- ۱۰۰۰/- روپے

٭ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ٭

ماہنامہ سہیل گیا
ریلوے سائڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر - ۲۱۵۷۳

درخت لگائیں ـ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے زیادہ اشرف المخلوقات اور عقل مند مخلوق ہے
اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض اولین ہے ـ

(۲) یہ اس کا پورا فرض ہے کہ اس کے حاصل شدہ ذرائع کا استعمال پورے ویدک سے کریں ـ

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقہ سے نہیں کرتے ہوئے
اس کی حفاظت آنے والی نسل کیلئے کریں ـ

(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہتر لائحہ عمل ہے ۔ اس سے فرار نقصان دہ ہوگی ـ

(۵) بارش اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے ۔ ماحولیات اتنا ۔
پراگندہ ہو جائے گا کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا ـ

(۶) سرزمین کا وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات
اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے ـ

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی اس سرزمین پر
پہلے ہوئی تھی ۔ انہوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے جس سے
انسان کا اس سرزمین پر افزائش ہوئی ۔ آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے ـ

(۸) درخت لگائیے ـــــ جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں
اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں

جاری کردہ :ـ محکمۂ جنگلات و ماحولیات ، بہار

P.R.NO 188D (INF - 102) 92-93

نوٹ

یہ کیا ہو رہا ہے ؟
یہ کیوں ہو رہا ہے ؟

ہندوستان میں بڑھتی ہوئی عصبیت کا پورا منظر نامہ آپ کے سامنے ہے۔ آزادی کے بعد سے آج تک ترقی پسند طاقتوں کی کوشش رہی ہے کہ ملک سے فرقہ واریت کی فضا کو ختم کیا جائے مگر ہمیں کھلے دل سے اس امر کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہمیں اتنے برسوں میں جو کامیابی ملنی چاہئے تھی وہ نہیں مل پائی ہے ——— اس کی سب سے بڑی اور روشن وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان پر سب سے زیادہ طویل عرصے تک حکومت کرنے والی سیاسی جماعت یعنی کانگریس کا رویہ اس سلسلے میں واضح طور پر منافقانہ رہا ہے۔ اس نے ایک طرف اپنے منشور میں سیکولرزم پر یقین کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف ووٹوں کی سیاست میں پڑ کر عملی طور پر وہی کچھ کیا ہے جو رجعت پرست، تخریب کار اور احیا پرست سیاسی جماعتیں کرتی رہی ہیں۔ اس دوہری پالیسی نے ہندوستان کے عوام کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں یہ فیصلہ کرنا بسا اوقات دشوار ہو گیا تھا کہ اس صاحب اقتدار سیاسی جماعت کا انداز فکر کیا ہے۔

لیکن حالات رفتہ رفتہ حقائق کو بے نقاب کرتے جا رہے ہیں۔ آج پانی کانگریس کے سر سے بھی اونچا بہنے لگا ہے اور اسے یہ اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ اگر اب بھی صحیح راستہ نہیں اپنایا گیا تو ملک کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی جماعت بھی غرقاب ہو جائے گی۔ ہوتا کیا ہے کہ بہت عرصے تک منفی اور غلط کار رویہ اپنانے والے اچانک صحیح کام کرنا بھی چاہیں تو اپنی پرانی عادت کے خلاف کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں، آج کانگریس بھی اسی ذہنی انتشار کی شکار ہے۔

ہم سب یہ جانتے ہیں کہ اجودھیا کے نہایت غیر اہم، دبے دبائے اور خاموش معاملے کو ہندوستان میں ایک اہم ترین مسئلے کی طرح پیش کرنے کی ساری ذمہ داری کانگریس پر ہے۔ مسجد کا مقفل تالا کانگریس نے کھلوایا، اس کے صحن میں مورتیاں اس کے ایما سے رکھی گئیں، شیلانیاس اسی نے کرائی ۔۔۔ یہ سب اس جماعت نے اپنے ووٹوں کو اکٹھا کرنے کی غرض سے کیا تھا لیکن اسے شاید اس کی خبر نہیں تھی کہ ان سارے اقدامات کا کریڈٹ بالآخر بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کو چلا جائے گا ۔۔۔ اور یہی ہوا۔

اب کیا نقشہ ہے ۔۔۔ مذہبی بخار اور جنون میں مبتلا کر کے کانگریس، بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور دوسری رجعت پرست جماعتوں نے عوام کو بری طرح گمراہ کرنا چاہا ہے، اب وہ وقت آگیا ہے کہ ملک کی سالمیت، اس کی بین الاقوامی ساکھ، اس کی معیشت، امن و امان، عالمی برادری سے اس کا رابطہ ۔۔۔ یہ سب کچھ داؤ پر چڑھا ہوا ہے۔

شاید عصبیت کے دیو استبداد کو کچلنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اگر آج بھی ارباب اقتدار نہیں سنبھلے، اگر اب بھی انہوں نے وقتی فائدے، مصلحت بینی یا خوف و خطر کی وجہ سے ملک کو تہس نہس کرنے والی قوتوں کو مسمار نہیں کیا تو پھر وہ دن دور نہیں جب ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور اہل وطن کی معیشت و معاشرت برباد ہو جائے گی۔

اجودھیا کے حالیہ سانحے کے بعد بظاہر مرکزی حکومت تخریب کار قوتوں سے لڑنے کے لئے کچھ اعلانات کر رہی ہے، ہلکے پھلکے عملی اقدامات بھی کر رہی ہے لیکن یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے رویے میں خلوص کو دخل ہے اور جب تک نظریاتی طور پر یقین و اعتماد نہ ہو اس وقت تک کوئی دیرپا اور کارگر نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ کانگریس جو آج کر رہی ہے وہ اسے بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔ رجعت پرستی اور تخریب کاری کے جس آدم خور درخت کی پرورش کانگریس آج تک کرتی رہی ہے اب اس کی تخریبوں سے اپنے بچنا خود کانگریس کے بس میں بھی نہیں رہا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سبھی مذہبوں، فرقوں، طبقوں اور ذاتوں کے تمام سیکولر، جمہوری، امن پسند اور محب وطن لوگ متحد ہو کر فرقہ وارانہ طاقتوں کی خطرناک سازش کا مقابلہ کریں اور ملک کو خطرے سے نجات دلائیں۔

ارباب اقتدار کو اس امر میں اپنا ذہن صاف کر لینا چاہئے کہ اب کھلے طور پر POLARISATION کا وقت آ پہنچا ہے۔ اب دھند، بے یقینی، دو عملے اور سستی حکمت عملی ایک ایسے کھڈ میں پہنچا دے گی جہاں سے سنبھلنے اور کھڑے ہونے کا وقت کبھی نہیں مل پائے گا ۔۔۔

● مسعود منظر

محمد حسن

ہم عصر اردو تنقید

تنقید تخلیقی ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش ہے۔ معاصر تنقید میں یہ کوشش کئی جہتوں سے کی جا رہی ہے۔ تخلیقی فن پارہ ادبی روایت کا عنصر بھی ہوتا ہے اور عصری تجربہ کا جزو بھی۔ اس کے پیرایۂ اظہار میں فن کی رمزیت اور خیال کی ندرت مل کر ایک دل کش آمیزے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ظاہر سب سے پہلی کوشش تخلیقی فن پارے کا مفہوم سمجھنے اور اس کے کیفیت پہچاننے یا اس کی کیفیات کے تجزیے کی ہوتی ہے پرانا انداز یہ تھا کہ زبان و بیان کی غلطیوں پر حرف زنی کی جائے اور اسلوب بیان اور پیرائیہ اظہار کا موازنہ مسلمہ اساتذہ فن کے تخلیقات سے کر لیا جائے اور اس میزان پر ہم عصر ادب کو پرکھ لیا جائے علم بیان و بدیع کے ماہرین اچھے ادب کی جو کسوٹیاں مقرر کی ہیں ان پر فن پارے کو کسا جائے اس قسم کی تنقید میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ تنقید محض جزئی اور کسی قدر سرسری اور سطحی معاملات میں الجھ کر رہ جاتی ہے کہ ادب کے جمالیاتی اور فکری پہلوؤں پر توجہ نہیں ہو پاتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تنقید خواہ وہ کسی زاویے اور کسی مرتبے کی کیوں نہ ہو زبان و بیان کی غلطیوں کو نظر انداز کر سکتی ہے۔ علم بیان و بدیع کے کم سے کم بنیادی اصول سے روگردانی روا نہیں رکھی جا سکتیں۔ لیکن عروض، بیان اور بدیع کے علوم کے اصولوں پر اترنا ہی اعلیٰ ادب کا معیار نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ کبھی تو ماورائے سخن بھی ہے اک بات اور اس بات کو جمالیاتی کیف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جمالیاتی کیف کا تجزیہ مختلف نقاد مختلف طور طریقوں سے کرتے آئے ہیں لیکن ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جمالیاتی کیف دراصل ادب کے باطنی آہنگ یا توازن اور تناسب سے پیدا ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں ہر فن پارے کا حسن اس کی باطنی ہیئت میں پوشیدہ ہوتا ہے اور یہ باطنی ہیئت جس قدر زیادہ متناسب، متوازن اور مختلف النوع عناصر کے درمیان ایک نازک ہم آہنگی کا نتیجہ ہوگی اس

اس قدر اس میں فن پارے میں زیادہ دل کشی ہوگی. ہیئت پسندانہ تنقید کا کوئی ایک دبستان نہیں ہے طرزِ تنقید میں طرح طرح کے اسالیب موجود ہیں بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ادب بھی محض آوازوں اور رنگوں کا مجموعہ ہے اور وہ اپنے صوتی آہنگ اور تلازموں کے ذریعے آوازوں کی نئی معنویت کی آہنگ تاثیں دریافت کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے ادب ہر قسم کی ترسیل و ابلاغ سے آزاد ہے بلکہ نئے قسم کی ترسیل و ابلاغ کی تلاش سے عبارت ہے اس طرزِ فکر کے نقادوں کے نزدیک ایک تنقید کا سارا دائرہ ادب پارے کے متن تک محدود رہنا چاہئے اور متن کے علاوہ دوسرے مباحث اور مسائل تنقید کے دائرے میں شامل نہیں ہونے چاہئیں.

یہ طرزِ تنقید زیادہ تر شاعری تک محدود ہے اور شاعری میں نظم کے بھی الفاظ، اصوات اور آہنگ تک کیونکہ ان کے نزدیک نظم کا مطالعہ کرتے وقت نظم کے زمانے یا شاعر کے احوال و افکار یا اس کی شاعری کے فکری اور سماجی محرکات وغیرہ تذکرہ تنقید کے دائرے سے خارج ہے بلکہ تنقیدی مباحث صرف متن تک محدود رہنے چاہئیں. الفاظ کی صوتی ترتیب، آہنگ، ان کی رمزیت اور تلازمات اور ان سب سے مل کر بنتی ہوئی شعری ہیئت اور اس ہیئت سے پیدا ہونے والی جمالیاتی کیفیات پر بھی نقاد کو پوری توجہ مرکوز رکھنی چاہئیے۔ اس طرزِ تنقید کی افادیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے کم سے کم شاعری کے پیرائیہ اظہار اور الفاظ کے دروبست اور الفاظ اور تراکیب کے باہمی ترتیب و تعلق کا نیا عرفان حاصل ہوتا ہے لیکن اس طرزِ تنقید سے شاعری وسیع تر ادبی و تہذیبی سیاق و سباق سے کٹ کر رہ جاتی ہے طرزِ تنقید ادبی پیرائیہ اظہار میں تبدیلیوں کا کوئی معقول جواب فراہم نہیں کرتا اور جہاں انفرادی نظموں یا ادب پاروں کے مطالعے کے سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے وہاں ان انفرادی کاوشوں کے پیچھے کارفرما وسیع تر تاریخی اور عمرانی عوامل کی نشاندہی سے قاصر رہتا ہے.

اس کے بعد وہ تنقیدی کوششیں ہیں جو ادب کو محض پیرائیہ اظہار یا الفاظ، اصوات اور الوان کی رنگ برنگی ترتیب سمجھنے کے بجائے یا اس کے ساتھ ساتھ ادب کو محض اقدار اور خیالات کا مجموعہ جانتی ہے یہ خیالات اور اقدار پوری معاشرت اور تہذیب کے پروردہ ہوتے ہیں اور ان خیالات کے پیچھے سماجی عوامل، اقتصادی محرکات اور تہذیبی حالات کی دھوپ چھاؤں دیکھتے ہیں اس اعتبار سے ادب کی تنقید کے رشتے تہذیبوں کی پیدا کردہ تصورات تک پھیل جاتے ہیں۔ اور تنقید ادب اور زندگی کے درمیان ایک باشعور اور حساس مبصر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ دورِ حاضر میں یہ بھی تنقیدی رویے نظر آتے ہیں۔

دراصل ادب کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کو پہچاننے کے لئے کئی طریقِ کار اور کئی رویئے درکار ہیں شاید ان سب رویوں کو مجموعی طور پر برتنے کے بعد ہی ادب کی تفہیم اور تجزیہ ممکن ہے کچھ لوگ ادب کا رشتہ زندگی سے ملاتے ہیں کچھ اسے الگ قلم و مان کر ادب کے اپنے آئین و ضوابط دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کچھ ادب کو محض خیال کے آئینے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو کچھ اسے محض آوازوں یا رنگوں کی کرشمہ سازی جانتے ہیں بہرحال آج ادب کو سمجھنے کی کوشش کئی طرح سے ہو رہی ہیں ان میں بعض محض رائے زنی بن کر رہ جاتی ہیں اور کچھ دیر گرمیِ محفل کا سبب بن کر گمنامی میں ڈوب جاتی ہیں۔

سب سے پہلے شاید ان قد آور شخصیتوں کا ذکر ضروری ہے جو عہد جدید کے تنقیدی مزاج کی تشکیل کرتی آئی ہیں ان میں کلیم الدین احمد کا نام سر فہرست ہے جنہوں نے گو حال میں کوئی تنقیدی تصنیف شائع نہیں کی ہے مگر عملی تنقید چند سال پہلے شائع کرکے اردو تنقید کو نیا رُخ دیا اس سے قبل میراجی نے ادبی دنیا " میں اس نظم میں " کے عنوان سے اس قسم کی عملی تنقید کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ کلیم الدین احمد نے اس کے دائرہ بحث کو وسیع تر کیا اور مختلف شاعروں کی تخلیقات کو اصولی نقطۂ نظر سے جانچنے پرکھنے کی کوشش کی۔ کلیم احمد کا رویہ عام طور پر ہیئت پرستانہ ہے اور ان کی تنقید کافی حد تک شاعری میں (خواہ نظم یا غزل) ایک شعری ہیئت یا پیکر کی تلاش پر زور دیتی ہے ان کا عام رویہ کلاسیکی معیار کو سند مان کر ادب کی پرکھ کے اصول و ضوابط وضع کرتا ہے۔ اور شعری تخلیق کی مرکزیت پر اصرار کرتا ہے اس اعتبار سے ان کی تنقید شعری تخلیقات میں تجربے اور ندرت کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتی اور شعریت کا ایک مخصوص کلاسیکی تصور متعین کرنے کے بعد اس کے بے لاگ حکیمانہ اطلاق کو لازمی گردانتی ہے۔ وہ شاعری میں " پختہ کاری " خلوص، جوش اور سنجیدگی " کی تلاش کرتے ہیں لیکن نظم ہو یا غزل دونوں میں سڈول پن اور سجل پیکر تراشی کو اہم جانتے ہیں۔

" اپنی تلاش میں " وہ اپنے تنقیدی نظریے کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

" اس زمانے میں (اپنے دور شباب میں ۔ م ۔ ح) شاعری میں جو دلچسپی ہوتی ہے وہ زیادہ تر لفظی ہوتی ہے۔ لفظوں میں جادو سا محسوس ہوتا ہے جن میں ایک نامعلوم کشش ہوتی ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے نئے نئے الفاظ نئی نئی بندشیں " نیا اسلوب " نئے تصورات سے تخیل مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں اصل شاعری سمجھ لگتا ہے ایسا ہونا ناگزیر ہے اور برا بھی نہیں۔ آخر شعر لفظوں سے بنتا ہے اس لئے لفظوں سے دلچسپی ضروری ہے البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دلچسپی صرف لفظی نہ رہ جائے اور یہ دلچسپی لفظی نہ تھی۔ حسرت، فانی، اصغر کی غزلیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مجھے " کچھ اور " کی بھی تلاش تھی۔ یہ میں نہیں کہتا کہ اس وقت میرا کوئی واضح تنقیدی شعور یا نقطۂ نظر جس کا نتیجہ " اردو شاعری پر ایک نظر " لیکن کچھ شعور دھندلا سا ہی تھا لیکن کچھ تمیز مبہم سی سہی تھی "

" اپنی تلاش میں " صفحہ ۲۲۰ ۔

یہ صرف دور شباب ہی کا حال نہیں ہے اس دور میں بھی کلیم الدین احمد کی تنقید ربط اور تسلسل کو قدر اول گردانتی ہے ۔ ان کے نزدیک شعری پیکر میں ایک بت تراشوں کی تخلیق کا تناسب اور آہنگ ملنا چاہئے اور یہ تناسب جتنے زیادہ اور جتنے مختلف النوع اجزا سے ترتیب پائے اتنا ہی دلکش ہوگا۔ تناسب اور آہنگ کے اس ضابطے کی تلاش میں اکثر وہ معمولی نظموں میں بھی اکتفا کر لیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی تنقید کو ادب اور تہذیب کا رابطہ قرار دیتے ہیں ان کا مزاج بھی کلاسیکی ہے جوش اور فراق تک بھی وہ خاصے تکلف تک پہنچتے ہیں ورنہ ان کے تخیل کی تگ و تاز فارسی ادبیات کے اعلیٰ نمونوں سے ہوتی ہوئی اصغر اور جگر ہی تک آکر ٹھہر جاتی ہے ادب ان کے لئے تہذیب کی صالح قدروں کی دریافت اور ترسیل ہے اس لحاظ سے ان کی تنقید میں اجتماعی ادب کے لئے کوئی گنجائش نہیں وہ ادب کے تہذیبی آہنگ کے نقاد ہیں گو ان کا دور میان سر سید اور حالی کی سی اصلاحی تحریکوں

پر صرف نہیں ہوتا لیکن ان کے نزدیک صالح شاعری صرف صالح یا کم سے کم سماج کے صالح حصے کے صالح افراد کے ذریعہ میں پرورش پا سکتی وہ لفظوں کی پکڑ یا ... تہذیبی تسلسل کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی فن کے تہذیبی پہلو کی اور اسی لئے ان کی تنقید میں صرف ان کے احساس کی شدت تہذیبی شعور کی پختگی اور کلاسیکی روایات کا احترام جھلکتا ہے بلکہ ایک ایسی فضا کی بازیافت کی کوشش ملتی ہے جو تہذیب اور شائستگی کے گم شدہ معیاروں کو پھر سے بحال کر سکے کہ ان کے نزدیک شاعری (اور ان کی تنقید تقریباً شاعری تک محدود ہے) انہیں معیاروں کی بازیافت ہے۔

اس ضمن میں فراق گورکھپوری کی تنقیدوں کا ذکر آئے گا۔ فراق صاحب نے اردو کی عشقیہ شاعری اور "انداز ے" کے بعد تنقیدی مضامین بہت کم لکھے البتہ ان کے "من آنم" والے خطوط اور بعض تقاریر اور مکالمات میں تنقید کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں فراق ہمارے ان چند شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنی تنقیدوں کے ذریعے اپنی شاعری کی تخلیقی عمل، معیار و محرکات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ فراق کے نزدیک شاعری کا پیمانہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"حقیقی شاعرانہ وجدان محض کائنات کے وجود کے احساس سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس وجود کے سچے علم اور اسے سچی طرح سمجھ سے پیدا ہوتا ہے" نقوش۔ ادب العالیہ صفحہ ۱۔ یعنی فراق کے نزدیک حسیات کے ذریعے حاصل کردہ تجربات دراصل تاریخی تسلسل کے تحفظ کا ذریعہ ہیں اور یہ تاریخی تسلسل ایسا ہے جیسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "ہمیں ان شاعروں کی (قدیم

دور کے شاعروں کی۔ م۔ع) دنیا لینے سے ہمیں انکار ہے اور ان کے کارنامے کھو دینے سے بھی ہمیں انکار ہے اور ان کے کارنامے کھو دینے سے بھی ہمیں انکار ہے۔

دیکھا اور اسی اعتبار سے اسے پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

پھر آل احمد سرور ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو مغربی طرز و آہنگ بخشا۔ آل احمد سرور نے تاثراتی اور سائنٹیفک تنقید کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی اور اردو ادب میں ایک متوازن تنقیدی لب و لہجہ رائج کیا ان کی تنقید میں تنقید متن کے حدود سے باہر نکل کر ایک وسیع تر آگہی تک پہنچیں کر ان کے نزدیک تنقید کا منصب تخلیقی فن پارے کی تفہیم ہے۔ محاکمہ نہیں گویا فن پارے کو اس کے اندرونی ضوابط و آئین کے مطابق ہی پرکھنا اور جانچنا ان کے خیال میں کافی ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"شاعر سے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنی نظر سے وفادار ہو۔ اب اس کی نظر ہمیں سوئے افلاک لے جائے یا دھرتی کے کرب اور اسی دور کے انتشار کی طرف اسے اس کی آزادی ہے۔ اس طرح اسے یہ بھی آزادی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں زبان کو جس طرح چاہے استعمال کرے شرط صرف یہ ہے کہ وہ شاعری کی زبان ہو۔ اس زبان میں روایت یا قواعد کا علم مفید ہوگا مگر حسب ضرورت اس سے آگے بھی جانا پڑے گا (مسرت سے بصیرت تک صفحہ ۸) اس طرح بلاشبہ کئی قباحتیں ہیں اول تو نقاد اپنی ترجیحات سے محروم ہو جاتا ہے، اور اسی بنا پر سرور صاحب کو پڑھنے والے

"یوں بھی اور یوں بھی" کے گومگو کا شکار رہتے ہیں اور وضاحت کی کمی کے شاکی ہوتے ہیں۔ دوسرے اگر ہر فن پارے اور فن کار خود اس کے قائم کردہ اصول و ضوابط کی روشنی میں جانچا جائے (یا سمجھا جائے) تو ناسخ کی طرح غالب اور اقبال سے کم تر قرار نہ پائیں گے اور مہمل سے مہمل شاعر کے کلام کو صحیفۂ الہام صرف اس لئے ماننا ہوگا کہ خود مصنف کا اپنے کلام کے بارے میں یہی خیال ہے پھر تیسری قباحت یہ ہے کہ اس کا تصفیہ کیوں کر ہوگا کہ شاعر اپنی دین سے وفادار ہے یا نہیں۔ اور اس کی اپنی نظر میں کوئی دوسرے نظر یا کسی دوسرے نظر سے اکتساب تو شامل نہیں ہو گیا ہے اور کیا ایسا ہونا فن کا نقیض ہوگا۔ پھر چونکہ شاعری کی زبان کو روایت یا قواعد سے آگے جانے کی بھی آزادی ہے تو اس صورت میں "حسب ضرورت" کا فیصلہ نقاد کرے گا یا فنکار۔

احتشام حسین کے تنقیدی تصورات ہمیں دوسری سطح تک لے جاتے ہیں احتشام صاحب کے نزدیک فن وسیع تر عمرانی زندگی کا حصہ اور فن اور ادب میں ظاہر ہونے والا شعور بھی وسیع تر عمرانی زندگی کا حصہ ہے۔ اور فن اور ادب ظاہر ہونے والا شعور بھی وسیع تر عصری آگہی سے وابستہ ہوتا ہے اور تنقید نگار فن پارے اور فن کار کو سمجھنے کے لئے اس کے دور کے سماجی اور اقتصادی محرکات کو پہچاننے پر مجبور ہے فن کار نہ صرف اپنے دور کی حقیقتوں سے متاثر ہوتا ہے بلکہ کسی نہ کسی طرح وہ سماجی حقیقت کے کسی نہ کسی پہلو سے جڑا ہوا بھی ہوتا ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اقدار کا مطالعہ ہے اور یہ اقدار مختلف فن پاروں اور فن کاروں کے جذبات افکار اور احساسات میں ایک تاریخی معنویت اور ترتیب پیدا کرتی ہیں ادب بھی اس کا ایک جزو ہے اور تنقید ادبی شہ پاروں میں کارفرما ان رشتوں کو بے نقاب کرتی ہے اور ان کے شعور کو زیادہ واضح اور نمایاں کر دیتی ہے۔

(۲)

اردو تنقید کی اس روایت میں ہم عصر تنقید پروان چڑھی۔

ہم عصر تنقید کے سامنے کئی مسائل تھے۔ ترقی پسند دور اسے پر آ چکی تھی کہ اسے آگے لے جانے کے لئے جس سماجی تاریخ کے جس گہرے مطالعے اور تجزیئے اور اس کے ساتھ ساتھ جس ٹھوس حکیمانہ شعور کی ضرورت تھی وہ دستیاب نہ تھا اور بدلتے ہوئے سماجی اور سیاسی حالات صاف ذہنوں کو بھی دھندلائے دیتے تھے اس کے پہلو بہ پہلو مارکسی تنقید نے گویا ہنوز اپنا سفر سنجیدگی سے شروع ہی نہیں کیا تھا ترقی پسند تنقید کا سارا زور بیانی صرف ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو ثابت کرنے اور اس کا بار بار اعادہ کرنے پر صرف ہوا تھا ادب کی طبقاتی بنیادوں کا تجزیہ ممتاز حسین کی بعض تنقیدوں کے علاوہ ناپید تھا حالات کی پیچیدگی تجزیئے کو اور مشکل بنا رہی تھی۔

اس زمانے میں بعض اہم اور بنیادی مباحث اٹھے جدیدیت علی گڑھ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے آل احمد سرور نے جدیدیت کی تعریف غیر مشروط طبعیت سے کی مراد اس سے یہ تھی کہ ادب اور نظریئے کا تعلق گمراہ کن ہے نظریہ [illegible] (جسے انہوں نے نظرے تعبیر کیا تھا) اب گویا ادب [illegible] احساس کے خلوص کی راہ روکتا تھا چنانچہ سچا ادب

ادب وہی ہوگا جو غیر مشروط ہو نظریاتی وابستگی سے دور ہو اور خود اپنی نظر سے اپنے احساس اور اپنی فکر پر انحصار کرتا اس سے ادب اور نظریئے کی بحث نئے سرے سے اٹھ کھڑی ہوئی جسے جدید اصطلاح میں اب "کمٹ منٹ" سے تعبیر کیا جانے لگا۔

اس بحث نے کئی دلچسپ زاویئے اختیار کئے ایک رخ احتشام حسین اور عمیق حنفی کو "شاعری کے لئے ایسی آزادی پر اصرار تھا جو غیر مشروط ہو" دوسری طرف احتشام صاحب کا کہنا تھا کہ اس "غیر مشروطیت" کے پیچھے وہ انفرادی رویئے اور نظریئے چھپے ہوتے ہیں جو ذرا غور سے پرکھے جائیں تو خود کسی نہ کسی طریقے سے جانبداری کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور سماجی رشتوں سے بندھے ہوتے ہیں اس سلسلے کا دوسرا رخ وہ تھا جو باقر مہدی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے درمیان زیر بحث آیا۔ خالص روایت کے پیرائے کمٹ منٹ کی تعریف یہ ٹھہری "ادیب کے لئے کمٹ منٹ یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کے مسائل سے پوری طرح آگاہ اور اس کا ایمان ہو کہ یہ بہت اغراض تھا کہ "ادب کی صرف جمالیاتی بحث کی جائے تو بھی کمٹ منٹ سے بچنا خاصہ دشوار ہے" کمٹ منٹ کی اس بحث نے ترقی پسند حلقے میں شدید ردعمل پیدا کئے اور سردار جعفری، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر قمر رئیس اور بعض دوسرے لکھنے والوں نے کمٹ منٹ کی بحث کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کی اور فرد اور سماج کے رشتوں کا نئے ڈھنگ سے سراغ لگانا چاہا اس کے نتیجے کے طور پر "عصری آگہی" کی نئی اصطلاح وجود میں آئی جس سے مراد کوئی قطعی اور واضح نظریہ نہیں تھا بلکہ وہ تصورات تھے جو کسی ایک دور میں جاری وساری ہوتے ہیں اور اس دور کے ذہنی اور جذباتی رویوں پر اثر انداز کرتے ہیں ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:۔

"ہو سکتا ہے کہ فرد اپنی ذہنی، جسمانی، طبعی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ ان حالات کو مختلف طریقوں پر محسوس کرے لیکن اس کی زندگی اور مسائل کا تعلق جماعتی زندگی اور مسائل کا تعلق جماعتی زندگی کے اجتماعی مسائل سے الگ نہیں ہو سکتا۔

سماج اور قوم جس تاریخی اور سماجی دھارے میں اپنے مسائل کے ساتھ بہا کرتے ہیں فرد بھی انھیں کے ساتھ شامل رہتا ہے۔" تنقید اور عصری آگہی ۱۲۴

اس سلسلے کے کچھ اہم مباحث ڈاکٹر وحید اختر کے تنقیدی مضامین میں ملتے ہیں۔ اول تو ڈاکٹر وحید اختر اس پر اصرار ہے کہ "جدید شاعری ترقی پسند شاعری سے کیفیت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس تسلسل ہے بلکہ ہم اس شاعری کو نئی تکنیک کی طرف ترقی پسندی کا اگلا قدم کہیں تو غلط نہ ہوگا (فلسفہ اور ادبی تنقید صفحہ ۲۱۹) ان کے نزدیک "غیر مشروطیت" کے معنی سماجی ذمہ داری سے انکار کے نہیں بلکہ:

"جدید شاعری مجموعی طور پر سماجی ذمہ داری کا منکر نہیں بلکہ شعور جو کل تک اوپر سے لادا جاتا تھا اب اس کے احساس کا جزو بن چکا ہے صرف سیاسی پروگرام یا نعرے کو نظم کر دینے سے ہی سماجی شعور ظاہر نہیں ہوتا۔" ایضاً صفحہ ۲۲۴

اس بحث سے جڑا ہوا مسئلہ ترسیل اور ابلاغ کا تھا۔ شاعر اور ادیب کے ذریعہ اظہار میں ترسیل کا کیا مقام ہے؟ کیا ہر اظہار لازمی طور پر ترسیل ہے؟ اور ابہام اور ابہام کا اس ضمن میں کیا درجہ ہے، شمس الرحمٰن فا

نئے نام " کے دیباچے میں ترسیل کی ناکامی کو فنکار
ی کی بجائے عہد حاضر کی پیچیدہ اور پارہ پارہ
ی کا نتیجہ قرار دیا اور اس نقطۂ نظر سے ہر ذہنی
خریعہ ہے کہ وہ فن کار کی اپنے مخصوص لب و لہجہ
و ذہنی ترتیب اور اس کے شخصی پیرایۂ اظہار تک پہنچنے
ناظ سے ہر اظہار لازمی طور پر ترسیل قرار پاتا ہے

اس مسئلے نے بھی تنقید میں مختلف رویے پیدا
یک طرف وہ نقاد تھے جو شاعری میں جذبے، شعور
یال کی اولیت ہی کے سرے سے قائل نہ تھے اور اس کی جگہ
ـ طرزِ احساس کو ترتیب نو پر زور دیتے تھے جس
قر کے معنی اہم نہ تھے بلکہ اس کی کیفیت اہم تھی دوسری
ـ وہ نقاد تھے جن کے نزدیک ایک کیفیت معنی سے
یاز رہ سکتی ۔ اور کم سے کم ادب میں کیفیت کا معنی
ـ رہ کر تصور نہیں کیا جا سکتا اہم سوال یہ تھا کہ
الفاظ اور ان کے عام معنی کے دائرے میں رہ کر تخلیقی
ر کے اعتبارات اور اجتہادات کی جد و جہد کیا ہے کیا
نے ذاتی اور نجی رموز و علائم بلکہ ایک نجی اور ذاتی زبان
ن کا حق رکھتا ہے اور اپنے قارئین سے یہ مطالبہ کرنے
ن بجانب ہے کہ لہٰذا اس کی شاعری سمجھنا چاہیے
زبان اور ذاتی علائم کی تفہیم کا حق ادا کرے ۔

اس مسئلے کے گرد بھی گھمسان کا رن پڑا اس کے موافق
لف دلیلوں کا جائزہ لینے کا یہ محل نہیں لیکن اہم بات
ہے کہ ان مسائل اور مباحث کے سلسلے میں دو مختلف
نظر رکھنے والے نقادوں میں مناظر اور مجادلے کی
ت معاصر تنقید میں اتنی نمایاں ہے کہ اس مناظر
نص فن " کی بنیاد پر تنقید صرف اس وقت قابل
می ٹھہرتی ہے جب وہ ادبی تفہیم کے سلسلہ میں اپنے
کو واحد طریق کار کے طور پر پیش کرتی ہے یہی بات
شاید ترقی پسند یا مارکسی تنقید کے سکہ بند تصور کے
بارے میں کی جا سکتی ہے جو صرف عمرانی پس منظر یا کسی
دوسرے کے نظریات یا افکار کی بنیاد پر تنقیدی فیصلے
صادر کرتی ہو ۔ یہ تضاد بڑی حد تک فرضی ہے اور
ادبی تفہیم و تنقید شاید ان دونوں میں سے کسی طریق کار
سے بھی یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ ادبی تنقید کو اگر
تخلیق کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے تو اسے
ان دونوں طریق کار کو بھی اپنانے ہوں گے مثلاً تقابلی یا
لسانیاتی طریق تنقید یا اس قسم کے کئی اور طریقے مفید
ہوں گے ۔

اس بحث نے گرما گرم مناظر ایسا ادب پیدا
کیا جس میں روشنی کم اور حرارت زیادہ تھی ۔ بعضوں کے
الٹ پھیر پھبتی کی شوخی اور انداز بیان کے چٹخارے
کی کمی نہ تھی جس کے بین السطور میں تنقیدی تصورات
کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں نظر آجاتی تھیں (اور اس
ضمن میں وارث علوی، محمود ہاشمی، باقر مہدی کی تحریروں
کا تذکرہ ضروری ہے) لیکن یہ قلق پھر بھی دل کو نہیں بھولتا
کہ دونوں مکاتیب فکر میں سے کسی نے مثبت انداز میں
اپنے تنقیدی افکار کی نظریاتی بنیادوں پر سنجیدگی
سے اپنے خیالات کو مضبوط ڈھنگ سے پیش کرنے کی
کوشش نہیں کی ۔ خالص ادب اگر کوئی مربوط اور مرتب
نظام تنقید تو اس کی ضرورت ہے کہ اردو ادب میں
اس کے پورے نظام اقدار کو سنجیدگی اور وقار کے ساتھ
پیش کیا جائے اور اسے متضاد نظام ہائے اقدار سے
محض ٹکراتے رہنے کے بجائے اس کے اصول و آئین اور
تجزیے اور تفہیم کے معیار اور پیمانے وضع کرنے اور اس

نظامِ تنقید کو پوری جامعیت کے ساتھ متعارف کرانے کی توجہ نہیں کی گئی۔

ظاہر ہے یہی بات ترقی پسند تنقید یا مارکسی تنقید کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے (یہاں دونوں اصطلاحوں کو مترادفات کے طور پر استعمال نہیں کیا جا رہا ہے) ترقی پسند تنقید نے یہ کام تھوڑا بہت کیا ہے لیکن اس کی دسترس صرف اس خیال تک ہوئی ہے کہ ادب اور سماج کے درمیان ایک گہرا زیرِ زمیں رشتہ ہے۔ مارکسی تنقید کو اس کے ایک قدم آگے بڑھانے کی ضرورت تھی یعنی سماج چونکہ طبقوں میں بٹا ہوا ہے اس لئے ادب کی بھی طبقاتی بنیادوں کے ذریعہ اسے جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ سچ یہ ہے کہ پچھلے ۲۷ سال میں مارکسی نظریات کے بارے میں عالمی پیمانے پر نئے سرے سے غور و خوض کیا گیا ہے اور لاتعداد اہم اور قابلِ غور افکار و خیالات سامنے آئے ہیں جن کا براہِ راست اثر مارکسی تنقید پر پڑنا لازمی ہے۔ ان نئے افکار کی روشنی میں مارکسی تنقید کو اپنے تنقیدی رویوں طریقِ کار اور وسائل کا نئے سرے سے جائزہ لینا اور ان کی بھرپور وضاحت کرنا ضروری ہے۔

(۴)

ان مباحث اور مسائل کے پہلو بہ پہلو تنقیدی مضامین اور تصانیف کا ایک ایسا سلسلہ بھی تھا جس نے اس نظریاتی ہلچل کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا اور زیادہ تر قدیم ادبی سرمائے کو اور کبھی کبھار ہم عصر ادب کی تنقیدی چھان بین کرتا رہا۔ اس قسم کے لکھنے والوں میں قابلِ ذکر نام ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا ہے جن کی دو مستقل تصانیف پچھلے چند برسوں میں شائع ہوئیں۔ غالب اور آہنگ غالب، میں انہوں نے کسی قدر ، طریق تنقید روا رکھا ہے پہلے غالب کی شخصیت کے عہد بہ عہد ارتقا کی مدد سے ان کے فکر و فن پر اثر انداز ہونے والے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے پھر ان کے دور کے فکری تقاضوں کے تجزیے کی مدد سے ان کی ذہنی ارتقا کی تصویر پیش کی گئی ہے پھر ان کی تراکیب اور محاکاتی تاثر پاروں کی مدد سے ان کے شعری آہنگ اور اس بیانی خصوصیات تک رسائی حاصل کی گئی ہے ظاہر ہے یہ کوشش کئی حیثیتوں سے تشنہ ہے اور اسے ہم عصر تنقید میں مثالی درجہ حاصل نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ہم اثر تنقید میں ایسی مسلسل پرواز اور ایسی مربوط اور مرتب تنقیدی کاوشیں موجود نہیں ہے۔

پھر ان کی دوسری تصنیف حافظ اور اقبال ہے جس میں انہوں نے تقابلی تنقید کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ یوسف حسین خاں کی تنقید میں عینیت پسندی کے عناصر واضح طور پر موجود ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:۔

" جمالیاتی تجربہ خالص تجربہ ہے جس میں ہر اس عنصر کو الگ کر دیا جاتا ہے جو وہ خود نہیں ہے اس میں وہ تخلیقی لمحے بھی آتے ہیں جن میں ابدیت کی نشان دہی ہوتی ہے یہ زمان و مکان سے ماورا اور خود اپنے تجربہ کیف سے بھی سوا ہوتے ہیں " صفحہ ۲۳

ظاہر ہے ایسے دوسرے مکاتیب تنقید تسلیم نہیں کریں گے پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یوسف خاں اپنی تنقید کو محض جمالیاتی تجربے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ان نمائندہ خیالات اور تصورات کے سماجی عوامل کے

بے سے بھی قطعی طور پر بے نیاز نہیں رہتے۔ حافظ
اقبال ان کی پہلی تصنیف کا مقابلے میں کمزور ہے اور
ن تلاش کرتا ہے۔ دوسرا اہم نام اسلوب احمد انصاری
دھن کی تنقیدی تحریروں میں تجزیاتی نظر اور ایک وسیع
ی آگہی کے نشانات ملتے ہیں۔ غالب کے فن کا علوی
ر اور اقبال پر ان کے مضامین اس کے اصول و ضوابط
الفیں جو تجزیاتی شعور بخشتا ہے اسے کام میں لاتے
اس اعتبار سے ان کی تنقیدوں میں دلکش توازن
ی وقار قائم رہتا ہے۔

پھر سردار جعفری ہیں جنہوں نے کبیر، میر اور
ب کے انتخابات پر اچھے دلکش اور خیال آفریں
باچوں کی مدد سے اپنا تنقیدی لب و لہجہ پا لیا
. سردار جعفری ماضی کے کلاسیکی سرمائے سے گہرا
ن اور شعور رکھتے ہیں اور اس کی روشنی میں
ی کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاعری
نزدیک محض جمالیاتی کیفیت نہیں ہے بلکہ
ے تہذیبی شعور کا حصہ ہے اور اسے اس
ی وحدت کے پس منظر میں سمجھنا اور پرکھنا
کتا ہے۔ اقبال پر ان کے مضامین تہذیبی وحدت
شنی میں شاعر کے مطالعے کی کوششیں ہیں۔
ن مضامین میں شاعری کو خیالات اور افکار ہی
میں دیکھا گیا تھا اور ان کے سلسلے میں وسیع تر
اس منظر سے جوڑا گیا ہے مثلاً "پیغمبرانِ سخن" کے
میں لکھتے ہیں۔

آج جب کہ ہندوستان کے بعض حلقے تنگ
ثبوت دے رہے ہیں اور ایک محدود تہذیبی
روغ دینے کی فکر میں ہیں تو قومیت کے ایک

تصور پر اصرار کرنے کے لئے جس کے اندر ہندوستان کے مزاج اور وسعت ہو یہ ضروری ہے کہ ایک طرف موجودہ مغربی سائنس سے استفادہ کیا جائے اور دوسری طرف اپنے ملک اور قوم کی وسیع القلبی کی روایتوں کو یاد رکھا جائے۔ جدید عہد کی سیاسی انقلابی تحریکوں کو مزید تقویت حاصل کرنے کے لئے قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہئے۔ اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لئے اہم ہیں۔" صفحہ ۹

ہماری شاعری کے تہذیبی مطالعے کے سلسلے میں سردار کی یہ کوششیں لائق ستائش ہیں۔

اس دور میں چند تنقید نگاروں نے جدید اور قدیم ادب کے مسائل پر سنجیدگی اور تسلسل کے ساتھ لکھا ہے ان میں ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر سید محمد عقیل کے نام قابل ذکر ہیں وحید اختر کے نزدیک تنقید نگاری کے دو رُخ تھے ایک عہد حاضر کے فنی اور فکری رویوں کو تخلیقی فن کار کے نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش تھی جس میں تنقید نگار کی حیثیت کسی قدر ضمنی تھی اور تخلیقی فنکار کو اولیت حاصل تھی — جدید ادب پر ان کے مضامین میں ان کی یہ حیثیت نمایاں ہے دوسرے وہ مضامین ہیں جن میں انہوں نے قدیم اور جدید شعری ادب کے فکری آہنگ کو سمجھنے کی کوشش کی اور مختلف فن کاروں کے شعری مزاج کے اجزائے ترکیبی تلاش کئے ہیں۔ "مخدوم محی الدین" پر ان کا تازہ اور طویل مقالہ ان کی تنقیدی کاوشوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مخدوم کی شخصیت دور اور فکری اور فنی وراثت کی مدد سے مخدوم شناسی

کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل کی دو تنقیدی تصانیف حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ "اردو میں علامت نگاری" میں دراصل نئے دور کی الجھی ہوئی حریت کا مطالعہ کیا گیا ہے اور ان تصورات کی جڑیں مغربی ادب میں بھی تلاش کی گئی ہیں۔ علامت نگاری ایسے صالح اور غیر صالح استعمال اور ان کے سماجی اور تہذیبی عوامل و محرکات سے بحث کر کے سید محمد عقیل نے یہ ثابت کیا ہے کہ اہمال اور ابہام کے پردے میں بھی سماجی طور پر جانبدار عناصر کارفرما ہوتے اور عالمی جمالیات بھی خالص نہیں ہوتی بلکہ جانے پہچانے فکری اور جذباتی رویوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ دوسری تصنیف مختلف تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے لیکن یہاں بھی یہی تصور کارفرما ہے کہ ادب کا مطالعہ دانش عصر کی وحدت کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ سید محمد عقیل کی نظر جدید مغربی تحریکات اور خصوصاً جدید انگریزی ادب کے میلانات پر ہے اور انہیں کی اثر پذیری وہ ہم عصر ادب میں بھی دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے ادھر کم لکھا لیکن انھوں نے اپنے کو افسانوی ادب کی تنقید کے لئے بڑی حد تک وقف کر لیا ہے ان کی نگارشات میں بھی فن پاروں کو تاریخی تسلسل اور سماجی متعلقات کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش ملتی ہے۔

تنقید کے سلسلے میں ظ۔ انصاری کے مضامین اور کتابوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ظ کی غالب شناسی اس اعتبار سے اہم ہے کہ انھوں نے غالب پر سبھی تنقیدی رایوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آزادانہ غالب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے پر کوشش بھی کسی حد تک انتخابی

ہے وہ تاریخ اور تہذیب سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ فن تمثیلوں کے مطالعے سے شاعر کی تفہیم کی کوشش کی ہیں امیر خسرو اور جاں نثار اختر پر ان کے مضامین بھی یہی اسلوب نمایاں ہے۔ "چیخوف" اور "پشکن" پر مختصر تنقیدی کتابچوں کے ذریعے انہوں نے ارد کو آفاقی ادب سے بہتر طور پر متعارف کرانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔

اس کے علاوہ شکیل الرحمٰن ہیں جنھوں نے جمالیات کے آئینے میں مختلف فن کاروں کو سمجھنے کی کوشش کی غالب کی جمالیاتی "اس سلسلے کا پہلا قدم تھی۔ اقبال پر ان کے مضامین میں بھی یہی کوشش موجود ہے کہ شاعر کو اس کے خیالات اور تصورات کی مدد سے بھی سمجھا جائے اور پھر ان خیالات اور تصو میں جو باہمی ربط ہے اسے شاعر کے پیرائیہ بیان میں نما ہونے والے ربط سے مربوط کر کے دیکھنے اور سمجھنے کوشش کی جائے۔

ہئیتی تنقید میں سب سے اہم نام شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے جنھوں نے اپنے مقالات اور دیباچوں میں برابر ادب کی ایک خالص ادبی یا ہئیتی تنقید زور دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے تمام تر خیالات سے متفق ضروری نہیں لیکن ان کی تحریروں نے ہمارے تنقید کو نامی تحریک کے اصو ضوابط سے نئے طور طریقے کے ساتھ متعارف کرایا ادب کو محض کیفیاتی سطح پر پرکھنے پر زور دیا۔

ہئیتی تنقید کو نقادوں میں فاروقی کے بعد سے اہم نام وارث علوی کا ہے جن کے بھرپور مضامین فقرہ بازی اور پھبتیوں کے علاوہ ادب اور اس کی

ے بارے میں خیال انگیز باتیں بھی مل جاتی ہیں اس کے
لبتہ محمود ہاشمی کا نام ہے لیکن اس مکتبۂ خیال کا
ایدسب سے سنجیدہ ہوگا۔ اور متوازن تنقید میں فضیل
جعفری کے قلم کی مرہون منت ہیں جن کے ہاں قدیم روایت
شعور بھی موجود ہے اور جدیدیت کے نئے تنقید کی
ش بھی۔

اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے خود کو
یتی تنقید کے گروہ سے ہم آہنگ کرایا لیکن وہ دراصل
ن کے ابہام اور فلسفہ طرازی سے اتنے متفق اور مرعوب
ہیں جتنے ان کی شاعری میں ندرت احساس کے جو یا
ور ان کے اظہار بیان کی تازگی کے متمنی اور قدردان
ہا۔ اس ضمن میں بعض دوسرے تنقید نگاروں کا ذکر آتا
ہے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بعض مضامین میں جدید
ادب کے بعض لسانی پہلوؤں کو عملی تنقید کی مدد سے حل کرنے
کوشش کی اور صوتی آہنگ کی ترتیب کے تجزیے سے
سانیاتی تنقید کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی ڈاکٹر
م حنفی کے مضامین میں بھی ہیئت کو فکر اور خیال پر اولیت
مل رہی لیکن ان کے مضامین میں "غیر مشروطیت"
اصطلاح "تخلیقی حیثیت" کے نئے پیرائے میں جلوہ گر
تی ہے۔ ان کی تنقید دراصل الفاظ اور احساس کے
سیع امکانات پر زور دیتی ہے کہ یہی ان کے نزدیک
اعری کا حقیقی منصب ہے۔

علی جواد زیدی نے اپنے تنقیدی مضامین کو
یادہ تر قدیم ادب سے متعلق رکھا اور نئی تحقیق کی
شنی میں قدیم ادب کی تاریخ اور مشاہیر کی درجہ بندی
ران کے مقام کے تعین کے سلسلے میں قابل ذکر کام کیا۔
زو ادو ، اسکو ز ، مو ، انہو ، ز دہلی اور لکھنؤ۔ سکو

دبستانوں کی تقسیم پر سوالیہ نشان قائم کرکے غور وفکر
کے نئے پیش کش کئے اس طرح تنقید شاعری یا اردو
قصیدہ نگاری اور اس قسم کے متعدد موضوعات کو اپنایا
جو ابھی تک تنقید سے حاصل نہیں کر سکے تھے اس
سلسلے میں تاریخ ادب کی تدوین پر ان کا مقالہ نہایت
اہم ہے جس میں تاریخ ادب کے بھی مفروضات واضح
کی گئی ہے۔ اور تاریخ ادب کی تدوین کے بعض اہم مفروضات
پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۵)

اس ہم عصر تنقیدی سرمائے میں یہ کمی بھی
کھٹکتی ہے کہ عام طور پر اس کا سارا زور بیان شاعری
ہی پر صرف ہوا ہے نثری سرمائے کی اہمیت انکار ممکن
نہیں لیکن نثر کے مزاج کو پہچاننے اور افسانوی ادب
پر تنقیدی نظر ڈالنے کا کام کچھ اہم نہیں ایسا لگتا ہے کہ
ہماری تنقید پوری ادبی اکائی کا ہنوز احاطہ نہیں کر
پائی ہے۔ اور نتیجے کے طور پر صرف شاعری ہی میں الجھ کر
رہ گئی ہے کہ قمر رئیس کی بعض تحریروں کو چھوڑ کر اردو
تنقیدی افسانے کا ذکر شاذ ہی ملے گا ممکن ہے اس
کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ نثر حکیمانہ مزاج اور سائنٹفک
طرز فکر سے قریب تر ہے اور یہ دونوں لہجے ہنوز ہماری
تہذیب کا جزو نہیں بنے ہیں اجنبی اجنبی سے ہیں اس
لئے نثر کو ابھی تک ہم اپنے سے اتنا قریب محسوس نہیں
کرتے کہ اسے شاعری کی طرح آنکھ کا نور اور دل کا سرور
بنا سکیں اور اسے جمالیاتی اظہار کا موثر وسیلہ تسلیم
کر سکیں۔ بہرحال یہ ایک ایسی کمی ہے جس کا مداوا ضروری
ہے۔

یہی حال نظریاتی تنقید کا بھی ہے۔ ہم عصر تنقید کا بھی۔ ہم عصر تنقید غزل کے اشعار کی طرح مضامین میں بکھری پڑی ہے اور ان میں ریزہ خیالی موجود ہے تنقید کے بنیادی نظریات پر بہت کچھ کام عالمی سطح پر ہوا ہے لیکن اس کی گونج اردو میں بہت کم سنائی دیتی ہے تنقیدی نظریات و تصورات اور طریقہ کار پر بھی اساسی کام کی کمی ہے۔ تنقید کی تاریخ کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر شارب ردولوی کی جدید اردو تنقید: اصول و نظریات (دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۷۶ء) ہی ابھی تک شاید اس موضوع پر تنہا کتاب کا درجہ رکھتی ہے بہت کچھ اضافے کے باوجود عہد حاضر کے متعدد اصول و نظریات ہنوز اس تاریخ میں شامل نہیں ہیں۔ اور ان پر الگ سے مستقل تصانیف کی ضرورت ہے پھر بھی یہ کتاب اردو تنقید کی بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ ابھی تک عالمی تنقید کے اہم تصورات تک اردو والوں کے لئے اجنبی ہیں مثلاً تقابلی تنقید یا تنقید افکار یا تشکیلی تنقید کی روایات۔

ہم عصر تنقید سے مناسب سنجیدگی اور توازن کی کا شکوہ کیا جا سکتا ہے۔ تنقید رائے زنی اور مناظرہ بازی یا پگڑی اچھالنے اور اشتہار بازی کرنے کے فن سے خطرناک حد تک قریب ہوتی نظر آتی ہے اس میں پہ ریڈیو کی تقریروں اور رسالوں کی مضمون طبعی کا ہی حصہ ہے کہ تنقید ایک سنجیدہ علمی طور پر مرتب فکر کے بجائے انشائیہ کا سا ہلکا پھلکا انداز اور نلح جگت کا پیرایہ بھی اختیار کرنے لگتی ہے آج تک اردو تنقید مغرب اور مشرق کے تنقیدی سرمائے کے بنیادی ... ا کا جائزہ لے کر ان کی طرف اپنا رویہ ... نہیں کر سکتی ہے اور اسے وہ وقار حاصل نہیں ہوا ہے جس کی وہ مستحق ہے اور جسے حاصل کئے بغیر عصر کی تخلیقی سرگرمیوں کی مزاج داں اور ... نہ بن سکے گی۔

اصغر علی انجینیر

پریم چند - حیات اور فن

قسط ۱

پریم چند کو جتنی ہمدردی کسانوں کے ساتھ تھی اتنی ہی ہمدردی انہیں .... سے بھی تھی۔ مذہب کی طرف ان کا شروع سے ہی ناقدانہ رویہ رہا تھا اور اسی رویے نے انہیں آریہ سماجی تحریک کی طرف بھی راغب کیا تھا چنانچہ وہ ذات پات کی تقسیم اور چھوت چھات کی لعنت کے سخت مخالف تھے۔ بعد میں تو وہ سوشلزم کو اپنا لیتے ہیں لیکن اس سے قبل وہ گاندھی کی تحریک کے زیر اثر بھی اسی سماجی لعنت کے خلاف جہاد پکار چکے تھے۔ ڈاکٹر مرلوکی فرائن کی تو یہ رائے ہے کہ

"پریم چند نے (مہاتما) گاندھی کی طرح کسی سیاسی چال یا ضرورت کے تحت ہریجنوں سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کے سماجی اور معاشی استحصال کی قدیم روایت کو ختم کرنے کے لئے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا ہے"

گاندھی جی کا مسلک تھا کہ ذات پات کی تقسیم ترقی کے لئے ضروری ہے۔ جو پیشہ جس ذات کے لئے مقرر ہے اسی ذات یا ان کے افراد ہی اسے اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ پریم چند نے اچھوت طبقہ کو ہندو دھرم کے نام پر بڑا کلنک مانا ہے:

پریم چند شروع ہی سے انسانوں کو مساوی درجہ دینے کے قائل تھے۔ لیکن ہندو سماج اور مذہب نے لاکھوں انسانوں کو اچھوتوں کا درجہ دے رکھا تھا اور انہیں ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ انتہا تو یہ ہے کہ ان کو اپنے دکھ من کی کہانی بھگوان کے در پر جا کر کہنے کی بھی ممانعت تھی۔ مذہب کے ٹھیکیداروں نے مندروں میں ان کا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا اور اس کے بھی روادار نہیں تھے کہ ان کے کانوں میں مقدس کتابوں کی آواز داخل ہو۔ پریم چند ایسی ظالمانہ پابندیوں کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔ میدان عمل میں جب منٹوا مندر کے دروازے پر بیٹھ کر کتھا سنتا ہے تو مندر کا

۱؎ راقم الحروف کو مرلوکی فرائن کی اس بات سے اختلاف ہے کہ گاندھی جی نے کسی سیاسی چال کے تحت ہریجنوں سے ہمدردی جتائی تھی۔

ری لالہ سمرکانت اور سیٹھ دھنی رام کے اشارے
جوتوں سے پیٹتا ہے۔ اس پر ایک سماج سیوک ڈاکٹر
شانتی کمار ان الفاظ میں احتجاج کرتے ہیں۔ یہاں پریم
چند نے در اصل اپنے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔

"آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لئے۔ لگائیے خوب
ناگس کر، اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ بندوقیں منگائیے
ر ان سب دھرموں کا خاتمہ کر دیجئے۔ اور تم دھرم کو
ک کرنے والو تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھا
و کھاؤ۔ تمہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ، مہاجنوں
بھگوان رہتے ہیں ..... یہ بھگوان جواہرات کے نگینے
نتے ہیں۔ موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے
ہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا
ہتے۔"

یہاں بھی پریم چند نے مذہب کے ساتھ ساتھ
اجی نظام پر بھی گہری چوٹ کی ہے۔ بھگوان بھی ہر
ح سے سرمایہ دارانہ نظام کی علامت ہے۔ جواہرات
ر، لذیذ کھانے اور مٹھائیاں یہ سب سرمایہ داروں
طبقاتی سماج کے اعلیٰ طبقوں کے لچھن ہیں اور ان
بھگوان بھی یہی لچھن رکھتا ہے۔ پریم چند یوں چھوت
ات کے مسئلے کو سماجی نظام کے مسئلے سے جوڑ دیتے
ں۔ مذہبی رواداری تو اچھوتوں کی طرف زیادہ سے
دہ ترحم کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ پریم چند کا مقصد
چھوتوں کے ساتھ محض بہتر برتاؤ کرنا نہیں بلکہ اس
منت کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اور یہ
ا وقت ممکن ہے جب سماجی نظام کو ہی بدلا جائے۔

اچھوتوں کا مسئلہ سماجی نظام سے کس طرح جڑا
ہے اس کی تصویر ہمیں پریم چند کے ناول "پردۂ
مجاز" میں نظر آتی ہے۔ گاؤں میں ہریجنوں سے بیگار لینا
بہت عام رہا ہے اور یہ پرتھا آج بھی موجود ہے۔ دراصل
یہ پرتھا جاگیردارانہ نظام کی دین ہے۔ اگر اچھوتوں نے
کبھی مزدوری مانگی یا بیگار سے انکار کیا تو اس پر طرح
طرح کے مظالم ہوتے تھے۔ [illegible] سے پیٹا جاتا تھا اور
گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا۔ پردۂ مجاز میں دیوان
صاحب کے گھوڑوں کو وقت پر گھاس اس لئے نہیں
مل پاتی کہ بھوکے چمار تیزی سے گھاس نہیں کاٹ پا
رہے تھے۔ دیوان صاحب کو اس بات سے کوئی دلچسپی
نہیں تھی کہ چمار بھوکے ہیں، ان کے گھوڑوں کو وقت
پر گھاس ملنی چاہئے۔ ورنہ ان کو ایسی کڑی سزائیں
دی جاتی تھیں کہ

"یکایک مزدوروں کے باڑے سے گریہ وزاری
کی صدائیں آنے لگیں۔ کسی کیمپ میں گھاس نہیں تھی اور
دیوان صاحب ہنٹر لئے چماروں کو پیٹ رہے تھے ...
ایک چمار بولا مالک آپ کو اختیار ہے مار ڈالئے۔ پیٹ
باندھ کر کام نہیں ہوتا .... ایک نوجوان نے کہا ہم لوگ
بنا گھاس کھائے آٹھ دن سے گھاس دے رہے ہیں
کیا گھوڑے بنا کھائے ایک دن بھی نہ دوڑ سکیں گے
دیوان صاحب نے جھپٹ کر اسے چار پانچ ہنٹر لگا دیئے
برہنہ جسم کی جلد کٹ گئی اور خون بہہ نکلا۔ وہی ہنٹر
تان کر سپودھری کو جما دیا بوڑھا آدمی تھا اس پہ
کئی دن کا بھوکا ہنٹر پڑتے ہی گر پڑا۔"

سرکاری حکام بھی اس زمانے میں ہریجنوں سے
بیگار لیا کرتے تھے اور اسی طرح ان کے ساتھ ظالمانہ
سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کی تصویر کشی پریم چند نے
اپنے دوسرے ناول "گوشۂ عافیت" میں کی ہے ضلع

نظام کا لشکر گاؤں والوں کی فلاح و بہبود کے بہتر مواقع فراہم کرنے کی غرض سے ان کے موجودہ حالات کی جانچ پڑتال کرنے آتا ہے۔ مگر یہ سرکاری حکام بھی اچھوتوں پر اسی طرح ظلم ڈھاتے ہیں اور انہیں بیگار کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اچھوت ان لشکر والوں کی جان توڑ خدمت کرتے ہیں لیکن لشکر والوں کو ان کی بھوک پیاس کسی چیز کا خیال نہیں رہتا۔ جب افلاس زدہ اچھوت سخت محنت کرنے کے بعد مزدوری مانگتے ہیں تو تحصیلدار غصے میں پاگل ہو کر چپراسیوں کو حکم دیتا ہے ۔۔ ان چماروں کی اچھی طرح خبر لیں۔ یہی ان کی مزدوری ہے چپراسیوں نے بیگاریوں کو گھیرنا شروع کیا کانسٹیبلوں نے بھی بندوقوں کے کندے لگانا شروع کئے۔ کئی آدمی مجروح ہو گئے " یہ سارا نظام ایسا ہے کہ زمیندار اور سرکاری حکام تو بیگار ان اچھوتوں سے لیتے ہی ہیں لیکن حد تو یہ ہے کہ مہنت اور پجاری بھی انہیں معاف نہیں کرتے۔ پریم چند کے ایک افسانے "نجات" کا ایک کردار پروہت کی بیگار کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے۔ " زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ یعنی پروہت تو بیگار لینے کے بعد کچھ بھی دینے پر رضامند نہیں ہوتا۔" نجات " میں دکھی چمار صبح اٹھتے ہی پنڈت جی کے بیگار میں لگ جاتا ہے۔ تمام دن بغیر کھائے پئے لکڑی پھاڑتے ہوئے چکر کھا کر گر جاتا ہے تو " پنڈت جی نے پکارا، اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ مگر بے چارہ دکھی چمار تو مر چکا تھا۔ مگر مرنے کے بعد بھی پنڈت جی کو اس پر رحم نہ آیا۔ زندگی بھر بیگار لیتے رہے اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو رسی سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر پھینک آئے۔ پریم چند لکھتے ہیں۔ " دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کتے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی اور خدمت کا انعام تھا "

آج بھی ہندوستان کے دیہاتوں میں ایسے دلدوز منظر ہمیں نظر آتے ہیں۔ آزادی کے ۳۰۔۳۵ سال بعد بھی اچھوتوں کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ بیگار اور بندھوا مزدوری کی لعنتیں آج بھی ہمارے سماج میں موجود ہیں اور یہ اسی نیم جاگیردارانہ نظام کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ پریم چند ان کہانیوں میں کہیں بھی مبالغہ نہیں ہے۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے ہریجنوں پر ہو رہے ان مظالم کو دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی انہیں زندہ جلا دینے معمولی معمولی بات پر گولی مار دینے کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں پریم چند کی ایک اور کہانی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ بڑی دل ہلا دینے والی کہانی ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ " دودھ کی قیمت " امرت رائے اس کہانی کے متعلق " قلم کا سپاہی " میں لکھتے ہیں " دودھ کا دام (کہانی کا ہندی عنوان) یوں تو وہی چھوت اچھوت اونچ نیچ کی کہانی ہے لیکن اب غصے کی جگہ دل کو مسوس دینے والے، چیر دینے والے ایک درد نے لے لی ہے۔ مندر جیسی کہانی میں جو آکروشن کی ایک چیخ تھی وہ یہاں درد کی ایک میڈ بن گئی ہے۔ " کہانی اس طرح ہے۔ ایک غریب بھنگی ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھوکا رکھ کر ایک بابو صاحب کے بچے کو جس کی ماں کو دودھ نہیں اترا دودھ پلانے کے لئے نوکری کر لیتی ہے۔ سال بھر سلسلہ چلتا ہے اور پھر سماجی ٹھیکیدار اس بات پر

ستر من ہوتے [illegible]ور بھنگن کو نکال دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر اس بھنگن کا شوہر پلیگ کا شکار ہو کر مر جاتا ہے اور خود وہ ایک نالہ صاف کرتے ہوئے سانپ کاٹنے سے مر جاتی ہے ۔ اس کا لڑکا منگل اب اس دنیا میں اکیلا ہے اور اسی بابو صاحب کے ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کے پیڑ کے نیچے ایک پھٹے سے ٹاٹ کے ٹکڑے ، دو مٹی کے برتن اور ایک دھوتی جو سریش بابو کی اترن تھی اس اثاثے کے ساتھ رہتا ہے۔ جھلستی ہوئی لو ہو یا کڑاکے کی سردی یا موسلا دھار بارش، اس کا ٹھکانہ وہی تھا۔ اس کا اپنا کوئی ساتھی تھا تو ایک کتّا ۔ دونوں ایک ہی کھانا کھاتے، ایک ہی ٹاٹ پر سوتے۔ اس کتّے کا نام تھا ٹامی ۔ منگل اور ٹامی میں گہری چھنتی تھی۔ منگل کہتا دیکھو بھائی ٹامی۔ ذرا اور کھسک کر سو۔ آخر میں کہاں لیٹوں سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا۔ ٹامی عوں عوں کرتا، دُم ہلاتا اور کھسک جانے کے بجائے اور اوپر چڑھ آتا۔ اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا ۔ ایک دن آس پاس کے بچے جن میں سریش بابو کا لڑکا بھی شامل ہے اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے کہتے ہیں۔ پہلے منگل ڈرتا ہے کہ مالک کو پتہ لگ گیا تو اسے ماریں گے لیکن جب وہ کھیلنے پر راضی ہوتا ہے تو اسے سب گھوڑا بننے کے لئے کہتے ہیں تاکہ دوسرے بچے اس پر سواری کر سکیں کیونکہ آخر وہ بھنگی ہے۔ منگل اس بات پر اڑ جاتا ہے کہ اگر وہ گھوڑا بنے گا تو وہ بھی ان کی سواری کرے گا۔

منگل کا یہ سوال ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ سوچ کر کہا مجھے اپنی پیٹھ پر کون بٹھائے گا۔ سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں ؟ منگل بھی کڑا ہو گیا۔ بولا۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں، لیکن تمہیں میری ہی ماں نے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ جب تک مجھے بھی سوار کرنے کو نہ ملے گی، میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ بڑے ہشیار ہو آپ تو مزے میں سواری کر و گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا! ہوتے ہوتے اس سوال پر جھگڑا ہوا اور منگل کو بری طرح پھٹکار پڑی۔ اس کے نازک احساسات کو اتنی شدید چوٹ پہنچی کہ اس نے پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ سریش بابو کے گھر کا کھانا نہیں کھائے گا۔ لیکن پیٹ کی مار آخر عزت نفس کے احساس سے زیادہ جان لیوا ہوتی ہے۔ منگل کا اور کوئی سہارا نہ تھا آخر ہار کر وہیں جھوٹے پتّل چاٹنے پہنچا۔ آخری منظر بڑا دلدوز ہے۔ اس نے پتّل کو اٹھا کر منگل کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں ڈال دیا۔ منگل نے اس کی اور ایسی آنکھوں سے دیکھا جن میں ممنونیت کا احساس بھرا ہوا تھا۔ ٹامی بھی اندر سے نکل آیا تھا۔ دونوں وہیں نیم کے نیچے پتّل میں کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا۔ دیکھو پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ یہ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتی تو کیا کرتے ؟ ٹامی نے دُم ہلا دی۔ سریش کو اماں نے پالا تھا۔ ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔ لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے ! ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔

کتا اس کہانی میں ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ علامت انتہائی ذلت کی ۔ سماج کچھ لوگوں کو اتنا ذلیل کرتا ہے کہ ان کو اچھوت بنا کر انہیں کتوں کی طرح جینے پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر بھی وہ اپنے آقاؤں سے کتوں ہی کی طرح وفادار رہتے ہیں اور ہر روٹی کے

سیّد علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط ۱۰

(اپنے پر طول سے پہلے اپنا پورا تعارف کرانے
الے شاعر مقصود مرحوم تھے۔ غزل شروع ہونے سے پہلے
عبارت اپنے قلم سے لکھ لیتے

• از قلم یوسف جمال عرف محمد مقصود عالم منشی
لیوالعلائی مالک مکان و مالک ذی اختیار محلہ نادرہ
نج وارڈ ...... پرگنہ ...... ضلع ......
بس کو غصب کیا پدر ظالم نے مع گنگ زمرہ بدمعاشوں
کے۔ لبٹ (Boot) پوٹ (Foot) اور لوٹ
لارئیٹ۔ تھینکس (THANKS) عطا کردہ گورنمنٹ
آف بہار۔ دو سو چھپن بار اٹنڈ (Attend) کردہ
ی۔ ایس۔ پی البوالخیر الک " قاری جو ان سے ناواقف
ہوں گے (زیادہ تر آج کی نسل) وہ تو سمجھیں گے کہ ایسا
شخص یقینی طور پر دماغی توازن کھو چکا ہوگا مگر نہیں۔
س میں شک نہیں کہ جہاں ان کے والد کا ذکر آتا یا خود
نہیں اپنے والد یاد آتے تو بہک جاتے مگر وہ اپنے
الد کو مادی ہی نہیں کرتے تھے۔ کہا کرتے میاں بالو (یعنی
میں) میں نہایت حسین و جمیل تھا۔ میرا نام یوسف جمال
ہے تخلص مقصود۔ مگر مقصود عالم اس لئے لکھنے لگا
کہ اوائل میں محبوب عالم صاحب اور صدیق عالم صاحب
کی صحبت میں رہا۔ (یہ دونوں اکابر بہ نجورہ ضلع گیا کی مقبول
ہستیاں اور شہر کے روسا میں گنے جاتے تھے) کشتی
کا شوق تھا۔ میں دریافت کرتا۔ " استاد آپ میں اور
محبوب عالم صاحب میں پہلوان کی حیثیت سے کون بہتر
تھا۔ تو بتاتے " ہم دونوں ٹٹ وپٹ (یعنی برابر کے
پہلوان تھے) جہاں تک فن کا تعلق ہے میں نے دیکھا
کہ وہ داؤ پیچ کے ماہر تھے جس کا تماشہ کئی بار دیکھنے
کو ملا۔ انہوں نے ایک پیچ میرے ایک منشی رضا خاں
صاحب مرحوم کو بتایا کہ اگر کسی پہلوان کی پشت ہو تو
گردن پر ہاتھ رکھ کر کس طرح اس کو زیر کیا جاتا
ہے۔ یہ خیال ہے کہ یہ عمل چشم زدن میں ہونا چاہیے
ایک بار مقصود مرحوم مجھ سے باتیں کر رہے تھے اور بھی
دو ایک کھڑے تھے۔ رضا خاں آہستہ سے ان کے پیچھے

دیکھے باؤں آئے۔ مجھے اشارہ کیا کر بتاؤں نہیں۔ اور چشم زدن میں مقصود مرحوم کی گردن پر ہاتھ رکھنا چاہا ان کا ہاتھ گردن تک تو جاتے دیکھا پھر جو ہوا سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ہوا۔ مقصود مرحوم باتیں کرتے کرتے زرا جھکے اور پھر رضا خاں مرحوم ان کے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے زمین پر دھم سے گرے۔ ادھر رضا خان طور مچلنے لگے کہ عجیب بیہودہ انسان ہو اس زور سے دے پٹکا کہ کمر میں سخت چوٹ آئی۔ مگر استاد مرحوم ان کے پروا کئے بغیر الگ خفا تھے۔ وہ میاں بابو یہ رضا خاں خطرناک آدمی ہے میرے ہی داؤ سے مجھ پر وار کیا۔ اگر میں کاٹ نہ جانتا تو یہ مجھے اٹھا کر پٹک دیتا۔ ایسے کئی بار تماشے مقصود مرحوم دکھا چکے تھے۔ میں ان کو استاد کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ شاعری کرتے تھے مگر کسی کا کلام سُن نہیں سکتے۔ مشاعرہ میں اگر ان کو شروع میں پڑھوا دیا گیا تو فوراً وہاں سے روانہ ہو جاتے اور جو ملتا اس سے کہتے کہ مشاعرہ سمجھو ختم ہو گیا۔ میں نے غزل پڑھ دی مشاعرہ اسٹارٹ (START) کر دیا۔ لوگ پوچھتے کہ استاد (سبھی لوگ ان کو استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے) مگر دوسرے شعرا تو اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ وہ کہتے کہ یونہی آؤں جاؤں کر رہے ہیں۔ پبلک سب اٹھ کر چلی گئی۔ غزل بھی کم از کم پچیس تیس اشعار کی ہوتی۔ پیدائشی شاعر تھے۔ کسی سے اصلاح نہ لی۔ مگر کبھی شعر میں غلطی تلاش کرنا کار دے وارد والی بات تھی۔ افسوس ان کا کلام ان کے ساتھ دفن ہو گیا ہو گا۔ غالباً ۱۹۵۰ء کے آخری حصہ میں انتقال کر گئے۔ اپنے والد کے نام سے بیزار رہتے تھے یہ تو بتا چکا ہوں مگر ایک بار محبوب وارثی صاحب مرحوم کے نکاح کے موقع پر (یہ نکاح ظفر منزل میں شام کے وقت ہوا تھا) ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک نہایت ضعیف آدمی کو آتے دیکھا۔ نہایت دبلے پتلے، شیروانی، چوڑی دار پاجامہ پہنے۔ سلام علیک کے بعد جب استاد مرحوم کی نظر پڑی فوراً مود باشہ کھڑے ہو گئے۔ یہ ان کے والد تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیسے ہو مقصود" بولے "حضور کی دعائیں ہیں۔ الحمد اللہ" جانا چاہتے تھے کہ انہوں نے کہا "بیٹھ جاؤ" بولے "حضور کے حکم کی تعمیل" یہ کہہ کر چپ چاپ پانچ دس منٹ بیٹھے پھر اجازت مانگی کہ "قلب بے چین ہو رہا ہے اجازت ہو تو اٹھ کر ٹہل لوں" اجازت لے کر ادھر ادھر ٹہلے پھر ظفر منزل سے باہر۔ ان کا ایک شعر اس زمانے میں تقریباً ہر شخص کو یاد تھا۔

سبزہ اگر نہ گورِ غریباں کی لے خبر
حسرت زدوں کی قبر پہ چادر چڑھائے کون

اسی غزل کا ایک شعر اور مجھے یاد ہے۔

صحرا ہے ہولناک شب تار اور ہم
سایہ بھی ہو نہ ساتھ تو پھر کام آئے کون

باتوں باتوں میں ایک شعر اور یاد آگیا۔

ترے ہاتھوں میں کیا کل ہے سکون و بیقراری کی
نکلتے ہیں جو تیری بزم سے مضطر نکلتے ہیں

افسوس اور اشعار یاد نہیں آرہے ہیں۔ ہاں ایک بات اور قابل ذکر ہی نہیں بلکہ اگر نہ لکھوں تو ان کی حق تلفی ہو گی۔ مرحوم نہایت غیور تھے۔ ایک کمرہ خواجہ حبیب تاج الدین صاحب مرحوم (رجسٹرار) کی قیام گاہ رام سلہ پہاڑ پر ان کو ملا ہوا تھا وہاں سامان رکھتے تھے۔ کپڑا وغیرہ، کھانے کا سلسلہ یہ تھا کہ جا جا جاتے لوگ تو ان

کے گرویدہ تھے۔ روک لیتے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم لوگ ظفر منزل میں بیٹھے ہیں دکھن طرف ویرانڈا VARANDAH میں نشست ہے۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے۔ معلوم تھا کہ ڈیڑھ بجے کھانا ٹیبل پر لگ جائے گا۔ اٹھ جاتے اور اُتر طرف لمبے برآمدے میں ٹہلنا شروع کرتے کہ لوگوں کی نظر بچا کر چلے جائیں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے خاص طور پر ان کا خیال کرنا پڑتا تھا۔ ورنہ وہ غیور شخص جتنے وقت فاقہ ہو مگر زبان کھولنے والے نہ تھے۔ اب میں ایسے انسان کو ماؤف نہیں کہہ سکتا خواہ وہ اپنے والد کو برا بھلا کہتے ہوں۔ غالباً ان کے دماغ پر بیوی کی موت نے کچھ زیادہ اثر ڈالا ہوگا۔ حکیم کا علاج ہوگا کہتے تھے کہ "ران کے پاس سے سیخ گرم کرکے پیر کے نچلے حصے سے نکالی جا رہی تھی۔ مگر مجھ میں طاقت تھی۔ بھاگ نکلا۔ جان بچ گئی۔ ورنہ اپنی دوسری بیوی کو خوش کرنے کو وہ مجھے ختم کر دیتے"۔ دسترخوان پر بھی نہایت مہذب انداز میں کھانا کھاتے اگر کوئی چیز بڑھائی جاتی تو کھڑے ہو کر تسلیم بجا لاتے پھر لیتے۔ کپڑے بہت سارے پہنے رہتے تھے ایک پاجامہ اتارا تو دوسرا اس کے نیچے پھر تیسرا اس کے نیچے۔ یہی حال کرتوں کا تھا۔ خوش فکر بھی تھے۔ کھانا پکانا جانتے تھے۔ کباب، گریل (GRILL) بہت مزیدار لگاتے تھے۔ غرض کہ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ کہتے تھے "میاں بابو۔ اگر میں انگریزی جانتا تو پوپ (POPE) ہوتا"۔ یہ بات تو کالج میں داخلہ کے بعد معلوم ہوئی کہ مراد پاپائے روم نہیں بلکہ انگریزی شاعر پوپ سے تھے۔

▲ متفرقات

گیا میں سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ [illegible] دو اور

شعرا کا کلام پڑھنے کا موقع ملا۔ ندیم ہی ایک جریدہ تھا جو نانا ابا بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ ہاں "عصمت" بھی، مگر عصمت کچھ سمجھ سے باہر تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے قریب "ساقی" بھی پڑھنے کو ملتا تھا۔ نانا ابا مرحوم جب باہر جاتے تو ان کے بیڈروم سے "ساقی" یا "ندیم" یا کتابیں لے کر پڑھتا۔ اور جلد ان کے آنے سے قبل رکھ دیتا۔ اس میں عظیم بیگ چغتائی کی ساری کتابیں مثلاً کمزوری، شہزوری، خودداری، مرز، جنگی کوبتار، انگوٹھی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ۔ ہاں تو ندیم میں ایک شاعر رسا ہمدانی ٹرپل ایم اے کا کلام چھپتا تھا۔ رسا صاحب کو دیکھا نہیں مگر یہ معلوم ہوا کہ تین مضامین میں وہ ایم اے ہیں تو ان کا زبردست رعب طاری ہوا۔ اسکول میں زیادہ تر اساتذہ بی اے تھے۔ ایک شیو شنکر بابو ایم اے تھے۔ اس بات کو شمس صاحب سے کہا کہ سب سے قابل شاعر تو رسا صاحب ہیں۔ شمس صاحب نے بتایا کہ کوئی ایم اے، بی اے کی ڈگری کی وجہ سے اچھا شاعر یا برا شاعر نہیں ہوتا بلکہ اس کا کلام کیسا ہے۔ اور رسا ہمدانی ہم لوگ جیسے شاعر نہیں۔ شمس صاحب کی مراد "ہم لوگ" سے صرف ان کی ذات ہوتی تھی۔ دوسرے شاعر حفیظ سہروردی مرحوم تھے۔ یہ وکیل بھی تھے۔ وکالت کرتے تھے۔ خالو ابا سے دوستی تھی اکثر آتے تھے۔ شعر و شاعری کی سمجھ تو نہ تھی۔ اشعار سن لیتا مگر کچھ یاد نہیں رہتا۔

▲ حفیظ جالندھری

گھر کی مرغی دال برابر۔ باہر کے شاعر کا رعب زیادہ ہوتا تھا۔ حفیظ جالندھری ہندوستان کے

شہرت کے شاعر جب پٹنہ تشریف لائے۔ میں پٹنہ کالج میں ایک طالب علم تھا۔ ظاہر ہے کہ حفیظ جالندھری پٹنہ تشریف لائیں اور بزم ادب پٹنہ کالج مدعو نہ کرے ناممکن بات تھی۔ ارباب حل و عقد کی دعوت پر پٹنہ کالج میں ایک ادبی نشست ہوئی۔ اور مرحوم نے شاہ نامہ سنایا۔ اس سلسلے میں یہ عرض کردوں تو بے جا نہ ہوگا کہ کسی شاعر کا کلام سننے والے دو چار گھنٹے مسلسل نہیں سن سکتے۔ اکتاہٹ ضرور ہوتی ہے۔ مگر حفیظ صاحب جب شاہ نامہ دو چار گھنٹے بھی پڑھتے تو سننے والے نہیں تھکتے اور نہایت خاموشی اور جذبۂ اعتقاد سے مست ہو کر داد سخن دیتے۔ حتیٰ کہ خود مرحوم سناتے سناتے جب تھکتے تو فرماتے حاضرین میں جب تک ایک سگریٹ پی لوں آپ درود شریف پڑھیں۔ پتہ نہیں۔ کچھ کلام میں واقعی عجیب تاثیر ہوتی ہے مثلاً حالی کی مسدس میں جب یہ ٹیپ کا بند آتا ہے کہ

"ہوا پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیل اور نوید مسیحا"

یا حفیظ جالندھری کی نظم شاہ نامہ میں بعثت رسول صلعم سے پہلے جب یہ شعر آتا ہے کہ صحرانے اللہ سے یہ دعا کی۔

اگر اب میرے دامن سے ہوائے گرم آئے گی

تو مجھ کو رحمت العالمین سے شرم آئے گی

تو عجیب و غریب اثر ہوتا ہے۔ حفیظ جالندھری مرحوم کو پہلی اور آخری بار سنا۔ پھر کبھی ریڈیائی مشاعرہ میں بھی سننے کا اتفاق نہ ہوا۔ ویسے اکثر شاعروں کو جن کو دیکھا نہیں مگر ریڈیائی مشاعرہ میں سننے کا اتفاق ہوا۔ مثلاً حسرت موہانی مرحوم، مجاز مرحوم، آل احمد سرور صاحب۔ سرور صاحب سے بسلسلۂ یاشاؔ میں ... پور کے جلسہ میں ضرور حاصل ہوا مگر سرسری۔ انجمن ترقی اردو کا جلسہ تھا۔ ہاں وہاں پنڈت آنند نرائن ملا سے بھی شرف ملاقات حاصل کر سکا۔ سبحان اللہ اخلاق کی زندہ تصویر تھے۔

بقیہ: پریم چند کے

ٹکڑے کو ان انسانوں کا کیا ہوا احسان سمجھ کر احساس تشکر کے ساتھ کھاتے ہیں۔ کیسا دل دہلا دینے والا المیہ ہے! پریم چند کیوں نہ لڑتے، کیسے نہ لڑتے اس گھناؤنے سماجی نظام کے خلاف۔ لیکن پریم چند نے اسے محض جذبہ مسئلہ نہیں بنایا اور نہ صرف مذہبی، وہ سماجی اور معاشی عوامل پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اور انہوں نے اس مسئلے کو اصلی ماہیت کا پتہ لگا لیا تھا۔ ہندو مذہب، ذات پات کا نفسیاتی سطح پر شعور دیتا ہے لیکن اس شعور کو فعال بناتا ہے۔ ہمارا سماجی اور معاشی نظام جس میں اعلیٰ طبقے اور فرقے انتہائی سستی مزدوری سے دولت پیدا کر کر اس پر اپنا حق جمالیتے ہیں۔

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا

شمیم حیدرِ حیدر نسب کی رخصت

(اپنے ماموں پروفیسر شمیم حیدر کے انتقال پر ایک محزون و منظوم تاثر)

حسین الحق

شمیم حیدرِ حیدر لقب کی رخصت ہے
ہمارے گھر کے عجب منتخب کی رخصت ہے
کہ جس کے دَم سے مسرت چراغ جیتی تھی
کہ جس کا نام اجالوں کی اب ضمانت ہے

وہ خوب رو کہ جمالِ خدا کا منظر تھا
وہ خوش گلو کہ الوہی صدا کا پیکر تھا
مثیلِ حُسنِ صنم تھا کہ حُسنِ یوسف تھا
عجیب شخص کہ ہر چیز میں وہ برتر تھا

فضا میں سوگ بداماں، ہوا میں ماتم ہے
گھٹا گھٹا سا عجیب زندگی کا عالم ہے
وہ شہریار سرائے فنا نہیں باقی
کہ جس کے دَم سے محبت کا نام دائم ہے

شباب دیکھ کے لگتا کہ رب نے اس کو تو
یہ چند روزہ خزانہ بھی لازوال دیا
نگاہ برق رہی، چہرہ آفتاب رہا
قسم خدا کی ہر اک نقش باکمال دیا

وہ شہسوارِ بلند حوصلہ ہوا رخصت
کہ جس کے نام سے مشکل بھی خوف کھاتی تھی
وہ اپنے ہاتھ میں نبضِ حیات رکھتا تھا
ہنسی بھی اس کے قدم چھو کے سر اٹھاتی تھی

(۲)

مگر سراب تھا، دھوکا تھا بس توہم تھا
طریقِ جبرِ مشیئت بھلائے بیٹھے تھے
ازل سے دیکھتے آئے تھے چرخِ ظالم کو
اور اس کے بعد بھی نظریں چرائے بیٹھے تھے

گری جو برق تو خرمنِ مجلس گیا سارا
لگی وہ آگ کہ روحیں بھی جل اٹھیں مولا
اٹھا وہ شورِ قیامت کے دل دہل اٹھا
یہ کیا غضب کہ ردائیں بھی جل گئیں مولا

علیم و دانا و بینا ہے، تو تو واقف ہے
سہاگ مانگنے والی کی مانگ سونی ہے
نجف کی خاک کا تارا تھا گو کہ دھندلا تھا
علیؑ کے گھر یہ قیامت بھی آج ہونی تھی

خدایا گود کا بچہ پدر کو روتا ہے
وہ جس نے دودھ پلایا پسر کو روتی ہے
بہن کا درد کوئی اور کیا سہے گا؟
کہ وہ غریب تو بس منہ چھپا کے روتی ہے

(۳)

سوائے صبر کوئی اور کیا کہے مولا؟
مگر یہ صبر بھی کیسی عجیب دولت ہے
کہ غم کے ساتھ چلیں گر تو صبر بھی پائیں
خوشی کے پل سے تو گویا اسے عداوت ہے

زمیں فلک سے چھٹی، چاند ارض سے بچھڑا
ہر ایک شئے سے جدائی ہماری قسمت ہے
جسے کبھی چاہا اسی سے بچھڑ گیا انساں
تو گویا ہجر مسلسل ہی بس حقیقت ہے

اسی جدائی نے سب کو اسیر کر ڈالا
اسی کے زہر سے سب نیم جاں ہوئے آخر
اس ایک زہر کا تریاق کیا ملے مولا
گزیدۂ شبِ ہجراں تو سب ہوئے آخر

وہ آسمانِ محبت کے سب ستارے تھے
شمیم پھیلتی رہتی تھی ان میں حیدر کی
عجب کیا کہ ستاروں کی صف شکست ہوئی
خدایا کیسی مشیت یہ تو نے ظاہر کی

(۴)

ملا جواب کہ شبیرؑ کا الم سوچو
علیؑ سے عابدؑ بیمار تک تسلسل ہے
نبیؐ کے گھر تو مسلسل قیامتیں ٹوٹیں
نظر سے آنکھ ہٹائے تو پھر وہ کیا کم ہے

جگر فگار کرو بھی تو کیا تمہیں حاصل
زمانہ ایک مسلسل ندی کی صورت ہے
حیات و موت بہاؤ کے دو سرے سمجھو
ادھر اجل تو ادھر زیست کی ضرورت ہے

تم اپنے غم کو اب وجد کے غم سے دھو ڈالو
ملے جو غم تو غمِ کربلا کو یاد کرو
مسافروں کی قناتوں کی بے حسی سوچو
حسن کے سامنے موت لیے کو یاد کرو

(۵)

یہ کچھ گھڑی کے در و بام کی محبت کیا
یہ دھوپ چھاؤں تو فانی ہے، بس خدا دائم
سرائے دہر فنا میں تو بس "چلا چل" ہے
یہاں کبھی بھی کوئی نام رہ سکا قائم ؟

ہر ایک دید کو مرنا ہے، یاد کو رہنا
ہر ایک یاد کی دولت سنبھال کر رکھنا
سفر طویل ہے، صحرا کی دھوپ سے آگے
بچھڑنے والوں کی یادوں کے سائے میں چلنا

فضا میں سوگ بداماں، ہوا میں ماتم ہے
گھٹا گھٹا سا عجب زندگی کا عالم ہے
یہ سارا نقش خیالی، ہوا پہ قائم ہے
بس ایک یاد سہارا ہے، خواب دائم ہے

اس ایک خواب سے شب بھی نشان رحمت ہے
وہ ایک خواب اجالوں کی اب ضمانت ہے
ہمارے گھر کے عجب منتخب کی رحلت ہے
شمیم جیسے حیدر نسب کی رخصت ہے

اُردو پڑھیے، اُردو لکھیے

شارق عدیل

ہے فضا تاریک تر سونے گھروں کے درمیاں
روشنی پھیلی ہے لیکن مقبروں کے درمیاں

گونج جائیں گی صدائیں سلسلہ در سلسلہ
چیخ کر دیکھا نہ جائے پتھروں کے درمیاں

چند لمحوں کے لئے ہی آؤ رکھ کر دیکھ لیں
اپنی آنکھیں خوبصورت منظروں کے درمیاں

آنکھ کھلتے ہی زمیں پر آگرا تو کیا ہوا ؟
آسماں سمٹا ہوا تھا شہپروں کے درمیاں

ریزہ ریزہ کون ہوگا گفتگو کے وار سے
شیشہ گر کوئی نہیں ہے آذروں کے درمیاں

اس لئے تیغیں شکستہ ڈھال بن کر رہ گئیں
حوصلہ وہ کھو چکا تھا خنجروں کے درمیاں

غزل

"ایودھیا — چھ نظمیں"

● مناظر عاشق ہرگانوی ●

(۱)

وہ جو سو گئے لوگوں میں
ایک دہکتی سلاخ کے جلنے کا رنگ
پیدا ہو گیا ہے
بھوک کا لق و دق جنگل
پانی کے بلبلے کے رنگ سے مشابہ ہے
پوجا کے ڈھونگ نے بھی اب
ایسا رنگ ابھارا ہے
جو کالے رنگ کی گرم سڑک بناتا ہے
جس پر خون کے چھینٹے ہیں
اور جو مذہب کی پشت سے ہو کر جا رہا ہے

(۲)

مذہب کے دائرے میں بندھا
آدمی کا جیون
کتنا واہیات ہو گیا ہے
ٹھنڈی زہر بھری ہوا سے
اور بندشوں سے
ٹکراتی ٹوٹتی سانسیں
عدالت کے کٹہرے
کار سیوکوں کی زد میں آگئی ہیں
ننگی سچائی کے سامنے
ترشول لیے کھڑے ہو گئے ہیں

(۳)

ایودھیا کے حادثے کے بعد
قبرستان تک
آنسو بہا کر
اپنے حصے کی تلاش میں
کھو گیا ہے
ہندوستان کا اقلیتی آدمی!

(۴)

ایودھیا
چوراہے پر ایک خبر کی طرح
لٹکا ہے
لوگ اپنا گھبرایا ہوا چہرہ
پڑھ رہے ہیں
عزیزوں، دوستوں کو
پوچھ رہے ہیں
لگتا ہے
نیند کو پنجے میں پھنسائے
ایک چیل اڑی جا رہی ہے

(۵)

ہم نے چاہا تھا
کالے چہرے کو
جامنی ہونٹ دیدیں
اپنی شوکیس کا حصہ بنالیں
مگر یہ رنگ
اپنے نہیں بن سکے
پہچان کی بساط پر
شہ کی چال چل گئے
اور سورج پورب کی بجائے
اتر سے نکل کر
سارے چہرے کو
لہولہان کرتا چلا گیا ہے

(۶)

سانپ کتنا سرسراتے ہیں یہاں
ہم نے گننے کی کبھی کوشش نہیں کی
اور کبھی جھٹکنے کے بارے میں
ہم نے سوچا ہی نہیں
آج لیکن دب گئے ہیں
آگ کی لمبی زبانیں
ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں
سانپ کی یہ اکثریت
زہر کا جادو جگا کر
ہوش کی اپنی گواہی دے چکی ہے
اور ہم مجبور و بے بس !

یہ تم نے کیا غضب کیا!

(بابری مسجد کے انہدام پر فرقہ پرستوں کے نام)

عبد الاحد ساز

یہ تم نے کیا غضب کیا ـــــ!
ہماری سانس میں بسی وطن کی سرزمیں کی مہک میں زہر بھر دیا
بڑی کدورتوں کے بعد بھی
دیانتوں کا اِک قرار
چاہتوں کا ایک خواب تھا
ـــــ اُسے بھی چور کر دیا!
ہمارے دیس کی پرمپراؤں کے امین صرف تم نہیں ہو، ہم بھی ہیں
تمہاری آتماؤں کے دکھوں میں مضطرب ہمارے غم بھی ہیں
کہاں کہاں جڑے ہوئے ہیں ہم
تمہاری سب کتھاؤں، سب حکایتوں کا رس ہمارے آرٹ میں رواں دواں
ہماری داستاں کے آب و رنگ خود تمہارے فن میں جاوداں
ملے جلے معاش و روزگار، طرزِ زیست، جہدِ زندگی
ہمارا دردِ مشترک ـــــ جہالت اور مفلسی
ہزار سال سے جڑے ہمارے دامنوں پہ یہ لہو کا رنگ کس لئے ؟
بجا ـــ ہمارے جرم سب
تمہارے سب گناہ بھی
ہمارے بیچ ہے مگر پرائشچت کی راہ بھی
پیام جب کہ مندروں کا، مسجدوں کا ایک ہے
بساطِ آشتی پہ پھر فساد و جنگ کس لئے ؟
ذرا پلٹ کے دیکھ لو
ذرا ٹھہر کے سوچ لو
ـــــ یہ کارِ ظلم و جبر تم نے کتنا بے سبب کیا
ـــــ یہ تم نے کیا غضب کیا!

نظمیں

تعلق

ڈاکٹر سعید عارفی

خواب میں بھی
تو
پہچاننے میں زحمت ہو
کریں جو بات
تو ایسے
کہ
یہ گماں ہو جائے
کہ
ہم میں تم میں
کوئی
رسم و راہ تھی ہی نہیں

○

شہر

جینت پرمار

پل بھر پہلے
لہو کی اک ندی میں گرا تھا
ہتھیلیوں کے بل مشکل سے
ابھی ابھی اٹھا ہے
ماتھے اور کنپٹیوں سے
اب بھی خون ٹپکتا ہے
ہاتھ لٹکتا ہے جھولی میں
ایک ٹانگ گولی سے زخمی
مشکل سے
بغل میں بیساکھی کے سہارے
اپنی کمر سیدھی کرتا ہے
اور کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے

○

جی جی سریواستو رند ساغری

غزلیں

درد کی بخشی ہوئی سوغات سے جائیں گزر
زندگی گزرے تو ان آفات سے جائیں گزر
شور تھم جائے تو ہم لوگوں سے پوچھیں راستہ
بھیڑ کچھ کم ہو تو اس بارات سے جائیں گزر
بھیگتے لمحوں کی کچھ تو آبرو رہ جائے گی
دھوپ کھل جائے تو اس برسات سے جائیں گزر
زندگانی کے سیہ پانی میں کیوں غوطے لگیں
کیوں نہ ہم بے مہری حالات سے جائیں گزر
شیشہ و پتھر کے اب تو فاصلے کم ہو گئے
وقت کہتا ہے کہ ان لمحات سے جائیں گزر
بات کی خاطر تو اکثر سر کٹا دیتے ہیں لوگ
ہم نہیں ایسے کہ اپنی بات سے جائیں گزر
رند اپنی بے بسی کی انگلیاں ہی تھام کر
دورِ حاضر کی اندھیری رات سے جائیں گزر

اتارے بزم میں کوئی تو خامشی کا بوجھ
اٹھائے شمع کہاں تک یہ روشنی کا بوجھ

ہوائیں گاڑتی پھرتی ہیں ریت کے خیمے
اٹھا سکیں نہ کبھی سر پہ یہ کسی کا بوجھ

تمہارے شہر کے آداب ہیں نہ کوئی اصول
کسی کے سر پہ ہے رکھا ہوا کسی کا بوجھ

اک ایسا دور بھی دیکھا ہے ہم نے موسم کا
گلوں سے اٹھ نہ سکا جب کسی کلی کا بوجھ

یہ کیسی آج کی تہذیب نے ہے لی کروٹ
کہ آدمی ہی پہ بھاری ہے آدمی کا بوجھ

سکون ملے تو ذرا ٹھہر جاؤں دم لے لوں
اٹھائے پھرتا ہوں مدت سے زندگی کا بوجھ

جو آرزو ہے تو اے رند بڑھ کے لے لو جام
لئے ہوئے دل پہ عبث ذوقِ میکشی کا بوجھ

شعیب احمد کاف

بابو! کہانی نہیں سناؤ گے؟

پہلے ان دنوں کی بات ہے جب ' الف لام میم ' نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ ابتدا ہی سے اس نے جم کر لکھا۔ کاوشیں چھپیں اور صرف دو سال کے عرصے میں وہ صف اول کا افسانہ نگار مانا گیا۔ اس کے افسانوں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں موضوعاتی فقدان نہیں ہوتا۔ اور نہ ان میں اسلوب کی وہ پیچیدگی اور تصنع جسے آج کا لکھنے والا تخلیقی زبان بتا کر قاری کو دھوکا دیتا ہے۔ الف لام میم کی تخلیقات میں یہ بات ہرگز نہیں تھی۔ وہ کبھی زندگی کے عام تجربات میں ایک حقیقت سا موڑ پیدا کر دیتا جس سے کہانی جنم لے لیتی۔ وہ صرف اور صرف موضوعات کی بنیاد پر اپنے افسانے تعمیر کرتا۔ اوروں کی مانند دھند میں اپنی بات ہرگز نہیں کہتا۔ جس کے سبب واقعات، کردار، مکالمات اور افسانے کی پوری فضا واضح اور روشن ہو جاتی تھی۔ پس اس کی کہانیاں افسانے ہوتے کے باوجود حقیقی لگتے۔ یوں لگتا کردار سامنے چل پھر رہے ہیں۔

دو سے پانچ سال گذرے۔ الف لام میم معیاری رسالوں میں پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے رسالے میں اس کی تخلیق نظر آنے لگی۔ پڑھنے لکھنے والوں نے اسے خطوط لکھنے شروع کر دیئے تھے۔

پھر مخلصوں نے مشورہ دیا کہ ایک مجموعہ نکال لے۔

" تم خریدو گے؟ " وہ ان مخلصوں سے الٹا پوچھ لیتا۔ وہ کہتے ایک تو ضرور خریدیں گے۔

" باقی کے سمندر میں پھینک دوں؟ "

اسے پتہ تھا کہ وہ اردو کا ادیب ہے اور اردو کا قاری کتابیں مانگ کر پڑھنے کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ کوئی طوعاً و کرہاً ایک کتاب خریدے گا اور دس کتابیں دوسرے سے مانگ کر پڑھے گا۔

ملک سے خطوط لکھنے والے بھی تو صرف ایک کتاب خریدیں گے۔ پانچ سالوں میں ڈھائی سو خطوط جمع ہوئے ہیں۔ اب ضروری نہیں کہ ہر خط لکھنے والا خریدے ہی۔

ایک بھی پنکھا (Fan) اگر پانچ پانچ کتابوں

ی ذمے داری سے نو ہزار ڈیڑھ ہزار کا پیالہ آسانی سے
نکل جاتی تھی۔ لیکن انڈیا ـــ اور ـــ اردو ـــ کہاں
تیم تھا۔ بیچ حرف تقسیم کچھ حاصل نہ ہوگا۔ الف لام
میم یہ جانتا تھا۔

اُردو کی کتابوں کے دوکاندار ـــ اُف ـــ کچھ
نہ پوچھئے۔ عجیب حال ہے ـــ وہ دکانوں پر فروخت
لئے آئی ہر کتاب کو اپنا آبائی ورثہ تسلیم کرتے ہیں۔ غریب
دیب یا شاعر سوچتی کر کے ہزاروں میل دوری
سے انہیں کتابیں بھیجتا۔ فخر کا پیکر بن کر وہ لکھتا براہِ
کرم انہیں فروخت کر کے اپنا کمیشن نکال کر باقی رقم
روانہ کر دیں۔ اور یہ حضرات ان کتابوں کو ڈکار لے بغیر
ہضم کر جائیں۔ اُدھر بے چارہ ادیب، شاعر مہینوں
نہیں سالوں خطوط لکھتا رہتا۔ رقم کے تقاضے جاری
رہتے اور ان کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگتی۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ اکا دکا کوئی شاعر یا ادیب ان
کے پاس چلا آیا اور کتابوں کی رقم مانگی اور صاحب
دکان صاف مکر گئے کہ کتابیں تو آئی ہی نہیں۔ ہاں ایک
دو دکان دار شریف زادے بھی ہیں جو باقاعدہ فروخت
ہونے کے فوری بعد متعلقہ احباب کو ان کی امانت لوٹاتے
رہتا لیکن ایک دو سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں تو آوے کا
آوا ہی خراب ہے۔

الف لام میم کے اپنے ہی شہر کے ایک شاعر کا حال
سب سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ "کلیم ورباجوادی" وہ
گزشتہ بارہ سالوں سے ہر سال اردو کی کوئی نہ کوئی کتاب
باقاعدگی سے نکالتے آ رہے تھے۔ چھ سات سو کی تعداد
میں اور ہر اشاعت کے لئے انہوں نے کبھی اپنا

سے قرضہ لیا۔ ہر اشاعت کی ڈیڑھ دو سو کاپیاں شاعروں
کو مفت روانہ کر دیتے۔ سو سوا سو لائبریریوں کو بھیجتے
باقی خود رکھ لیتے۔ بکتے تو صرف چھ یا سات۔

الف لام میم نے ایک بار جوادی سے پوچھا۔ "یہ
کیا کرتے ہیں جناب آپ؟"
وہ مسکرائے۔ "خدمت نہیں کہو گے تم اسے۔
بے لوث خدمت۔ اردو کی ـــ؟"
"لیکن حاصل؟"
"اب ہر کوئی معاوضے یا صلے کا سوچنے لگے تو اللہ
میاں زمین کو الٹ نہ دیں" ــــ یہ جوادی کا جواب تھا۔
وہ سب جان گیا اس لئے مجبوراً نہیں نکالا
اتنا ضرور کیا کہ جس رسالے میں بھی کہانی شائع ہوئی اس
کے اوراق نکال کر جلد بنوالی۔ پانچ جلدیں بن گئی تھیں
کل اب تک۔

ایک بار الف لام میم اپنے آبائی گاؤں پہنچا وہاں
اس کے ایک دور کے رشتے دار لیسین بھائی سے ملاقات
ہوئی۔ بالشت کر بیٹھے ہیں کتنے دن۔ انہوں نے اٹھ کر اسے
گلے سے لگایا، خوب بھینچا۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ ورنہ
اس سے پہلے تو لیسین بھائی سے جب بھی ملاقات ہوئی وہ
صرف مصافحے پر قناعت کرتے۔

"کیا بات ہے لیسین بھائی ... کچھ جھیلی پا سلے
ہوں آپ ہیں؟" اس نے استفسار کیا۔
"بالیو ـــ ایک کہانی پڑھا تھا تمہاری ـــ واہ ـــ
مزہ آگیا ـــ یقین نہیں آیا کہ تم نے لکھا ہے۔ جیسے فطرے
حالاتِ حاضرہ کے نبض پہ انگلی رکھ دی تم نے تو ـــ خاندان

ـــ اتنی اچھی زبان کہاں سے لی تم نے۔ سنتا ہے کافی
یب رہے ہو پتہ نہیں کن کن رسالوں میں؟
خریدتے ہو نا یسین بھائی۔ کتنے رسالے ہیں بازار میں؟
ن لام نے کہا۔

ہاں! لیکن دراصل میں India Yesterday
ر News Weekly کا مستقل خریدار ہوں نا۔ اس
اردو رسالوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔

الف لام داشتہ کسمسا کر رہ گیا۔ جی میں آیا کہہ دے
یسین بھائی نام بھی بدل لیجئے۔ جیمس ہو جائیے ـــ لیکن
کس سے کہتا اب تو ساری ہی قوم کو کرسچین بن جانا
ہے۔ نام بدل لینے ہیں ـــ واہ رے انگریز ـــ کیا
قسمت ہے تیری۔ ملک تو چھوڑ گیا ـــ لیکن کون
منتر تھا جو تو نے پھونکا۔ جاتے وقت اپنی زبان،
ذیب، اپنے اخلاق، چال ڈھال سب چھوڑ گیا۔ اب
ادان قوم نہیں سمجھتی کہ تقلید صرف وہی کرتا ہے جس کے
پاس کوئی ٹھوس بنیاد اور مضبوط دیوار نہیں ہوتی۔
مکمل نظام حیات (جو قیامت تک کے لئے اور
زمانے کے لئے ہے) اپنے پاس ہونے کے باوجود یہ تیری
ہی تقلید میں باؤلے ہو رہے ہیں۔

اور انگریز ـــ جب تک تو تھا۔ تیرے خلاف
ے جاری ہوتے تھے۔ تیری ملازمت اختیار کرنا کفر
ر دیا جاتا۔ کوئی شرٹ پینٹ پہنتا تو اسے برادری سے
ارج کیا جاتا۔ انگریزی کا ایک لفظ بولنا گالی دینے
مترادف تھا۔ مگر آج۔ جو تیری زبان نہیں جانتا وہ
ہل کہلاتا ہے۔ سات سمندر پار سے یہ سب دیکھ کر خوش
تا ہے نا تو ـــ؟ اور پیارے انگریز تجھے یاد ہوگا کہ
ے اپنے عہد کے دوران ایک بیج بویا تھا۔ دو پیاری

قوموں کے مابین نفرت کا بیج۔ آکر دیکھ کہ وہ بیج ایک
تناور درخت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جس کی جڑیں ملک
کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں۔ اس کی ہر شاخ ہر پتے اور
ایک ایک پھول سے لہو رس رہا ہے۔ پھلوں کی جگہ انسانی
سر نظر آتے ہیں۔ ٹہنیوں کی جگہ انسانی ہڈیاں۔ اس کی جڑیں
اتنی مضبوط ہو گئی ہیں کہ قیامت تک کوئی اکھاڑ نہیں سکتا۔
شاید تو نے بھی نہ چاہا ہو کہ یہ بیج اتنا پھولے پھلے۔

آکر یہ بھی دیکھ لے کہ تیری غلام قوم تجھ سے اتنا محبت
کرتی ہے کہ ہر سال یکم جنوری دھوم دھام سے مناتی ہے
بچوں کی سالگرہ کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ صرف کرسمس منانی
کی کسر رہ گئی ہے۔ اس قوم کے نام دوسرے کام پورے کے
پورے تیرے۔ ایک بات تو ماننی پڑے گی تو دو روپے میں
آٹھ سیر چاول دیتا تھا۔ آج آٹھ روپے میں ایک کیلو بھی
تو چودہ سو گرام کی ہوتی تھی کیلو تو صرف ایک ہزار گرام
رہ گئے ہیں۔ قوم کو ترقی کرنا ہے تو اتنا کرنا ہی ہوگا۔ نیو
کلیر ہتھیار بنانے میں پیٹ کو کاٹ کاٹ کر۔ فاقے کر کر کے۔

الف لام سوچتا رہا۔ جانے کیا کیا۔ پرانے قصے
باپ دادا، بزرگوں سے سنے۔ وہ خوشحالی وہ چین۔ تبھی
یسین بھائی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "کیا تم نے کوئی
مجموعہ نکالا ہے؟"

"اوں۔ ہاں۔" وہ چونکا۔ "جی نہیں، ہمت نہیں
ہوتی۔ کیونکہ اردو ناولیں اور کہانیاں اور اردو زبان
خود دقیانوسی کہلائی گئی ہے ان دنوں۔ ہمارے نوجوان
لڑکے اور لڑکیاں Chase اور Harold Robbins
کے شوقین ہیں۔ تاکہ یہ کتابیں پڑھ کر کم از کم ایک جرم تو
کر ہی لیں۔ اردو کی کتابوں میں تو انہیں روکھے سوکھے،
اخلاقیات کے درس پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اردو میں جتنی

کتابیں بھی نہیں ملیں۔ مجبوراً وہ دوسری دیا باتوں کو سیکھنے اور اپنا اخلاق جوانی اور مستقبل تاراج کر بیٹھے۔"

"لیکن میں پڑھنا چاہتا تھا بھائی تمہاری کتابیں۔ فائل تو ہوگا تمہارے پاس۔ مجھے لا دو پلیز" لیسین بھائی کہہ رہے تھے۔ الف لام نے سوچا کاش لیسین بھائی نے یہی جملہ کچھ اس طرح کہا ہوتا۔ "افسانوں کو تم نے محفوظ تو رکھا ہوگا کرم ہوگا اگر تم یہ مجھے دو۔ منگوا، یا ممنون ہوں گا تمہارا۔"

الف لام نے وعدہ کر لیا۔

دو سال بیت گئے۔ اسی دوران وہ اپنے گاؤں جا نہ سکا۔ اسے یاد تھا اپنا وعدہ لیسین بھائی کو کہانیاں بھیجنے کا۔ ایک بار موقع نکل آیا۔ ساتھ میں وہ اپنے افسانے لیتا گیا۔ لیسین بھائی کے مکان پہنچا۔ انہیں کہانیاں پیش کیں۔ لیکن .... وہ خلا میں دیکھ رہے تھے۔ اور ایک عجیب سی مسکراہٹ چہرے پر تھی۔

"لیسین بھائی یہ جلد لایا ہوں اپنی کہانیوں کا — آپ نے فرمائش کی تھی نا؟" وہ بولا۔

"کاش بابو کاش — ایک سال پہلے کا لیتے تم — پوری دلچسپی سے پڑھتا۔ لیکن اب — دیکھو۔ مجھے کچھ نہیں دکھتا۔ سب اندھیرا ہے بابو —"

الف لام کو ایک دھچکا لگا۔ اس نے غور کیا۔ وہ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ اور ان کی آنکھیں بے نور تھیں۔ "کہہ رہے تھے اوپر سے ایک Remender بھیجا گیا ہے کہ میں جانے کی تیاری کر لوں۔ لیکن جانے سے پہلے تمہاری کہانیاں پڑھ کر نہ سہی سن کر جاؤں گا چلو شروع ہو جاؤ۔"

لیکن الف لام کے پاس صرف دو گھنٹے تھے۔ سارے کام نپٹا کر اسے واپس ہو جانا تھا۔ اس نے معذرت کی۔

"لیسین بھائی — بھابی سے پڑھوا لیجئے یا شہباز سے۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ ہاں اگلے مہینے فرصت سے آؤں گا۔ دوسری جلد بھی دوں گا اور خود سنا دوں گا آپ کو۔"

لیسین بھائی کا حال اور شوق دیکھ کر اسے خود بھی خواہش ہو رہی تھی ان کی خواہش پوری کرے۔ لیکن — انسان کے ساتھ لیکن بھی قدم قدم پر جڑا ہوتا ہے۔

"ٹھیک ہے بابو — ضرور آنا — میں منتظر رہوں گا۔" انہوں نے الف لام کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

چلتے چلتے اس نے شہباز سے کہا جو لیسین بھائی کا منجھلا لڑکا تھا۔

"یہ کہانیاں ابا جان کو سنا دینا۔" اس نے سر ہلایا۔

اگلے مہینے حسب وعدہ وہ لیسین بھائی کے ہاں جا نہ سکا۔ زندگی اتنی ہی تیز بھاگ رہی تھی۔ کچھ سوچنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ ہاں دوڑتے بھاگتے وہ لیسین بھائی کے بارہ میں سوچتا۔ بس اتنی ہے زندگی۔ ابھی سب دکھتا تھا۔ ابھی سب اندھیرا ہے۔ کائنات کے تمام رنگ۔ ہرے پیلے سرخ اودے صرف کالے ہیں۔ قوس و قزح بھی کالی ہو گئی سبزہ بھی کالا — آسمان بھی — اس نے سوچا ایک کہانی لکھی جا سکتی ہے۔ لیسین صاحب کے بارہ میں۔ پر کیا لکھو کیا ہو؟

ایک دن اسے کلائمکس مل گیا۔ ایک بھتیجے نے اطلاع دی کہ لیسین بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ دوڑا۔ راتوں رات پہنچ گیا لیسین بھائی کے سرہانے۔ وہ لیٹے تھے۔ منہ تھوڑا کھلا ہوا تھا — اسے لگا۔ وہ کچھ کہہ رہے ہوں۔

نوشاد احمد کریمی

پانچ پولکیں

مجھے اس کی ساری باتیں اب بھی یاد ہیں جب وہ پہلی بار مجھ سے ملا تھا۔ کب ملا تھا — کہاں ملا تھا — یہ تو یاد نہیں آرہا ہے۔ لیکن اتنا تو طے ہے کہ بار بار ملنے سے قبل کبھی نہ کبھی تو پہلی بار ضرور ملا ہوگا۔ اور اس کی باتیں اگر سب کے کانوں میں گھر نہ کر لیتیں تو وہ سلسلہ آخری بار تک جاری نہ رہتا۔

اس کا حلیہ بھی اس کی باتوں سے مختلف نہ تھا۔ سفید پائجامہ میں ملبوس ایک شخص — جیسے نہ دنیا کی فکر نہ اپنی پرواہ۔ کچھ پانے کی خوشی نہ کھونے کا غم، ہر وقت ایک ہی تیور ایک ہی انداز — چال میں متانت، لبوں پہ مسکراہٹ، زبان پر توازن، آنکھوں میں ڈوبتے ابھرتے لمحوں کی واضح تصویریں اور ماتھے پر چھلکتی سنجیدگی کی لکیریں۔ مگر اس حد تک سنجیدگی بھی نہیں کہ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو۔ اپنے گرد و پیش سے غافل ہو۔ یعنی اس کی سنجیدگی ابھی بے حسی کی سرحد پار نہیں کر پائی تھی۔ پھر بھی اس کی وضعداری کبھی کبھی کچھ کھل جاتی تھی۔ اگر آدمی مصلحت پسند نہ ہو تو کم گفتار ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ ہر ایرے غیرے کو یہ سمجھ کر برداشت کر لیا جائے کہ اس کی عقل ہی یہاں تک ہے یوں کیسے ممکن ہے جو خود سے کسی کو اپنے اوپر مسلط کر لے گا۔ اور نام نہاد قد آور شخصیتوں کا قائل ہونا اپنی خوش نصیبی سمجھے گا۔ لوگ پاک تو بڑے بڑوں کی ایسی تیسی کرتے نہیں چوکتے۔ اس صورت میں اپنے ہونے کا احساس خود دلانا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا سپاٹ پن ایسا کچھ کرنے سے عاری تھا۔ وہ سبھوں کو اپنے ہی جیسا سمجھتا تھا۔ اور پے در پے دھوکے کے باوجود اس کے رویے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھ ہی سے پہلی بار یوں ملا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

مجھے آپ نے پہچانا؟ اس کے اچانک اس سوال پر میں ٹھٹھک گیا تھا۔ نا کہہ نہیں سکتا تھا اور ہاں کہنے کے لئے پہچاننا ضروری تھا۔ نا اس لئے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے اس مخلصانہ اور رازدارانہ انداز میں پوچھا تھا کہ

اپنی نگاہوں پہ شبہ ہونے لگا تھا اور ہاں کا تو سوال ہی نہ تھا، میری نظروں سے متعلق مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ اور وہ بار بار مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ یہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اور قبل اس کے کہ میں اس سے جواباً کچھ عرض کرتا وہ میری پریشانی کو تاڑ گیا۔ مسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میری طرف جھکا۔

"آپ نوشاد احمد کریمی ہیں نا ؟"

"ہاں !"

"دیکھئے آپ نے مجھے نہیں پہچانا اور میں نے آپ کو...... خیر اس دور میں کسے فرصت ہے جو خواہ مخواہ کسی کو پہچانتا پھرے۔ اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ دوسروں کو پہچاننے کے چکر میں زیادہ تر وہی رہتے ہیں جو خود کو نہیں پہچانتے۔ تمام زندگی تو اپنی شناخت قائم نہ ہو سکی۔ مگر دوسروں کی فکر بہت رہتی ہے اور مجھ جیسے سر پھرے بہت کم ہوتے ہیں جو اپنی شناخت کے بعد دوسروں کی شناخت چاہتے ہیں۔ اور میں نے اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ میری شناخت یہی ہے کہ ابھی میں اپنی شناخت میں ہوں۔ آپ ادیب ہیں۔ سوچ رہے ہوں گے کہاں سے کہاں آکر پھنس گیا۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو مجھے تو صرف اتنا ہی کہنا تھا کہ آپ کہانیاں بہت اچھی لکھتے ہیں۔ مگر آپ کہانیاں ہی کیوں لکھتے ہیں ؟"

"میں اپنی کہانیوں میں وہی لکھتا ہوں جو اپنے گرد و پیش میں دیکھتا ہوں۔ میرے کردار وہی بولتے ہیں جو اپنے کانوں سے سنتے ہیں اسے محسوس کرتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ جو انھیں کرنا چاہئے۔ میرے کرداروں کے پاس کوئی جادوئی چراغ نہیں ہوتا اس لئے وہ جو بھی کرتے ہیں ان میں انہیں قدم قدم پر نت نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" اور میں خاموش ہو گیا۔ لیکن میری نگاہوں کی دھند اس کے چہرے پر بدستور قائم تھی۔

میرے جواب پر وہ لمحہ بھر کے لئے چپ رہا۔ پھر مخاطب ہوا۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ کی کہانیاں حقیقت سے گریز کرتی ہیں۔ لیکن آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں اپنی کہانیوں میں........

حقیقت کی ایک ایک اینٹ سے تکمیل ہونے والی عمارت اپنی تکمیل کو پہونچ کر کہانی کیسے ہو سکتی ہے ؟ اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

لیکن اس کا ہنسنا مجھے برا نہ لگا تھا۔ کیونکہ میں بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا تھا۔

"آپ سگریٹ پیتے ہیں ؟" اس نے ہنسی روکتے ہوئے اپنی جیب ٹٹولنا شروع کیا۔ پھر ہم دونوں سگریٹ کے کش لیتے ہوئے ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھ گئے۔ سورج سوا نیزے پر لٹک رہا تھا۔ تارکول کی پگھلتی ہوئی سڑک دور تک سنسان اور ویران تھی۔

"مجھے آپ سے یوں نہیں ملنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے آپ میرے متعلق کچھ اور سوچنے لگے ہوں......

میری آنکھیں ایک بار پھر اس کے سراپے پر پھیلنے لگیں۔ اور اس بار وہ نہایت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ جیسے ابھی کچھ دیر قبل ملنے والا وہ نہیں کوئی اور ہو۔

"آپ کچھ سوچ رہے ہیں ؟"

"نہیں بس یونہی .....!"

سوچنا ایک فطری عمل ہے اور بہت سارے مسئلوں کے باوجود کچھ نہیں سوچنا اختیاری عمل ہے اور ہم جس دن اپنا یہ اختیار کھو دیں گے اس دن سے صرف

سوچنا بھی زندگی کا سرمایہ بن جائے گا۔ اور یہ سرمایہ بھی منزل اور راستے کے درمیان کہیں دفن کر دے گا اور ہماری لاشعوں کی سڑاند پورے ماحول پر قابض ہو جائے گی — ماضی اور حال کی طرح مستقبل بھی ہمارے دسترس سے پھسل جائے گا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب اس کی باتیں مجھے جانی پہچانی لگنے لگی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ اسے نہیں پہچان کر میں نے اخلاقی جرم کیا ہے۔ اور اس کے چہرے پر انانیت کا لیبل لگا لیا ہے۔ ذہن کے تاریک گوشوں سے ایک بجلی سی کوندی۔

تم وہی ہو نا جسے گھوڑ سواری کا بہت شوق تھا اور جو سرکش سے سرکش گھوڑے کے منہ میں آسانی سے لگام ڈال دیتا تھا۔ اور تلوار پر جس کی گرفت بہت مضبوط بھی تھی۔

اس نے اعتراف میں سر ہلایا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک تازہ اور فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور آنکھیں چھلکنے لگیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا مجھے پہچاننے کے بعد وہ بھی مجھے پھر سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھنسی میرے متعلق غلط فہمی کی گرد چھوڑ رہی تھی۔

— اور پھر ہم ہر روز ملنے لگے۔ ملاقات کا زیادہ حصہ اس کو سننے میں گزرتا۔ جبکہ اوروں کے ساتھ وہ کم گفتار تھا —

لیکن ادھر چند مہینوں سے وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ آخری ملاقات میں اس کی کیفیت معمول پر نہیں تھی۔ جاتے جاتے تک ہنستا ہی رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر اداسی کی لکیریں بالکل واضح ہو رہی تھیں۔ اور ہر روز کے برعکس وہ صرف مجھے سنتا رہا تھا۔ باتوں کے دوران میں اس سے پوچھ بیٹھا تھا۔

" آدمی خود کشی کیوں کرتا ہے ؟ "

میرے اس سوال پر وہ تلملا گیا تھا۔ جیسے میں نے اس کے چہرے پر اگی لکیروں کا مفہوم پڑھ لیا ہو۔ لیکن فوراً ہی اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے نہایت ہی اطمینان سے بولا تھا —

" آدمی خود کشی اپنے آپ کو پانے کے لئے کرتا ہے ! "

اور اپنے اس جواب کے ساتھ ہی وہ لوٹنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ اور اس دن کے بعد سے وہ نظر نہیں آ رہا ہے — لیکن میں اس کی تلاش میں پریشان بھی نہیں ہوں۔ کیوں کہ اس کی ساری باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں !!

(بقیہ :۔ کہانی نہیں سناؤ گے بابو)

" بابو کہانی نہیں سناؤ گے ؟ " عین ان کے سر پر کتابوں کی چھوٹی سی الماری تھی۔ انگریزی کی — اور آخر میں اس کی کہانیوں کی جلد بھی — اس نے یہ جلد نکال لی — اور کمرے سے باہر آ گیا۔ شہباز سے ملا اور پوچھا " تم نے ابا کو کہانیاں سنائی تھیں ؟ " یکایک شہباز کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے کہا — " نہیں بیٹا۔ مجھے تو اردو ہی نہیں آتی ہے۔ " اور الف لام میم فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ آنسو اس کے اباجان کی جدائی کے یا اردو سے ناواقفیت کے غم کے —

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجئے (ادارہ)

شکر خیال

رضا نمبر کی اشاعت کے بعد اس کے بعد کا شمارہ بھی خوب ہے۔ عمود کے تحت تحریریں فکر انگیز ہوتی ہیں۔

اشتراکیت کے بحران (؟) پر میرا مضمون انگریزی میں ہے۔ ترجمہ ویلور سے واپس آ کر کروں گا اور سہیل میں چھپنا بھی چاہئے۔

اردو یونیورسٹی دراصل ایک سیاسی چال ہے، یہ سیکولر حکومت عقل کا خواب دیکھتا ہے۔ اردو والے سیاست میں روپیہ بٹورنا جانتے ہیں۔ تفصیلات مطلع کروں گا۔

غالباً اب بالکل آخری منزل میں ہوں۔ تم سب کو دعا دیتا ہوں۔

▲ تارا چرن رستوگی، گورکھپور

مشرکہ شمارہ ملا۔ آپ لوگوں نے محنت کی ہے۔ خوشی ہے کہ آپ لوگ وقتاً فوقتاً ادبی شخصیتوں پر خصوصی شمارے کرتے رہتے ہیں۔ اس ادبی خدمت کے لئے سہیل یاد رکھا جائے گا۔

▲ مظہر امام، دہلی

سہیل کا شمارہ نمبر ملا۔ ماشاء اللہ معلوم ہوتا ہے، ادھر خدا کے فضل و کرم سے رسالے پر آپ کی توجہ زیادہ ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے اور حضرت بسمل، رمیز بھائی اور ادریس مرحوم کی روحوں کو چین نصیب ہو۔ آمین

امید ہے آپ مع متعلقین بخیر ہوں گے

▲ قیصر عثمانی، بمبئی

رضا اشک نمبر پر ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحات پر شمارہ بے حد پسند آیا۔ مبارکباد قبول کریں۔ دو دن قبل شمارہ ملا ہے۔ میں جستہ جستہ بیشتر مضامین پڑھ گیا ہوں۔ ان کی شاعری اور شخصیت پر اتنا بھرپور مواد آپ نے یکجا کر دیا ہے کہ چہل پہل پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے باضابطہ طور پر اس خصوصی شمارہ میں شریک ہونا تھا لیکن باضابطہ طور پر۔ تقاضہ کے باوجود کچھ نہیں لکھ سکا۔ اس کا افسوس اب ہو رہا ہے۔ بہرحال! آپ کو اور رضا اشک صاحب کو ایک بار پھر مبارکباد قبول ہو۔

▲ مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

آپ کا خط ملا۔ اور دو دن بعد 'سہیل' رضا اشک نمبر مل گیا۔ ورق گردانی کر رہا تھا کہ صفحہ ۱۴۲ پر 'کچھ رمیز کے بارے میں' نظر اٹک گئی۔ رمیز چونکہ میرے پسندیدہ فنکار ہیں اس لئے مضمون پڑھ ڈالا۔ رضا صاحب اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ —— پریم چند، بیدی، منٹو، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری اور رام لعل اور اس سے قبل کے ناول نگاروں سے بڑے فنکار ہیں —— سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فہرست سے پریم چند کا نام نکال دیا جائے تو ناول نگار رہ کون جاتا ہے۔ بیدی نے اپنے ادبی کیریر میں صرف ایک ناولٹ "ایک چادر

کیلی سی [illegible]۔ منٹو نے کبھی ناول لکھا ہی نہیں۔ منٹو
خود کہتا ہے کہ وہ اس قدر آتا تھا سیم سے سیدھا بہانا نہیں ہو سکتا
تھا۔ رام لعل بطور ناول نگار کے جانے ہی نہیں جاتے۔ یہی
حال گندی کا ہے۔ اب آگے بڑھئے — فلو کو موپاساں،
ٹالسٹائی، میکسم گورکی، چیخوف، دوستوفسکی اور سارتر وغیرہ
کے قد سے ہم ناپ سکتے ہیں۔ یہ بھی فضول ہوگی۔ موپاساں اور
چیخوف نے ایک چھوٹا سا ناول THE THREE اور
موپاساں THE FATE OF A WOMAN لکھے
ضرور لیکن ان کو ادبی اہمیت کبھی نہیں رہی۔ سارتر نے ناول
لکھے ہیں اپنے فلسفۂ وجودیت کو ثابت کرنے کے لئے لیکن
ان کی اہمیت ڈرامہ نگاری سے ہے۔ ٹالسٹائی، دوستو
وسکی کے ساتھ ترگنیف اور کچھ فرانسیسی اور انگریزی
ناول نگاروں کا ذکر تو کیا جا سکتا تھا مثلاً فلوبیر، ہارڈی
اور امریکہ کے ہیمنگوے، مارک ٹوین وغیرہ کا لیکن تو ادھر سمجھا ہی
میں گرو دیال سنگھ نے آنچلک ناول لکھے ہیں۔ ایک کا
تو حال ہی میں میں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن پنجابی
ایک مخصوص علاقہ کی زبان ہونے کی وجہ سے زیادہ
لوگوں تک نہیں پہنچی۔ دیوکی نندن کھتری منشی کے پہلے ناول
نگار تو کہے جا سکتے ہیں، آنچلک کسی طرح نہیں۔ کھتری
کے ناول چندر کانتا، چندر کانتا سنتتی ۲۴ حصے، بھوت
ناتھ ۲۱ حصے، کرشن کانتا ۶ حصے، آنچلک نہ ہو کر
طلسماتی ہیں۔ حیران کن واقعات سے بھرے ہوئے جن [illegible]
حد تک سائنسی معلومات کو بھی دخل ہے۔ جاسوسی کو بھی اور
کو بھی۔ گئودان یوپی کی دیہاتی زندگی کی عکاسی
ضرور ہے 'آنچلک' نہیں کہا جا سکتا۔ محض دیہات کی
کہانی کہنے سے ناول آنچلک نہیں ہو جاتا۔ پریم چند کے
ناول اور افسانے یوپی کی دیہاتی زندگی (جو اس وقت کم و

جیسی پورے ہندوستان کی کہانی پیش کرتے ہیں۔ جبکہ رینو
کا میلا آنچل بہار کے ایک خاص علاقہ کی (دیہاتی)
زندگی پیش کرتا ہے۔ 'میلا آنچل' پہلی بار ۱۹۵۴ء میں
میں شائع ہوا تھا۔ جبکہ بیدی کا "ایک چادر میلی سی" اس
کے بعد منظر عام پر آیا تو یہ نام بیدی کے ناول سے مستعار
کیسے ہوا۔ کیا معاملہ الٹا نہیں ثابت ہوتا؟ آنچلک
یا شبد آنچل سے بنا ہے۔ رینو جانتے تھے کہ وہ آنچلک
ناول لکھ رہے ہیں جبکہ پنجاب میں چادر اندازی جیسا فن
میں بیوہ سے شادی کرنے کا نام ہے۔ ایک مخصوص ڈھنگ
سے یعنی گھر کے ہی کسی مرد، دیور، جیٹھ یا کسی دوسرے مرد کے
کے گھر ڈال جاتی ہے۔ سہرا پر چادر ڈال کر۔ یہ گھر کی عزت
اور دین کے جوڑے کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ آخری
بات درست (؟) ہو سکتی ہے کہ میلا آنچل کا خیال کسی
بنگالی ناول سے لیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو بنگالی ناول
اس قدر مشہور کیوں نہیں ہوا؟ جب شرت چندر، بنکم
چندر، ٹیگور، پریم چند وغیرہ کی تخلیقات ہندوستان کی
ترجمہ ہو سکتی ہیں تو اتنا معروف ناول کیوں چھوڑ دیا گیا۔
کچھ قریبی علاقے کے لوگ جو حسد کے مارے اس پر بھی اڑا
دیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہت نہیں ہوا کرتے ——— یوں تو
شیکسپیر کا کوئی بھی ڈرامہ اس کا اپنا نہیں۔ لیکن کہانی
مستعاری کہانی ہے بات تو اس Treatment
کی [illegible] تخلیق کو فن پارہ بنا دیتی ہے۔ کالی داس نے بھی
سنی سنائی کہانیوں کو ناٹک کا روپ دیا تھا۔ ویسے
بھی اس دنیا میں ORIGINAL ہے کیا۔ یہی نا کہ آپ
بات کہتے کس طرح ہیں۔

● شروَن کمار ورما، امرتسر

Regd. P. & T. R.N.I. Regd. No 3320/57

The SOHAIL Monthly River Side Road, Gaya—823001

52 years of Publication Phone : 21573

